دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
جولائی 2010
نگران اعلیٰ
معراج رسول
www.pkdigest.com
قیمت: 50 روپے

11
جنوں کی حد

18
حالات برہم

آخری رقص
تنویر ریاض

انجانے

90
للکار

گاہِ جنوں

سایہ

شبِ ظلمات
فاطمہ حسام

غلط انتخاب
کاشف زبیر

ستمگر

گرداب

75500
2010 ... 50 روپے

چند باتیں جیسی تحریر ہیں

منزہ اعلیٰ

عزیزانِ من... السلام علیکم!

ماہِ جولائی کا شمارہ پیشِ خدمت ہے... اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ تعلیم ہی وہ واحد راستہ ہے جو قوموں کو ترقی کی منزل تک پہنچاتا ہے... شرحِ تعلیم کے تناظر میں پاکستان ترقی پذیر ممالک میں کافی پیچھے ہے۔ اس کے باوجود یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ جولائی سے شروع ہونے والے نئے مالی سال کے تعلیمی بجٹ میں حکومت نے نمایاں کمی کر دی ہے۔ اگرچہ وطنِ عزیز میں بڑی حد تک نجی شعبہ ہی عوام کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر رہا ہے لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ ریاست تعلیم کی فراہمی کے لیے اپنی ذمے داریوں سے آزاد ہو چکی ہے اس لیے حکومت بیٹھ کر چین کی بانسری بجائے... نجی تحویل میں چلنے والے تعلیمی اداروں پر لوگوں کا اعتماد اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سرکاری سرپرستی میں فراہم کی جانے والی تعلیم کے معیار سے مطمئن نہیں۔ یہ بات بالکل غلط بھی نہیں ہے۔ یقیناً ناقص معیارِ تعلیم کی وجوہات میں سے ایک مالی وسائل کی کمی بھی ہے۔ ہمارا تعلیمی بجٹ دنیا کے متعدد ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں پہلے ہی بہت کم تھا۔ اب اس میں واضح کٹوتی سے عالی سرکار نے سب کو یہ صاف صاف بتا دیا ہے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنا ہے تو پڑھو ورنہ جاؤ پھر پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں... وہ ہم بھی کیا قوم ہیں۔ بحیثیت مسلمان ہم قرآن پر ایمان کامل رکھتے ہیں۔ دنیا کی وہ اعلیٰ و ارفع مذہبی کتاب جس کے نزول کی ابتدا ہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوئی...

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا

پاکستان کی اکثریتی آبادی لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔ اس پر مستزاد کہ ہم نے تعلیم کا بجٹ ہی واضح طور پر گھٹا دیا ہے۔ قوموں کی زندگی میں ایک غلطی کبھی کبھار صدیوں کی سزا بن کر نسلوں پر عذاب ڈھاتی ہے۔ فراہمیِ تعلیم اور فروغِ تعلیم، حکومت اور مملکت کی ذمے داری ہے۔ یہ ذمے داری درست طور پر ادا نہ ہوئی تو پھر تاریخ کے صفحات پر مورخ کا قلم اسے قومی غلطی ہی لکھے گا۔

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں کہ آپ کی بزم میں جہاں ملک کے چھوٹے بڑے شہروں، قصبوں اور گاؤں سے ارسال کردہ آپ کے محبت نامے اظہار کے منتظر تھے۔

عابد جاناں کی خامہ فرسائی چارسدہ سے ''ٹائٹل پر حسینۂ عالم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ شربتی ہونٹوں پر تبسم سجائے جانے کس کو تک رہی تھی؟ نشیلی آنکھوں میں غرق ہوتے سے بچ نکلے تو رخِ تاباں پر اٹھکیلیاں کرتی ہوئی شریر لٹ نے رقابت میں مبتلا کر دیا۔ صراحی دار گردن میں چمکتے ہوئے ہار کی طرف دیکھنے کا حوصلہ دل مضطرب کو نہ ہو سکا۔ سو عقب میں دیکھا کہ ایک بندہ بے فکر اپنی جوانی یا شاید غموں کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑا رہا تھا جبکہ دوسرا بلند و بالا شخص تھا کہ جو چتول اٹھا کر کا عزم کیے ہوئے تھا کہ شاید دونوں ہی دل پہ چوٹ کھائے بیٹھے تھے۔ اشتہارات سے بچتا بچاتا آگے فہرست کا ایک سرسری نظر ڈالی اور سیدھا محفل میں ... مسعود بابی بارش کے ساتھ خوشیوں میں بھی تنہائی ہوئی تھیں۔ ہماری طرف سے ... یہ آپ کو جاسوسی لیے دیا ہے ... بہترین تحفہ شاید آپ کو اپنی سالگرہ پر نہیں ملا ہوگا۔ شبلی صاحب اکافی مذاکراتی ہیں۔ آپ کا ... آپ کو تو انڈیا بھیج دینا چاہیے مذاکرات کے لیے۔ یار تنویر! اتنا لمبا اور پیچیدہ نام لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں ''مصنف کو خاطر'' کو ناک آؤٹ کرنے پر تلے ہو۔ عزت اللہ وقار! اتنا کل پر غور نہ کرنے کا مشورہ مفت مان لیجیے ورنہ حافظ احمد جو تھوڑی بہت عقل ہو گی اس سے بھی پیدل ہو جائیں گی اور عقل مند کے بجائے صرف ''مند'' رہ جائیں گی۔ آمنہ پٹھانی! اتنا بے کری نے سید حماد مانع پر اثر ڈالا ہے۔ لیموں کا شربت پی لیجیے ورنہ متبادل کے طور پر ہم آپ کو کوہستان آنے کی گرم جوشانہ دعوت دیتے ہیں۔ جاسوسی کی جان للکار میں ہیرو بھائی نے واقعی شاطروں کو للکارا ہے۔ اپنی طرف سے تو عمران نے سلیم کی موت کا بدلہ لینے کی بے داغ چال چلی تھی لیکن تابی کی بے چابی نے سب کچھ چوپٹ کر دیا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ادھر گرداب میں کشور صاحب کو فی الحال تو ڈاکٹر صاحب نے بچا لیا، آگے کا خدا ہی حافظ ہے۔ چودھری صاحب گوروں کی عیاری میں پھنس گئے تو ہیروئن جنگیوں کے شکنجے میں ہے۔ ویسے اسماعی کو داد دینی چاہیے کہ ایک ہی کہانی میں پاکستان کے تمام ہاٹ ایشوز کو سمیٹ لیا ہے پھر بھی کہانی پر گرفت کافی مضبوط ہے۔ رنگوں کی دنیا میں احمد اقبال صاحب کا دشمن ابتدا میں تو کافی خوش قسمت نکلا لیکن آخر میں کھودا پہاڑ نکلا چوہا والا معاملہ ہو گیا۔ ایسے کہانی میں مزاح کا عنصر کم تھا۔ خود کمائی بھی خوب صورت کہانی تھی۔ ... کی خوش بختی کہ شوہر کی رنگین دلدل سے بخوبی نکل گئی۔ ایچ اقبال صاحب کی پس دیوار تحریر ایکشن اور جاسوسی سے بھرپور کہانی تھی۔ فرزانہ نے بالکل کسی سیکرٹ ایجنٹ کا سا کردار ادا کیا۔''

تومی اے قرام مسلم ٹاؤن بہاولپور سے لکھتے ہیں ''عرصے بعد جاسوسی کے شایانِ شان سرورق بنایا گیا جس میں پستول نمایاں تھا۔ حسینۂ جاسوسی کو نظرانداز کرتے ہوئے اشتہارات پر نظر دوڑاتے پہنچے محفل دوستاں میں۔ ... مسعود کو مبارک، پہلے نمبر پر آنے پر بھی اور جنم دن پر بھی۔ ویسے آپ نے نام اچھے تجویز کیے۔ ... کہنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ کبیر عباسی! اس بار کی تنقید کس کی ... ہو گئی؟ ہاں سعید اچھے تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں ویسے ہی تصویر الحسن صاحب کے بھی دو دو بیانات۔ تنویر پاکی صاحب تعریف ہی کرتے رہے۔ تریل ایس کے اسماعیل جوانی ذہانت کی مثال دے رہے تھے ... ہے جناب۔ ویسے اپنے منہ میاں مٹھو بننے والے کو کیا کہتے ہیں۔ یہ تو سب کو پتا ہی ہوگا۔ بابا ایمان آپ تھک ہوا آرزو تو چودھری! اعجاز احمد شکریہ۔ حافظ بلال، بے دلی سے پڑھتے ہوتے ہیں تو نہ ہی پڑھا کریں تبصرے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ سارے شرکائے محفل کی تعلیمی قابلیت کو کیوں کھنگالا جا رہا ہے۔ بھئی پڑھے لکھے ہیں تو محفل میں شرکت کے قابل ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب جو کہ کچھ بور ہوتی جا رہی ہے۔ اسما قادری صاحبہ کچھ تیز کریں کہانی۔ للکار کے سحر میں ایسا کھوئے کہ باقی اگلے، واپس جاتے ہوش آیا۔ شوبز سے متعلق کہانی ہمیشہ بور ہی ہوتی ہے۔ سو پہلا رنگ کچھ خاص رنگ نہیں جما سکا۔ دوسرا رنگ دشمن تاریخی لحاظ سے کچھ حسرت کی تھی۔ سمجھ نہیں آیا کہ موہن لال نے خودکشی کر لی تھی تو غلام علی اور عبدالرشید کو کیوں ساتھ ملایا اور جب وہ جانے لگا تو دونوں کیوں چپ رہے؟ پس دیوار میں داراب کا کردار اچھا لگا۔ کہانی کا اختتام اچھا تھا، بنا کسی خون خرابے کے سب ٹھیک ہو گیا۔''

www.pkdigest.com

ٹریل ایس کے اسماعیل کی دھنک خیبر ایجنسی شاہ کس سے ”تمہیں جون کو ڈائجسٹ نے انٹری دی۔ سرورق پر ایک دوشیزہ موجود تھی جو میری طرف ایک خاص ادا سے مسکراتے ہوئے چند دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے، گالوں پر سرخی لائے، شرما کر گردن کو تھوڑا سا خم کرکے، نیلی آنکھوں میں شرارت لیے، ہونٹوں پہ خوب صورت تبسم لے کر دیکھ رہی تھی۔ واہ رے واہ! کیا بات ہے۔ لو جی آ گئی نا آخر کار سائرہ مسعود پہلے نمبر پر۔ لوگ اس پر اور مجھ پر تنقید کر رہے تھے۔ چلو سائرہ! بہت بہت مبارک ہو اور شکریہ جی محمد سلیم ہماری رائے ٹھیک ہی ہوتی ہے۔ تو یہ! آم نے تو ڈائجسٹ کو بھی حسب معمول نہیں دیکھا ہے۔ ہیر وفہ خلاف معمول ہوتا ہے۔ پوائنٹ نوٹ کرلو۔ آمنہ پٹھانی! میرے پاس ڈگریاں ابھی تین ہی ہیں۔ میں تو ابھی ننھا منا بچہ ہوں۔ گرداب میں ماہ بانو گرداب میں پھنسی نظر آرہی ہے۔ ڈاکٹر مار دیا۔ نے کشور کو بدنامی سے بچا لیا مگر آگے کیا ہوگا یہ تو دیکھنا پڑے گا۔ دادا نے بہت غلط غلط کاموں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ چودھری کو شاید ماہ بانو نہ ملے، اگر وہ انگریز سے ایڈرس بھی لے۔ حدگماں میں شرفو نے واقعی ایک سچے پیار کا ثبوت دیا اور روشنی کو کسی بھی مرحلے میں اکیلے نہیں چھوڑا اور اسی پیار سے اس نے روشنی کو حاصل کیا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں اور کچھ زیر مطالعہ ہیں۔“

عبدالرؤف زرگر کی لفاظی مظفر گڑھ سے ”ماہنامہ جاسوسی میرے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق پر براجمان حسینہ کی آنکھوں کی چمک و مسکراتی ہوئی اور نکھری ہوئی زلفیں زندگی میں آنے والی خوشیوں کا پیغام دے رہی تھیں۔ حسینہ کی آنکھوں میں خوشی کی پرچھائیاں پہلی ہی نظر میں محسوس کی جاسکتی تھیں۔ حسینہ کے پس منظر میں ایک مرد اپنے تمام احساسات و خواہشات اور مطالبات کو سگریٹ کے دھوئیں میں اڑاتے ہوئے مکمل اور روشن آنکھوں کے ساتھ حقیقت کا جائزہ لے رہا ہے۔ بالوں سے خالی اور شکل سے معصوم اور عملی طور پر کرمنل آدمی پستول کو ماتھے پہ ٹکائے گزری زندگی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ سائرہ مسعود کرسی اسٹینڈ پر خوب صورت تبصرے کے ساتھ خوشی سے پھول رہی تھیں۔ بھئی مبارکاں شارکاں... اپنے تبصرے پر نظر پڑی تو حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہمارے قلم سے نکلے الفاظ اور بزم جاسوسی کمال تو نہیں خوش قسمتی ضرور ہے۔ کبیر عباسی، جعفر حسین، ساگر تولر عجیب سا نام ہے... ماہ پال سعید اور دوسرے ساتھیوں کے تبصرے پسند آئے۔ ماہا ایمان ہم آپ کو کیسے پہچانیں اور پہچان بھی کیسے سکتے ہیں، ہمارا تو یہ دوسرا تبصرہ ہے۔ خیر آپ کا لکھا ہوا تبصرہ مجھے خوب پسند آیا بلکہ انتہائی خوشی ہوئی کہ روایتی تنقید، طنز و مزاح و ہلکی پھلکی شرارتوں سے ہٹ کر کوئی تو ہے جو چیزوں کے علاوہ الفاظ کو استعمال کرکے تبصرے کو چار چاند لگاتا ہے۔ کولہوار روداں صاحب! پھر کوئی اچھا تبصرہ بھی لکھیں۔ لکھتے اردو داں ہیں اور تبصرہ وہ لکھا پھیکا سا۔ عجیب بات ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے چکی دیوار پڑھی۔ متاثر ہوئے بلکہ اس میں کھوئے رہے۔ طارق زنجانی نے بھی بے غیرتی کی لیکن ایاز بھی تو کوئی اچھا انسان نہیں تھا... حیرت ہوئی کہ طارق زنجانی مکافات عمل سے بچ گیا۔ شاید اس کی شکل اس کے کام آگئی ہوگی۔ ویسے معاشرے میں کیسے کیسے بھیڑیے لوگ موجود ہیں جو قدرت کے اس عظیم شاہکار یعنی صنف نازک کو یوں بیچ دیتے ہیں۔ دھوکا دہی کے تحت کیا یہ لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں...؟ خیر، داراب کی قربانی نے دل جیت لیے۔ محبت گزیدہ جسے کاشف زبیر نے لکھا، یہ تو معاشرے میں پھیلی ہوئی عام روایت ہے۔ کسی کی عزت کی جائے تو وہ کہتا ہے میں نے اس کو اپنی فنکاری سے پاگل بنا دیا ہے۔ کئی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ خیر، پھر بھی ایک محبت کرنے والا اللہ تعالیٰ نے پیدا کر دیا [illegible] انگار میں [illegible] عمران کی ذہنی چپقلش حیران کر گئی... سلیم کی قاتل نادیہ بھی انجام کو پہنچ گئی... سیکلی مریم کے خان نے [illegible] پہلا رنگ جسے بارش [illegible] کہانی تھی جس میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا کہ دنیا ان بھیڑیوں سے بھری پڑی ہے جو [illegible] کردیتے ہیں اور وہ پیسے بے جا خواہشات بھی انسان کو تباہی کے دہانے پر پہنچا رہی ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے اس کو خوش ہونا چاہیے دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اصل چیز تو خوشی، راحت و سکون ہی تو ہے۔ دشمن جسے احمد اقبال نے لکھا، ایک بات ذہن میں آگئی کہ ہندو شروع سے بدنیت ہیں۔ اب دیکھیں اس بیٹے نے اپنے ہندو بھائی کو بھی غلط سونا دیا اور اس سونے کے حصول کے لیے اس ہندو کی اولاد کو کیا کیا تنگ و دو کرنی پڑی مگر ملا کیا...“

بھوانہ سے جعفر حسین کی رائے ”یکم جون کو ہی جاسوسی ملا تو ٹائٹل کی تعریف میں نغمہ سرا ہو گئے۔ سرورق بہت اعلیٰ پائے کا اور جاسوسی کی شاندار روایات کا عکاس تھا۔ دوشیزہ اور اس بار گن بھی پورے طمطراق کے ساتھ سرورق کی زینت تھی۔ سائرہ مسعود صاحبہ! بارش، سالگرہ اور کرسی صدارت، اکٹھی تین خوشیاں۔ ہم پنجاب والے تو اول اللہ کرتے کافی عرصے سے محروم ہیں۔ سالگرہ اور کرسی صدارت کی دلی مبارک باد۔ ساگر تولر صاحب! آپ نے تو سلیم فاروقی صاحب کی تحریروں کے بارے میں میرے منہ کی بات چھین لی۔ رومیو صاحب! اگر آپ اصلی رومیو ہیں تو آپ کی جولیٹ کہاں ہے؟ ٹریل ایس کے اسماعیل صاحب! آپ کی ذہانت میں تو ہمیں کوئی کلام نہیں۔ آخر آپ تبصرہ بامقصد شارٹ تصحیح کرنے کے بجائے کمال جو کر لیتے ہیں۔ ماہا ایمان صاحبہ! صورت، قرات، بذات خود ایک پہیلی ہے، اوپر سے یہ پہیلی چپلی؟ خیر، باقی دوستوں کی طرح میں بھی ٹکا ٹکا رہتا ہوں۔ آ گئے آفریدی! شعاع چودھری۔ نہال نگر صاحب! پہلے راولپنڈی اور اب بھکر، مجھے یقین ہے کہ اگلی بار آپ چیچوں کی ملیاں سے وارد ہوں گے۔ چودھری سرفراز صاحب! اچھے پسندیدہ تبصرہ نگار کو بلیک لسٹ میں دیکھنا ایک تکلیف دہ کام ہوتا ہے۔ کولہوار روداں اتنا مشکل نام اوپر سے اتنی مشکل نام والی جگہ سے تشریف آوری۔ تحریروں میں ابتدا خلاف معمول چھوٹی کہانیوں سے کی۔ ”آخری تحفہ“ میں ہام نے منصوبے کی تمام تر جزئیات کا خیال رکھا مگر تقدیر کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ سائنسی اور تحقیقی موضوع پر لکھی گئی ”محسن“ زبردست رہی۔ بلاشبہ مغربی دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو امن کے داعی ہیں اور دنیا سے ہتھیاروں کی دوڑ کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ”محبت گزیدہ“ ہالی وڈ کی بےرحم حقیقتوں اور اس کی مادیت پرستی کو اجاگر کرتی اچھی تحریر تھی۔ سیاہ عمارت اپنے موضوع کے لحاظ سے کافی منفرد تھی۔ امریکا کے اصل باشندوں ریڈ انڈین کے مسائل اور ان پر بعض سفید فاموں کی لاقانونیت اور چیرہ دستیوں کا احاطہ کرتی الگ ڈگر کی تحریر تھی۔ سنسنی، تحیر، سسپنس اور کسی حد تک آسیبی ماحول میں لکھی گئی ”آسیب“ نے لفظ بلفظ کہانی سے جڑے رہنے پر مجبور کیا۔ مریم کے خان کی کیکلی نے خاصا متاثر کیا۔ بچپن کی یادیں، واقعات ہمارے لاشعور کا ہمیشہ حصہ رہتے ہیں۔ اگر ان کی مناسب تحلیل نفسی نہ کی جائے تو بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں۔ مختلف لوگوں کی نفسانی خواہشوں کی عکاس پل دو پل تبدیلی ہوتی وہاں جان زبردست رہی۔ حضرت انسان کسی بھی حال میں خوش نہیں رہتا۔ رنگوں میں دشمن میں سونے کی تلاش نامی مہم تو موہن لال کی ناکامی پر اختتام پذیر ہوئی مگر ہمیشہ کی طرح اقبال صاحب کے قلم کا سحر پوری تحریر میں حاوی رہا۔ میرے گرد کہانی کا ماحول یوں طاری رہا کہ مصنف کی سنگت میں قدم بہ قدم کرداروں کے ساتھ رہا۔ دوسرے رنگ میں ساحل اللہ ادارہ و مذہبی حدود و قیود سے بے تکلف ہو کے شوبز کی چکاچوند نگری میں قدم رکھنے والی روشی

کو بروقت مہربان لوگوں کا ساتھ اور پولیس کا تحفظ حاصل ہوگیا ورنہ ہمارے سماج میں جا بجا ایسی کہانیاں بکھری پڑی ہیں جن کا انجام روشی سے [illegible] ہے۔ مصنف نے ہیپی اینڈ کرنے کے لیے ارسلان کا کردار یک طرفہ منفی کر دیا۔ (واہ کمال ہے... آپ کو کیسے پتا چلا؟) اب تو اقبال کی پلپ دیوار معیاری پلاٹ اور تحریر مربوط، قلم میں روانی اور کردار نگاری کمال کی تھی۔ مگر اختتام توقعات کے برعکس اور عجیب سا لگا۔ خوش گوار اینڈ کرنے کے لیے سب کچھ سیٹ کر دیا مگر پھر بھی جاسوسی کے ابتدائی صفحات کے لیے موزوں ترین کہانی تھی۔ کہانی وہ بھی سلسلے وار لکھنا خاصا جان جوکھم کا کام ہے مگر اسما صاحبہ مشاقی اور روانی سے لکھ رہی ہیں۔ مصنفہ نے ڈاہانہ پیروں، ان کی پشت پر کار فرما گروہوں اور سادہ لوح لوگوں کا مذہب کے نام پر استحصال اور ان کے اندھے اعتقاد کا صحیح تجزیہ کیا۔ ساتھ ہی دو ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں برسر پیکار غیر ملکی ایجنسیوں اور ان کا مذہب کی بنیاد پر دہشت وبربریت کے کھیل میں ساتھ دیتے متعالی فرقوں کا احوال بھی بڑی خوب صورتی سے مسلسل ضابطہ تحریر میں لا رہی ہیں۔ ویلڈن اسما قادری صاحبہ۔ گرداب کی یہ قسط بلاشبہ کمال کی تھی۔ انگار میں کافی عرصے بعد اس طرح کی سنسنی خیزی، تھرل اور ایکشن دیکھا۔ دم سادھے پوری قسط ایک ہی نشست میں ختم کی۔ حالات و واقعات نے یکایک عمران کو ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے کہ اب نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ ساتھ یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ دھند اور اسرار کے دبیز پردے میں چھپے عمران کی زندگی کے حالات و واقعات بھی منظر عام پر آنے والے ہیں۔ مجموعی طور پر جون کا جاسوسی بہت زبردست اور شاندار رہا۔“

محمد نعمان پیارے پنجاب سے حاضر ہیں ”اس دفعہ کا جاسوسی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ جلد ہی مل گیا۔ سب کچھ بھول کر ٹائٹل گرل پر نظریں دوڑائیں۔ ٹائٹل گرل اپنی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جلوہ افروز تھی اور اس کے پیچھے ایک آدمی منہ میں سگریٹ دبائے ہماری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی سگریٹ کا دھواں ٹائٹل گرل کے سر کے بالوں کو چھوتا ہوا جاسوسی ڈائجسٹ کے اوپر سے گزرتا ہوا نہ جانے کہاں جارہا تھا۔ ماشاء اللہ! اور اس کے پیچھے دوسرا شخص ہاتھ میں پستول پکڑ کر اپنی ایک آنکھ نہ جانے کیوں چھپائے ہوئے تھا۔ تبصروں میں سائرہ مسعود کا تبصرہ جاندار تھا۔ ٹریل ایس اور جعفر حسین صاحب آمد مبارک ہو۔ میں تو آپ کا بہت چاہنے والا دوست ہوں۔ یہ بات الگ ہے کہ ہوں ذرا کم خوشبو لگا کے۔ اب مدیر صاحب کی مرضی ہے کہ ہمیں اپنی محفل میں جگہ دیتے ہیں یا اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ یہ پہلی تحریر ہے اور میرا جاسوسی ڈائجسٹ کے ساتھ پرانا یارانہ ہے اس لیے امید کرتا ہوں کہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔ کہانیوں میں کاشف زبیر کی محبت گزیدہ بہترین تھی۔ اور انگار... اس کے تو ہائے ہائے کیا کہنے۔ ہمارے ہیرو صاحب پر ایک کے بعد ایک مصیبت آرہی ہے لیکن عمران اپنی دوستی کا حق ادا کر رہا ہے۔ تنویر ریاض صاحب کی آخری تحفہ اور احمد منیر صدیقی کی آسیب بھی کافی اچھی تھیں اور باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔“

ایم احمد ہاشمی اچھے ادھورے تبصرے کے ساتھ ”جون 2010ء کا شمارہ 4 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی حسینہ نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کشمیری زلفیں، کشادہ پیشانی، مخمور آنکھیں، ابھرے ہوئے گال، ستواں ناک، نرم ہونٹ، گول تھوڑی، صراحی دار گردن، جادوگر جسم، کانوں میں لٹکتی سونے کی بالیاں۔ واہ بھئی! خوشبو لگا کے۔ پیچھے ایک پرلے درجے کا نشے باز ہوا میں دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہا تھا۔ اوپر ایک رستم خان ٹائپ شخص کسی کو شوٹ کرنے کی [illegible] ایک نظر ڈال کر محفل میں آئے۔ سائرہ مسعود واہ جی واہ۔ ڈبل مبارک ہو [illegible] ماہا ایمان [illegible] خیال آیا تھا۔ ویسے تکتے چلنے کی خوب ماہر ہو۔ ویلڈن۔ آمنہ بی بی [illegible] آپ تو آسیہ خان کی طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نہ جائیں۔ اوکے، اب بات ہو جائے گرداب کی۔ پہلے کچھ یوں تھا کہ رسالہ ہاتھ آتے ہی انگار پڑھتے تھے مگر اب 12 اقساط ایک ساتھ پڑھ کر جو مزہ آیا اس وجہ سے اب جولائی کے شمارے کے لیے بےتابی سے منتظر ہیں۔ وہ انتظار یقیناً گرداب کے لیے ہے اور بلاشبہ رسالہ پکڑتے ہی گرداب پڑھنی پڑے گی۔ انتہائی خوب صورت انداز میں لکھی گئی یہ کہانی ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد آدمی درمیان میں نہیں چھوڑ سکتا۔ تجسس، سسپنس، تھرل، ایکشن اور دست و گریباں۔ بلاشبہ یہ جاسوسی کہانیوں کا زیور ہوتا ہے جو کہ اسما قادری نے اپنی کہانی کو بڑی خوب صورتی سے پہنایا ہوا ہے۔ گرداب، پنجاب کی روایات، اقتدار کی ذہنی ہوئی اور چودھری کی عتاب زدہ ماہ بانو کی ایک لرزہ خیز اور دل کے تاروں کو چھیڑنے والی، ضمیر کو جھنجوڑنے والی ایک خونچکاں داستان ہے۔ بلاشبہ یہ کہانی ظلم و استبداد اور ناانصافی کے خلاف انسان کی ہمت، جہد مسلسل اور آہنی عزم کو کمپیئر کرتی ہے۔ در بدر ٹھوکریں کھاتی ماہ بانو کو چودھری کے عتاب نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ شہریار کی ہمدردی اور رفاقت ماہ بانو کے لیے ایک ڈھال بن گئی مگر ہر جگہ اس ڈھال پر چودھری کی ظالم شمشیر نے پے بہ پے ایسے ایسے طوفانی وار کیے کہ ڈھال میں دراڑیں پڑ گئیں مگر پھر بھی وہ ایک دل ہمدرد حوصلہ نہیں ہارتا کیونکہ وہ ایک کنارہ ہے۔ اسے کسی کی ضرورت ہے۔ اس لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ماہ بانو پر چودھری کا جبر وار اپنے سینے پر سہہ لیتا ہے۔ کشور اور آفتاب محبت کے سمندر میں بہتے چلے گئے۔ واقعی محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو امیری، فقیری اور بے بسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ انگار میں سلیم کے قتل نے عمران کو سرتاپا قہر بنا دیا اور وہ قہر شعلے بن کر میڈم نادیہ پر ٹوٹ پڑے۔ اتنی مہارت سے ٹھکانے لگا دیا میڈم کو کہ خود اپنے ہم سفر دوستوں کو بھی وقتی طور پر پتا نہیں چلا۔ نادیہ کی موت سے اسے ایک سکون پہنچا تھا مگر تابش نے ایسا گل کھلایا کہ بے چارے کو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مگر اس چھلاوے کو بھی کوئی پروا نہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آخر میں مغل صاحب نے جس طرح ان دونوں کو ڈیک نالے کے پل پر چھوڑ دیا اسی طرح ہمیں ایک مہینے انتظار کی سولی پر چھوڑ دیا۔“

تصور یاسمین کی نوک جھوک اوکاڑہ سے ”ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ بندھے ہوئے بالوں کے ساتھ دوشیزہ کو دیکھ کر گرمی میں کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا جبکہ سائڈ پر موجود شخص سگریٹ کے کش لگا کر چونکا دینے کی کوشش میں تھا جبکہ دوسرا شخص پستول اوپر اٹھائے سوچ میں گم تھا۔ جاسوسی کے ٹائٹل کے بعد سیدھا اپنی محفل میں پہنچے۔ صدارت کی کرسی پر اس بار سائرہ مسعود براجمان تھیں۔ بہت بہت مبارکاں۔ عبدالرؤف زرگر صاحب! کہیں آپ کا شمار ان لوگوں میں تو نہیں جو ٹائٹل دیکھ کر کہانی کا عنوان بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھی دوشیزہ کے چہرے کے ٹکڑوں سے ہی کہانی بنا ڈالی۔ محمد سلیم شبلی صاحب! بہانے سے تخلیقی قابلیت جھاڑنے کا شکریہ۔ منہ پٹھانی کی باتوں کو اتنا دل سے لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ ساگر تولر! جاسوسی ڈائجسٹ کے نام کے مطابق ہی ٹائٹل ہوگا نہ۔ بہت ٹائٹل کا شوق ہے تو کوئی ناول خرید کر پڑھ لیا کریں۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ جعفر حسین! کتنی فکر ہے آپ کو میری پڑھائی کی خود تو جیسے پی

اچھی دی ہیں نا۔ ویسے بھی میں پڑھائی نہ کرنے کے لیے بہانے نہیں بناتی۔ کبیر عباسی کا تبصرہ سب سے زیادہ جاندار تھا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ چودھری مسرور کی باتیں اچھی لگیں۔ ہمایوں سعید رومیو، آسیہ نے آپ کے تبصروں کی تعریف کی۔ جواباً آپ کا فرض بنتا تھا شکریہ ادا کرنا اس لیے برا لگا۔ زیادہ تر کا سوال آپ کے امتحانات کے متعلق تھا کہ کس کلاس کے تھے ان لوگوں کو جواب ضرور دے دیں تا کہ تسلی ہو جائے ان سب کی۔ محبت گزیدہ کاشف زبیر کی بہت اچھی کہانی تھی لیکن انجام نے دکھی کر دیا۔ اسما قادری نے گرداب کی رفتار تھوڑی بڑھا دی ہے۔ نیاز علی کے انجام سے خوشی تو ہوئی لیکن افسوس بھی ہوا کہ اس نے یوں اپنی جان گنوائی۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ عمران نامی شخص شاید ماہ بانو کی کچھ مدد کرے۔ اپنے بچوں کو کھا جانے کی فطرت تو سانپ کی ہوتی ہے۔ دیہاتی تندیر محمد نے شاہ نواز کے کہنے پر اپنے بچوں کو قتل کیا۔ میرے خیال میں اگر ہم قرآن مجید کو ترجمے کے ساتھ پڑھ لیں تو ہمیں اچھائی یا برائی کی اچھی خاصی سمجھ بوجھ ہو سکتی ہے۔ ہمیں صرف قرآن اور حضور کی حدیث و سنت پر عمل کرنا چاہیے۔ دین دار بن کر دھوکا دینے والوں سے تو دنیا بھری پڑی ہے۔ گرداب میں سب کردار بہت پرفیکٹ ہیں لیکن شہریار کا کردار سب سے اچھا ہے جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی امید نہیں چھوڑتا اور عزم و ہمت سے ہر مشکل کا سامنا کرتا ہے۔ لکار میں اچھا ہوا جو میڈم نادیہ کے ساتھ یہ سب ہوا۔ مجھے اس کی حد سے بڑھی ہوئی بے باکی بالکل پسند نہیں۔ میڈم مطلوبہ حقیقتاً اپنی بہن کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ہر حد سے گزر جائے گی۔ عمران، تابش اور اقبال دیکھتے ہیں کہ آگے کیا کارنامے انجام دیتے ہیں۔ انکل طاہر! اب تو تابش کو اپنے اصل روپ میں لے آئیں۔ تابش سے زیادہ وہ اس کہانی کا ہیرو عمران لگتا ہے۔ مریم کے خان کی شکل بہت زبردست تھی۔ آخر میں میرین بھی امیلا جیسی ہی ہو گی۔ حد گمان بابر نعیم کی کہانی کا دوسرا حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ہم نے سوچا تھا۔ باقی کہانیاں پڑھی ہی نہیں اس لیے تبصرہ نہیں کر سکتے۔ (ہمیشہ کی طرح آپ کی تخلیق کردہ تصویر شاہکار تھی)۔"

ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ کی پسندیدگی "جانِ بہاراں جاسوسی میرے ہاتھ میں ہے۔ ہر طرف ٹھنڈی برفیلی ہوائیں چل رہی ہیں۔ رگ و پے میں سکون آفریں احساس گھل رہا ہے۔ جاسوسی کا ٹائٹل دھیمے رنگوں سے مزین۔ لڑکی تو خوب صورت، ہیرو سگریٹ کے کش لگاتا اداے دلبری سے مسکراتا خوب صورت۔ اور تو اور سائڈ پر دیا الہ دین کا بھی خوب صورت نظر آ رہا تھا۔ 2 ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفل میں پہنچی۔ کرسیٔ صدارت پیاری سائرہ مسعود کو ملی۔ بہت مبارک سائرہ! محمد سلیم شبلی دعوت دینے کا بہت شکریہ۔ ملتان میری جان ہے، روح ہے، میرا اسویٹ لینڈ ہے، میرا ڈریم لینڈ ہے، میرے خوابوں کی چاہتوں کی سرزمین پوری دنیا سے حسین جس کی گرمی میرے لیے برفیلی ہوا... جب آؤں گی تو ضرور بتاؤں گی لیکن شرط ہے کہ آپ ریلوے اسٹیشن پر سرخ رومال لے کر کھڑے ہوں... ہاہا۔ تنویر پاکیا! یاد آوری کا شکریہ۔ چودھری مسٹرز زبردست تبصرہ کیا۔ جہانگیر آپ نے کیا جرم کیا ہے؟ سزا کب ختم ہو گی؟ محفل میں حاضری دو۔ جعفر حسین! پلیز اپنے آپ پر رحم کرو کیوں محفل میں قدم رکھ کے دل کا دورہ پڑوا دیتے ہو، یوں جھٹکے کھا کھا کے کہیں... کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی جہاں شہریار کے لیے ڈھیروں ہری تحریریں تھیں۔ کہانی ابھی تو بہت کچھ سلجھ ہوئی ہے۔ چودھری کی مکاری... ایچ اقبال کی اوپس دیوار جو کہ محبت، والہیوں اور تلخ تجربات کا نچوڑ... شہریار اور زبیر اپنی کہانی میں بہت پسند آیا۔ داراب کو ایک بہن کا پیار مل گیا۔ رنگوں میں سب سے پہلے بابر نعیم کی حد گمان... بہت پسند آئی۔ شرفو کا کردار بہت پسند آیا جس نے اپنی محبوبہ کو آخر تک اکیلا نہ چھوڑا۔ دوسرا رنگ احمد اقبال کی دشمن کچھ خاص پسند نہ آئی۔ ہنری کو مسکرانے کی بات پوری کہانی میں ملی جبکہ ٹائٹل پر لکھا تھا کہ لبوں پر مسکراہٹ بکھر جائے گی۔ (امداد تحریر کے حوالے سے لکھا گیا تھا... احمد اقبال کی کہانی تھی ہی سنجیدہ سی... شگفتگی کا عنصر ساتھ ساتھ چلتا ہے)۔ چھوٹی کہانیوں میں مریم کے خان کی شکل پڑھی۔ امیلا نے میرین اور باقی پانچ دوستوں سے بھیانک انتقام لیا۔ محبت میں ایسی شدت کسی کسی میں ہوتی ہے بلکہ فی زمانہ نایاب ہے۔ خیر، اس کہانی سے ایک نئے کھیل کا پتا چل گیا یعنی بھوت بھوت کھیلنا۔ کاشف زبیر کی محبت گزیدہ کو پڑھتے ہوئے دل کی کیا حالت ہوئی بیان سے باہر ہے اور اختتام پڑھ کے 30 منٹ رونے میں گزرے۔ علی کے ساتھ جو کچھ ہوا تو دنیا میں ہر انسان بے لوث چاہتوں سے فائدہ اٹھا کے کر رہا ہے۔ محبت جتنی بے غرض ہو کے کرو، لوگ اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہیں۔ علی تو پھر بھی خوش نصیب تھی کہ زندگی کے آخری لمحوں میں اسے مانگ کی محبت مل گئی۔ بہت زبردست اسٹوری جو برسوں یاد رہے گی۔ ثمر عباس کی وبال دل ہلکی پھلکی تھرل اور ایکشن کی اسٹوری مزہ دے گئی اب بات ہو جائے جاسوسی کے دل یعنی لکار کی لیکن الفاظ نہیں ہیں کیونکہ یہ خاص کہانی ہے اسے آرام و سکون سے حفظ کرنی ہوتی ہے۔ بعد میں پڑھوں گی۔ اجازت دیں، شکریہ جاسوسی۔"

دلپسند سیالی کی بہاولپور سے توصیف "کافی عرصے کی غیر حاضری کے بعد ایک مرتبہ پھر چٹکی، بلکہ چینچی کی محفل میں حاضری دے رہا ہوں تڑکا لگا کے۔ امید ہے سب دوست خیریت سے ہوں گے تڑکا لگا کے۔ بات ہو جائے سرورق کی تو ایک شخص ریوالور اپنے سر سے لگائے خودکشی کرنے کے در پے تھا تو دوسرا سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بناتے ہوئے سگریٹ کے ساتھ اپنی زندگی کو بھی پھونک رہا تھا تڑکا لگا کے۔ حرکتوں سے دونوں عاشق نامرادی لگتے جبکہ شوخ حسینہ اپنی نیلی آنکھوں کی بجلیاں گراتے ہوئے اپنی شریر اور قاتل مسکراہٹ سے انہیں اقدام خودکشی پر اکسا رہی تھی تڑکا لگا کے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جلا مرنا ہمیشہ عاشق کو پڑتا ہے۔ اپنی زندگی برباد کرنا، دربدر ہونا عاشق نامراد کا ہی مقدر ٹھہرتا ہے تڑکا لگا کے۔ جبکہ معشوق ہمیشہ اپنے شوہر اور بچوں میں مست رہتی ہے اور ہنسی خوشی زندگی گزار لیتی ہے تڑکا لگا کے۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا

چینچی، بلکہ چینچی میں پرانے دوست کیا اب جبکہ نئے لوگوں کی بہتات تھی تڑکا لگا کے۔ وکٹری اسٹینڈ پر سائرہ مسعود اپنی اکیسویں سالگرہ کا کیک کاٹنے میں مصروف تھیں تڑکا لگا کے۔ سائرہ جی! آپ کو ڈبل خوشی پر ڈبل مبارک باد تڑکا لگا کے۔ پلیز برا تھوڑے ہی ہو، اگر آپ کو صنف وجاہت میں وجاہت نظر نہیں آئی تو پھر بھی ہو سکتا ہے کہ اکیس سال میں بھی شعور، چوچنی اور فیڈ رنگ محدود ہے تڑکا لگا کے۔ ہاہا ایمان! آپ کی پہیلی کا جواب بشریٰ افضل یا پھر وہ وکیل صاحبہ ہو سکتی ہیں جن کا نام بھول گیا ہے تڑکا لگا کے۔ (آپ کے دونوں اندازے ہمیں تو غلط لگ رہے ہیں)۔ آمنہ پٹھانی کی چٹکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ بس

چٹکیاں ہوتی ہیں۔ یقین آ جاتا ہے کہ یہ واقعی پٹھانی ہیں تڑکا لگا کے۔ چودھری مسٹرز کے تبصرے سے کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ تبصرہ ایک سے زیادہ کا مشترکہ ہے تڑکا لگا کے۔ باقی سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ لکار بڑی سبک روی سے جاری ہے۔ لگتا ہے اس کہانی کے ہیرو تابش اب واقعی ہیرو کا کردار نبھانا شروع کرنے والے ہیں تڑکا لگا کے۔ گرداب میں بیک وقت کئی کہانیاں چل رہی ہیں۔ بہرحال، کہانی اچھی ہے۔ جاسوسی کے اول صفحات کی زینت بننے والی ایچ اقبال کی کہانی پس دیوار اچھی کہانی تھی۔ داراب کا کردار بہت متاثر کن رہا جبکہ اکبر بے چارے کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ سرورق میں احمد اقبال کی دشمن اچھی کہانی تھی۔ موہن لال اپنے ہی ہمدردوں کی ذہانت کا شکار ہوا۔"

عبدالغفار خان کی شمولیت پشاور سے "پہلی مرتبہ جاسوسی میں خط لکھ رہا ہوں۔ (خوش آمدید) اور اس امید سے لکھ رہا ہوں کہ یہ ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا اور ساتھ میں یہ بھی بتا دوں کہ خط تو پہلی بار لکھ رہا ہوں لیکن تقریباً پچھلے تیرہ چودہ سال سے جاسوسی پڑھ رہا ہوں یعنی جب میں بیس یا اکیس سال کا تھا۔ خدا کے فضل سے جاسوسی کو جو ٹیم ملی ہے، وہ بہت زبردست اور ماہر لکھاریوں پر مشتمل ہے جن میں طاہر جاوید مغل، ایچ اقبال، رضوانہ منظر، مریم کے خان، کاشف زبیر وغیرہ اور بھی بہت ماہر لکھاری موجود ہیں مگر ان کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے۔ مجھے پہلی مرتبہ خط لکھنے کی جو تحریک ملی ہے، وہ اسما قادری صاحبہ کے ناول سے ملی ہے۔ اس میں دو کردار ہیں جو جنس کے لحاظ سے تو ایک ہیں مگر ہمت اور قوتِ فیصلہ کے لحاظ سے بہت مختلف ہیں۔ ایک ماہ بانو اور دوسری ڈاکٹر ماریا۔ ایک طرف تو ایک کمزور خاندان کی کمزور سی لڑکی جو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اے سی کے پاس پہنچ جاتی ہے اور چودھری کے ظلم سے عارضی طور پر بچ جاتی ہے۔ اگرچہ اس کی جدوجہد جاری ہے اور دوسری طرف ایک پڑھی لکھی اور ایک غیر ملکی عورت کی بیٹی جو ڈاکٹر بھی ہے اور دنیا کو بھی دیکھ رکھا ہے، وہ چودھری کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے سے ہچکچا رہی ہے۔ سرورق کے رنگ میں احمد اقبال کا دشمن پسند آیا۔ محمد عرفان آزاد کی سیاہ عمارت اور ثمر عباس کی وبال دل بھی اچھی تحریریں تھیں جبکہ احمد منیر صدیقی کی کہانی عجیب کی بالکل سمجھ نہیں آئی۔ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ اب میں انتظار میں ہوں کہ کیا میرے خط کو جگہ ملتی ہے کہ نہیں۔ بفرض محال اگر اس شمارے میں میرے خط کو جگہ نہ ملے تو آئندہ شمارے میں شائع کریں... (ویلڈن)۔"

اختر عباس کبیر والا لکھتے ہیں "4 جون کو جاسوسی ملا۔ ٹائٹل بس گزارے لائق تھا۔ چینچی، بلکہ چینچی میں قدم رکھا۔ بے اختیار مسکرانے پر مجبور ہو گئے۔ تمام دوستوں کے تبصرے اچھے اور نوک جھونک دلچسپ تھی۔ ایچ اقبال کی پس دیوار اچھی لگی۔ گرداب پڑھ کر اسما جی کو داد دیے بنا نہ رہ سکے۔ لکار کے کیا کہنے... طاہر جاوید صاحب کہانی کو انتہائی خوب صورتی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ کہانی پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں کھو جاتا ہے۔ تمام چھوٹی کہانیاں اچھی تھیں۔ سرورق میں بابر نعیم کی حد گمان پسند نہ آئی۔ البتہ دشمن تھوڑا بہت مزہ دے گئی۔"

عبدالغفور خان خٹک کا تبصرہ ایک سے "رسالہ 8 جون کو ملا۔ ٹائٹل پر نظر ڈالی تو کچھ مختلف اور منفرد نہیں تھا۔ ذکر انکل ٹائٹل کو اس طرح رنگین کر دیے ہیں... پہلی مرتبہ تو ٹائٹل بہت اچھا... صدارت کی کرسی پر سائرہ مسعود صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ کو سالگرہ مبارک ہو اور تمام قاریوں کی طرف سے مبارک ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے لکار پڑھی۔ لکار اس دفعہ زبردست رہی لیکن اس میں سلیم کی موت اور میڈم نادیہ کے فوت ہو جانے کے سسپنس اور تھرل کا ایک باب بند ہوا لیکن امید ہے کہ تابش، عمران اور اقبال کوئی نئے دن دیں گے۔ کہانی کا اختتام سسپنس سے بھرا تھا۔ بہرحال، اس دفعہ مجموعی طور پر کہانی بہت زیادہ پسند آئی ہے مجھے۔ گرداب کی پچھلی اقساط میں اکرم کا قتل ہوا اور ماہ بانو پر جان قربان کر کے ایک فرض کی ادائیگی تھی۔ اس کے بعد جبار راجا صاحب کا قتل ہوا۔ بہت افسوس ہوا ہے۔ ادھر چودھری صاحب کے گرد شہریار اور راوا نے جال ڈال رہے ہیں اور لالچی آدمی کی آخر بری ہوتی ہے۔ شہریار اور محکمہ جنگلات کے انسپکٹر عابد انصاری جیسے ایماندار لوگ ہوں تو چودھری جیسے بے ایمان لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے اور وہ دونوں اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس کے عزائم کو خاک میں ملا دیں گے۔ محسن پڑھی۔ مختصر کہانی جس میں بونا گون والے سائنس دان کے قاتل ہو کے پوری حکومت بنانا چاہتے تھے لیکن اس نے اپنا کام ہی کر دکھایا۔ آخری دو کہانیاں اور پہلی کہانیاں ہی جاسوسی کی جان ہوتی ہیں اور حد گمان پڑھی کہ روشنی جیسی لڑکیاں اپنی خواہشات کی تکمیل اور غربت کے ہاتھوں کیا سے کیا کام کرتی ہیں اور میڈم جیسی ہستیاں ان کی مجبوریوں سے کیسا فائدہ اٹھاتی ہیں۔"

افضال مرزا اور صبا مرزا کی مشترکہ کاوش چکوال سے "جاسوسی کی محفل میں پہلی دفعہ حاضر ہو رہے ہیں، امید ہے کہ حاضرین محفل ہمیں خوش آمدید کہیں گے۔ میں افضال مرزا اور ساتھ میری کزن صبا مرزا۔ میں نے بی اے کے امتحانات دیے ہوئے ہیں جبکہ صبا نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ بقول اس کے اپنے اس کا دماغ ہی اتنا کچھ ہے۔ صبا کو تقریباً پانچ سال ہوئے ہیں جاسوسی پڑھتے ہوئے اور مجھے اس سے کم عرصہ ہوا ہے۔ 6 جون کو جاسوسی اپنی خوشبو بکھیرنے آیا۔ ٹائٹل گرل کی لپ اسٹک کا کلر بدل دیں۔ پہلا قدم چینچی، بلکہ چینچی کی محفل میں رکھا۔ سائرہ مسعود کو صدارت کی کرسی ملنے پر مبارک باد۔ اسماعیل خان آفریدی! ہم آپ سے زیادہ ذہین ہیں کیونکہ ہم تقریباً دو سال سے گھر بیٹھے ایک منٹ میں ایس ایم ایس یا کال کے ذریعے جاسوسی کی آمد کا پتا لگا لیتے ہیں۔ ہو بے نہ ہم آپ سے زیادہ ذہین؟ مدیر علی! صبا مرزا آپ کو بہت دعائیں دے رہی ہیں، وہ اس لیے کہ آپ نے وردی کی طرح اسماعیل خان کے تبصرے پر قینچی جو چلائی۔ پہلی جو ہماری تسلی لے کے آئی ہیں میں تو نہیں صبا ہو سکتی ہے، اس کا کہنا ہے تو نئی چودھری۔ ہمایوں سعید رومیو، محمد سلیم اور آمنہ پٹھانی آپ لوگوں کے تبصرے ہمیں بہت پسند آتے ہیں۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے ہوتے ہیں جب ہی تو شائع ہوتے ہیں۔ اب کہانیوں کے گلدستے کا بنڈل کھولتے ہیں۔ سب سے پہلے جو پھول چنا ایچ اقبال کا۔ واہ! کیا گل باپ بیٹے میں محبت پڑھنے کو ملی۔ اسما قادری گرداب پر آپ کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ پتا نہیں شہریار کا کیا ہوتا ہے، پانچ یں؟ بے چینی سے انتظار ہے۔ گرداب میں پھنسے تھے کہ پیچھے سے طاہر انکل کی لکار سنائی دی۔ دوڑ کے دوڑ کے ان کے پاس پہنچا۔ تابش پہ بہت غصہ آیا۔ اگر عمران کی جگہ میں ہوتی تو اسے اسی پانی والے نالے میں ڈبکیاں لگواتی... پر افسوس! طاہر انکل! پلیز آپ عمران کے ماضی سے پردہ ہٹا دیں۔ بابر نعیم کا پہلا رنگ بس اچھا ہی تھا۔ دوسرے رنگ کا اختتام پڑھ کر بہت ہنسی بھی آئی اور پسند بھی آیا۔"

راحت علی وڑائچ کی آمد کلر صاحب شیخوپورہ سے "بندہ عرصہ دراز سے جاسوسی کا شوقین ہے۔ اس ماہ جتنا گرم موسم تھا جاسوسی نے اس سے بھی

زیادہ وگری دکھائی۔ قیمت کا ذکر ہم نہیں کریں گے۔ حالات ایسے ہیں کہ ہر چیز مہنگی سے مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ ٹائٹل خوب صورت تھا۔ حسینہ کی مسکراہٹ سے محسوس ہوا جیسے ہونے والے خاوند کی فرمائش پر مسکرا رہی ہو۔ ساتھ ہی سگریٹ سلگا کے اتنا لمبا دھواں چھوڑ رہے ہیں کہ جاسوسی کا ٹائٹل صفحہ ختم ہو گیا مگر دھواں نہ نکلا۔ دیکھ تو ایسے رہے ہیں جیسے کسی بار میں بیٹھ کر اپنے حریف کو دیکھ رہے ہوں۔ کونے میں صاحب پستول ایک آنکھ پر رکھ کر ایسا انداز بنائے ہوئے کہ جیسے زبردستی پستول تھما دیا گیا ہو اور سوچ رہے ہوں کہ کسے قتل کروں یار۔ خیر محفل میں پہنچے تو سردی لگنا شروع ہو گئی۔ سائرہ مسعود صاحبہ تو بارش میں نہا رہی ہیں۔ سائرہ جی مبارکاں۔ محفل میں تبصروں پر نظر ڈال کر سیدھے گرداب میں پہنچے۔ اسما قادری صاحبہ کمال کر رہی ہیں۔ ایک دفعہ کہانی پڑھنا شروع کی کہ دنیا جہان سے بے خبر ہو گئے۔ گرداب سے نکلے تو للکار میں پہنچ گئے۔ واہ جی طاہر جاوید مغل صاحب! کاش آپ میرے شہر میں ہوتے، کیا دلچسپ سلسلہ شروع کیا۔ عمران، اقبال اور تانی۔ اب نادیہ سے سلیم کا بدلہ تو عمران نے اپنی پلاننگ سے لے لیا۔ اب صفورا میڈم کی دشمنی کیا رنگ دکھاتی ہے۔ انچ اقبال کی پسِ دیوار بھی شاندار کہانی ثابت ہوئی۔ داراب نے کس طرح فروزاں، طارق زنجانی اور صابرہ بیگم کو اکٹھا کر دیا۔ احسن نے لیاز جو کہ فروزاں کا حقیقی باپ تھا، سب حقائق معلوم کر لیے۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ خط جلدی لکھ رہا ہوں۔"

امتیاز علی بیرکوٹھ اوکھل سے لکھتے ہیں "اس بار شدید گرمی میں جاسوسی کی آمد ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح لگی۔ ٹائٹل پر ایک شخص ریوالور اپنی ناک اور پیشانی پر رکھے گہری سوچ میں گم تھا جبکہ دوسرا شخص سگریٹ پھونک کر گرمی کی شدت میں اضافہ کر رہا تھا۔ البتہ حسینہ کی خوب صورت آنکھوں اور مسکراہٹ بھرے انداز سے کچھ راحت ملی۔ محفل جاسوسی میں سائرہ مسعود کی مسلسل کوشش کارگر ثابت ہوئی اور تاج جاسوسی اس بار ان کے سر سجا۔ عبدالرؤف کو پہلے اور شاندار تبصرے پر خوش آمدید و مبارک باد۔ جعفر حسین کا تبصرہ زبردست تھا۔ دیگر تبصروں میں ہمایوں سعید رومیو، نہال سنگھ، نوشی چودھری، ٹرپل ایس کے اسماعیل اور کولمبو رودوان کے تبصرے پسند آئے۔ محفل میں رضوان تنوبی کریزوی اور چودھری محمد سرفراز کی کمی محسوس ہوئی۔ انچ اقبال کی پسِ دیوار الجھے ہوئے رشتوں کو سلجھاتی ہوئی جا رہی ہے۔ بھرپور تحریر تھی لیکن اس میں ایکشن دیکھنے کو نہ ملا۔ آخری نکتہ میں ہم کی منصوبہ بندی زبردست تھی۔ اگر ایکشن پر آگ نہ لگی ہوتی تو یہ کیس معما بن جاتا۔ مریم کے خان کی تحریر کنگل میں اسیلا نے میرین کو اپنی جگہ پہنچا کر اپنا انتقام پورا کیا۔ رضوانہ منظر کی محسن جذبۂ انسانیت کی غماز عمدہ تحریر تھی۔ للکار میں تابش نے ہمت نہیں کی لیکن عمران نے کسی بھی لمحے بور نہ ہونے دیا۔ اینڈ سسپنس تیز رہا۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ کاشف زبیر کی محبت گزیدہ میں علی پارکر کو بھی محبت مل ہی گئی قربانی کے لیے۔ گرداب میں کشور کا راز فاش ہونے سے بچ گیا۔ ستارہ رم خان نے ہاتھ پاؤں چلائے۔ ماہ بانو، کشور اور شہریار ہنوز گرداب میں پھنسے نظر آئے۔ محمد عثمان آزاد کی سیاہ عمارت خوب رہی جس میں چارلس نے عقل و ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگل جیسے ظالم مجرم کو پکڑوا دیا۔ عجیب پوری پڑھنے کے باوجود ادھوری لگی۔ وہاں دل میں کف نے پیسے بینک میں نہ جمع کرا کے موقع سے کچھ چیزیں چوری ہونے سے بچائیں۔ چھ ہزار ڈالر کی بچت کی اور چہرہ پہ کوئی شکن [illegible] سرورق کے پہلے رنگ میں [illegible] نسیم نے شوبز کی [illegible] کے قریب منظر رکھا ہے۔ یہ تحریر حقیقت کے قریب تر تھی۔ سرورق کے دوسرے رنگ میں احمد اقبال نے [illegible] دشمن [illegible] کثر ملا سب ہی لاجواب تھیں۔"

سید محی الدین اشفاق کی شمولیت شیخ لیہ سے "وطن عزیز کے حالات ہر لحاظ سے بہت خراب ہیں۔ اس کی بڑی مثال جاسوسی ڈائجسٹ کی قیمت [illegible] محفل میں نام نہاد صنف نازک کا بڑا احسان ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سیٹ تو صنف وجاہت کے لیے مخصوص ہے۔ خیر، ہم بڑے دل کے مالک ہیں اس لیے سائرہ مسعود صاحبہ کو مبارک باد۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب۔ سب سے پہلے انکل طاہر جاوید مغل کی للکار پڑھی۔ کہانی میں سسپنس اور دلچسپی بڑھ رہی ہے لیکن تابش کا وقتی طور پر کمزور ہونا پسند نہیں آ رہا ہے۔ اور عمران سے بھی جلن سی محسوس ہو رہی ہے۔ تابش کے بجائے وہ (عمران) ہیرو بنتا جا رہا ہے۔ پہلا رنگ حد کمال پڑھا۔ بابر نعیم تھوڑا سا الجھ گئے تھے اس لیے وہ روشنی اور شرفو کے کردار کو صحیح طور پر ہائی لائٹ نہ کر سکے۔ دوسرا رنگ دشمن احمد اقبال کی تحریر تھی۔ احمد اقبال صاحب میرے فیورٹ رائٹر ہیں انہوں نے موہن اور اوما کے کرداروں کے ساتھ خوب انصاف کیا اور بشیر علی، اشرف علی نے ہندوؤں کو خوب مزہ چکھایا۔ محی الدین نواب اور احمد اقبال لازمی انٹری دیتے رہا کریں کیونکہ وہ میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ انچ اقبال کی پسِ دیوار زبردست تھی۔ فروزاں، احسن نے جو تحقیق کی زبردست تھی۔ داراب کا کردار بھی اچھا تھا۔ گرداب کو پلیز جلد از جلد کلوز کر دیں، اس کہانی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ اس کے علاوہ عبدالرؤف زرگر، کبیر عباسی، آمنہ پٹھانی کے تبصرے خاص طور پر پسند آئے۔ صنفِ وجاہت سے اپیل ہے کہ خوب ڈٹ کر صنفِ نازک کا مقابلہ کریں۔"

عبدالسلام صدیقی کی پریشانی ملتان سے "اس طوفانی بارش اور ٹپکتی چھت میں... میں حسینہ کے حسن کے قصیدے تو نہیں پڑھ سکتا ہاں... محفل میں چلا ہی جاؤں گا۔ سائرہ مسعود صاحبہ! اس دفعہ آپ ڈبل مبارک کی مستحق ہیں لیکن پہلے یہ کلیئر کرنا ہے کہ آپ کی کون سی سالگرہ ہے؟ اکیسویں یا... محمد سلیم شیخ صاحب! آپ ایف ایس سی کس چیز میں کر رہے ہیں۔ ٹرپل ایس کے اسماعیل صاحب!! اتنے چکر لگانے یا فون کرنے سے بہتر ہے کہ آپ ایک بک اسٹال لگا لیں تاکہ آپ کی ذہانت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ ماما ایمان صاحبہ! آپ اپنے اصل نام سے آئیں تو زیادہ خوشی ہوگی۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ یہ کہ ماضی میں دو کامیاب تبصرہ نگار گزر چکی ہیں جو بلیک لسٹ بھی کم ہی ہوتی تھیں اور عوام ان سے حسد یا رشک بھی رکھتی تھی۔ ان میں سے ایک بشریٰ افضل اور دوسری ایک لائر تھی اور کراچی کی ماسٹر بھی تھی، نام اس کا مجھے یاد نہیں رہا... حافظ محمد بلال حیدر صاحب! میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ آمنہ پٹھانی صاحبہ! کرنٹ تو اب بھی نکلتا ہے لیکن وہ بے چارے شوہر کی جیب پر گرتا ہے۔ کمرے میں کافی پانی جمع ہو گیا ہے، کوئی جگہ ایسی نہیں بچی جہاں قطرہ نہ ٹپکا ہو۔ اس سے پہلے تبصرے کا سوا ستیاناس ہو، میں کہانیوں کی طرف آتا ہوں۔ گرداب... اس میں اتفاق بڑے ہوتے ہیں۔ ایک طرف جرم ہوتا ہے اور دوسری طرف اتفاق سے مجرم پکڑا جاتا ہے۔ کچھ سنسنی، گرمی ہوئی ہے۔ للکار، آخر تابش عمران کو مروا ہی دے گا۔ ویسے بھی جب تک بڑا دشمن موجود ہو تو چھوٹا چھوٹا ہی لگتا ہے۔ پسِ دیوار سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔ کہانی میں کوئی ربط یا تسلسل نظر نہیں آیا۔ حد کمال، بہت اچھی کہانی تھی ان کے لیے جو پیچھے دیکھنے کے بجائے آگے دیکھتے

ہیں، بغیر کسی محنت [illegible] نہیں کیا کریں، لالچ اندھا ہوتا ہے۔ محبت گزیدہ، علی پارکر کو نیک کی محبت [illegible] بھی میرا تو یقین ہے کہ روح عالم ارواح پر جاتی ہے اس لیے چڑیل پر [illegible] کھول دیا گیا۔ عجیب، ذہانت کسی کی میراث نہیں ہے۔ قانون کے [illegible] کی دروازے سے بھی اندر آنا شروع ہو گیا۔ خدا خیر کرے، بیدار ات [illegible]

شان ا [illegible] رشتوں میں بدل گئے۔ ریوالور اٹھائے اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتے دو آدمیوں کے علاوہ گندمی رنگت کی مالک خاتون کی نیلی آنکھیں سمجھ سے باہر ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں گندمی رنگت عام ہے تو اس کے ساتھ بھوری اور کالی آنکھیں عام پائی جاتی ہیں نہ کہ نیلی سبز آنکھیں۔ ابتدائی صفحات پر انچ اقبال پسِ دیوار کے ساتھ موجود تھے۔ کہانی میں کردار کم تھے پھر بھی اسے غیر ضروری طوالت دی گئی۔ آخری نکتہ تو یہ ریاض کی دلچسپ کہانی تھی۔ ہم نے منصوبہ بندی تو بہت مہارت سے کی تھی مگر آخری نکتہ فراموش کر بیٹھا۔ وہ یہ بھول گیا کہ کوئی اور بھی ٹرین سے سفر کر کے وہاں آ سکتا ہے۔ رضوانہ منظر کی محسن میں آئیون کا جذبہ قابلِ تعریف ہے مگر ہتھیاروں کی جو دوڑ شروع ہو چکی وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ کاشف زبیر کی محبت گزیدہ میں یہ حقیقت نظر آئی کہ دنیا میں خاص طور پر شوبز کی مصنوعی دنیا میں عیش و آرام اور زندگی کے مزے تو ہر کوئی لوٹنا چاہتا ہے مگر جب وقت پڑنے پر قربانی دینے کی بات آئے تو کوئی بھی اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگاتا۔ وہ تو نیک اپنی کم عمری کے جوش کی وجہ سے قربانی پر آمادہ ہو گیا۔ اسما قادری کی گرداب نے 12 اقساط مکمل کر لی ہیں۔ ایک سال تک گرداب کو کامیابی سے چلانے پر اسما صاحبہ کو بہت بہت مبارک باد۔ محمد عثمان آزاد کی سیاہ عمارت میں ماضی میں امریکا کے غیر سفید فام لوگوں پر کیے گئے مظالم کا ذکر تھا۔ چارلس نے تن تنہا اتنے مسلح افراد پر قابو پا کے خالص فلمی ہیرو ہونے کا ثبوت دیا۔ عجیب جو کہ احمد صغیر صدیقی کی ترجمہ شدہ تحریر تھی، اس میں سالے نے بہت چالاکی سے اپنی بہن کے قتل کا بہنوئی سے انتقام لیا۔ طاہر جاوید مغل کی للکار کی حالیہ قسط کافی دلچسپ رہی۔ میڈم صفورا آسانی سے عمران کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ مریم کے خان کی کنگل چونکہ غیر حقیقت پسندانہ تحریر تھی اس لیے پسند نہیں آئی مگر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ کبھی کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے اور نہ ہی کسی کا دل توڑنا چاہیے۔ بابر نعیم کی ترجمہ شدہ کہانیاں تو پڑھنے میں آتی رہتی ہیں مگر پہلی دفعہ ان کی اپنی طویل تحریر رنگوں کی دنیا میں نظر آئی۔ حد کمال بہت دلچسپ اور کافی سبق آموز تھی۔ دوسرا رنگ احمد اقبال کی دشمن میرے خیال میں سسپنس کے آخری صفحات کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ دشمن کچھ حقیقت سے دور ہونے کے باوجود بھی کافی دلچسپ رہی۔"

شہزادہ کوہسار کی پسند ناپسند ملکہ کوہسار سے "ٹائٹل عام سا تھا۔ فہرست میں بھی کچھ نیا پن نہ تھا۔ اداریے میں بھی حالات کا رونا رویا جا رہا تھا۔ سائرہ مسعود [illegible] کیا اوٹ پٹانگ ہانک رہی ہیں۔ آپ کی ذہنی صحت تو ٹھیک ہے؟ ارویشا نے صنم، ماما ایمان کے نام کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں (ہمارے یقین کا عالم [illegible] آخر [illegible] باقی سب [illegible] بات گپ کی کیونکہ یہ وہ جہان ہے جہاں ہر تبصرہ نگار نے ایک نہ ایک دن جانا ہوتا ہے۔ [illegible] پنجاب رومیو کہاں [illegible] تو آپ کو اصلی جولیٹ والا رومیو سمجھتا ہوں۔ گرداب میں ذرا سا بیچ بیچ ہوا جو اچھا لگا مگر ماہ بانو کا کردار اب بور لگنے لگا ہے۔ وجہ اس کا بار بار اغوا ہونا ہے۔ للکار زبردست... کیا کردار نگاری ہے طاہر صاحب کی۔ عمران، تابش، نادیہ، سراج، میڈم صفورا ہر کردار ایک مختلف اور منفرد کردار۔ کردار نگاری اور منظر نگاری تو بس طاہر انکل پر بس ہے۔ انچ اقبال کی پسِ دیوار سسپنس سے بھرپور مگر عام سے واقعات اور پرانے موضوع کی وجہ سے اوسط درجے کی لگی۔ بابر نعیم کی حد کمال پڑھی۔ پرانا موضوع کچھ جھول مگر رواں انداز تحریر کی بنا پر چالیس نمبر حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ احمد اقبال کی دشمن، پرانا موضوع مگر اچھی کی دلچسپ انداز تحریر، کچھ جھول مگر اچھا اینڈ۔ ان سب خصوصیات کی بنا پر اس تحریر کو ہم نے [illegible] نمبر دیے ہیں۔"

جواد اداس کی افسردگی چارسدہ سے "جون کا شمارہ تیسرے چکر میں تیرہ تاریخ کو ملا۔ سرورق کچھ پھیکا سا لگا۔ ہیرو، ہیروئن اور ولن کے چہرے کی لمبائی اور چوڑائی کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے تینوں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ اب بات ہو جائے جون کے شمارے پر۔ گرداب پڑھی۔ یہ قسط کچھ دھیمی رہی۔ اس کے بعد للکار میں پہنچے۔ ہیرو بھائی کی عظمت کو سلام۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ بہت جلد تابش اکیلا ہو جائے گا۔ سرورق کا پہلا رنگ بس روایتی سا تھا جس میں ایک شریف گھرانے کی لڑکی شوبز کے خواب آنکھوں میں سجا کر اپنا مستقبل تباہ کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن کچھ اچھے لوگوں کی وجہ سے وہ تباہی سے بچ جاتی ہے۔ دوسرا رنگ پڑھا ہی نہیں کیونکہ مزاحیہ تحریریں مجھے ہمیشہ بور کرتی ہیں۔ انچ اقبال کی پسِ دیوار نے ابتدائی صفحات کا حق ادا کر دیا۔ کاشف زبیر کی محبت گزیدہ بس ٹھیک ہی تھی، وہ میرے پسندیدہ رائٹر ہیں وہ اگر کوئی بڑی کہانی لکھیں تو مشکور ہوں گا۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔"

ان قارئین کے نام جن کے مکتوبات شاملِ محفل نہیں ہو سکے۔

شازیہ ممتاز، ضلع وہاڑی۔ عطاء اللہ جنگوانی، [illegible]۔ محمد سلیم شیخ، تحصیل و ضلع ملتان۔ عبدالغفور خان خٹک، ضلع اٹک۔ مہر اے ڈی سیال، خانیوال۔ ہمایوں سعید رومیو، بنوں۔ غلام مصطفیٰ ستارے والی، پیر شہر سلطان۔

اہم اعلان

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

www.pkdigest.com

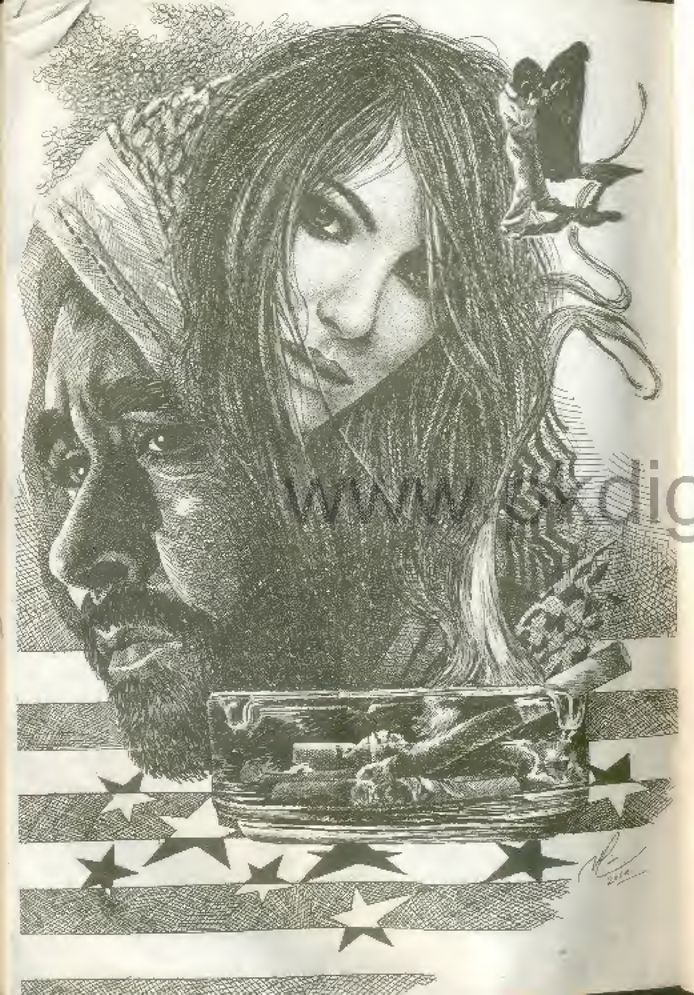

حالات ہائے برہم

محی الدین نواب

عزائم انسان کے ہوں یا کسی بڑی عالمی طاقت یا کسی بڑی ریاست کے۔۔۔ ان کے پیشِ نظر صرف اور صرف اپنا مفاد ہوتا ہے۔۔۔ چاہے اپنے دیرینہ خواب اور تعیشات کی تکمیل کے لیے انہیں کیسا ہی طریقہ کار کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔۔۔ ایسی ہی عالمی طاقتوں کا کھیل جو اپنی طاقت و مفادات کو قائم و دائم رکھنے کے لیے حالات میں بگاڑ پیدا کر کے انسانیت کو خس و خاشاک کی طرح روندتے جا رہے تھے۔ عالمی حالات کے تناظر میں رونما ہونے والی سیاسی۔۔۔ فکری اور نظریاتی تبدیلیوں کی غماز۔۔۔۔

ناانصافیوں۔۔۔۔ ناہموار زندگی کی مشکلات۔۔۔۔ عشق جمال اور امن کے جذبوں کی عکاس

رات کا سفر اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا کہ ایک پولیس وین اس وسیع و عریض عمارت کے سامنے آکر رک گئی۔ امریکی اس عمارت کو "ڈیتھ ہاؤس" کہتے تھے اور مقامی زبان میں اسے دارالاجل کہا جاتا تھا جہاں سانس لیتی ہوئی زندگیاں دم توڑ دیتی تھیں۔

دارالاجل میں سزائے موت پانے والے قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔

اس پولیس وین کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا گیا۔ قاضی ابرار ہاشمی وین سے باہر آیا۔ وہ جیل خانے کی مسجد کا پیش امام تھا۔ اکثر سزائے موت پانے والے قیدیوں کی وہ آخری نماز پڑھاتا تھا۔ انہیں قرآن مجید کی آیات سناتا تھا۔ پھر سپاہی ان قیدیوں کو پھانسی کے تختے پر یا گیس چیمبر میں لے جاتے تھے۔

اذان ہو رہی تھی اور ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا۔ شہری سو رہے تھے اور سوتے سوتے جاگ رہے تھے۔ دور و نزدیک سے فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ ایک آدھ بار بم کے دھماکے بھی سنائی دیتے تھے۔ پورے عراق میں موت چیختی چنگھاڑتی پھرتی۔۔۔۔ تھی اور وہ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اللہ کو پکارتے رہتے تھے۔

مارچ 2003ء کو امریکا کی اتحادی افواج نے حملہ کیا تھا۔ امریکا، برطانیہ اور دیگر بڑے ممالک اپنی پوری طاقت کے ساتھ گرجتے برستے تھے مگر خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ موت ان کے بیرکوں میں بھی گھسی چلی آتی تھی۔

دور کہیں بم بلاسٹ ہوا اور تاریکی میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔۔۔ قاضی ابرار ہاشمی نے سر گھما کر ادھر دیکھا اور پولیس افسر کے ساتھ اس عمارت میں داخل ہوگیا۔

وہاں ایک کمرے میں قاضی صاحب کے شناختی کاغذات چیک کیے گئے۔ پھر ان سب کو آگے جانے کی اجازت دی گئی۔ ان کے ساتھ آنے والے جیلر اور سپاہیوں نے آگے بڑھ کر آہنی سلاخوں والا ایک دروازہ کھولا۔ وہ اس دروازے سے گزر کر آگے بڑھے تو پچھلا دروازہ بند ہوگیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر دوسرا دروازہ کھل گیا۔

وہ دوسرے دروازے سے گزر کر ایک راہداری میں آئے جس کے اطراف میں تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں۔ ہر کوٹھری میں ایک قیدی تھا۔ وہ سب ہی اپنی موت کی مقررہ تاریخ کا انتظار کر رہے تھے۔

قاضی ابرار ہاشمی پولیس افسر اور سپاہیوں کے ساتھ چلتا ہوا ایک کوٹھری کے سامنے آکر رک گیا۔ صبح کی اذان ہو چکی تھی۔ ایک قیدی سراج مصطفیٰ تنگ کوٹھری میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ابرار ہاشمی نے بھی سلاخوں سے باہر نماز ادا کی۔ جیلر، پولیس افسر اور سپاہی چپ چاپ ایک دیوار سے لگے کھڑے رہے۔

پھر ایک بم دھماکا سنائی دیا۔ موت صرف اس مقامِ مرگ میں نہیں تھی۔ اس عمارت کے باہر شہر اور پورے عراق میں دندناتی پھر رہی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے سب ہی سہمی ہوئی زندگی گزار رہے تھے۔ بھی کسی اشد ضرورت کے تحت مجبور ہو کر کلمہ

بڑھتے ہوئے گھروں سے نکلتے تھے۔ ورنہ دروازے کھڑکیاں بند کر کے اپنی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

نماز کے بعد اسسٹنٹ جیلر نے آہنی سلاخوں والا دروازہ کھولا۔ پولیس افسر اور سپاہیوں نے اپنی اپنی گن کا رخ سراج مصطفیٰ کی طرف کر دیا۔ یہ دھمکی تھی کہ وہ قاضی صاحب کو نقصان پہنچائے گا تو اسے گیس چیمبر میں لے جانے سے پہلے گولیوں سے زخمی کر کے اپاہج بنا دیا جائے گا۔

سپاہیوں نے کوٹھری میں جا کر سراج کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر مضبوطی سے باندھا اور محتاط انداز میں اسے گن پوائنٹ پر رکھا۔ پھر قاضی ابرار ہاشمی نے اندر آ کر کہا۔ ”السلام علیکم...“

اس نے جواب دیا۔ ”وعلیکم السلام...“

قاضی نے کہا۔ ”تمہیں اللہ تعالیٰ سلامتی اور سکون دے گا۔“

وہ خشک لہجے میں بولا۔ ”نہیں دے گا۔“

”اللہ پر بھروسا رکھو۔ وہ ہم سب کے لیے بہتری کرتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”بے شک! اس معبود کی رضا سے موت مل رہی ہے۔ یوں ہم محبانِ وطن کی قربانیاں عراقی قوم کو جھنجھوڑ رہی ہیں۔“

قاضی ابرار ہاشمی نماز پڑھنے کے انداز میں دونوں ہاتھ باندھ کر کلام پاک کی ایک آیت پڑھنے لگا۔ سراج مصطفیٰ نے کہا۔ ”میں مجاہد ہوں۔ میرے ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے ہیں تو میں تن کر کھڑا ہوا ہوں۔ تم سب عراق میں امریکا کی پٹھو حکومت کے غلام ہو۔ اس لیے تمہارے ہاتھ غلاموں کی طرح آگے بندھے ہوئے ہیں۔ کیا مقدس آیات پڑھتے وقت تمہاری زبان نہیں لڑکھڑاتی؟“

سزائے موت پانے والے ہزار طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں موت کی طرف لے جانے والے ہرکارے ایک کان سے سنتے تھے دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔ وہ اسے ایک بڑے سے ہال میں لے آئے۔ وہاں اسٹیل سے بنا ہوا ایک گیس چیمبر تھا۔ اس کے ہر طرف دبیز شیشوں کی دیواریں تھیں۔ ایک اونچا اسٹیل کا روشن دان تھا جو موت کے گھر سے باہر کھلتا تھا تاکہ سزا کے عمل کے بعد گیس باہر نکل جائے۔

وہ چیمبر تقریباً چھ فٹ چوڑا تھا۔ اس کے وسط میں ایک اسٹیل کی کرسی تھی جس میں ہاتھوں اور پیروں کو کسنے کے لیے چرمی بیلٹ لگی ہوئی تھی۔

سائنائڈ کرسی کے نچلے حصے میں رکھا ہوا تھا۔ اس مقامِ مرگ کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے دیکھنے والے خود اس کرسی پر بیٹھے ہوں۔ اس تصور سے ہی کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔

سراج مصطفیٰ ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اسے ٹارچر سیل میں رکھا گیا تھا۔ بڑی اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔ وہ زخموں سے چُور تھا۔ چہرے کی سوجن کے باعث اور بھی بھاری بھرکم لگ رہا تھا۔ وہاں اس کے ساتھ جو ہونے والا تھا، وہ اسے اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خالی پن تھا۔ وہ موت سے پہلے ہی اندر سے خالی ہو چکا تھا۔

وارڈن نے سیکیورٹی افسر کے پاس آ کر کہا۔ ”اوکے...!“

سپاہیوں نے چھوٹے سے سیل کا دروازہ کھولا۔ سراج کا جسم تن گیا۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ گارڈ نے اسے بازو سے پکڑا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جی دار بڑا تھا، حوصلے سے چلتا ہوا سیل سے باہر آ گیا۔

وارڈن جیسے جان چھڑانے کے انداز میں ڈیتھ وارنٹ پڑھنے لگا۔

”سراج مصطفیٰ ولد غلام مصطفیٰ! چھ نومبر 2006ء کی شام تمہاری والدہ اُم حفصہ نے اتحادی فوجیوں کے دو ٹرکوں کے درمیان آ کر خودکش حملہ کیا جس کے نتیجے میں چھ فوجی ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔

”سراج مصطفیٰ! عینی گواہوں اور ٹھوس ثبوت کے مطابق تم ماں بیٹے القاعدہ کے لیے کام کرتے رہے۔ تمہاری گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا۔ تم دس نومبر کو سفارت خانے کے سامنے ایک کار میں بم رکھ کر فرار ہو رہے تھے کہ تمہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت بم دھماکے سے سفارت خانے کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ ایک چوکیدار مارا گیا اور چھ افراد زخمی ہوئے۔

”عراقی عدالتِ عالیہ نے تمام ٹھوس ثبوت اور چشم دید گواہوں کے بیانات کے مطابق تمہیں سزائے موت دی ہے جس پر عمل کیا جا رہا ہے۔“

موت کے منہ میں سراج جا رہا تھا لیکن ڈیتھ وارنٹ پڑھتے وقت وارڈن کے ماتھے پر پسینا چمک رہا تھا۔ اس نے سراج سے پوچھا۔ ”کوئی آخری بات...؟“

اس نے کہا۔ ”میری طرح تم سب عراقی ہو۔ شرم کرو اور امریکا کی غلامی سے باز آ جاؤ۔“

گارڈ نے اسے دھکیلتے ہوئے چیمبر میں پہنچا دیا۔ وہاں اسے ایک اسٹیل کی کرسی پر بٹھایا گیا۔ چرمی بیلٹ کس دیے گئے۔

ایک گارڈ نے سلفیورک ایسڈ کو ایک مٹی کے برتن میں لا کر رکھ دیا۔ کرسی کے نچلے حصوں میں پتھر سے لگے ہوئے تھے۔ ٹھیک ان کے نیچے اس برتن کو رکھا گیا۔

وارڈن نے بیلٹس کا معائنہ کیا۔ ایک بیلٹ سراج کے سینے کے گرد بندھی ہوئی تھی۔ باقی بیلٹس دونوں ہاتھوں اور پیروں کو جکڑے ہوئے تھیں۔

وہ اپنا ہاتھ سراج کے کندھے پر رکھ کر بولا۔ ”تم جلدی چلے جاؤ گے جوان! بس ایک لمبی سانس کھینچنا۔ تمہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔“

وہ چیمبر سے باہر آ گیا۔ سراج وہاں تنہا رہ گیا۔ شیشے کا مضبوط دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے بولٹ کس دیے گئے۔

وارڈن کی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر تھی۔ دس سیکنڈ کا انتظار تھا اور یہ دس سیکنڈ نظارہ کرنے والوں کے دل دھڑکا رہے تھے۔

صدیاں گزر جاتی ہیں۔ دس سیکنڈ گزرنے میں بھلا کیا دیر لگتی؟ وارڈن کے اعصاب تن گئے۔ اس نے ایک جھٹکے سے لیور نیچے کر دیا۔ ننھے پتھر مٹی کے برتن میں گرنے لگے۔ سراج نے ان کی آوازیں سنیں اور کرسی پر تن گیا۔ پتھر برتن میں گر رہے تھے اور سفید گیس تیزاب میں سے نمودار ہو رہی تھی۔

تب وہ اپنے ہاتھوں کو کرسی سے جکڑی ہوئی بیلٹس سے آزاد کرنے کی کوششیں کرنے لگا۔ گیس تیزی سے پھیل رہی تھی۔ وہ اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکرانے لگا۔ وہ دھوئیں سے بچنا چاہتا تھا، سانس لینا نہیں چاہتا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ سانس روک کر موت کو قبول کرنے سے پہلے زندگی کو مشکل بنا رہا تھا۔ وہ لاکھ سر پٹختا مگر سانس نہیں روک سکتا تھا۔ اسے تو موت ہی روکنے والی تھی۔

پھر بھی وہ اس نے مجبور ہو کر ایک لمبی سانس کھینچی اور گیس کی بھاری مقدار اس کے پھیپھڑوں میں پہنچ گئی۔ وہ بڑے کرب سے چیخ پڑا۔ اس کی چیخیں چیمبر کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں... ٹھہرتی ہوئی اور گونجتی ہوئی معدوم ہو رہی تھیں۔ وہ گیس جو مٹھی کی گرفت میں بھی نہیں آتی، وہ چیمبر کے اندر ٹھہری تھی اور باہر نکلنے سے معذور تھی۔

وہ کراہ رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی نظریں اسٹاپ واچ پر تھیں۔ تیس سیکنڈ... چالیس سیکنڈ... پھر پچپن سیکنڈ اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

ڈاکٹر نے اپنے سامنے رکھے ہوئے چارٹ پر وقت کا اندراج کیا۔ سراج غافل ہو چکا تھا۔ اس کا سر بائیں شانے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس نے کھانسنا بند کر دیا تھا۔ دھوئیں سے چیمبر بھر گیا تھا اور وہ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔

ڈاکٹر کبھی اس کو اور کبھی اسٹاپ واچ کو دیکھ رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ اس کا سر شانے سے اٹھا پھر سینے کی طرف ڈھلک گیا۔ لمبے بال اس کی پیشانی اور آنکھوں پر آ گئے۔

ایک منٹ اور گزر گیا۔ پھر سب کچھ تھم گیا۔ ڈاکٹر نے آہستگی سے کہا۔ ”ہم سب کو اپنے رب کی طرف جانا ہے اور یہ جا چکا ہے۔“

وہ موت کا سرٹیفکیٹ لکھنے لگا۔

☆☆☆

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وہ پندرہ برس کا تھا اتنی سی عمر میں پندرہ افراد کو بے موت مرتے دیکھ چکا تھا۔ بغداد کی چھوٹی بڑی شاہراہوں میں، چوراہوں، محلوں اور گلیوں میں لوگ دن رات کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے رہتے تھے۔ گولیاں چلتی تھیں اور بم دھماکے ہوتے رہتے تھے۔ اس نے کبھی گھر کی چھت سے اور کبھی اسکول سے آتے ہوئے موت کے یہ بھیانک تماشے دیکھے تھے۔

لوگ گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔ اسکول اور دیگر تعلیمی ادارے بند ہو گئے تھے۔ سہمے ہوئے بچے گھروں میں دبک کر رہ گئے تھے۔ اس کا باپ دائمی مریض تھا۔ پورے ملک میں دواؤں اور خوراک کی کمی تھی۔ مہنگی اور موثر دوائیں تو کیا پانی ملی ہوئی دوائیں بھی نصیب نہیں تھیں۔ اس کا باپ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔

اس کی ماں اُم حفصہ اور بڑا بھائی سراج مصطفیٰ مجاہدین کے گروہ سے تعلق رکھتے۔ پانچ نومبر 2006ء، عراقی ہائی کورٹ نے صدام حسین کو سزائے موت کا حکم سنایا تو عوام کی جانب سے ملا جلا ردِعمل ظاہر ہوا۔ اس حکم کے بعد خاموشی بھی رہی اور کسی قدر ہنگامے بھی ہوئے۔

صدام حسین کے حامیوں نے جان کی بازی لگا دی۔ اُم حفصہ نے خودکش جیکٹ پہن کر جان دی۔ اپنے ساتھ چھ امریکی فوجیوں کی جانیں بھی لیں اور بیس فوجی جوانوں کو زخمی اور اپاہج بنا دیا۔

ماں نے چھ نومبر کو جان دی۔ بڑا بھائی سراج مصطفیٰ دس نومبر کو کار بم دھماکا کرتے وقت پکڑا گیا۔ پندرہ دنوں کے بعد ہی اسے سزائے موت دے دی گئی۔ گیس چیمبر میں اس کی زندگی تمام ہو گئی۔ اب اس خالی گھر میں وہی پندرہ برس کا لڑکا رہ گیا تھا۔

پڑوس میں دو جوان بیٹیاں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی بہن سلیمہ کی شادی ہو گئی تھی۔ گھر داماد عبدالمعتصم بڑا حرام تھا۔ اپنا زیادہ وقت بیوی کے ناز نخرے اٹھانے میں صرف کرتا تھا۔

دوسری بہن یاقوت العزیزی ڈاکٹر تھی۔ ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ آرمی اسپتال میں ڈیوٹی انجام دیتی تھی اس لیے ہفتے میں دو دن کے لیے گھر آتی تھی۔ پولیس کی گاڑی اسے گھر لاتی اور اسپتال لے جاتی تھی۔

www.pkdigest.com

جو لوگ امریکا اور اس کی کٹھ پتلی حکومت کے لیے کام کرتے تھے، مجاہدین انھیں خاص طور پر نشانہ بناتے تھے۔ پولیس کی نگرانی میں آنے جانے والوں پر حملے کرتے تھے۔ یاقوت العزیزی پر بھی دو بار ناکام حملے کیے گئے تھے لیکن وہ محفوظ رہی۔ وہ پُراعتماد انداز میں آتی جاتی تھی۔

اعتماد کی وجہ یہ تھی کہ مجاہدین جان بوجھ کر ناکام حملے کرتے تھے اور فرار ہو جاتے تھے۔ اس کی جان نہیں لیتے تھے کیونکہ وہ درپردہ ان کے لیے جاسوسی کے فرائض ادا کرتی تھی۔

اس کی مخبری کے باعث مجاہدین نے پچھلے تین برسوں میں سات کامیاب حملے کیے اور اتحادی فوج کے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک اور زخمی کیا۔

وہ دی لائن آف اللہ بریگیڈ کے مجاہدین صدام حسین کے حامی نہیں تھے اور اسے ایک آمر فرعون کہتے تھے۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں سے بھی نفرت کرتے تھے۔ انھیں وہاں سے مار بھگانا چاہتے تھے اور امریکا کی جی حضوری کرنے والے موجودہ عراقی حکمرانوں پر لعنت بھیجتے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک اسلامی جمہوری حکومت کے قیام کی آرزو تھی۔ وہ ملک میں خانہ جنگی اور بڑھتے ہوئے جرائم کو ختم کرنے کے لیے مسلسل جہاد کر رہے تھے۔

یاقوت العزیزی بڑی رازداری سے ان کے لیے کام کر رہی تھی۔ وہ پڑوس میں رہنے والے لڑکے وسیم کو اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ تمام دن اس فیملی کے ساتھ رہتا۔ رات کو سونے کے لیے یاقوت کی ماں اور باپ کے ساتھ اپنے گھر آجاتا تھا۔ چونکہ کوئی رات کو باہر نہیں نکلتا تھا اس لیے آنے جانے کے لیے دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنا دیا گیا تھا۔

وسیم بچپن ہی سے یاقوت کو بہت چاہتا تھا۔ جب وہ آٹھ برس کی تھی اور وسیم ڈیڑھ برس کا تھا تو وہ اسے گود میں لیے پھرتی تھی۔ جب وہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہوا تو اسے اپنے پاس بٹھا کر پڑھاتی تھی۔ محلے کے بچے گلیوں میں کھیلتے رہتے، وہ اس کے آنگن میں آکر شرارتیں کرتا رہتا۔

یاقوت نے کئی بار پوچھا۔ ''باہر کیوں نہیں جاتے؟ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرو۔''

وہ کہتا۔ ''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ تمھیں چھوڑ کر اسکول جاتا ہوں تو وہاں بھی تمہاری یاد آتی رہتی ہے۔''

وہ اس کی بات پر ہنس پڑتی۔ اس کی معصوم چاہت اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بڑے اچھے دن تھے۔ نہ اتحادی فوجوں نے حملہ کیا تھا، نہ ٹارگٹ کلنگ تھی۔ نہ خودکش حملے تھے۔ نہ موت گلی کوچوں میں دندناتی پھرتی تھی۔

اس موت نے ایک معصوم لڑکے سے لہو کے تمام رشتے چھین لیے تھے۔ یاقوت پہلے سے زیادہ اس کی محبت کا مرکز بن گئی۔ وہ ہفتے میں دو دن کے لیے اسپتال سے گھر آتی تو زیادہ سے زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتی اور رات کو اسے سلانے کے بعد اپنے بستر پر آتی۔

پہلے اسے سلاتے وقت کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ وہ کہانیاں جگ بیتی ہوتی تھیں۔ اب اسے آپ بیتی سنانے لگی تھی۔ اور اسے سمجھاتی۔ ''اب تم بچے نہیں رہے۔ اپنے ملکی حالات کو دیکھو... سمجھو۔ ہمیں آزادی کے لیے نہ جانے کتنے عرصے تک جنگ لڑنی ہوگی؟ شاید ہم بوڑھے ہو جائیں گے اور شاید میں بھی شہید ہو جاؤں۔ پھر...''

وسیم نے آگے کچھ کہنے سے پہلے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسی باتیں نہ کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ شہید ہو جاؤں گا۔ زندہ نہیں رہوں گا۔ تمہارے بغیر ایک سانس بھی نہیں لوں گا۔''

وہ بول رہا تھا اور وہ حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ اس کے منہ پر ایک بھاری بھرکم، سخت مردانہ ہاتھ رکھا ہے۔ وہ کوئی نوعمر لڑکا نہیں ہے۔

کمرے میں تقریباً اندھیرا تھا۔ کھڑکی ذرا سی کھلی ہوئی تھی۔ [illegible] چاندنی [illegible] سائے کی طرح [illegible] رہا تھا۔

وہ دن کے وقت بھی اسے چھو لیتا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا مگر تاریکی اور تنہائی بڑی طلسماتی ہوتی ہے۔ احساسات کو الٹ پلٹ کر رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہے۔ یاقوت نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اسے اپنے منہ پر سے ہٹا دیا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ وہ وسیم سے متاثر ہوگئی تھی۔ نہیں... وہ اچانک ہی اپنے حارث کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اسے بھاری بھرکم اور پتھر جیسے سخت ہاتھوں کی گرفت یاد آگئی۔ حارث نے اس کے دونوں بازوؤں کو جکڑ لیا تھا پھر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

وہ کسمسانے لگی۔

کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟

وسیم نے نیم تاریکی میں اس کی بے چینی کو محسوس کیا پھر پوچھا۔ ''سسٹر! کیا ہوا؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''کچھ نہیں۔ میں کہہ رہی تھی، ہم عراقی اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ غاصبوں نے ہمارے خودغرض اور لالچی سیاست دانوں کو خرید لیا ہے۔ بظاہر عراقی حکمران ہیں لیکن ان حکمرانوں کی لگام امریکا کے ہاتھ میں ہے۔''

وسیم نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ہم دشمنوں کو مار بھگائیں گے۔ میں بھی بڑا ہو کر ان کے خلاف جنگ لڑوں گا۔''

وہ موجودہ عمر سے بڑا ہونے کی بات کر رہا تھا جبکہ وہ اپنا ہاتھ حارث کے ہاتھوں میں محسوس کر رہی تھی۔ عجیب سی بات تھی، عجیب سے احساسات تھے، وسیم کے بڑا ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''امریکا اور اس کے اتحادی ہمارے دشمن ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ ہم خود اپنے دشمن ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''وہ کیسے...؟''

''ہمیں غلام بنائے رکھنے کے لیے دنیا والوں کو دکھایا جا رہا ہے کہ یہاں ہم عراقی حکمران ہیں۔ اس کٹھ پتلی حکومت کی عدالتوں میں امریکا کا قانون ہے اور امریکی مفادات کے مطابق فیصلے سنائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی پولیس ہمیں مارتی اور کچلتی ہے اور غاصبوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔''

وسیم نے ذرا قریب ہو کر اس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ پولیس والے...''

وہ جلدی سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''دور رہو۔ یہ کیا کر رہے ہو؟''

''میں کیا کروں؟ تم بہت اچھی لگتی ہو۔ [illegible]''

[illegible] ''وہ [illegible] پیار کرتا [illegible]'' [illegible]

اپنی جسامت سے بڑا ہو گیا تھا... سائے تو روشنی کی قربت اور دوری سے سکڑتے اور پھیلتے ہیں۔ وہ مچل رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''اب میں تمہارے پاس آتا ہوں تو تمہارے بدن سے عجیب سی گرمی محسوس ہوتی ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہر انسان کے بدن میں حرارت ہوتی ہے۔''

''ہوتی ہوگی۔ مجھے تو تمہاری حرارت، تمہاری قربت یاد آتی ہے۔ پہلے تو تم مجھے گلے لگاتی تھیں، پیار کرتی تھیں۔ اب دور کیوں ہٹاتی ہو؟''

''اب تم بڑے ہو گئے ہو۔''

''یہ تو اچھا ہے۔ جب میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں تو ہم برابر لگتے ہیں۔''

''قد آور ہونے کی بات نہ کرو۔ مرد تو اونٹ بنتا جاتا ہے۔ عورت بلی ہی رہتی ہے۔ تم مجھ سے آٹھ برس چھوٹے ہو۔''

''پھر کیوں کہتی ہو کہ میں بڑا ہو گیا ہوں؟''

''یا خدا! میں تمھیں کیسے سمجھاؤں؟ یہ سمجھنے سے زیادہ محسوس کرنے والی بات ہے۔ کسی بھی لڑکی کو ہاتھ لگاؤ گے، اسے پکڑو گے تو وہ یہی محسوس کرے گی جیسا کہ میں کر رہی ہوں۔''

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

جولائی 2010ء کے حسین رنگ

شہر محبت

جذبات کی آندھیوں میں خوابوں کی کرچیاں بکھر جائیں تو رقابتوں کے طوفان تمام رشتوں اور دستوں کے نشان تک مٹا دیتے ہیں۔ آخری صفحات پر آپ کے محبوب مصنف **طاہر جاوید مغل** کی دلگداز تحریر

سعی رائگاں

ابتدائی صفحات پر **ہمایوں بلگرامی** کی عبرت اثر تحریر... محلاتی سازشوں اور سنسنی خیز حالات واقعات کا احوال

حضرت یونسؑ

خدا کی شان کہ جس نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے پیغمبر کو زندہ وسلامت رکھا... منکرین کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والا قصہ

واپسی

تحیر، تجسس اور عشق کے دلفریب لمحات پر مشتمل پل پل رنگ بدلتی طویل داستان...... **محی الدین نواب** کے قلم کا جادو

مصیبت کا مارا

عدالت کا منظر...... **مرزا امجد بیگ** کی معرکہ آرائی اور دشمن کی پسپائی کا پرتجسس واقعہ

اور مستقل سلسلے: انا ڑی، محفل شعروسخن، آپ کے خط

مزید: کاشف زبیر، تنویر ریاض، مریم کے خان، ڈاکٹر شیر شاہ سید، رنجنی پٹیل اور منظر امام کی سحر انگیز تحاریر

''تم بہت اچھی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا محسوس کر رہی ہو؟ میں پکڑتا ہوں تو کیا ہوتا ہے؟ پہلے تو تم ایسا نہیں کہتی تھیں؟''

''کہہ تو رہی ہوں' تم بڑے ہوگئے ہو۔ اب مرد لگنے لگے ہو۔''

''وہ تو میں ہوں۔ مرد بن کر پیدا ہوا ہوں۔''

اس کی معصومیت نے اسے الجھا دیا۔ وہ ایسا نہیں سمجھ رہا تھا جیسا وہ سوچ رہی تھی۔ مگر وہ بھی کیا کرے؟ اس کی قربت گزر رہی تھی۔ اسے اپنے محبوب حارث کے پاس پہنچا رہی تھی۔

وہ اسے تھپکتے ہوئے بولی۔ ''بس اسی طرح چپ چاپ لیٹے رہو۔ آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔''

''نیند نہیں آئے گی۔''

''کیوں نہیں آئے گی؟''

''اس طرح لگنے کے بعد تم اور اچھی لگ رہی ہو۔ میں پیار کروں؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم چاہتے کیا ہو؟''

''تم میرے چہرے کو چومتی تھیں؟''

''یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔''

''اپنے رخسار کو چومنے دو۔''

وہ فوراً ہی اسے دھکا دے کر الگ ہوگئی۔ اسی طرح پہلی بار حارث کو بھی دھکا دیا تھا۔

آہ! تم کہاں ہو حارث...؟ بڑے ضدی تھے۔ مجھ سے مجھ ہی کو چھین لیا کرتے تھے۔

اس نے دیکھا' وہ ساید اس کے رخسار تک آگیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے حارث کو دیکھنے لگی۔ مگر نہیں... وہ رخسار سے ہو کر پیشانی پر آگیا۔ جیسے وہ اسے چومتی تھی ویسے ہی وہ معصومیت سے اسے چوم رہا تھا۔

پھر وہ سرکتا ہوا اس کے دھڑکتے ہوئے سینے پر آگیا۔ وہاں اس نے سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ دھڑکنوں کا الگ الگ مزاج ہوتا ہے۔ بعض حالات میں دھڑکنیں ہوس کی طرف لے جاتی ہیں اور بعض اوقات گمشدہ رشتے کی لے میں دھک دھک کرتی ہیں۔

خوش کش حملہ کرنے والی اُم حفصہ ان لمحات میں یاقوت کے سینے سے کن کن... کن کن... لوری سنا رہی تھی۔ وہ بہت دور ممتا کے پالنے میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی گہری نیند سو گیا۔

وہ جاگ رہی تھی۔ تاریکی میں آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور وہ آنکھیں حارث کو دیکھ رہی تھیں۔ اس روز اسپتال سے گھر آتے وقت یہ خبر ملی تھی کہ حارث انجما کی کو ابو غریب جیل سے کہیں اور کر دیا گیا ہے۔

یاقوت کا دل گھبرا رہا تھا۔ اسے وہاں سے کیوں منتقل کیا گیا ہے؟ کس جیل میں ٹرانسفر کیا گیا ہے؟

ایک اطلاع کے مطابق اسے سزائے موت سنائی جاچکی تھی۔

یاقوت کو یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنے محبوب کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ شام تک دی لائن آف اللہ بریگیڈ نے خفیہ طور پر اسے اطلاع دی کہ حارث کو شمالی زون کے شہر سلیمانیہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ سزائے موت پانے والے قیدیوں کو وہیں بھیجا جاتا تھا۔ وہ ڈیتھ ہاؤس یعنی دارالاجل اسی جیل خانے کی چار دیواری میں تھا۔

سینے سے آہیں نکل رہی تھیں... آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

☆☆☆

عراق کے موجودہ سیاست داں امریکا اور اس کے اتحادیوں کی چھتر چھایا میں تھے اور اپنے آقاؤں کی پالیسیوں کے مطابق حکومت کر رہے تھے۔

پالیسی یہ تھی کہ عوام کو بیرونی مداخلت کے خلاف احتجاج کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

پالیسی یہ تھی کہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کو دال روٹی کے مسئلے میں الجھا دیا جائے۔ سانس لینے کے بعد انسان کا سب سے اہم مسئلہ روٹی کا ہے۔ جب پیٹ نہیں بھرے گا تو لوگ خالی پیٹ حکمرانوں کو گالیاں دیں گے لیکن ان کی غلامانہ سیاست کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے۔

پالیسی یہ تھی کہ بیماروں کو دوائیں اور زخمیوں کو مرہم نہ ملے۔ ضرورت سے زیادہ دوائیں فوجی اسپتالوں اور بیرکوں میں ہوتی تھیں۔ ملک کے تمام اسپتالوں میں پانی ملی ہوئی دوائیں ملتی تھیں یا ایسی جن کے استعمال کی مقررہ تاریخ ختم ہوجاتی تھی۔ وہ بھی مہنگے داموں اور وہی انجکشن کے طور پر مریضوں کو موت سے پہلے مار دیتی تھیں۔

غریب اور محتاج مریض معمولی بیماریوں میں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے تھے اور اپنے معصوم بچوں کو بے بسی سے دم توڑتے ہوئے دیکھتے۔

پالیسی یہ تھی کہ عورتوں' مردوں' بچوں اور بوڑھوں کو خوف و ہراس میں مبتلا رکھا جائے۔ ڈاکے اور قتل و غارت گری میں اضافہ ہوتا رہے۔ ٹارگٹ کلنگ ہو' راہ چلتی عورتوں اور بچوں سے چھینا جھپٹی ہو' اغوا برائے تاوان ہو اور پولیس کبھی موقع واردات پر نہ پہنچے۔

...اور یہ کہ کٹھ پتلی حکمران اپنے مفادات حاصل کرنے میں مست رہیں۔ پولیس کا محکمہ اور قانون کے محافظ وردی میں رہ کر قانون کی دھجیاں اڑائیں اور چھوٹے بڑے مجرموں کو

واردات کرنے کی چھوٹ دیتے رہیں۔

یاقوت کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ وہ پڑوس میں وسیم کے ساتھ اس کے مکان میں تھی اور اس کے اپنے مکان میں واردات کرنے والے گھس آئے تھے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ چہرے پر ماسک اور ہاتھوں میں گنز تھیں۔ انہوں نے آتے ہی دھمکی دی۔ ''خبردار! شور مچاؤ گے تو موت ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے گی۔ جو بھی نقد دینار اور ڈالرز ہیں، ہمارے حوالے کر دو۔''

یاقوت کے باپ نے کہا۔ ''ہماری ایک ہی بیٹی کمانے والی ہے۔ ابھی اس کی تنخواہ نہیں ملی۔ گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک نے گن کے دستے سے اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ بوڑھا مار کھا کر فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ مارنے والے نے کہا۔ ''جھوٹ بولے گا تو کتے کی موت مرے گا۔ تیری بیٹی آج شام آرمی اسپتال سے آئی ہے۔ ماہانہ تنخواہ اور اوور ٹائم کے پانچ ہزار ڈالرز لائی ہے۔''

دوسرے نے ایک کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی وہ رقم نکال کر لاتا ہوں۔''

دوسرے کمرے میں یاقوت کی بڑی بہن سلیمہ اپنی ماں کے ساتھ سہمی بیٹھی تھی۔ وہاں دو گن بردار آئے۔ ایک نے اس کی ماں بیٹی سے کہا۔ ''اے اٹھو! یہ الماری کھولو۔''

سلیمہ دیکھ چکی تھی کہ اس کے باپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا ہے، وہ چپ چاپ الماری کھولنے لگی۔ ایک نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہائے! کیا قیامت ہے؟''

دوسرے نے پیچھے سے آکر اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ وہ سمٹ کر بولی۔ ''مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ خدا سے ڈرو۔ میں سہاگن ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''پھر تو کافی تجربہ ہوگا۔ ہمیں بہت خوش کرو گی۔''

دوسرے نے کہا۔ ''پہلے مال وصول کرنے دو۔ اسے الماری کھولنے دو۔''

سلیمہ نے آگے بڑھ کر چابی نکالی، الماری کے ایک پٹ کو کھولا۔ گن بردار نے اسے دھکا دے کر دور ہٹایا پھر دونوں پٹ کھول کر ایک جگہ ملبوسات کے نیچے سے ڈالرز کی ایک پتلی سے گڈی نکالی۔ وہ یاقوت کی مہینے بھر کی تنخواہ تھی۔

سلیمہ حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ ڈاکا ڈالنے والا تلاشی لیے بغیر سیدھا ان نوٹوں تک کیسے پہنچ گیا؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ وہ رقم کپڑوں کی تہ میں چھپا کر رکھی گئی ہے؟

اس نے سلیمہ سے چابیاں چھین کر ایک دراز کو کھولا۔ وہاں سونے کے زیورات رکھے ہوئے تھے۔ وہ تمام زیور نقد رقم کے ساتھ بیگ میں پہنچ گئے۔ ڈاکا ڈالنے والوں نے پھر کسی سامان کی تلاشی نہیں لی۔ الماری میں چار دراز یں تھیں۔ انہوں نے کسی کو کھول کر نہیں دیکھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اس گھر میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

البتہ لوٹنے کے لیے ابھی بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں سلیمہ کا لباس پھاڑنے لگے۔ وہ رونے لگی۔ اب نقدی اور زیورات کے ساتھ آبرو کا مال و متاع بھی جانے والا تھا۔

اس کی ماں گڑگڑاتے ہوئے ان کے پاؤں پکڑنے لگی۔ انہوں نے اسے ٹھوکروں میں اڑا دیا۔

سلیمہ کا شوہر منعم ایک طرف سہما ہوا اکڑوں بیٹھا تھا۔ وہ بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر التجائیں کرنے لگا۔ ایک نے اس کے شانے پر لات ماری۔ وہ فرش پر الٹ کر وہیں پڑا رہ گیا۔ اس نے وہاں سے اٹھنے کی غلطی نہیں کی کیونکہ ایک نے اسے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔

کمرے کے باہر بوڑھا باپ زخمی پڑا تھا۔ منہ اور ناک سے لہو بہہ رہا تھا۔ کمرے کے اندر سے بیٹی کی آہیں' کراہیں اور فریادیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ بیٹی کے ساتھ کیسا شرمناک سلوک کیا جا رہا ہے؟ بے شرمی کی انتہا یہ تھی کہ ایک ماں ... اور شوہر کے سامنے حیوانیت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ ابھی وہاں دو تھے' تیسرا بھی ادھر جانے والا تھا۔

اس نے درمیانی دیوار کے چھوٹے سے دروازے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تیری دوسری بیٹی ادھر والے مکان میں ہے۔ ایک لونڈے کے ساتھ سو رہی ہے۔''

بوڑھے کے دانت بھی ٹوٹ گئے تھے' وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''انکار کیا کرتا ہے؟ وہ سالی ادھر آکر ہمارے ساتھ بھی منہ کالا کر سکتی ہے۔''

اس نے آگے بڑھ کے بندوق کے دستے سے دروازے پر دستک دی۔ یاقوت بستر پر پڑی سوچ میں گم تھی۔ کمرے کے باہر آنگن کے پار درمیانی دروازے پر دھما کے کے انداز میں دستک ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گئی۔

اس نے آنگن میں آکر دروازے کی طرف دیکھا۔ چھٹی حس نے کہا' دستک نارمل نہیں ہے۔ جارحانہ آواز آرہی ہے۔

وہ سوچتی ہوئی آگے بڑھی۔ اسی وقت پھر دروازے پر دھماکے سے ہوئے۔ وہ سہم کر رک گئی۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

اُدھر باپ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی تمام توانائیوں کو سمیٹ کر کسی طرح حلق سے آواز نکالی اور بڑی مشکل سے کہا۔ ”دروازہ نہ کھولنا... خطرہ ہے۔“
دروازہ کھلوانے والا جھنجلا گیا۔ اس نے بندوق کے دستے سے زوردار ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ”چپ ہو جا خبیث...!“
وہ ایک ذرا سا پھڑپھڑا کر ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔
یاقوت وہاں سے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی۔ وسیم کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ”اٹھو... آنکھیں کھولو! خطرہ ہے۔“
وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ”کیا ہوا سسٹر...؟“
وہ اپنے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ ”ہمارے مکان میں دہشت گرد گھس آئے ہیں۔ دروازہ توڑ کر ادھر بھی آسکتے ہیں۔ ہم کسی دوسری جگہ جا کر پناہ لیں گے۔“
[illegible] آف اللہ بریگیڈ کے ایک مجاہد سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے تڑتڑاتا فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجاہد نے پوچھا۔ ”ہیلو یاقوت! اتنی رات کو کال کر رہی ہو... خیریت تو ہے؟“
”خیریت نہیں ہے۔ میرے گھر میں دہشت گرد گھس آئے ہیں۔ میں پڑوس والے گھر سے بول رہی ہوں۔ پلیز! میری مدد کے لیے آؤ۔“
”ہم یہاں کاؤنٹر فائرنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایک طرف اتحادی فوجی چھپے ٹرکوں میں ہیں۔ دوسری طرف غلام عراقی سپاہی گولیاں چلا رہے ہیں۔ ہم یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے چار مجاہدین مارے جا چکے ہیں۔“
وہ بولی۔ ”یہ سن کر افسوس ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے، میری فکر نہ کرو۔ میں یہاں سے کسی دوسری گلی میں جا رہی ہوں۔“
وسیم بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ حیرانی سے فون پر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے سے نکل کر مکان کے پچھلے حصے کی دیوار کے پاس آگئی۔ اُدھر درمیانی دروازے پر دھماکے ہو رہے تھے۔ اُسے توڑنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔
واردات کرنے والوں کو اس بات کا ذرا سا بھی خوف نہیں تھا کہ شور سن کر محلے والے آجائیں گے یا پولیس کو کال کریں گے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ راتوں کو چاہے قیامت آجائے‘ کوئی اپنے گھر سے نہیں نکلے گا۔ لٹنے اور مرنے والوں کے ساتھ صبح ہمدردی کی جاتی تھی۔
اور پولیس تو اپنے گھر کی تھی۔ اسی کی سرپرستی میں کھل کھلا کر ڈاکے، قتل اور اغوا کی وارداتیں ہوتی تھیں۔
یاقوت نے آکر دوزانو بیٹھ کر وسیم سے کہا۔ ”میرے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھو اور دوسری طرف کود جاؤ۔“
وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“
”انکار نہ کرو۔ میں تمہارے پیچھے آرہی ہوں۔“
”تم دیوار پر کیسے چڑھو گی؟“
”میں اندر سے کرسی لے آؤں گی۔ بحث نہ کرو۔ وہ دروازہ توڑ رہے ہیں۔“
”میں بدتمیزی نہیں کروں گا۔ تمہارے اوپر پاؤں نہیں رکھوں گا۔“
وہ دوڑتا ہوا قریبی کمرے میں گیا۔ وہاں سے ایک کرسی اٹھا کر لے آیا پھر بولا۔ ”پہلے تم جاؤ۔“
وہ بولی۔ ”نہیں۔ پہلے تم جاؤ۔ میری بات مانو۔ دیر نہ کرو۔“
”نہیں سسٹر! میرا ضمیر گوارا نہیں کرے گا۔ پہلے تم یہاں سے نکلو۔“
یاقوت نے جھنجلا کر اسے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ ”ضد کرو گے تو یہاں سے جا کر کہیں مر جاؤں گی۔ پھر بھی میری صورت نہیں دیکھ سکو گے۔“
وہ تڑپ کر آگے بڑھا۔ اس سے لپٹ کر بولا۔ ”میں تمہاری صورت دیکھوں گا‘ دن رات دیکھوں گا۔ ٹھیک ہے، میں جاتا ہوں۔ اُدھر جا کر تمہارا انتظار کروں گا۔“
”نہیں۔ آگے جا کر کسی گھر کا دروازہ کھلواؤ۔ میں وہاں آجاؤں گی۔ اب چھوڑو بھی... کب تک لپٹے رہو گے؟“
وہ الگ ہوتے ہی اس کے رخسار کو چوم کر کرسی پر آگیا پھر وہاں سے دیوار پر چڑھ کر بولا۔ ”تم بہت اچھی لگتی ہو۔ جلدی آؤ۔ میں کسی گھر کا دروازہ کھلواتا ہوں۔“
وہ دوسری طرف کود کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دہشت گردوں کا خوف طاری تھا۔ اس کے باوجود وسیم کا لڑکپن اور پیار کہہ رہا تھا‘ ہماری زندگی میں صرف دہشت گرد نہیں ہیں، پیار کی جادوگری بھی ہے جو جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔
وہ بھی کرسی پر چڑھ کر دیوار پر آگئی۔ ایسے ہی وقت وہ درمیانی دروازہ ٹوٹ گیا۔ ایک نے کہا۔ ”وہ دیکھو! وہ فرار ہو رہی ہے۔“
وہ دوسری طرف کود گئی۔ اس نے دائیں بائیں سر گھما کر دیکھا۔ جانے وسیم کس سمت گیا تھا؟ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ ایک سمت میں بھاگتی چلی گئی۔
آگے کسی قریبی مکان کا دروازہ پیٹ کر اسے کھلوانے میں دیر لگتی۔ پیچھا کرنے والے آکر اسے دبوچ لیتے۔ وہ دور بھاگتی چلی گئی۔ پلٹ کر دیکھتی بھی رہی۔ پیچھے گلی ویران تھی۔ شاید انہوں نے اسے پکڑنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ تقدیر

اور زیورات کے ساتھ منہ کالا کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ ان کی تسلی ہو گئی تھی۔
یوں یاقوت کی جان چھوٹ گئی۔ آگے جا کر اسے ایک گھر میں پناہ مل گئی۔ وہاں اس نے پناہ دینے والوں کو بتایا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے اور نہ جانے وہ دہشت گرد اس کے گھر والوں کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہوں گے؟ اب وہ صبح ہی وہاں جا کر معلوم کر سکتے تھے۔ فی الوقت وسیم کی فکر تھی... وہ کہاں ہوگا؟
وسیم دیوار سے کود کر دوسری گلی میں آیا تھا۔ پھر اس نے ایک طرف دوڑتے ہوئے دیکھا، آگے مکانات نہیں تھے۔ دکانیں بند پڑی تھیں۔ گلی کے موڑ پر دوسری تیسری گلیوں میں مکانات تھے۔ اس نے ادھر دوڑ لگائی پھر ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ گشتی پولیس کی وین اس کے سامنے آکر ایک زوردار بریک کے ساتھ رک گئی تھی۔
اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انسپکٹر نے گالی دیتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا مرنے کے لیے ہماری گاڑی کے نیچے آنا چاہتا ہے؟“
پھر اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”ہیڈ لائٹس آن کرو۔ دیکھو! یہ کون ہے؟“
وہ پولیس والے کسی وجہ سے لائٹس بجھا کر گشت کر رہے تھے۔ روشنی ہوتے ہی وسیم دکھائی دیا۔ ایک سپاہی نے [illegible] ”سر! بہت ہی خوبصورت چھوکرا ہے۔“
انسپکٹر نے اسے دور سے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے تو؟“
”میرا نام وسیم مصطفیٰ ولد غلام مصطفیٰ ہے۔ اُدھر ساتویں گلی میں رہتا ہوں۔“
انسپکٹر نے کہا۔ ”او... اچھا ساتویں گلی میں... غلام مصطفیٰ یعنی وہی غلام جس کے بیٹے کا نام سراج مصطفیٰ تھا اور جو گیس چیمبر میں حرام موت مر چکا ہے؟“
وسیم نے کہا۔ ”حرام موت نہ کہو۔ میرے بھائی نے شہادت کا درجہ پایا ہے۔“
وہ سب ہنسنے لگے۔ ”شہادت کا درجہ...؟ ہاہاہا... یہ لوگ کتوں کی موت مرتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے انہیں شہید ہونے کا سرٹیفکیٹ دیتے ہیں۔ اٹھالو اسے...“
دو سپاہیوں نے اسے اٹھا کر وین کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ انسپکٹر نے فون کے ذریعے مطلوبہ شخص کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو ابوولاد! ایک سودا ہے۔ تھانے آؤ اور ڈن کرو۔“
دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“
رابطہ منقطع ہو گیا۔ وسیم پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ میں اپنا محلہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اگر واپس نہ گیا تو میری سسٹر پریشان ہو جائیں گی۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔“
وہ بول رہا تھا مگر سب بہرے تھے۔ کوئی نہیں سن رہا تھا۔ تھانے پہنچ کر اسے حوالات میں ڈال دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ابوولاد اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ پہنچ گیا۔ اس نے حوالات میں وسیم کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے...؟ حسنِ مجسم ہے۔“
اس نے وسیم کو اچھی طرح سے ٹٹول کر دیکھا۔ پھر انسپکٹر کے پاس جا کر باتیں کرنے لگا۔ وسیم آہنی سلاخوں کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں یوں باتیں کر رہے تھے جیسے بحث کر رہے ہوں۔ ان کے سر ہاں اور نہ کے انداز میں ہل رہے تھے۔
پھر ابوولاد نے نوٹوں کی ایک گڈی انسپکٹر کے سامنے رکھ دی۔ اس نے وہ گڈی اپنی جیب میں ٹھونس لی۔ ابوولاد نے وسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے گارڈز سے کہا۔ ”اسے لے چلو۔“
گارڈز نے اسے حوالات سے باہر نکالا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ ”میں اپنی سسٹر کے پاس جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔“
ایک گارڈ نے ریوالور کی نال اس کے منہ میں ٹھونس دی پھر پوچھا۔ ”جینا چاہتا ہے یا مرنا...؟“
وسیم نے سہم کر دیکھا۔ ابوولاد نے کہا۔ ”زندہ رہے گا تو اپنی سسٹر اور گھر والوں کے پاس جا سکے گا۔ ابھی جہاں جائے گا‘ وہاں عیش کرے گا۔ بہت سارے نوٹ کمائے گا۔ کمانے والوں سے سب ہی خوش رہتے ہیں۔ تیری سسٹر بھی خوش ہو جائے گی۔“
اس کے منہ سے ریوالور کی نال نکالی گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہ آس دلائی جا رہی تھی کہ وہ بعد میں یاقوت کے پاس جا سکے گا۔
موت کی دہشت بھی تھی اور وہ بہن تک پہنچنے کے لیے زندہ بھی رہنا چاہتا تھا۔ وہ گارڈز کے ساتھ چلتا ہوا ایک گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اس گاڑی میں تقریباً ایک گھنٹے تک سفر جاری رہا۔ پھر وہ ایک کھنڈر جیسی عمارت کے سامنے آکر رک گئے۔ وہ شہر کا جنوبی علاقہ تھا۔ وہ گارڈز اسے عمارت کے اندر لے آئے۔
وہاں ایک بڑے سے ہال میں تقریباً پچیس لڑکے تھے۔ وہ سب چھ برس سے لے کر اٹھارہ برس کے تھے۔ تمام رات

www.pkdigest.com

محنت کرنے کے بعد وہ سب فرش پر بے سدھ پڑے تھے۔ کوئی سو رہا تھا، کوئی جاگ رہا تھا۔

وہ جگہ وسیم کو عجیب سی لگ رہی تھی۔ اگرچہ وسیع و عریض ہال تھا لیکن اسے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے اس کے بازو کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میں اپنی سسٹر کے پاس جاؤں گا۔ مجھے جانے دو۔“

دوسرے نے اس کی گردن پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں جائے گا؟ یہاں آنے والے ہماری مرضی سے جیتے اور مرتے ہیں۔“

وسیم نے جواباً اسے ایک الٹا ہاتھ رسید کر دیا اور پھر دوسرے آدمی سے اپنا بازو چھڑانے لگا۔ وہ دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہاں ایک بوڑھا نگراں تھا۔ وہ چھڑی ٹیکتا ہوا آیا۔ ان دونوں کو چھڑی سے مارتے ہوئے بولا۔ ”اس لڑکے پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ آقا نے ابھی فون پر کہا ہے، یہ اسپیشل ہے۔ اس کے منہ پر، اس کے بدن پر کوئی نشان نہیں لگنا چاہیے۔ اسے ٹریننگ کے لیے بھیجا جائے گا۔“

وہ دونوں اس سے ذرا دور ہو گئے۔ ایک نے ٹی ٹی سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہم تجھے ہاتھ نہیں لگائیں گے لیکن یہاں سے بھاگنے کی بات کرے گا تو گولی مار دیں گے۔“

دوسرے شخص نے اس بوڑھے سے کہا۔ ”اسے سمجھا دو باہر نکلے گا تو مارا جائے گا۔“

وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ بوڑھے نے وسیم کے سینے پر چھڑی کی نوک رکھی۔ جیسے تنبیہ کے انداز میں انگلی رکھ رہا ہو پھر اس سے کہا۔ ”سن لیا یہ کیا کہہ رہے تھے۔ باہر یقینی موت ہے، یہ بات تمام لڑکے جانتے ہیں۔“

اس نے چھڑی کا رخ لڑکوں کی طرف کیا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”ہاں، باہر موت ہے۔“

وہ پریشان ہو کر کبھی ان لڑکوں کو، کبھی بوڑھے کو اور کبھی باہر کھلنے والے دروازے کو دیکھ رہا تھا جو بند ہو چکا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔ ”تو بہت حسین ہے۔ آقا نے کہا ہے تجھے کانچ کی طرح سنبھال کر رکھنا ہے۔ ذرا سی ٹھیس نہیں لگانا ہے۔ ویسے تو یہاں نہیں رہے گا۔“

وسیم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”کسی وقت یہاں سے چلا جائے گا۔ ایک خاص ٹریننگ سینٹر میں بڑی اچھی تربیت حاصل کرے گا۔ جا... اُدھر جا کر بیٹھ جا۔“

وہ الجھا ہوا تھا۔ کچھ نہیں پا رہا تھا کہ کہاں آ گیا ہے؟ وہ ہال میں لڑکوں کے درمیان آ کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی سو رہا تھا، کوئی جاگ رہا تھا۔ وہ تین لڑکوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ”میرا نام وسیم مصطفیٰ ہے۔ میں شہید اعظم سراج مصطفیٰ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ تم نے میرے بھائی کا نام سنا ہے؟“

وہ تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ ایک نے کہا۔ ”ہم نے صدام حسین کا اور امریکا کے ایک بش کا نام سنا ہے۔“

وسیم کو افسوس ہوا۔ اس نے کہا۔ ”جب مجاہدین امریکا کو یہاں سے بھگا دیں گے، ہمارا وطن آزاد ہو جائے گا، تب شہیدوں کا نام بچے بچے کی زبان پر ہو گا۔“

ان لڑکوں کے چہروں سے بہتری کی کوئی امید، آزادی کی کوئی خواہش ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ وسیم نے پوچھا۔ ”تمہیں یہاں قیدی بنا کر کیوں رکھا گیا ہے؟ تم سے کیا کام لیا جاتا ہے؟“

ایک سولہ برس کے لڑکے نے کہا۔ ”ہم سب نائٹ ڈیوٹی کرتے ہیں۔ ابھی ابھی اپنی ڈیوٹی سے واپس آئے ہیں۔“

ایک لڑکے نے کہا۔ ”میرا نام فراز ہے۔ ہم سب طوائف ہیں۔“

وسیم کو ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو؟ طوائف، عورت ہوتی ہے، مرد نہیں ہوتا۔“

”مرد بھی ہوتا ہے۔ جس طرح ایک طوائف کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی مجبور کیا جاتا ہے۔“

تب وسیم کے دماغ نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ حیرانی سے سر گھما کر ان دونوں لڑکوں کو دیکھنے لگا جو بے سدھ سو رہے تھے۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوتا؟ یہ سب لڑکے آ کر سو گئے ہیں، تم کیوں جاگ رہے ہو؟“

”کیا کریں، کبھی کبھی بہت تھکن ہونے کے باوجود نیند نہیں آتی۔“

ایک بارہ برس کے لڑکے نے اپنا سر تھام کر کہا۔ ”خدایا! سر دکھ رہا ہے۔“

ایک نے اپنی کمر کو ایک ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔ ”وہ لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں نہ مانو تو لاتیں مارتے ہیں۔ ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ... کہ...“

وہ وسیم کو دیکھ کر بولا۔ ”میں کیا بتاؤں اب آ گئے ہو... تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔“

وہ پریشانی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”میں یہاں نہیں رہوں گا۔“

”زندہ رہنا ہے تو یہاں رہنا ہی ہو گا۔“

”کیا فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے؟“

اخبارِ جہاں کے مقبول سلسلے

مصنف	کتاب	قیمت
خان آصف	اللہ کے ولی	450/-
خان آصف	اللہ کے سفیر	450/-
خان آصف	سفیرانِ حرم	350/-
خان آصف	فاتح اعظم صلاح الدین ایوبی	400/-
خان آصف	شعلوں کا کفن	400/-
ایم اے راحت	کالا جادو	350/-
ایم اے راحت	سایہ	350/-
ایم اے راحت	بند آنکھیں	350/-
ایم اے راحت	طلسم زادی	400/-
انوار علیگی	خالی گھر	300/-
انوار علیگی	بسیرا	300/-
انوار علیگی	بچھو	300/-
انوار علیگی	ہوشربا	300/-
انوار علیگی	[illegible] داستان	300/-
انوار علیگی	سفید محل	300/-
انوار علیگی	شیرنی	350/-
انوار علیگی	پوری عورت	200/-
انوار علیگی	ریچھ کے اسرار	135/-

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور
فون: 37652546, 37668958 (042)

''ہے... یہ بعد میں آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم آزاد ہیں جہاں چاہیں جاسکتے ہیں مگر نہیں جاتے۔''

وسیم نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیوں نہیں جاتے؟''

اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''میں اپنے خاندان میں واپس نہیں جاسکتا۔ کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا۔ انہوں نے میری شرمناک تصویریں اتاری ہیں۔ میں دھندے سے انکار کرتا ہوں تو وہ دھمکیاں دیتے ہیں کہ تمام تصویریں میری فیملی میں پہنچادیں گے۔''

وہ پھر ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''میرا باپ' میرے بھائی بہت غیرت مند اور غصے والے ہیں۔ مجھے گولی ماردیں گے۔''

وسیم نے کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تمہارے بزرگوں کو سمجھنا چاہیے کہ تمہیں یہاں کس طرح مجبور کیا گیا ہے؟''

''ہاں' مگر غیرت کے جوش میں کوئی نہیں سمجھتا۔''

ایک لڑکے نے کہا۔ ''میرے بزرگ میری مجبوریاں سمجھتے ہیں لیکن وہ ابو ولاد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتے۔''

وسیم نے پوچھا۔ ''یہ ابو ولاد کون ہے؟''

وہ بوڑھا دور بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر چھڑی ٹیکتا ہوا آیا پھر بولا۔ ''وہ ہمارا آقا ہے۔ بہت پہنچا ہوا ہے۔ کوئی اس کی گردن تک نہیں پہنچ پاتا۔ ابھی اسی نے تمہیں تھانے والوں سے نجات دلائی ہے۔ وہ تمہارے جیسے بے شمار بچوں کا باپ ہے اس لیے ابو ولاد کہلاتا ہے۔''

پھر وہ چھڑی نچاتے ہوئے بولا۔ ''چلو اٹھو یہاں سے اور اپنی اپنی جگہ جاکر سو جاؤ۔ اب کسی کی باتوں کی آوازیں سنائی نہ دیں۔''

وہ چھڑی ٹیکتا ہوا لکڑی کے ایک تخت پر جاکر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکے ادھر ادھر جاکر لیٹ گئے۔ وسیم بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی پچھلی رات سے جاگ رہا تھا۔ لیٹنے کے بعد شاید نیند آجاتی مگر ایک یاقوت بار بار یاد آرہی تھی۔ پوچھ رہی تھی۔ ''کہاں کھو گئے ہو؟'' پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟ اس کے سامنے ہوگا تو کیا کہے گا کہ کیسی جگہ ہے؟ ایسی جگہ جہاں مرد اپنی آبرو لٹاتے ہیں۔

پورے عراق میں یہ شرمناک دھندا جاری تھا۔ اناج کی کمی مہنگائی' بے روزگاری' غربت اور محتاجی کے باعث لڑکے راضی خوشی اس دھندے میں آرہے تھے۔ اس سے ان کو اور گھر والوں کو تین وقت کی روٹیاں مل رہی تھیں۔

یہ کام نچلی سطح پر بھی تھا اور اعلیٰ پیمانے پر بھی جاری تھا۔ امیر کبیر شوقین حضرات بڑے بڑے مہنگے ہوٹلوں کے سوئمنگ پول میں غوطے لگاتے تھے۔ تیرتے تھے' شراب پیتے تھے اور تو خیز لڑکوں سے کھیلتے تھے۔

بڑے بڑے عالی شان محلات کے حرم سراؤں میں صرف کنیزیں نہیں ہوتی تھیں۔ حسین لڑکوں کا بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس قدر وسیع پیمانے پر ہونے والا دھندا قانون کی ڈھیل اور پولیس کے تعاون کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اور بھلا کیوں نہ ہوتا؟ اتحادی فوج کے جوانوں کی پہلی ترجیح کم سن لڑکے ہی تھے۔ آخر وہ فوجی بھی انسان تھے۔ ان کی تہذیب میں سیکس کا معاملہ ایسا تھا' جہاں شرم وحیا کا اور اخلاقیات کا گزر ہوتا ہی نہیں تھا۔

یہ عبرت کی جا ہے کہ جس ملک میں بھی امریکا کے کٹھ پتلی حکمران ہیں وہاں مہنگائی' بے روزگاری' اسٹریٹ فائرنگ' ٹارگٹ کلنگ' جرم وتشدد' قانون کی موت اور ناانصافی لازمی ہوتی ہے۔ ایک طرف غربت اور مہنگے اناج کا حصول' دوسری طرف موت کی وحشت مجبور کرتی ہے کہ اپنی اور بچوں کی فکر کرو۔ حکمرانوں کو بے لگام رہنے دو۔

☆☆☆

یاقوت کو محلے کے ایک گھر میں پناہ مل گئی تھی۔ پناہ دینے والوں نے اس سے ہمدردی کی تھی لیکن وہ اور محلے والے اتنی جرأت کو اس سے گھر جاکر واردات کرنے والوں کا محاسبہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس شہر میں کئی جرائم پیشہ گروہ تھے۔ کوئی انہیں للکارنے اور ان سے ٹکرانے کی جرأت نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ پولیس والوں سے سالے بہنوئی کا رشتہ رکھتے تھے۔ یعنی ساری دنیا ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف...

وہ ایک طرف قانون سے بالاتر رہتے تھے' دوسری طرف لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ ڈکیتی' قتل اور اغوا کی واردات سے انہیں بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ صبح محلے والوں کے ساتھ اپنے گھر میں آئی تو وہاں پچھلی رات قیامت گزر چکی تھی۔

صحن میں باپ کی لاش پڑی تھی۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے پاس اس گھر کا داماد عبدالمنعم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے ماں رو رہی تھی۔ یاقوت باپ کی لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔

محلے والوں نے کمرے کا دروازہ پیٹتے ہوئے یاقوت کی ماں سے پوچھا۔ ''لاش یہاں پڑی ہے۔ تم وہاں رو رہی ہو۔ کیا بات ہے؟ دروازہ کھولو۔''

تھوڑی دیر بعد بند دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔ ''میں دروازہ کھول رہی ہوں۔ کوئی مرد ادھر نہ آئے۔ آپ لوگ صحن میں چلے جائیں۔''

مرد وہاں سے ہٹ گئے۔ دروازہ کھل گیا۔ عورتوں نے وہاں جاکر دیکھا تو ہائے ہائے کرنے لگیں۔ سلیمہ فرش پر پڑی تھی۔ لباس تار تار ہوچکا تھا۔ حالت دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ عزت کی دھجیاں بکھر چکی ہیں۔ ظالموں نے بے دردی کی انتہا کردی تھی۔ وہ نیم مردہ سی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ ایسا لگتا تھا مرچکی ہے۔

وہ ایسی حالت میں تھی کہ عورتوں سے کچھ کہنا نہیں پڑا۔ وہ سب سمجھ گئیں کہ اجتماعی زیادتی کرنے والے کچھ زیادہ ہی درندگی دکھا کر گئے ہیں۔

یاقوت نے وہاں آکر بہن کی حالت دیکھی۔ پھر اس پر ایک چادر ڈال کر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ سلیمہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر بہن کو دیکھا۔ وہ ہولے ہولے جھٹکے کھا رہی تھی۔ مشکل سے سانسیں لے رہی تھی۔ بولنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ پھر بھی اپنی قوت کو مجتمع کرتے ہوئے بولی۔ ''منـ...عم...وار...واردات...''

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا دم نکل گیا۔ بہن نے آخری وقت' آخری سانسوں میں اپنے شوہر منعم کو یاد کیا تھا۔ وہ دروازے کے باہر سر جھکائے رو رہا تھا۔ شاید اس لیے رو رہا تھا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی شریک حیات کی آبرو لٹتے دیکھتا رہا تھا۔

دن کے ایک بجے تک محلے کے بیشتر افراد دو لاشوں کی تجہیز وتدفین کے لیے آگئے تھے۔ پولیس نے رسمی طور پر پوچھ گچھ کی۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرایا پھر انہیں تدفین کی اجازت دے دی۔

علاقے میں ایسی بھیانک وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کچھ روز تک بڑی گرما گرمی سے ان کا چرچا ہوتا پھر ایسی خاموشی چھا جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس واردات پر بھی اسی طرح خاک پڑنے والی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شام کو یاقوت کی ماں نے بین کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا پھر بیٹی سے کہا۔ ''دروازہ مقفل تھا۔ وہ ڈاکو اندر کیسے آئے؟''

یاقوت نے اُدھر دیکھا پھر سوچا' دروازہ باہر سے کھلوایا نہیں گیا۔ اسے توڑا نہیں گیا۔ مکان میں داخل ہونے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے بہنوئی سے پوچھا۔ ''وہ لوگ اندر کیسے آئے ہوں گے؟''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''میں نے غور نہیں کیا' گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اس وقت عزت اور جان ومال کی فکر تھی۔ آنے والے آہی گئے تھے اس لیے دروازے کی طرف دھیان نہیں گیا۔''

ماں نے وہاں سے اٹھ کر کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''منعم! یہاں آؤ۔''

وہ اس کے پیچھے گیا۔ یاقوت نے بھی کمرے میں آکر پوچھا۔ ''کیا بات ہے ماں...!''

ماں نے الماری کھولتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکا ڈالنے والے گھروں میں گھستے ہی مال وزر تلاش کرتے ہیں مگر انہوں نے تلاشی نہیں لی۔ جیسے ہی سلیمہ نے الماری کھولی' ایک ڈاکو نے ان کپڑوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر یاقوت کی مہینے بھر کی تنخواہ نکال لی۔''

یاقوت نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا واقعی انہوں نے تلاشی نہیں لی اور سیدھے نقد رقم تک پہنچ گئے؟''

ماں نے کہا۔ ''ہاں' انہیں کیسے معلوم ہوا کہ رقم ٹھیک اسی جگہ رکھی گئی ہے؟''

ماں بیٹی نے منعم کو دیکھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کیا دیکھ رہی ہو؟ میں تو خود حیران ہو رہا ہوں۔''

ماں نے یاقوت سے کہا۔ ''پھر جانتی ہو کیا ہوا؟''

اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ بولی۔ ''اس ڈاکو نے سلیمہ سے چابیاں چھین کر اس نچلی دراز کو کھولا جبکہ اسے اوپر والی دراز کھول کر پہلے اس کی تلاشی لینی چاہیے تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ سونے کے زیورات اسی ایک دراز میں رکھے ہوئے ہیں۔''

یاقوت نے کہا۔ ''یا خدا! انہیں واردات سے پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا کہ ان کی مطلوبہ چیزیں کہاں رکھی ہوئی ہیں؟''

ماں نے کہا۔ ''ہاں۔ اب سوچو! دروازہ مقفل تھا... اسے اندر سے کسی نے کھولا تھا' تب ہی وہ آسانی سے یہاں گھس آئے تھے۔''

وہ بولی۔ ''تعجب ہے ماں! دروازہ اندر سے کون کھولے گا؟''

وہ ماں بیٹی بول رہی تھیں اور منعم کو تک رہی تھیں۔ وہ بولا۔ ''میں رات دس بجے ہی سو گیا تھا۔ تمہارے والد جاگ رہے تھے۔''

ماں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی سو گئے تھے۔ کل شام کو تم الماری کے پاس گئے تھے۔ تم نے سلیمہ کو کپڑوں کے نیچے رقم رکھتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ زیورات نچلی دراز میں رکھے جاتے ہیں۔''

وہ گھبرا گیا مگر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ کیا میں نے یہ واردات کرائی ہے؟ کیا میں نے ان کے لیے دروازہ کھولا تھا؟''

''اپنے سوالوں کا خود ہی جواب دو۔ تم نے نہیں تو کس

www.pkdigest.com

نے کھولا تھا؟ ڈاکوؤں کو کیسے معلوم ہوا کہ یاقوت تنخواہ اور اوور ٹائم کے پانچ ہزار ڈالرز لے کر آئی ہے؟ انہیں الماری میں یہاں چھپا کر رکھا گیا ہے؟ یہ تو صرف ہم گھر والے ہی جانتے ہیں۔ ہم نے باہر محلے میں کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔"

"تو کیا میں نے بتائی ہے؟"

"ہاں، تم ہڈ حرام ہو۔ میری بیٹی کے ٹکڑوں پر پلتے ہو۔ کبھی کوئی الٹا سیدھا دھندا کر کے کچھ کماتے ہو تو نشہ کرنے لگتے ہو۔"

یاقوت نے کہا۔ "منعم! تم نے پچھلے ہفتے ماں اور سلیمہ سے جھگڑا کیا تھا اور کہا تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے جاؤ گے مگر جانے سے پہلے ہمیں تباہ کر دو گے۔"

وہ اپنا سینہ ٹھونک کر بولا۔ "ہاں، کہا تھا... جاؤ... باہر جا کر چیخو چلاؤ کہ میں نے یہاں ڈاکا ڈالا ہے۔ اپنی بیوی اور سسر کو قتل کیا ہے۔ دیکھتا ہوں، میرا کون کیا بگاڑ لے گا؟"

یاقوت اسے دیکھ رہی تھی، سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "سلیمہ آخری وقت بول نہیں پا رہی تھی مگر اس نے دم توڑتے وقت تمہارا نام لیا تھا۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "کیا وہ مرتے ہوئے بتا کر گئی ہے کہ میں نے یہاں واردات کرائی ہے؟"

وہ سرد لہجے میں بولی۔ "ہاں، اس نے کہا تھا منعم... پھر اس نے کہا تھا، واردات... اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکی۔ بے شک وہ یہی کہنا چاہتی تھی کہ واردات تم نے کرائی ہے۔"

وہ ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا۔ "ہاں کرائی ہے، باہر جاؤ... فریاد کرو۔ دیکھتا ہوں، کون تمہارا ساتھ دینے آتا ہے؟ جو آئے گا اس کے گھر میں بھی واردات کراؤں گا۔ میں جس گھر کی مخبری کرتا ہوں اور ڈاکا ڈالنے والوں کو وہاں سے مال ملتا ہے تو وہ مجھے دس فیصد کمیشن دیتے ہیں۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا... نہ میں ڈاکا ڈالتا ہوں، نہ کوئی خطرہ مول لیتا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے مال کماتا ہوں۔"

وہ فاتحانہ انداز میں وہاں سے جانے لگا۔ دونوں ماں بیٹی نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ بیرونی دروازے سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ کیسی بے بسی تھی؟ گھر داماد بن کر رہنے والا شخص اپنے جرم کا اعتراف کر رہا تھا اور وہ کسی ثبوت کے بغیر اسے قانون کے شکنجے میں نہیں لا سکتی تھیں۔ یہ بھی مجبوری تھی کہ اس ملک میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔

یاقوت نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ یہ میرے باپ کا، میری بہن کا قاتل ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے دوسرے کمرے میں آ کر وی لائن آف اللہ بریگیڈ کے ایک مجاہد سے رابطہ کیا۔ اسے بتایا کہ اس کے گھر میں کس طرح واردات کی گئی ہے۔ اس کے باپ کو اور بہن کو قتل کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ کرانے والا اس کا بہنوئی عبدالمنعم ہے۔

پھر اس نے کہا۔ "ان ظالموں اور قاتلوں کو سزا نہیں ملے گی تو میں اندر سے ٹوٹ جاؤں گی۔ صدمے سے مر جاؤں گی۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "صدمہ برداشت کرو۔ ہم منعم کو جانتے ہیں۔ اب وہ زمین پر نظر نہیں آئے گا۔ تمہاری بہن اور باپ کے قاتل اپنے انجام کو پہنچیں گے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ جن کے لیے وہ کام کر رہی ہے، وہ اس کے کام آئیں گے۔ قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اس اطمینان کے باوجود بے اطمینانی تھی۔ وسیم کی فکر ستا رہی تھی، وہ پچھلی رات سے لاپتا تھا۔ اس کی گمشدگی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں ہے؟ واپس کیوں نہیں آ رہا ہے؟

☆☆☆

اُسے شام سے پہلے دوسری عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں ایک بڑے سے کمرے میں چار کم عمر لڑکے تھے۔ اس کی طرح وہ بھی بہت خوبرو تھے لیکن ان میں لڑکیوں جیسی نزاکت نہیں تھی۔ وہ ناز و انداز نہیں جانتے تھے۔ انہیں بڑے نخروں سے ہاتھ نچا کر، آنکھیں مٹکا کر باتیں کرنا نہیں آتا تھا۔ یہ کمی پوری کرنے کے لیے انہیں وہاں لا کر باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔

ایسے تربیت یافتہ لڑکے مہنگے ہوٹلوں اور شاہی محلوں میں اونچے اسٹیٹس کے عیاش بدمست لوگوں کے پاس پہنچائے جاتے تھے۔ کبھی ایک دن، کبھی ایک ہفتہ اور کبھی مہینوں کے لیے منہ مانگی قیمت پر اُن کی بکنگ ہوتی تھی۔

وہاں ٹرینر کے طور ایک بوڑھی اور دو جوان عورتیں تھیں۔ وہ انہیں تربیت دیتی تھیں۔ لڑکوں کو بڑے دھیمے لہجے میں بڑی نزاکت سے بولنا سکھاتی تھیں۔ بل کھا کر بیٹھنے اٹھنے اور ہر قدم پر لہرا کر چلنے کی ادائیں سکھاتی تھیں۔

ان عورتوں نے وسیم کے بدن کو ٹٹول کر کہا۔ "یہ بہت حسین ہے مگر نازک نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں مردانہ سختی آ رہی ہے۔ اسے زیادہ دنوں تک دھندے میں رکھا نہیں جا سکے گا۔"

ابو ولاد نے کہا۔ "یہ جب تک کیش ہوتا رہے گا، تب تک اسے رکھا جائے گا۔ پھر چھوڑ دیا جائے گا۔"

وسیم نے کہا۔ "میں ایسا گناہ نہیں کروں گا۔ مجھے جانے دو۔ میں اپنی سسٹر کے پاس جاؤں گا۔"

"ہماری بات مانو گے تو اپنے گھر جا سکو گے۔ تم نے سنا نہیں کہ زیادہ دنوں تک ہمارے کام نہیں آؤ گے؟ جلد ہی تمہاری چھٹی ہو جائے گی۔"

"مجھے زیادہ دنوں کے لیے نہیں، تھوڑے دنوں کے لیے ہی سہی مگر گناہ گار کیوں بناؤ گے؟ میں شہید اعظم سراج مصطفیٰ کا بھائی ہوں۔ کم از کم مجھے تو معاف کر دو۔"

ایک بے یار و مددگار کو بڑے بھائی کی شہادت اور قربانیوں کا کوئی مول، کوئی انعام نہیں مل رہا تھا۔ محبانِ وطن اپنی قوم کی خاطر غاصبوں سے برسرِ پیکار تھے۔ جان کی بازیاں لگا رہے تھے۔ اتحادیوں کے تمام پریس، تمام چینلز بہت ہی مستعد اور مؤثر تھے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر سے انہیں شہید تسلیم کرنے کے بجائے باغی اور دہشت گرد کے طور پر دنیا والوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔

وسیم شہید ہونے والے بھائی کے حوالے سے کوئی انعام نہیں چاہتا تھا۔ اس کی التجا اتنی تھی کہ اسے عزت اور تحفظ حاصل ہو جائے اور ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ان کے احکامات کی تعمیل نہ کرتا تو بے موت مارا جاتا۔ اسے زندہ رہنا تھا۔ اپنی سسٹر کے پاس جانا تھا۔ لہٰذا قہر اور جبر اً عشوہ طرازی کی تربیت حاصل کرنے لگا۔

یہ بات دل میں تھی کہ جوں ہی کام کا کھیل شروع ہونے سے پہلے کسی طرح وہاں سے نکل جائے گا۔ ہو سکتا ہے بچ نکلے اور اپنی سسٹر کی آغوش میں پہنچ جائے۔ اسے رہ رہ کر اس کے نرم و گداز بدن کی قربت یاد آتی تھی۔ وہ سحر زدہ سا ہو کر اس کے متعلق سوچتا رہتا۔

یاقوت تک پہنچنے کے لیے وہ جان کی بازی لگانے والا تھا۔ اسے موت منظور تھی، شرمناک فعل منظور نہ تھا۔

اگلے سات دنوں تک وہ بے دلی سے تربیت حاصل کرتا رہا۔ ایک کمرے کی جالی دار کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ وہ چھوٹی سی عمارت شہر سے کہیں دور تھی۔ بہت دور دو مکانات دکھائی دیتے تھے۔ مسلح افراد پہرا دیتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دن رات ان کی ڈیوٹی بدلتی رہتی تھی۔

وہ پریشان ہو کر سوچتا تھا، کیا جبراً گناہوں کی دلدل میں اترنا ہو گا؟ یہ سوچ کر ہی اسے شرم آتی تھی کہ مرد ہو کر عورتوں کی طرح مستعمل ہو گا۔

اس کے سر پر ریشمی بالوں کی وگ اور جسم پر زنانہ لباس آ گیا تھا۔ وہ یوں بھی حسین تھا۔ ایک بیوٹیشن نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ مختلف زاویوں سے اس کی دلکش تصاویر اتاری گئیں۔ اس کی البم بنا کر عیاش اُمرا کو بھیج دی گئی۔

بالی عمر کے نسوانی لڑکوں کی طلب کہاں نہیں تھی؟ اس کی البم دیکھ کر کئی رئیسوں نے بولیاں دیں۔ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار داؤد اسرار نے سب سے کم بولی دی مگر دھمکی بڑی دی کہ وسیم عرف وسیمہ کو ایک ہفتے کے لیے اس کے پاس نہ چھوڑا گیا تو وہ ابو ولاد کا دھندا چلنے نہیں دے گا۔

ابو ولاد نے فوراً ہی وسیم کو داؤد محل پہنچا دیا۔ وہ اس دھندے میں پڑنے سے پہلے ہی فرار ہونے کی فکر میں تھا۔ لیکن اس وسیع و عریض محل میں پہنچ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہاں جگہ جگہ سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔ الیکٹرونک آلات کے ذریعے وہاں آنے اور جانے والوں کو دیکھا جاتا تھا۔ سیکیورٹی افسر کی اجازت کے بغیر وہ محل کے احاطے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔

محل میں داؤد اسرار کی ایک بیوی اور ایک جوان بیٹی بھی تھی۔ محل کے ایک حصے میں تین کنیزیں تھیں۔ نئی آتی رہتی تھیں، پرانی چلی جاتی تھیں۔ داؤد اسرار نے حرم سرا میں آ کر وسیم کو وسیمہ کے روپ میں دیکھا تو خوش ہو کر دونوں بازو پھیلا کر کہا۔ "کیا قیامت کا حسن ہے؟ تم تو مجھے لوٹ لو گی۔ آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہا تھا۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ داؤد نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے کسمسانے لگا۔ داؤد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جو راضی نہیں ہوتی، نخرے کرتی ہے، خود کو چھڑاتی ہے، ادھر سے اُدھر بھاگتی ہے، اُسے پکڑنے اور زیر کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔"

وہ خود کو چھڑا کر الگ ہو گیا۔ وہاں کی کنیزیں ادب سے کھڑی تھیں۔ داؤد نے ایک سے کہا۔ "ایک بڑا پیگ بناؤ۔ یہ نئی نویلی کچھ زیادہ ہی نخرے دکھا رہی ہے۔ پینے سے مزہ آئے گا۔"

پھر وہ وسیم سے بولا۔ "یہ جو تین کنیزیں ہیں، ان میں بس یہ ایک کنیز ہے، باقی یہ دونوں تمہارے جیسی ہیں۔ مجھے عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔ تم آ گئے ہو تو میں ان سب کو رخصت کر دوں گا۔"

کنیز نے ایک ڈبل پیگ بنا کر پیش کیا۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر دوسرا ہاتھ وسیم کی کمر میں حمائل کرتے ہوئے بولا۔ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست..."

اس نے جام کو ہونٹوں سے لگایا۔ وسیم نے زیرِ لب ایک موٹی سی گالی دی اور بڑے موقع سے دی۔ وہ گالی بددعا کی طرح لگی۔ ایک گھونٹ لیتے ہی ٹھسکا لگا۔ وہ ایک دم سے جھٹکا کھا کر کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے وسیم سے دور چلا گیا۔

www.pkdigest.com

اس نے دعا مانگی۔ ”اللہ کرے یہ کھانستے کھانستے باہر چلا جائے پھر واپس نہ آئے۔“

ایسی دعائیں قبول نہیں ہوتیں کیونکہ مصیبتیں فوراً جانے کے لیے نہیں آتی ہیں۔ داؤد کو ذرا سکون ملا۔ وہ تھوڑی دیر ہانپنے کے بعد پھر پینے لگا اور سر گھما کر وسیم کو دیکھنے لگا۔

وہ اس کے قریب جا کر دور ہو گیا تھا۔ کوئی چیز ملتے ملتے نہ ملے تو اس کی اہمیت' اس کی کشش بڑھ جاتی ہے۔ وسیم کا سراپا للچا رہا تھا۔ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے وہسکی پیگ کا آخری گھونٹ پیا۔ پھر شیشے کے پیالے کو ایک صوفے پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ”اے قمر...! آ اور قیامت بن جا۔ شتاب آ کہ نہیں تاب اب جدائی کی...“

وہ بولتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ جبر بڑھتا ہے تو پھر رکتا نہیں۔ اب وہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ مرد تھا اور مرد بن کر حالات کا مقابلہ کرتا۔ وہاں سے فرار ہوتا' گولیوں کا نشانہ بنتا یا پھر گرفتار ہو کر مار کھاتا۔ کسی ٹارچر سیل میں پھینک دیا جاتا یا قسمت ساتھ دیتی تو زندہ سلامت اپنی سسٹر کے پاس پہنچ جاتا۔

وہ ایک دم سے تن گیا۔ داؤد اس کی طرف آیا مگر رک گیا۔ اس کے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ ”شٹ...“

پھر فون نکال کر کان سے لگایا اور جھنجلا کر اپنے پی اے سے کہا۔ ”نان سنس! کیا بہت ضروری کال ہے؟“

پی اے نے کہا۔ ”یس سر! تھرڈ سینٹرل زون سے میجر ڈوگلس آن لائن ہیں۔“

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جلدی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ بات کراؤ۔“

فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہاں مجاہدین کے ایک گروہ نے میزائل پھینکا تھا۔ معمولی سا نقصان ہوا تھا مگر اپنے محکوم سرکاری عہدے داروں کو غصہ دکھایا جا رہا تھا۔

عراق کے شمالی علاقوں میں اتحادی فوج کا قبضہ تھا۔ وہاں ان کی گرفت مضبوط تھی۔ غصہ اس بات کا تھا کہ بغداد کے کسی حصے سے وہاں کی ایک فوجی بیرک میں میزائل پھینکا گیا تھا۔

اتحادی آقا یہ الزام دے رہے تھے کہ بغداد کے کٹھ پتلی حکمران غافل ہیں۔ اپنے آقاؤں کو پوری طرح تحفظ فراہم نہیں کر رہے۔ داؤد اسرار فون پر ”یس سر! یس سر! جی جناب! جی حضور!“ کہہ رہا تھا۔ انہیں یقین دلا رہا تھا کہ بغداد کی پوری پولیس فورس کے ساتھ مجاہدین کے ٹھکانوں پر حملے کرے گا۔ اور انہیں بغداد سے نابود کر دے گا۔

اس نے ایک آقا کو تسلیاں دے کر فون بند کیا۔ پھر وسیم کو دیکھا۔ وہ ہوس کے دستر خوان پر رکھا ہوا تھا مگر اسے چبانا تو دور کی بات ہے' چکھنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ اپنی مستی اور مسرتوں سے پہلے گورے آقاؤں کو مطمئن کرنا لازمی تھا۔

وہ وہاں سے چلتا ہوا محل کے دوسرے حصے میں اپنی شریک حیات کے پاس آیا۔ اسے بتایا کہ آرمی ہیڈ کوارٹر سے اچانک کال آئی ہے۔ وہ باغیوں کی سرکوبی کے لیے جا رہا ہے۔ پتا نہیں واپسی کب ہو گی؟

بیوی نے پوچھا۔ ”رات کو تو واپس آ جائیں گے؟“

”نہیں۔ مجھے باغیوں کے خلاف کچھ کارکردگی دکھانے کے بعد ہیڈ کوارٹر جانا ہو گا۔ شاید کل واپسی ہو گی۔“

”آپ نے حرم سرا میں خواہ مخواہ اتنی بھیڑ لگا رکھی ہے۔ ایسی بھی کیا ہوس ہے؟ کچھ تو خیال کریں' ہماری جوان بیٹی کیا سوچتی ہو گی؟“

اس نے بیٹی کے بارے میں پوچھا۔ ”سارہ کہاں ہے؟“

”اپنے بیڈ روم میں ہے۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی' آج کوئی نئی لڑکی آئی ہے۔ یہ کب تک رہے گی؟“

داؤد نے سنجیدگی سے سوچتے ہوئے حرم سرا کی دیوار کو دیکھا پھر کہا۔ ”یہ جو نئی آئی ہے اسے رہنے دو۔ باقی تینوں کو یہاں سے رخصت کر دو۔“

بیوی نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ نئی آئی نہیں ہے۔ آئی ہے۔ توبہ توبہ... ہماری سارہ ابھی نادان ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ اس کے ابا حضور کیسے کیسے شوق فرماتے ہیں؟“

وہ گھور کر بولا۔ ”طعنے نہ دو۔ شکر کرو' کسی کو نکاح پڑھا کر نہیں لاتا۔ میری دولت اور جائداد کی وارث صرف تم سے ہونے والی اولاد ہو گی۔ اسی لیے تم یہاں آنے والی عارضی سوکنوں کو برداشت کرتی ہو۔“

بیوی نے پوچھا۔ ”سوکن بننے والے مردوں کو کیا کہتے ہیں؟ میں انہیں اپنی سوکن کہوں یا رقیب...؟“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”کچھ بھی کہہ لو۔ بیٹی کا خیال رکھو۔ وہ انجان ہے۔ اسے انجان رہنے دو۔ یہ معلوم نہ ہونے دو کہ یہاں لڑکیاں بن کر آنے والے دراصل لڑکے ہوتے ہیں۔“

وہ کمرے سے نکل کر بیٹی کے پاس آیا تو وہ بولی۔ ”ہائے پاپا! میں ابھی آپ کے پاس ہی آنے والی تھی۔“

”پاپا کی جان! میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ تم ملکی حالات کو سمجھتی ہو۔ میں کل تک آ جاؤں گا۔ بس اپنی بیٹی کو پیار کرنے آیا ہوں۔“

وہ اس کی پیشانی چوم کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ اپنی بچی کے لیے ایک شریف اور آئیڈیل باپ تھا۔ باقی دنیا کے تمام بچوں کے لیے ایک عیاش درندہ تھا۔ ایسے وہ غلیظ عیاش کسی بچے کی پیشانی کو پدرانہ شفقت سے کبھی نہیں چومتے۔

سارہ باپ کے جانے کے بعد ماں کے پاس آئی۔ وہ اپنے شوہر کے پی اے سے کہہ رہی تھی۔ ”ابو ولاد کو فون کرو۔ اس سے بولو' صرف آج آنے والی لڑکی یہاں رہے گی۔ وہ باقی گند سمیٹ کر یہاں سے لے جائے۔“

پی اے حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ وہ بیٹی سے بولی۔ ”تمہارے پاپا آرمی ہیڈ کوارٹر جائیں گے۔ کل سے پہلے نہیں آئیں گے۔ انہوں نے تم سے کچھ کہا ہے؟“

وہ بولی۔ ”کوئی خاص بات نہیں کی۔ ویسے آپ نے اس نئی لڑکی کو دیکھا ہے؟“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”نہیں۔ مجھے ایسی لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”میں نے اسے دور سے دیکھا ہے۔ بہت حسین ہے۔“

وہ بولی۔ ”اونہہ... تمہاری ماں کی جان جلانے آئی ہے۔“

”پلیز! آپ پاپا کے خلاف کچھ نہیں کہیں گی۔ وہ آتی ہیں تو کیا ہوا؟ چلی بھی تو جاتی ہیں۔“

”ہاں۔ تمہارے پاپا بہت اچھے ہیں۔ کسی کو میری مستقل سوکن بنا کر نہیں لاتے مگر ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ تم کو کیا تکلیف ہے بابا...!“

”جب تمہاری شادی ہو گی اور تمہارا شوہر ایسی حرکتیں کرے گا' تب جانو گی کہ یہ سراسر ہوس پرستی ہے۔ تعجب ہے' مرد کی بھوک کبھی نہیں مٹتی۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سارہ کو حرم سرا میں آنے والی لڑکیوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر تنہائی میں ان سے باتیں کیا کرتی تھی۔ شہر کے حالات ایسے تھے کہ وہ تفریح کے لیے کہیں باہر جانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے محل میں آنے والی لڑکیوں کے ساتھ باتیں کر کے دل بہلاتی تھی۔

وہ ایک گھنٹے بعد محل سرا کے ایک کمرے میں آئی۔ وہاں وسیم بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سارہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ ایک اور لڑکے کو لڑکی بنا کر لایا گیا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”میرا نام سارہ ہے۔ داؤد اسرار میرے پاپا ہیں۔“

اس کی آنکھوں سے اچانک نفرت جھلکنے لگی۔ وہ ایک ظالم عیاش شخص کی بیٹی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”وسیم... وس... وسیمہ...“

اسے ٹریننگ کے دوران تاکید کی گئی تھی کہ وہ خود کو کبھی ایک لڑکا نہ کہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ وسیم مر چکا ہے۔

سارہ نے کہا۔ ”یہاں صرف تم رہو گی۔ باقی وہ تینوں جا چکی ہیں۔“

”جبکہ مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں بہت بدنصیب ہوں۔“

”تم بدنصیب کیوں ہو؟ کیا یہاں رہنا نہیں چاہتیں؟“

”نہیں۔ میں اپنی سسٹر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“

”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

”مجھے زبردستی لایا گیا ہے۔“

”یہ تو بہت بری بات ہے۔ میں پاپا سے کہوں گی' وہ تمہیں تمہاری سسٹر کے پاس پہنچا دیں گے۔“

اسے سارہ کی معصومیت اچھی لگی۔ وہ اسے یاقوت کے پاس پہنچانے کی بات کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”جانتی ہو' تمہارا باپ مجھے کس لیے یہاں لایا ہے؟“

”میں بچی نہیں ہوں۔ پورے اٹھارہ برس کی ہوں۔ سب سمجھتی ہوں مگر پہلی بار سن رہی ہوں کہ تمہیں یہاں زبردستی لایا گیا ہے۔ پہلے کبھی کسی نے شکایت نہیں کی۔“

”میں دوسروں کو نہیں جانتی۔ تم اپنی باتوں سے بہت اچھی اور سمجھدار لگ رہی ہو۔ کیا تم مجھے یہاں سے رہائی دلا سکتی ہو؟“

”ہاں۔ پاپا آئیں گے تو میں ان سے کہوں گی۔ وہ تمہیں تمہاری بہن کے پاس پہنچا دیں گے۔“

”میری کوئی بہن نہیں ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں لہو کا ایک رشتہ بھی نہیں ہے۔“

”پھر تم سسٹر کسے کہتی ہو؟“

”اس کا نام یاقوت ہے۔ میں اسے بچپن سے سسٹر کہتی ہوں مگر وہ بہن نہیں لگتی' میرے دل کو لگتی ہے۔ پلیز! مجھے اس کے پاس پہنچا دو۔“

سارہ حیرانی سے بولی۔ ”تم لڑکی ہو! مگر ایک لڑکے کی طرح یاقوت سے ملنے کی بات کر رہی ہو؟“

”اس بات کو چھوڑو... بس تم خدا کے لیے مجھے اس محل سے باہر نکال دو۔“

”باہر جتنے سیکیورٹی گارڈز ہیں' وہ پاپا کی اجازت کے بغیر نہ تو کسی کو باہر جانے دیتے ہیں' نہ کسی کو اندر آنے دیتے ہیں۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں رہائی مل جائے گی۔ پاپا کو آنے دو۔“

”تمہارا باپ میری زندگی تباہ کیے بغیر' گناہ کیے بغیر مجھے یہاں سے جانے نہیں دے گا اور میں جان پر کھیل کر بھی یہاں سے جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔“

سارہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ جوش اور جذبے کے

www.pkdigest.com

باعث اس کی آواز اور لہجہ بدل گیا تھا۔ اس نے جو ٹریننگ حاصل کی تھی' اسے بھول گیا اور ایک مرد کی طرح بول رہا تھا۔

اچانک وہ خاموش ہوگیا۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ وہ سوالیہ نظروں سے پوچھ رہی تھی۔ ''کون ہو تم؟''

اس نے فیصلہ کن انداز میں ایک لمبی سانس لی۔ پھر سر سے ریشمی بالوں کی وگ اتارتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو ویسے بھی جان پر کھیل جانا ہے۔ اس لیے مرد بن کر ہی یہاں سے نکلوں گا۔''

سارہ گم صم کھڑی تھی اور حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے اسکارف سے آنکھوں کا کاجل اور ہونٹوں کی سرخی پونچھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''تم چاہو تو شور مچا کر گارڈز کو بلا سکتی ہو۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔''

وہ وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ سارہ نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ''کیا پاگل ہو؟ دماغ سے خالی ہو؟ گولیاں چلیں گی تو بھاگنے کے قابل نہیں رہو گے۔'' وہ اسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ ''بیٹھو یہاں۔ مجھے سمجھنے دو کہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ ابھی تم لڑکی تھے۔ پھر ایک دم سے مرد بن گئے۔ یہ بتاؤ' تم یہاں لڑکی بن کر کیوں آئے ہو؟''

''اس لیے کہ تمہارے باپ جیسے عیاش لوگوں کو لڑکی کے بھیس میں لڑکے پسند ہیں۔ وہ خوبصورت لڑکوں کے ساتھ منہ کالا کرتے ہیں۔''

سارہ نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ اپنے باپ کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وسیم نے کہا۔ ''ابھی یہاں سے جو تین لڑکیاں گئی ہیں' ان میں حقیقتاً دو لڑکے تھے۔ تم انہیں پہچان نہیں سکیں۔''

وہ انٹرنیٹ کے ذریعے بہت کچھ دیکھتی تھی۔ بہت کچھ پڑھ کر مختلف موضوعات کے متعلق معلومات حاصل کرتی تھی۔ لیکن باپ اس کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس

لڑکے سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا' اسے اس کے گھر پہنچانا چاہیے۔ یہ خیال تکلیف پہنچا رہا تھا کہ اس کا باپ زبردستی پیشہ کرانے والوں سے تعلق رکھتا ہے۔

وسیم نے کہا۔ ''میں اسی طرح یہاں بیٹھا رہوں گا تو تمہارا باپ واپس آجائے گا۔''

''وہ کل کسی وقت آئیں گے۔ سوچنے سمجھنے کے لیے بہت وقت ہے۔ تم آج کا پورا دن اور ایک رات یہاں گزار سکتے ہو۔ کل صبح تک یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کی جا سکتی ہے۔''

وہ تسلیم کر رہی تھی کہ باپ کی موجودگی میں اس کے کام نہیں آسکے گی۔ وہ باپ کی لاڈلی تھی اور اسے اپنے باپ کی حمایت میں سوچنا چاہیے تھا۔ لیکن اس میں نیکی اور بدی کی تمیز تھی۔ اس وقت اس کے اندر نیکی کا جذبہ غالب تھا۔

وہ دنیا والوں سے نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اپنے اندر تسلیم کر رہی تھی کہ باپ عیاش اور بدکار ہے۔ اسے ایک سیدھے سادے لڑکے کو گناہ کی دلدل سے نکالنا چاہیے۔

اس نے کہا۔ ''تم نے وگ اتار دی ہے۔ بہروپ میں نہیں ہو۔ مام دیکھیں گی تو فوراً پاپا کو اطلاع دیں گی۔ وہ ان سے کوئی بات نہیں چھپاتیں۔''

''کیا تم چاہتی ہو کہ میں یہاں سے فرار ہونے تک لڑکی بنی رہوں؟''

''میں چاہتی ہوں' مام تمہیں لڑکے کے روپ میں نہ دیکھیں۔ یا تو تمہیں لڑکی بن کر رہنا ہوگا یا مام سے چھپنا ہوگا اور ایسا ہو نہیں سکتا۔ تم نظر نہیں آؤ گے تو وہ فوراً ہی پاپا کو اطلاع کر دیں گی۔''

اس کے چہرے پر کاجل کی سیاہی اور لپ اسٹک کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ بولی۔ ''آئینہ دیکھو۔ تم کارٹون لگ رہے ہو۔ واش روم جاؤ۔ اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔''

وہ واش روم کی طرف جانے لگا۔ سارہ اسے دیکھنے لگی۔ وہ دیکھنے سننے میں اچھا لگ رہا تھا۔ اسے بے اختیار اس سے

وہ سوچتے سوچتے رک گئی۔ وہ واش روم سے نکل کر تولیے سے منہ ہاتھ پونچھتا ہوا نگاہوں کے سامنے آگیا۔ دل نے کہا۔ ''لو... وہ آگیا۔ اب بولو کیسا لگتا ہے؟ کیا ایسا خوبرو جوان پہلے کبھی دیکھا ہے؟''

اس نے بہت دیکھے تھے' پر ایسا کوئی نہیں تھا۔ وہ اتنی دیر سے چپ چاپ اس کی ہمدردی' اس کی توجہ سمیٹ رہا تھا اور وہ بے خبر تھی۔

اب ایک کمی رہ گئی تھی۔ اگر مردانہ لباس پہن لیتا تو مکمل مرد دکھائی دیتا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ لباس اتار دو۔ بڑا مضحکہ خیز لگ رہا ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''پھر کیا پہنوں؟''

وہ اِدھر اُدھر یوں دیکھنے لگا جیسے کہیں سے لباس مل جائے گا۔ سارہ نے کہا۔ ''میرے پاپا بہت موٹے ہیں۔ قد میں تم سے اونچے ہیں۔ ان کا لباس بہت ڈھیلا ہوگا مگر مردانہ تو ہوگا۔ میں ابھی لاتی ہوں۔''

وہ جاتے ہوئے بولی۔ ''دروازہ اندر سے بند کرلو۔ جب تک دستک دے کر آواز نہ دوں' اسے نہ کھولنا۔''

وہ کمرے سے نکل کر اپنے باپ کے بیڈروم کی طرف جانے لگی۔ ماں اپنے بیڈروم سے آرہی تھی۔ لاؤنج میں دونوں کا سامنا ہوا تو وہ بولی۔ ''دن پہاڑ جیسے لگتے ہیں۔ کاٹے نہیں کٹتے۔ کہیں سیر و تفریح کے لیے جانا تو دور کی بات ہے' اپنے گھر کے لان میں بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں سے کوئی اندھی گولی آکر کام تمام نہ کردے۔''

سارہ نے کہا۔ ''آپ کینیڈا چلی جائیں۔ وہاں آرام سے گھومتی پھرتی رہیں گی۔''

''یہی سوچ رہی ہوں۔ وہاں ہم ماں بیٹی آزادی سے لائف انجوائے کریں گے۔''

مگر سنبھل کر بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ باتیں اچھی کرتی ہے۔ ابھی سونے جارہی تھی اس لیے میں آگئی۔''

وہ بولتی ہوئی لاؤنج سے چلی گئی۔ پھر ایک کوریڈور سے گزرتی ہوئی اپنے باپ کے بیڈروم میں پہنچ گئی۔ وارڈ روب کو کھول کر دیکھا۔ وہاں درجنوں قیمتی ملبوسات تھے۔ سب ہی ڈھیلے ڈھالے تھیلے کی طرح لگ رہے تھے۔ وہ چاہتی تھی' وہ نگاہوں کے سامنے مضحکہ خیز نہ لگے۔ جیسا خوبرو ہے' ویسا ہی اسمارٹ بھی دکھائی دے۔ نظارہ دیدہ زیب ہو تو نظر نہیں ہٹتی بلکہ دیکھتے رہنے کی لگن رہتی ہے۔

وہ سوچتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسے یاد آیا' ایک ماہ پہلے اس کا ایک کزن آیا تھا۔ وہ آئل ریفائنری میں انجینئر تھا۔ وہ گاڑی میں ڈیوٹی پر جارہا تھا۔ اسی وقت گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ اس کا تمام سامان وہاں ایک کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ یقیناً پہننے کے چند جوڑے بھی سامان میں ہوں گے۔

وہ پلٹ کر جانا چاہتی تھی مگر ماں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس نے کمرے میں آکر پوچھا۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

اسے یوں لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آں... کچھ نہیں۔ میرے پاپا کا کمرا ہے۔ یونہی آگئی۔''

''یہ وارڈروب کیوں کھلا ہے؟''

وہ فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ ویسے بھی کوئی معقول جواب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دوسری الماری کو کھولتے ہوئے بولی۔ ''صرف وارڈروب ہی نہیں' میں اسے بھی کھولنے والی تھی۔''

پھر وہ ایک بڑی سی اٹیچی کو کھولتے ہوئے بولی۔ ''میں اسے بھی کھولنے والی تھی۔ جب پاپا نہیں رہتے تو میں یہاں آکر ان کی ایک ایک چیز کو دیکھتی رہتی ہوں۔ پھر اپنے طور پر ان کی سیٹنگ کرتی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اپنے پاپا کا کام کر رہی ہوں اور وہ کہیں دور نہیں گئے ہیں' میرے پاس

www.pkdigest.com

چھپکی ہی گڑبڑ ہونے لگی ہے۔

ماں حرم سرا کے ایک دروازے پر رک گئی۔ اسے خیال آیا۔ "اس نئی آنے والی یا والے کو دیکھنا چاہیے۔ یہ داؤد چھٹا ہوا عیاش ہے۔ پتا نہیں، حسین چھوکروں کو کہاں کہاں سے پکڑ کر لے آتا ہے؟"

بیٹی نے کہا تھا، وہ حرم سرا میں سو رہی ہے۔ وہ چاہتی تھی، ماں اُدھر نہ جائے مگر وہ دروازے تک آ ہی گئی۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔ وسیم سارہ کے انتظار میں لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا، شاید آ گئی ہے۔

وہ بستر سے اتر کر دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ سارہ نے کہا تھا، دستک کے ساتھ جب تک میں آواز نہ دوں، دروازہ نہ کھولنا۔

وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ دوسری بار دستک ہوئی۔ وہ آواز سننا چاہتا تھا۔ دوسری طرف بیگم داؤد نے سوچتی ہوئی نظروں سے بند دروازے کو دیکھا۔ بیٹی کی بات یاد آئی کہ وہ سو رہی ہے۔ اس نے پھر دستک نہیں دی۔ وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گئی۔

اُدھر وسیم بھی بیڈ کی طرف جانے کے لیے پلٹنے لگا تو فلاور اسٹینڈ سے ٹکرا گیا۔ وہاں رکھے ہوئے گلدان نے فرش پر گر کر شور مچایا۔ وہ جاتے جاتے رک گئی۔ اس نے دستک دیتے ہوئے کہا۔ "دروازہ کھولو..."

اس کے کانوں میں سارہ بول رہی تھی۔ اس نے لاک ہٹا کر دیکھا تو ایک دم سے گھبرا گیا۔ دھان پان سی سارہ کے بجائے ایک بھرپور جوان عورت نظر آ رہی تھی۔ بیگم داؤد اسے چند لمحوں تک دیکھتی رہ گئی۔ وہ کسی لڑکی کو دیکھنے آئی تھی۔ سامنے ایک خوبرو جوان دکھائی دے رہا تھا۔ وسیم نے دروازہ بند کرنا چاہا۔ وہ اسے دھکا دیتی ہوئی اندر آ گئی اور ذرا سخت لہجے میں بولی۔ "تم نے لڑکی کا گیٹ اپ کیوں اتارا ہے؟ کیا تمہیں تاکید نہیں کی گئی ہے کہ یہاں خود کو ظاہر نہیں کرنا ہے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "ہاں، مگر..."

"اگر مگر کیا کرتے ہو؟ ہماری بیٹی نادان ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ اس کا باپ یہاں لڑکیوں کے بھیس میں لڑکے لاتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے ایسی شرمناک حرکتوں کا علم ہماری بیٹی کو ہو۔"

وہ بیگم صاحبہ سے بول نہیں سکتا تھا کہ بیٹی سب کچھ جان گئی ہے۔ تم یہاں سے دفع ہو گی تو وہ میری رہائی اور آزادی کے لیے ادھر آئے گی۔

وہ بولی۔ "مجھے داؤد کو انفارم کرنا ہوگا۔ تم یہاں اصول کے خلاف حرکتیں کر رہے ہو۔"

وہ پلٹ کر جانا چاہتی تھی۔ وسیم نے گھبرا کر تڑپ کر اس کے بازو کو پکڑ لیا۔ وہ جہاں تھی، وہیں تھم گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے بھرے بھرے بازو پر اس کی گرفت دیکھی۔ اس گرفت نے سمجھا دیا کہ وہ نازک اندام دکھائی دینے والا باہر سے سرد ہے، اندر سے مرد ہے۔ اس کا ایک پنجہ بازو کے گوشت میں پیوست ہو گیا تھا۔ اندر تک محسوس ہو رہا تھا۔

وسیم نے سوچا، یہ فون کرے گی تو داؤد ابھی آ جائے گا۔ پھر وہ وہاں سے فرار نہیں ہو سکے گا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ "اسے فون نہ کرو۔ میں ابھی لڑکی بن جاؤں گا۔ تم یہاں سے جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں، تمہاری بیٹی مجھے لڑکی کے روپ میں ہی دیکھے گی۔"

اس نے بازو چھوڑ دیا۔ بیگم داؤد کو یوں لگا وہ جیسے بے سہارا ہو گئی ہے۔ کھڑی نہیں رہ سکے گی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "میں سچ کہتا ہوں... نہیں، سچ کہتی ہوں۔ ابھی دروازہ بند کروں گی پھر دو گھنٹے بعد لڑکی بن کر تمہارے پاس آؤں گی۔"

بیگم داؤد اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دروازے تک آئی۔ دل کہہ رہا تھا، ابھی نہ جائے۔ اسے اچھی طرح دیکھے سمجھے کہ وہ جیسا لگ رہا ہے، ویسا ہی [illegible] ہے یا محض فریب ہے۔

وہ بولی۔ "دروازہ بند کرو۔ سارہ آ جائے گی۔ میں جا رہی ہوں۔ یہاں پہرے دار آتے رہتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت آؤں گی۔ ان پہرے داروں کی موجودگی میں تمہارے ساتھ چائے پیوں گی اور باتیں کروں گی۔"

وسیم نے فوراً ہی دروازہ بند کر لیا اور زیر لب بڑبڑانے لگا۔ "یہ بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ بیٹی کو آنا چاہیے تھا۔ ماں آ گئی۔ پتا نہیں وہ کب آئے گی؟ میں یہاں سے کب نکل سکوں گا؟"

وہ وہیں دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ دل کہہ رہا تھا، سارہ ابھی آئے گی۔ بس آنے ہی والی ہے۔

بیگم داؤد سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کا بازو دُکھ رہا تھا۔ بڑی مدت کے بعد کسی مردانہ گرفت میں آیا تھا۔ اسے جگا رہا تھا۔ ورنہ وہ تو خود کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی تھی۔ وہ نام کی سہاگن تھی۔ شوہر ایسا عیاش تھا کہ مدتوں ہو گئیں بیوی کو بھول چکا تھا۔ ایسا بدذوق تھا کہ لڑکوں کے پیچھے بھاگتا تھا۔ اس کے اندر فطری نسوانی کشش مر چکی تھی۔

اس پر ستم یہ کہ اسے سخت پردے میں اور پابندیوں میں رکھتا تھا۔ باہر جو مسلح گارڈز تھے، ان میں مخنث بھی تھے۔ ماضی میں محل سراؤں کے اندر خواجہ سراؤں کو رکھا جاتا تھا۔ داؤد بھی جانتا تھا کہ بھرپور جوان عورت کو صرف بیوی بنا کر رکھو تو ہاتھ سے

لگاؤ تو وہ ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جاتی ہے۔

لہٰذا وہ اپنی بیوی کو ہی نہیں، بیٹی کو بھی سخت نگرانی میں رکھتا تھا۔ کسی رشتے دار سے تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں سیکیورٹی گارڈز کسی رشتے دار کو محل میں داخل ہونے نہیں دیتے تھے۔ یورپ اور امریکا کے آزاد ماحول میں بھی ویسی ہی پابندیاں عائد رہتی تھیں۔

اس کے چھ سیکیورٹی گارڈز مخنث تھے۔ ملک کے باہر بھی ماں بیٹی کو اپنی نگرانی میں رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ کے متعلق داؤد کو یہ رپورٹ پہنچاتے تھے کہ وہ نیک اور پارسا ہے۔

وہ اپنے فطری تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھی لیکن مجبوراً پارسا بن کر رہتی تھی۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ داؤد کسی کو نکاح پڑھا کر لے آئے اور اس کے اور بیٹی کے حقوق مارے جائیں۔ اس لیے وہ اس عیاش مرد کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ عراق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سوت رقص میں رہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اسی کے ساتھ رہتی تھی۔

داؤد اپنے ذوق و شوق سے مجبور تھا۔ اسے عورتوں سے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے دوسری وہ شادی نہیں کرتا تھا۔ برسوں سے بیگم کو پرکھتا آ رہا تھا۔ مطمئن تھا کہ بیوی کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔

عورت کو کتنا ہی ٹھنڈا کرو، راکھ تلے چنگاری ضرور رہتی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً بیڈروم میں بند رہ کر کمپیوٹر کا سہارا لیتی تھی۔ اور اپنے فطری جذبات کی تسکین کر لیا کرتی تھی۔

وہ اپنے بازو کو سہلانے لگی۔ بڑی مدت کے بعد ایک مردانہ ہاتھ نے اسے جکڑا تھا۔ اگرچہ بازو گرفت میں نہیں تھا مگر وہ ہنوز جکڑی ہوئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ ہزارہا پابندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود محل کی آہنی چار دیواری میں ایک مسیحا آ گیا تھا۔ اب وہ دوا دارو کرائے گی۔ اگرچہ دارو حرام ہے لیکن دوا تو حلال ہے۔

سارہ نے ایک کمرے میں آ کر دیکھا۔ وہاں اس کے مقتول کزن کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک اٹیچی میں اس کے تین جوڑے تھے۔ اس نے اندازہ لگایا، وہ تقریباً وسیم کے ناپ کے تھے۔ وہ انہیں اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ وہاں بیٹھ کر بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ لباس کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ وسیم اسے پہن کر یہاں سے بھاگ جائے گا مگر میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔

اگر میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ رہنے دیں تو وہ کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ وہ اسے برے ارادے سے لائے ہیں۔ اسے بازاری لڑکا کہہ کر میرے حوالے نہیں کریں گے۔ میں ان کے مزاج کو خوب سمجھتی ہوں۔ انہیں شرم آئے گی کہ جسے اپنے لیے لائے ہیں، اسے میں اپنے لیے رکھنا چاہتی ہوں۔

وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ پاپا کبھی نہیں مانیں گے۔ وسیم کے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ یا خدا... میں کیا کروں؟ وہ نہ جائے تو اچھا ہے۔ جائے گا تو اسے نہیں روکوں گی... مصیبت میں پڑنے نہیں دوں گی۔

وہ کپڑے لے کر کمرے سے نکلی۔ ماں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ محتاط انداز میں چھپ کر حرم سرا میں آئی۔ ہولے سے دروازے پر دستک دے کر بولی۔ "میں ہوں... دروازہ کھولو۔"

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ سارہ نے اندر آ کر کہا۔ "لو۔ یہ کپڑے پہن کر دیکھو۔ میرا خیال ہے، اس سے گزارہ ہو جائے گا۔"

وہ کپڑے لیتے ہوئے بولا۔ "گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تمہاری ماں آئی تھی اور میں نے دروازہ کھول دیا تھا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا۔"

"میں کیا کروں؟ تم ماں بیٹی کی آواز ایک جیسی ہے۔ میں سمجھا تم ہو۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو تمہاری والدہ تھیں۔"

سارہ نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی تھیں؟"

"پہلے تو انہوں نے دھمکی دی کہ تمہارے پاپا کو فون کریں گی۔ پھر میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا، غلطی ہو گئی ہے۔ اب میں لڑکی بن کر رہوں گا تو وہ مان گئیں۔"

"وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ انہوں نے یہاں سے جا کر پاپا کو فون کر دیا ہوگا۔ وہ مصروف ہوں گے ورنہ اب تک ان کا ردعمل سامنے آ جاتا۔ لیکن کسی وقت بھی وہ آ سکتے ہیں یا سیکیورٹی افسر یہاں آ کر تمہیں کسی کمرے میں بند کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔ میں ابھی یہ کپڑے پہن کر یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔"

"کیا باہر جا کر مرنا چاہتے ہو؟"

"میں یہاں رہ کر بازاری لڑکا نہیں بنوں گا۔"

"میں تمہیں بننے نہیں دوں گی۔ ابھی تو اس کمرے سے نکلو۔ ماما اور گارڈز کسی وقت بھی آ سکتے ہیں۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر..... کمرے سے باہر لے آئی۔ اس نے پوچھا۔ "مجھے کہاں چھپاؤ گی؟"

"خاموش رہو۔ دبے پاؤں چلو۔ آہٹ نہ ہونے پائے۔"

وہ اس کے ساتھ دبے قدموں چلتا ہوا لاؤنج میں آیا۔ بیگم داؤد اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ وسیم کا ہاتھ سارہ کے

www.pkdigest.com

ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا ایک بہت ہی آراستہ خواب گاہ میں آ گیا۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ میرا بیڈ روم ہے۔ تم یہاں سے بھاگنے والے تھے۔ سمجھو کہ فرار ہو چکے ہو۔“

”کیسے سمجھ لوں؟ جبکہ اسی چار دیواری میں ہوں۔“

”ابھی معلوم ہو جائے گا۔ جب تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔ پورے محل میں تمہیں تلاش کیا جائے گا۔ اندر اور باہر کہیں دکھائی نہیں دو گے تو وہ سب حیران اور بے یقینی کے باوجود یقین کر لیں گے کہ تم یہاں سے جا چکے ہو۔“

”کیا میں اس کمرے میں قیدی بن کر رہوں گا؟“

”فی الحال تم مصیبتوں سے بچ گئے ہو۔ پاپا یہاں تم سے زیادتی کرنے نہیں آئیں گے۔ کوئی یہاں آیا تو میں تمہیں اسٹور میں چھپا دوں گی۔ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ اس کے ساتھ ایک اسٹور روم میں آیا۔ وہاں مختلف قسم کا فاضل اور غیر ضروری سامان بھرا پڑا تھا۔

پھر وہ اس کے ساتھ اسٹور روم سے نکل کر ایک باتھ روم میں آیا۔ اس کی پچھلی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ سارہ نے اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ”یہ اسٹور روم کا دوسرا دروازہ ہے۔ تم یہاں سے سامان کے پیچھے پہنچو گے۔“

وسیم نے دروازے سے گزر کر اندر قدم رکھا۔ آگے بڑھنے کی جگہ نہیں تھی۔ بھاری سامان نیچے سے اوپر تک رکھا ہوا تھا۔ سارہ نے اس کی چٹخنی لگا کر کہا۔ ”یہ یہاں سے بند ہو چکا ہے۔ اسے میرے باتھ روم سے کھولا نہیں جا سکے گا۔ تم یہاں کئی گھنٹوں تک آسانی سے چھپے رہو گے۔“

وہ دونوں وہاں سے نکل کر کمرے میں آ گئے۔ سارہ نے کہا۔ ”تم کپڑے بدلو۔ میں کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔ ویسے اس فریج میں بھی کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ یہ بعد میں کام آئیں گی۔“

اس نے خواب گاہ سے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ وسیم نے فوراً ہی لڑکیوں کے لباس سے نجات حاصل کی۔ مردانہ لباس پہن کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ حلیہ بدل چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک مرد کی حیثیت سے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

سارہ ایک ٹرے میں کھانا لے آئی اور میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”جلدی کھاؤ۔ تمہیں چھپنا ہے۔ تمہارے فرار ہونے کا ڈراما لے کر رہا ہے۔“

وہ صبح سے بھوکا تھا۔ جلدی جلدی کھانے لگا۔ ”تمہاری ماں نے کہا تھا وہ میرے پاس کسی وقت آئیں گی۔ یہاں سخت پہرے دار ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں مجھ سے باتیں کریں گی۔ تم نے اچھا کیا، مجھے یہاں لے آئیں۔ اسٹور روم ایسا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ نہیں سکے گا۔“

”تم جس قدر محتاط رہو گے، اتنے ہی محفوظ رہو گے۔ منہ سے آواز بالکل نہ نکالنا، نہ آہٹ پیدا کرنا۔ بس ایک بار انہیں یقین ہو جائے کہ تم یہاں نہیں ہو۔ پھر کوئی یہاں نہیں آئے گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ اس کے ساتھ واش روم میں آیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے کہا۔ ”تم کمرے میں گونگے بن کر رہو گے۔ کھانسنے کھنکھارنے کی آواز بھی نہیں نکالو گے۔ کوئی ضروری بات کہنا ہو تو کاغذ پر لکھو گے یا ہم باتھ روم میں آ کر بات کریں گے۔“

ان کی آواز باتھ روم سے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ مگر کمرے سے باہر نہیں جا رہی تھی۔ سارہ سرگوشی کے انداز میں بات کرتے ہوئے اس کے قریب ہو گئی۔ ان کے ملبوسات ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔

وہ پہلی بار تنہائی میں ایک اجنبی کے اتنے قریب آئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں اچانک ہی تیز ہو گئیں۔

وہ فرش پر پڑے ہوئے اس کے کپڑوں کو اٹھا کر بولی۔ ”اب تم اسٹور میں جاؤ اور یہ سمجھ لو کہ بیٹھے بیٹھے رات ہو جائے گی۔ میں نے بہت ہی دیر کی ہے۔ انہیں جلدی یقین ہو جائے گا کہ تم یہاں سے جا چکے ہو۔“

”میں دعا مانگتا رہوں گا کہ یہاں سے سچ مچ نکل جانے کا موقع مل جائے۔“

وہ بولی۔ ”میں بھی دعا کروں گی کہ تمہاری دعا قبول ہو جائے۔“

وہ باتھ روم کا پچھلا دروازہ کھول کر اسٹور میں چلا گیا۔ وہاں اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اب اسے باتھ روم سے کھولا نہیں جا سکتا تھا۔

سارہ اس کے کپڑے اور کھانے کی ٹرے لے کر کچن میں آئی۔ ٹرے کو وہاں رکھا پھر ماں کے کمرے میں آ کر کہا۔ ”مام! وہ لڑکی وسیمہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ اس کا یہ لباس قالین پر پڑا ہوا تھا۔“

وہ بیٹھی ہوئی تھی، حیرانی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ وہ بھلا کہاں جائے گی؟“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں وسیم کو ایک مرد کی حیثیت سے دیکھ چکی تھی۔ وہ کسی کمرے میں نہیں تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ایک مسیحا آیا تھا لیکن مریضہ کی نبض ٹٹولنے سے پہلے ہی گم ہو گیا۔ اگر وہ نہ ملا تو اسے ہسٹیریا کا

دورہ پڑ سکتا تھا۔

وہ بدحواس ہو کر دوڑتی پھر رہی تھی۔ محل کے دوسرے حصوں میں اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے بھوکی پیاسی کے منہ سے لقمہ چھین لیا گیا ہو۔

سارہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے فون کر کے سیکیورٹی افسر سے کہا۔ ”جلدی آؤ۔ وسیمہ یہاں سے بھاگ گئی ہے۔“

وہ کئی گارڈز کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا۔ تمام گارڈز گھر کا کونا کونا دیکھنے لگے۔ سارہ کے بیڈ روم میں بھی آئے۔ اسٹور میں بھی گئے۔ ان کی عقل نے یہی سمجھایا کہ وہاں چھپنے کے لیے کوئی بھاری سامان تنہا نہیں ہٹا سکتا۔

سارہ کہہ رہی تھی۔ ”میں اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند رکھتی ہوں۔ کوئی میرے کمرے میں آ ہی نہیں سکتا۔“

سیکیورٹی افسر نے تھک ہار کر اعتراف کیا کہ وسیم فرار ہو گیا ہے۔ مگر کیسے...؟

وہ محل سے باہر کس سمت گیا ہوگا؟

احاطے کے اندر باغیچے سے گزرتے وقت کسی گارڈ کو نظر کیوں نہیں آیا؟

انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یقیناً کسی گارڈ نے غفلت اور لاپروائی برتی ہے۔ وسیم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گیا ہے۔

سیکیورٹی افسر نے داؤد اسرار کو فون پر اطلاع دی اور جواباً گالیاں سنیں۔ وہ غصے سے گرج رہا تھا، حکم دے رہا تھا کہ تمام گارڈز کی چھٹی کر دی جائے۔ ان کی جگہ دوسرے لائے جائیں۔

پھر اس نے ابوولاد کو حکم دیا۔ ”وسیمہ کو کسی بھی طرح تلاش کرو۔ ایک معمولی سا لڑکا میری سیکیورٹی توڑ کر گیا ہے۔ یہ میری توہین ہے۔ اس کے گھر والوں کو پکڑو۔ انہیں ٹارچر کرو۔ ان سے اگلواؤ کہ وہ کہاں چھپا ہے؟ میری تمام پولیس فورس اسے تلاش کرے گی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ اپنے سیکیورٹی افسر اور ابوولاد پر گرج رہا تھا۔ اپنے ماتحتوں کو دھمکیاں دے رہا تھا کہ اس لڑکے کو ڈھونڈ کر نہ لایا گیا تو انہیں ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔

وہ اپنے گورے آقاؤں کو مطمئن کرنے کے لیے مجاہدین کے مختلف گروہوں سے نمٹ رہا تھا۔ فی الحال کچھ دنوں تک گھر نہیں جا سکتا تھا۔

وہ وہاں بیٹھے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی اپنی چھت کے نیچے اپنی بیٹی کی خواب گاہ میں رنگین و سنگین آنکھ مچولی جاری رہنے والی تھی۔

☆☆☆

جب سے صدام حسین کو سزائے موت سنائی گئی تھی تب سے مجاہدین کے حملوں میں شدت آ گئی تھی۔ بیشتر مجاہدین کے گروپس کہتے تھے کہ وہ صدام حسین جیسے ڈکٹیٹر کے حامی نہیں ہیں لیکن امریکا کے کٹھ پتلی حکمرانوں اور عدالت کو سزا سنانے کا حق نہیں ہے۔

اس نقطۂ نظر سے عراق کی عوام سزائے موت کے خلاف تھی۔ صدام حسین کے قانونی مشیر اور وکیل نے رحم کی اپیل کی تھی۔ ابتدائی الحال سزائے موت کے حکم کی تعمیل نہیں ہو رہی تھی۔

داؤد اسرار جیسے اعلیٰ عہدے داران اور افسران کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ یہ اندیشہ تھا کہ مجاہدین کے تمام گروپس اب تک منتشر ہیں مگر جلد ہی متحد ہو کر کوئی بڑا حملہ کر سکتے ہیں۔

یہ محض اندیشہ تھا۔ یقین نہیں تھا کہ ان تمام گروہوں کے درمیان اتحاد قائم ہو سکے گا کیونکہ عراق میں سنی اور شیعہ کے گروہ ندی کے دو کنارے تھے۔ کرد باغیوں کی جماعت علیحدہ تھی۔ کوئی گروہ صدام حسین کا حامی تھا۔ کوئی گروہ مخالفت کرتا تھا۔

تمام محبان منتشر تھے۔ امریکی حملے کی ابتدا سے اب تک وہ تمام محبانِ وطن متحد ہو نہیں پائے تھے اور نہ ہی آئندہ اتحاد قائم ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ یوں عراقی عوام کی یہ کمزوری اتحادیوں کی سب سے بڑی طاقت بن گئی تھی۔

عوام کے حوالے سے کمزوری یہ تھی کہ غربت، مہنگائی اور بے روزگاری کے باعث ڈکیتی، اغوا اور قتل کی وارداتیں ہی حصولِ زر کا ذریعہ بن گئی تھیں۔

عبدالمنعم نے مال کمانے کے لیے اپنی بیوی سلیمہ کے گھر واردات کرائی تھی۔ وہ بیوی اور سسر کا قاتل نہیں تھا مگر اس نے قتل کرایا تھا۔ ان کے گھر میں چوری کرائی تھی۔ یوں کمیشن کے طور پر ایک ہزار دینار کمائے تھے۔

اس نے یاقوت اور اس کی ماں کو چیلنج کیا تھا کہ وہ بے یار و مددگار عورتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ وہ اس گھر کو چھوڑ چکا تھا۔ بیوی کو ہلاک کرنے کے بعد ان سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اب اسے نیا گھر مل گیا تھا۔

فائرنگ اور بم دھماکوں میں زیادہ سے زیادہ مرد ہلاک ہو رہے تھے۔ یتیم لڑکیوں اور بیوہ ہو جانے والی عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ منعم جیسے شکاریوں کو ایسی مظلوم عورتیں بہ آسانی مل جاتی تھیں جو اپنے باپ

www.pkdigest.com

بھائی یا شوہر کی چھوڑی ہوئی جائداد کی مالک ہوتی تھیں۔

ایسی ہی ایک عورت اسے مل گئی تھی۔ اگرچہ وہ پچاس برس کی تھی۔ لیکن اسے ساری عمر بٹھا کر کھلا سکتی تھی۔ مرنے کے بعد جائداد اس کے نام کرسکتی تھی۔ اس نے پہلی بیوی سلیمہ کی زندگی میں ہی اسے پھانس لیا تھا۔ اور اب عیش کرنے کے لیے اس کے پاس چلا آیا تھا۔

وہ ایسا صابر نہیں تھا کہ اس پچاس برس کی عورت کے مرنے کا انتظار کرتا۔ وہ اس سے جلد ہی نکاح کرنے والا تھا۔ اسے اپنی منکوحہ بنانے کے بعد سلیمہ کے پاس پہنچانے والا تھا۔ یہ ساری پلاننگ وہ پہلے ہی کرچکا تھا۔ اس بوڑھی عورت کو راضی کررہا تھا کہ وہ جلد سے جلد نکاح پڑھوا لے۔ اس کے بغیر ایک چھت کے نیچے رہنا گناہ ہے اور اس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔

اسی وقت تین مسلح افراد اس گھر میں داخل ہوئے۔ منعم نے گن پوائنٹ پر آتے ہی گھٹنے ٹیک دیے۔ دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر پوچھا۔ "کون ہو تم لوگ؟"

ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہم وہ تین ڈاکو نہیں ہیں جو یاقوت کے گھر میں گھسے تھے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ان ڈاکوؤں کو تم لائے تھے، یہاں ہم خود آئے ہیں۔"

تیسرے نے کہا۔ "ہم یہاں ڈاکا ڈالنے نہیں آئے۔ اُن تین ڈاکوؤں کے نام اور پتا بتادو، ہم چلے جائیں گے۔"

وہ سہما ہوا تھا۔ ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ انہوں نے ڈاکوؤں کی طرح ماسک نہیں پہنے ہوئے تھے۔ کھل کر سامنے آئے تھے۔

اس نے پریشان ہوکر کہا۔ "تم لوگوں کو کسی نے میرے خلاف بہکایا ہے۔ میرا کسی ڈاکو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ایک نے چاقو نکال کر کھولا۔ پھر اس کی نوک منعم کے حلق پر رکھ کر کہا۔ "اب جھوٹ بولو گے تو پھر کبھی بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔"

چاقو کی نوک حلق کے قریب چبھ رہی تھی۔ وہ لہو کی پتلی سے دھار بہتی ہوئی محسوس کررہا تھا۔ چاقو بدست نے کہا۔ "اس سے پہلے کہ یہ اور گہرائی میں اُترے، بولنا شروع کردو۔"

وہ موت کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ان تین ڈاکوؤں کے نام اور پتے بتانے لگا۔ ایک نے پوچھا۔ "یہ لوگ کس تھانے میں بھتا پہنچاتے ہیں؟"

اس نے تھانے اور تھانے دار کا نام بتادیا۔ وہ آگے پیچھے گن کے نشانے پر تھا۔ ایک گن بردار نے کہا۔ "اس عورت کے سامنے بولو تم نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مجھے معاف کردو۔ میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔"

"جھگڑا کررہے ہو۔ اس عورت کے پاس بھی ویسی ہی واردات کرنے آئے ہو۔ کیسے رذیل ہو؟ سلیمہ نے تمہیں پیار دیا، تین وقت کا کھانا کھلایا۔ اپنی شرم، اپنی آبرو تمہارے نام کرتی رہی اور تم نے اسے ہلاک کرادیا۔"

وہ عورت حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر یہ باتیں سن رہی تھی۔ چاقو بدست نے کہا۔ "محترمہ! تمہارے ساتھ بھی یہی ہونے والا تھا مگر اب نہیں ہوگا۔ اس کی بیوی اور اس کا سسر اسے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہی اس نے چاقو والا ہاتھ لہرایا۔ سانس کی نالی کے ساتھ گردن شانوں سے کٹ کر الگ ہوتی چلی گئی۔ وہ فرش پر گر کر پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ تینوں جس طرح آئے تھے، اسی طرح خاموشی سے چلے گئے۔

اسی رات ایک رئیس اعظم کے بنگلے میں شادی کی تقریب تھی۔ سیکیورٹی کے سخت انتظامات تھے۔ ان کے علاوہ انسپکٹر حشمت کی پولیس فورس بھی وہاں موجود تھی۔ اس تقریب میں خطرہ رئیس اعظم کو اور اس کے رشتے داروں کو نہیں تھا بلکہ سیکیورٹی فراہم کرنے والوں کو تھا۔

انسپکٹر حشمت کے موبائل پر گھنٹی بجی، اس نے فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو...!"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تمہارا ایک بہنوئی اور دو سالے یہاں سیکیورٹی گارڈز کی وردی میں ہیں۔"

اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

جواباً کہا گیا۔ "ہم بھی سیکیورٹی گارڈز کی وردیوں میں ہیں۔ تمہارے بہنوئی اور سالوں کی طرح ہم بھی بہروپیے ہیں۔"

وہ فون کو کان سے لگائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ فون پر کہا گیا۔ "دیکھ کر بھی پہچان نہیں پاؤ گے۔ تم ہمارے نشانے پر ہو۔ جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔ حرکت کرو گے یا کسی کو اشارے سے کچھ کہو گے تو مارے جاؤ گے۔"

وہ پولیس انسپکٹر تھا۔ آسانی سے دھمکیوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے چور نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ مہمان دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر کھڑے باتیں کررہے تھے۔ وہ ایک چھلانگ لگا کر مہمانوں کے پیچھے جاسکتا تھا۔

پھر یہ معلوم ہوجاتا کہ واقعی کسی کے نشانے پر ہے یا محض دھمکی دی جارہی ہے۔ یہ یقین تھا کہ چھلانگ لگانے کے دوران گولی کی زد میں نہیں آئے گا۔ پھر اسے چھپ کر مورچا بنانے کا موقع مل جائے گا۔

اس نے یہی کیا۔ اچانک ہی مہمانوں کی طرف چھلانگ لگادی۔ کہیں سے فائرنگ کی آواز سنائی نہیں دی لیکن اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ کمر کے پاس ریڑھ کی ہڈی تڑخ گئی تھی۔ وہ چھلانگ لگاتے ہی اوندھے منہ گر پڑا۔

تمام مہمان گھبرا کر دور ہٹ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انسپکٹر اوندھے منہ کیسے گر گیا؟

اس نے شدید تکلیف کے باوجود فرش پر سے اٹھنے کی کوشش کی، سر اٹھایا۔ اسی لمحے اس کی پیشانی میں سوراخ ہوگیا اور تیزی سے لہو اُبل پڑا۔

تمام مہمان دہشت زدہ ہوکر چیختے چلاتے بھاگنے لگے۔ مردہ انسپکٹر کے پاس کئی سپاہی آگئے۔ باقی سپاہی اور مسلح گارڈز قاتل کو ڈھونڈنے لگے اور مہمانوں کو تسلیاں دینے لگے کہ اب گولی نہیں چلے گی۔ انہیں نقصان نہیں پہنچے گا۔

انسپکٹر کا بہنوئی اور دو سالے مہمانوں کو پتا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا، قاتل ان کے درمیان ہوگا۔ اسی وقت بہنوئی کو کال کی گھنٹی سنائی دی۔ اس نے فون کان سے لگایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ "پہچانا، پیچھے والا انسپکٹر تیرا سالا تھا۔ سالا تو گیا لیکن تماشا ابھی باقی ہے۔"

اس نے غصے سے پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

"تم تینوں کی طرح ہم بھی تین ہیں۔ تم بھی بہروپیے ہم بھی بہروپیے۔ تم بھی وردی میں ہو، ہم بھی وردی میں ہیں۔ ہمیں پہچان سکو تو پہچان لو۔"

وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے سیکیورٹی گارڈز کو دیکھنے لگا۔ سب ہی ایک جیسی وردی میں تھے۔ وہ چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ قاتل تین ہیں اور گارڈز کی وردی میں ہیں۔

لیکن منہ کھول کر کچھ کہہ نہ سکا۔ ایک خاموش گولی کھلے منہ میں گھس کر دوسری طرف سے نکل گئی۔ وہ گر کر تڑپنے لگا۔ اس نے گولی چلانے والے کو دیکھ لیا تھا۔ پہچان لیا تھا لیکن بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

سپاہی اسے اٹھا کر ایمبولینس کی طرف لے جارہے تھے۔ اس نے ایمبولینس میں پہنچ کر اشارے سے کاغذ اور قلم مانگا۔ فوراً ہی دونوں چیزیں مہیا کی گئیں۔ اس نے لکھا۔ "دی لائن آف اللہ بریگیڈ کا کیپٹن سیتانی...!"

وہ آگے نہ لکھ سکا۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ وہ تقریب ہنگامے کی نذر ہوگئی تھی۔ وہاں وہ شکار رہ گئے تھے۔ انہوں نے فون کالز سنیں۔ اُن سے کہا گیا کہ انہوں نے یاقوت کے گھر میں گھس کر اس کی بہن کے ساتھ حیوانیت کا جو مظاہرہ کیا تھا، اس کی سزا انہیں موت کی صورت میں مل رہی ہے۔

ان دونوں پر بھی گولیاں چلائی گئیں۔ ان میں سے ایک وہیں مر گیا۔ دوسرا زخمی ہوکر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ بھی کسی دن، کسی وقت مارا جانے والا تھا۔

انہیں وہاں کی کسی عدالت سے کبھی سزا نہ ملتی مگر یاقوت کی قدر کرنے والوں نے، اس سے کام لینے والوں نے اُن مجرموں کو سزا دی تھی۔ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

☆☆☆

وہ روپوش رہنے کے ایک بہت سخت اور خطرناک مرحلے سے گزر گیا تھا۔ سیکیورٹی افسر اور گارڈز سارہ کے بیڈ روم، باتھ روم اور اسٹور روم میں آکر دیکھ چکے تھے اور آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھوں کی طرح اسے دیکھ نہیں پائے تھے۔ یہ یقین ہوگیا تھا کہ وہ محل کے کسی حصے میں نہیں ہے۔

سارہ نے اپنی خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ اب کوئی وسیم کو دوبارہ ڈھونڈنے کے لیے وہاں نہیں آتا۔ اگر آتا تو وہ پھر آسانی سے اسٹور روم میں جا کر چھپ جاتا۔ وہ دونوں محتاط تھے۔ بیڈ روم میں رہ کر باتیں نہیں کرتے تھے۔ اشاروں کی زبان میں بولنے اور سمجھنے کی کوششیں کرتے تھے۔ جب دشواری ہوتی تو باتھ روم میں آکر بہت دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے مدعا بیان کردیتے۔

وسیم نے کہا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے، میں آج رات ہی کسی طرح یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔"

"اگر نہ نکل پائے تو یہاں رہنا ہوگا۔ دل سے خوف نکال دو۔ خدا کا شکر ادا کرو۔"

"بے شک! خدا نے مجھے تمہارے باپ کے شرمناک ظلم سے بچایا ہے۔"

لفظ شرمناک پر سارہ کی گردن جھک گئی۔ اس نے لمحاتی تصور میں یہ جھلک دیکھ لی کہ باپ کیسی بدکاری کا مرتکب ہونے والا تھا اور وہ وسیم کی معصومیت اور شرافت دیکھ رہی تھی۔ اس نے اب تک اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا جبکہ وہ صرف حسین اور جوان ہی نہیں تھی، بلا کی پُرکشش بھی تھی۔

وہ اسے شرمندہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہاں صبر اور حوصلے سے رہو۔ جب یہ اطمینان ہے کہ پکڑے نہیں جاؤ گے تو پھر بھاگنا کیوں چاہتے ہو؟"

www.pkdigest.com

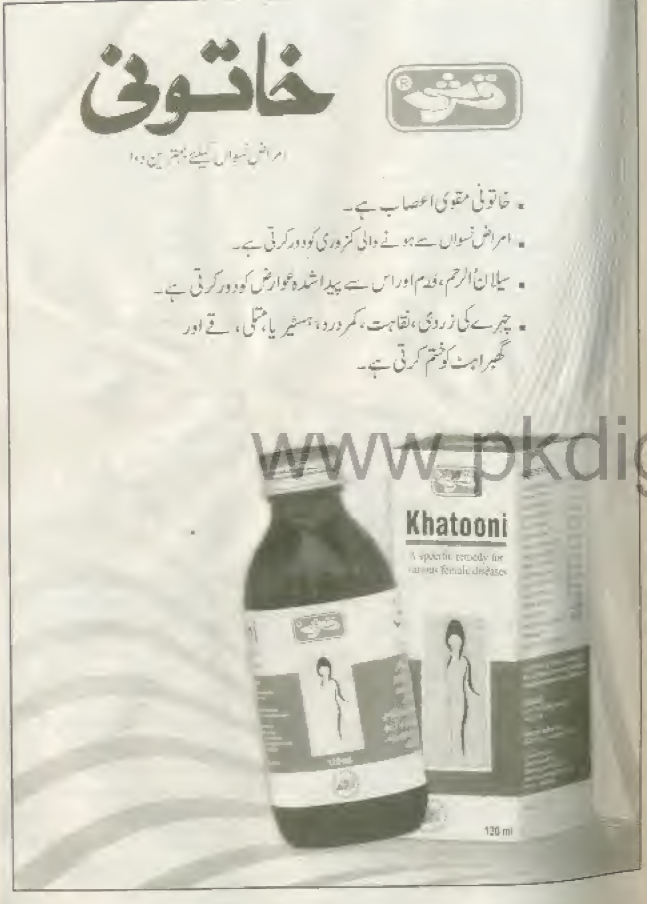

"میں یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتا؟"
"اس وقت تک رہ سکتے ہو جب تک آسانی سے فرار ہونے کا موقع نہ ملے۔"
"ہاں۔ تب تک صبر کرنا چاہیے۔ مگر سسٹرز بہت یاد آرہی ہیں۔ جی کرتا ہے ابھی اڑ کر چلا جاؤں۔"
"تم کہہ رہے تھے وہ تمہاری بہن نہیں ہے؟"
"ہاں۔ وہ بہن نہیں ہیں مگر میری سب کچھ ہیں۔"
"سب کچھ کا مطلب کیا ہوا؟"
وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں ٹھیک طرح کہہ نہیں سکتا۔ پہلے اُن کے قریب رہتا تھا تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب اُن کو چھونے، اُن سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔"
"اچھا... تو تم ان سے لپٹ جاتے ہو؟"
"ایک بار ایسا ہوا تھا۔ میں لپٹ گیا مگر انہوں نے ہٹا دیا۔ مجھ سے الگ ہو گئیں۔"
پھر وہ ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ اُن سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔"
سارہ نے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔ "تمہیں کوئی دوسری لڑکی سسٹر جیسی نہیں لگتی؟"
"ان کے سامنے کوئی نہیں جچتی۔"
"اب تو وہ سامنے نہیں ہیں۔ ایسے میں کوئی جچتی ہے؟"
"پتا نہیں۔ کسی کو دیکھوں گا تو سمجھوں گا۔ ان کی غیر موجودگی میں میرا ابھی کسی لڑکی سے سامنا نہیں ہوا..."
وہ کہتے کہتے ٹھٹک گیا۔ سارہ کو ایسے چونک کر دیکھنے لگا جیسے پہلی بار اس کی موجودگی کو سمجھ رہا ہو۔ وہ کسی قدر حیرانی سے بولا۔ "ہاں، تم تو لڑکی ہو۔"
وہ گھور کر بولی۔ "کیا مطلب ہے؟ اب تک تم کیا سمجھ رہے تھے؟"
وہ اسے دیکھ رہا تھا اور الجھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "تم اتنی دیر سے میرے ساتھ ہو۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ کوئی لڑکی ہے۔ بس یہی دیکھ رہا تھا کہ تم ہو۔ چاہے کوئی بھی ہو، میری ایک ہمدرد اور مددگار ہو۔"
"تم دیوانے ہو۔ تمہارے دماغ میں سسٹر گھسی ہوئی ہے۔ اسی کو سوچتے رہتے ہو۔ کوئی دوسری تمہیں دکھائی ہی نہیں دیتی۔"
"تم درست کہہ رہی ہو۔ یہی بات ہے۔"
"اب میں تمہیں دکھائی دے رہی ہوں یا نہیں؟"
وہ سر ہلا کر بولا۔ "ہاں۔ اب سمجھ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔"
"دیکھ رہے ہو تو کچھ بولو... کیسی لگ رہی ہوں؟"
"بہت اچھی لگ رہی ہو۔"
"صرف اچھی...؟ آگے بولو۔"
"کیا بولوں...؟"
"تم نے سسٹر کو کبھی تو کہا ہوگا کہ وہ بہت حسین ہے؟"
"میں نے کبھی نہیں کہا۔ جب وہ حسین ہیں تو کہنے کی ضرورت کیا ہے؟ انہیں معلوم ہوگا۔ وہ آئینہ دیکھتی ہوں گی۔"
سارہ نے سمجھ لیا کہ وہ عاشقانہ اور شاعرانہ مزاج کا حامل نہیں ہے۔ ایک سیدھا سادہ سا لڑکا ہے۔ وہ اس کے قریب آئی۔ دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر بولی۔ "اب میری سمجھ میں آرہا ہے۔ تمہاری سادگی اور شرافت متاثر کر رہی ہے۔ میں تمہارے کام آرہی ہوں، کیا تم مجھ سے متاثر ہو رہے ہو؟"
"ہاں۔ تم بہت اچھی ہو۔ کبھی میری ضرورت پڑے گی تو میں بھی تمہارے کام آؤں گا۔"
"تم کیسے سمجھو گے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے؟"
"تم بولو گی تو سمجھ لوں گا۔"
وہ اس کے اور قریب ہو گئی۔ چاہتی تھی کہ زبان سے کچھ نہ کہے اور وہ سمجھ لے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اچانک ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ دونوں نے گھبرا کر خواب گاہ کی طرف دیکھا۔ وہ باتھ روم میں تھے۔ وکرم فوراً ہی روم کا دروازہ کھول کر اسٹور میں چلا گیا۔
وہ تیزی سے چلتی ہوئی باتھ روم سے نکل کر خواب گاہ میں آئی پھر دروازے کے پاس آکر اسے کھولا۔ سامنے ماں کھڑی تھی۔ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔ "دروازہ بند کیوں تھا؟"
"یونہی۔ کیا آپ اعتراض کرنے آئی ہیں؟"
"اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ پہلے کبھی بند نہیں کرتی تھیں۔"
"آپ نہیں جانتیں۔ کبھی کوئی خاص موقع ہو تو اندر سے بند کر لیتی ہوں۔"
بیگم داؤد نے چونک کر پوچھا۔ "خاص موقع...؟"
"جی ہاں۔ آپ بھی ایسے موقع پر اپنا دروازہ اندر سے بند کر لیتی ہیں۔"
"کیا بک رہی ہو؟ کس خاص موقع کی بات کر رہی ہو؟"
"جب آپ خاص قسم کی فلمیں دیکھتی ہیں۔ میں سب جانتی ہوں۔ نادان بچی نہیں ہوں۔"
وہ جھکتے ہوئے انداز میں بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا کریں؟ ایسا لگتا ہے اس تاج محل جیسے محل میں ہمیں زندہ دفن کر دیا گیا ہے۔ تم بھی یہی کر رہی ہو۔"

www.pkdigest.com

اس نے ماں کو ہمدردی سے دیکھا۔ وہ سمجھتی تھی، یہ دیکھتی تھی کہ باپ جب وہاں آتا تھا تو حرم سرا میں راتیں گزارتا تھا۔

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”مام! آئی لو یو۔“

وہ بیٹی کی ٹھوڑی کو چھو کر بولی۔ ”آئی لو یو ٹو... وہ لڑکا بہت یاد آ رہا ہے۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کس کی بات کر رہی ہیں؟“

”وہی جو وسیمہ بن کر آیا تھا۔“

اس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ”وہ لڑکا نہیں، لڑکی تھی۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”نہیں۔ وہ لڑکا تھا۔“

اس نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ایسی بات ہے تو پھر لڑکی بن کر کیوں آیا تھا؟“

بیگم داؤد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ابھی اس بات کی گہرائی میں نہ جاؤ۔ رفتہ رفتہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کیا کریں؟ وقت اور حالات کبھی کسی راز کو راز نہیں رہنے دیتے۔ یہ بھید آخر تم پر کھلنا ہی ہے۔“

وہ اپنی ماں کی ڈھکی چھپی باتوں کو واضح طور پر سمجھ رہی تھی۔ اگر باپ کا وہ شرمناک روپ اس پر ظاہر نہ ہوتا تو یقیناً اُسے کریدتی۔ ضد کرتی کہ اسے سمجھائے، وہ کس بھید کی بات کر رہی ہے؟ ایک لڑکا وہاں لڑکی بن کر کیوں آیا تھا؟ مگر اس نے کچھ نہ پوچھا۔ کوئی سوال نہ کیا۔ نہ جانے کیوں اس بات کے ذکر سے ہی کراہت محسوس ہو رہی تھی۔

بیگم داؤد نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں تعجب نہیں ہو رہا ہے کہ وہ اچانک کیسے یہاں سے فرار ہو گیا؟ اسے سیکیورٹی گارڈز بھی نہ دیکھ سکے۔“

”میں نے سوچا تھا، پھر یہی بات سمجھ میں آئی کہ اس نے کسی گارڈ کی غفلت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بہرحال، وہ بھاگنا چاہتی... میرا مطلب ہے بھاگنا چاہتا تھا، بھاگ گیا۔“

”مگر کیسے بھاگ گیا؟ تمہیں اس کا لباس ملا تھا۔ کیا وہ یہاں سے بے لباس گیا ہے؟“

سارہ کو ہنسی آ گئی۔ وہ بولی۔ ”تم ہنس رہی ہو؟ ذرا سوچو! وہ گارڈز کی نظروں میں نہیں آیا لیکن جہاں سے بھی گزرا ہوگا، تماشا نہیں بنا ہوگا؟“

”ہو سکتا ہے، اس نے نیکر پہن رکھی ہو۔“

وہ بڑی حسرت سے بولی۔ ”نہ جاتا تو اچھا ہوتا۔ تم نے اسے لڑکے کے اصل روپ میں نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا تھا۔ وہ تو سیدھا دل میں اتر گیا۔“

سارہ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ وہ اپنے اس بازو کو سہلا رہی تھی جو ذرا سی دیر کے لیے وسیم کی گرفت میں آیا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ”مجھے معلوم ہوتا کہ وہ بھاگنے والا ہے تو میں اسے جانے نہ دیتی۔“

بیٹی نے اسٹور کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں بند تھا..... وہ اپنے اندر کی بات کھل کر نہیں کہہ رہی تھی مگر سارہ سمجھ رہی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ جو دولت مند عیاش کنیزیں پالتے ہیں یا گھر سے باہر داشتہ رکھتے ہیں... بیوی کو گھر کی مرغی سمجھ کر دانہ نہیں ڈالتے، وہ مرغی دانہ چگنے کے لیے دوسری جگہ منہ مارتی ہے۔

وہ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کے ساتھ چلتی ہوئی دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”گارڈز نے یہاں پورے علاقے میں اس کے متعلق پوچھ گچھ کی ہے۔ سب نے یہی کہا ہے کہ انہوں نے کسی خوبرو لڑکے کو نہیں دیکھا۔“

وہ دروازے کے قریب آ کر بولی۔ ”تماشا عجیب ہوا اور وہ کسی کو نظر نہ آئے... یہ ہو نہیں سکتا۔ میں یقین سے کہتی ہوں، وہ فرار نہیں ہوا ہے۔“

سارہ پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”آپ جذباتی طور پر کچھ زیادہ ہی اس لڑکے سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ وہ فرار نہیں ہوا ہے تو پھر کہاں غائب ہو گیا ہے؟“

”یقیناً اسی محل میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ میں ایک ایک کمرے میں جاؤں گی۔ ایک ایک کونے میں اسے تلاش کروں گی۔ میرا دل کہتا ہے وہ یہیں... یہیں کہیں ہے۔“

وہ بولتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ سارہ اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک پریشان ہو کر دیکھتی رہی۔ پریشانی یہ نہیں تھی کہ وہ وسیم کو ڈھونڈ نکالے گی بلکہ یہ تھی کہ ماں بھی اسی ایک انار کی بیمار تھی۔ عشق ایسا سچا تھا کہ اسے معشوق کی موجودگی کا یقین دلا رہا تھا۔ جذبۂ عشق نے اُسے تلاشِ یار میں لگا دیا تھا۔

سارہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔ اس ایک انار کے دو نہیں، تین بیمار تھے۔ اس کا باپ بھی اسے اپنے مقصد کے لیے لایا تھا۔ یہ عجیب سی شرمناک بات تھی۔ ماں، باپ اور بیٹی سب ہی اس کے طلب گار تھے۔

اُس نے باتھ روم میں آ کر دروازے پر دستک دی۔

”باہر آ جاؤ۔“

وہ باہر آ گیا۔ سارہ نے اسے دیکھا تو پہلے سے زیادہ اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ وہ خاموش کھڑا رہا پھر بولا۔ ”تم کب تک مجھے دیکھتی رہو گی؟“

وہ محویت سے چونک کر بولی۔ ”مام کو شبہ ہے کہ تم اسی محل میں چھپے ہوئے ہو۔ وہ تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا وہ اسٹور میں آ سکتی ہیں؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”یہاں پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ تم اتنے وزنی سامان کے پیچھے چھپے ہو۔ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ ہم بیڈ روم میں بھولے سے بھی باتیں نہیں کریں گے۔“

وہ بولا۔ ”میں محتاط رہوں گا۔ اب تو کافی وقت گزر چکا ہے؟ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کیا آٹھ بج چکے ہیں؟“

”نو بج رہے ہیں۔ میں ابھی کھانا لاتی ہوں۔ تم اسٹور روم میں جاؤ۔“

وہ چلا گیا۔ سارہ خواب گاہ سے باہر آئی۔ پھر وہاں سے کچن میں جا کر کھانا گرم کرنے لگی۔ ایسے وقت بیگم داؤد محل کے دوسرے حصے سے بھٹکتی ہوئی سارہ سے پھر ملنے آئی۔ اس نے بیٹی کو آواز دیتے ہوئے دروازے کو کھولا تو وہ کھل گیا۔ بالکل ایسے جیسے راز کھلتا ہے۔

اس نے اندر آ کر ہولے سے آواز دی۔ ”کہاں ہو تم؟“

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ وہاں دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے دروازے پر آ کر پوچھا۔ ”کیا واش روم میں ہو؟“

اس کی آواز باتھ روم کے اندر گونجتی ہوئی وسیم تک پہنچی۔ الفاظ واضح نہیں تھے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ صرف اسے سارہ کی آواز سنائی دی۔ یہی سمجھ میں آیا کہ سارہ اسے باہر آنے کو کہہ رہی ہے۔

اس نے کنڈی پر ہاتھ رکھا۔ اسے نیچے کر کے دروازہ کھول کر نکلنا چاہتا تھا... اچانک یاد آیا کہ اس نے پہلے بھی بیگم داؤد کی آواز سن کر دھوکا کھایا تھا اور دروازہ کھول دیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی کی آواز اور لہجہ ملتا جلتا ہے۔ اسے اور ایک بار اچھی طرح سننا چاہیے۔

بیگم داؤد باتھ روم میں جھانکنے کے بعد وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ”کہاں ہو؟ آ بھی جاؤ۔“

اس نے صاف طور پر سنا۔ سارہ باہر آنے کو کہہ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باتھ روم میں آ گیا۔ وہاں سارہ نہیں تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا ادھ کھلے دروازے پر آیا پھر ایک دم سے گھبرا گیا۔ وہاں بیٹی نہیں تھی، ماں تھی۔

خیریت یہ ہوئی کہ سامنا نہیں ہوا۔ بیگم داؤد کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بیٹی کو نہ پا کر واپس جا رہی تھی۔ وسیم فوراً ہی پلٹ کر اسٹور روم کی طرف جانے لگا۔ بدحواسی میں پچھلی بار فلاور اسٹینڈ سے ٹکرا گیا تھا۔ اس وقت تیزی سے چلنے کے باعث چکنے ٹائلز پر پھسل گیا۔

بیگم داؤد دروازے سے باہر جاتے جاتے رک گئی۔ ہلکی سی دھپ کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر باتھ روم کی طرف تعجب سے دیکھا۔ وہاں سے واپس چلتی ہوئی دروازے پر آئی۔ اسے پوری طرح کھول کر دیکھنے لگی۔ باتھ روم پہلے کی طرح خالی تھا۔

وہ بیگم داؤد کے پلٹ کر آنے سے پہلے ہی اٹھ کر دوڑتا ہوا اسٹور روم میں آ کر بند ہو گیا۔ وہ حیرانی سے سوچ رہی تھی، کیا آواز باتھ روم سے آئی تھی؟ اس نے اندر آ کر اسٹور روم کے دروازے کو ذرا دھکا مار کر دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دوسری طرف سے بند تھا۔

وہ جانتی تھی، اسٹور روم میں بھاری بھرکم سامان ہے۔ کوئی انہیں ہٹا کر دوسرے بند دروازے کی طرف آ نہیں سکتا۔ وہ واپس جاتے ہوئے سوچنے لگی۔ ’کوئی آواز نہیں تھی... وہم تھا۔‘

وہ باتھ روم کے دروازے سے نکلی تو ادھر سے سارہ ایک ٹرالی میں کھانا لے کر آئی۔ ماں کو باتھ روم سے نکلتے دیکھ کر وہ چیخ پڑی۔ ”آپ میرے کمرے میں... یہاں باتھ روم میں کیا کر رہی ہیں؟ کیا میں نے اس لڑکے کو یہاں چھپا رکھا ہے؟ آپ مجھ پر شبہ کیوں کر رہی ہیں؟“

”سارہ! یہ بات نہیں ہے۔ میں تو تم سے ایک بات کہنے آئی تھی۔“

”کوئی بات کہنے نہیں، جاسوسی کرنے آئی تھیں۔ آپ کے دماغ میں خناس بھرا ہے۔ وہ لڑکا آپ کے دماغ میں گھس گیا ہے۔ آپ اس کے لیے پاگل ہو رہی ہیں۔“

”ہاں پاگل ہو رہی ہوں۔ وہ اسی محل میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ ابھی یہ کہنے آئی تھی کہ تمہارے کزن کی اٹیچی سے اس کے کپڑے غائب ہیں۔“

وہ کپڑے سارہ لے آئی تھی۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ”غائب ہیں تو میں کیا کروں؟“

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ اس نے کپڑے پہن لیے ہیں۔“

”تو میں کیا کروں؟ آپ جا کر اُتار دیں مگر یہاں سے جائیں۔ آئندہ میری اجازت کے بغیر کمرے میں قدم نہیں رکھیے گا۔ اب میں باہر جاؤں گی تو ہمیشہ دروازے کو بند رکھوں گی۔“

بیگم داؤد غصے سے بولی۔ ”جا رہی ہوں۔ مجھے تمہارے کمرے میں آنے کا شوق نہیں ہے۔ توبہ ہے۔ ایسے چیخ رہی ہو جیسے تمہاری دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔ کسی چور کی داڑھی میں تنکا ہوگا تو وہ بھی ایسے نہیں چیخے گا۔“

وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ ”اب تو یقین ہو گیا ہے

کہ وہ یہاں ہے۔ آج اس نے کپڑے چرائے ہیں۔ کل تک بھوکا پیاسا رہے گا تو کھانا چرانے کچن میں ضرور آئے گا۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ بیٹی کو باتیں سنانے کی دھن میں ٹرالی کی طرف دھیان نہیں دیا کہ وہ کھانا ایک آدمی کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ سارہ نے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر تیزی سے باتھ روم میں آکر دروازے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "باہر آؤ۔"

وہ باتھ روم میں آیا۔ سارہ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے ماما یہاں باتھ روم میں آئی تھیں؟"

"ہاں۔ جانتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا' کہاں ہو؟ آ بھی جاؤ... اور میں دروازہ کھول کر نکل آیا تھا۔"

وہ ایک دم سے گھبرا کر چیخ پڑی۔ "کیا...؟"

"مگر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ باہر جا رہی تھیں۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "تم نے دروازہ کیوں کھولا؟"

"میں کیا کروں؟ ان کی اور تمہاری آوازیں بہت ملتی ہیں۔"

سارہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ "کیا مصیبت ہے؟"

وسیم بتا رہا تھا کہ وہ باتھ روم میں پھسل گیا تھا۔ وہ شاید پلٹ کر آئی تھیں۔ اسٹور روم کے دروازے کو دھکا مار کر کھولنا چاہا تھا لیکن وہ دم سادھے کھڑا رہا تھا۔ منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "ماما پرابلم بن رہی ہیں۔ تم بھی ذرا سی بات پر بوکھلا جاتے ہو۔ سنبھل کر چلنا بھول گئے ہو اسی لیے پھسل گئے۔"

"اسی لیے کہتا ہوں' مجھے یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیے۔"

"تم ابھی یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔ محل کے اندر اور باہر خفیہ کیمرے لگے ہیں۔ سیکیورٹی گارڈز ایک کمرے میں بیٹھے مختلف ٹی وی اسکرین پر دیکھتے رہتے ہیں۔"

"پھر تو وہ ہمیں دیکھ رہے ہوں گے۔"

"نہیں۔ میرے اور ماما کے کمروں میں خفیہ کیمرے نہیں ہیں۔"

"تم نے کہا تھا' میں رات کو یہاں سے نکل سکوں گا؟"

"ہاں۔ کبھی کبھی دھماکے ہوتے ہیں۔ بجلی منقطع ہو جاتی ہے' تب نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے چھت پر جا کر جائزہ لینا ہوگا کہ گارڈز کہاں کہاں پہرا دے رہے ہیں اور ایسی کون سی جگہ ہے' جہاں کوئی پہرے دار نہیں ہے۔ اسی راستے سے بھاگنے کا موقع ملے گا۔"

"جب بجلی جائے گی' تاریکی چھا جائے گی تو یہ کیسے نظر آئے گا کہ گارڈز کہاں ہیں اور کہاں نہیں ہیں؟"

"ہاں۔ نظر نہیں آئے گا۔ بڑی دشواریاں ہیں۔ اسی لیے کہتی ہوں' جلدی نہ کرو۔ کبھی نہ کبھی دن کو یہاں سے نکلنے کا موقع مل سکے گا۔"

وہ دونوں خواب گاہ میں آ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ کوئی ضروری بات کہنے کے لیے نہیں تھی اس لیے چپ چاپ کھاتے رہے اور اپنے اپنے طور پر سوچتے رہے۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ وہاں سونے کے لیے ایک بیڈ تھا۔ وہ اتنا وسیع تھا کہ چار افراد آسانی سے سو سکتے تھے۔ وسیم نے اشارے سے کہا۔ "میں قالین پر سو جاؤں گا۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر ہاتھ کے اشارے سے بولی۔ "تم بیڈ کے اس سرے پر سو سکتے ہو۔ میں اس کنارے پر سو جاؤں گی۔"

وہ بیڈ کے ایک کونے پر لیٹ گیا۔ اسے یاقوت یاد آ رہی تھی۔ وہ تو قریب آ کر لیٹ جاتی تھی مگر فاصلہ بھی رکھتی تھی۔ سارہ نے ہلکی سبز روشنی آن کی۔ باقی تمام لائٹس بجھا دیں۔ اب وہ زیرو پاور کی مدھم روشنی میں سائے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے اسکارف اور کوٹ اتار دیا۔ وہ کم سے کم لباس میں ہلکی پھلکی ہو کر سونے کی عادی تھی۔ وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر آ گئی۔ اسے لیٹنا چاہیے تھا لیکن وہ دوزانو ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے پھر ایک بھرپور انگڑائی لی۔

www.pkdigest.com

وسیم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ انگڑائی کی اٹھان قیامت کو پکار رہی تھی۔ کمر خمیدہ ہو گئی۔ دونوں بازو حلقہ بنا کر کہہ رہے تھے' پھندا تیار ہے۔

نیم تاریکی اور مدھم سی روشنی میں بدن کے تمام خطوط الگ الگ نمایاں ہو گئے تھے۔

وہ لیٹا ہوا تھا' اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سارہ کی صورت واضح نہیں تھی۔ وہ کوئی بھی ہو سکتی تھی... اور وہ یاقوت ہی لگ رہی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا؟ شاید انگڑائی لینے والی زیادہ خم کھا گئی تھی۔ دھپ سے اس کے قریب بستر پر گر پڑی۔ ایسا ہی لگا جیسے چکرا کر چاروں شانے چت ہو گئی ہے۔

کیا گرنے کا انداز تھا؟ وہ گم صم سا اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے گری تھی اسی حالت میں پڑی رہ گئی تھی۔ ایسے ساکت تھی جیسے پہلو میں آ کر ختم ہو گئی ہو۔

وہ جھک کر اسے آواز دینا چاہتا تھا۔ "اے! کیا ہوا؟ ٹھیک تو ہو؟ اٹھتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ بول نہ سکا۔ خواب گاہ میں بولنے کی ممانعت تھی۔ آواز باہر جا سکتی تھی۔ وہ ذرا اور قریب ہو کر کان کے قریب منہ لے جا کر بہت ہی دھیمی سرگوشی میں بولا۔ "اے! کیا ہوا ہے تمہیں؟ کچھ اشارے سے بتاؤ۔"

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا' اس کے اندر سے جان نکل گئی ہے۔ اب کبھی نہیں اٹھے گی۔

ایسے ہی وقت اتفاق سے بجلی چلی گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ مضطرب ہو کر سوچنے لگا۔ 'وہ دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کیسے معلوم کروں' کس حال میں ہے؟ میں خود کو دیکھ نہیں پا رہا ہوں... مگر میں ہوں اور وہ کہاں ہے؟'

اس نے خود کو سمجھایا' نہیں۔ وہ نابود نہیں ہوئی ہے۔ وہیں اس کے پاس ہے۔ ابھی چھونے سے معلوم ہو جائے گا کہ ہے یا نہیں ہے؟

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اندھے کا ہاتھ کہیں بھی پہنچ جاتا ہے۔ جہاں پہنچا' وہاں دھک دھک ہو رہی تھی۔ وہ دھک دھک پوچھ رہی تھی۔ "آ گئے...؟"

اس کا ہاتھ وہیں تھم گیا۔ اسے یاد آیا' جدائی کی رات اس نے بستر کی دھڑکنوں پر سر رکھا تھا اور وہ بستر ہی لگ رہی تھی۔ دھڑکنوں کا کوئی نام' کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ بس ایک کشش ہوتی ہے۔ تاریکی میں صورتیں نظر نہیں آتیں۔ صرف جذبے ہی ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔

اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے کب وہاں سر رکھ دیا تھا؟ عجیب سا سحر طاری تھا۔ اس کا ہاتھ جہاں جہاں جا رہا تھا وہاں وہاں اس کی آئیڈیل سلگ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "ہاں۔ یہ میں ہی ہوں۔"

باہر اس علاقے میں کہیں بم بلاسٹ ہوا تھا۔ دھماکے سے در و دیوار لرز گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے تڑخ گئے تھے۔ بیگم داؤد دھماکے کے باعث لرز گئی تھی۔ اٹھ کر ٹہل رہی تھی۔ اسے وسیم کی فکر تھی کہ وہ تاریکی میں دھماکے سے سہم گیا ہوگا۔ گھبرا کر جائے پناہ سے نکل آیا ہوگا۔ ایسے وقت آسانی سے ہاتھ آ جائے گا۔

وہ ایمرجنسی لائٹ اٹھا کر کمرے سے باہر آ گئی۔ رات کا ایک بجا تھا۔ یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ بے چارہ بھوکا ہوگا۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لائے گی۔ بھوک مٹائے گی۔ اسے پھر کبھی کمرے سے نکلنے نہیں دے گی۔

وہ محل اس قدر وسیع و عریض تھا کہ وہ ایک دن میں وہاں کے ایک ایک گوشے کی تلاشی نہیں لے سکتی تھی۔ وہ دن کے وقت کئی کمروں اور اسٹور روم میں گئی تھی مگر مطمئن نہیں تھی۔ اس وقت بجلی نہیں تھی۔ اگر وسیم کو ڈھونڈ نکالتی تو گارڈز اسے دیکھ نہ پاتے۔ وہ دعائیں مانگ رہی تھی کہ وہ تاریکی میں مل جائے اور رازداری سے من کی مرادیں پوری ہو جائیں۔

وہ بیٹی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے وقت رک گئی۔ ایمرجنسی لائٹ بجھا دی۔ جب بجلی جاتی تھی' سارہ فوراً ہی اپنے کمرے کی لائٹ آن کر لیتی تھی۔ اگر وہ لائٹ اس وقت آن ہوتی تو بند دروازے کے نچلے حصے سے روشنی ضرور جھلکتی جبکہ نہیں جھلک رہی تھی۔

وہ حیران تھی۔ بیٹی کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی؟ اسے اندھیرے میں ڈر نہیں لگ رہا تھا؟ ماں کا تجربہ کہہ رہا تھا۔ ڈرپوک لڑکیوں کو بس ایک ہی مرحلے میں تاریکی سے ڈر نہیں لگتا۔ سارہ کو ڈر کیوں نہیں لگ رہا ہے؟

وہ بند دروازہ اور اس کے پیچھے گھپ اندھیرا سوالیہ نشان بن گئے تھے۔

وہ دبے قدموں چلتی ہوئی دروازے سے آ کر لگ گئی۔ اسی وقت اس کی انگوٹھی دروازے سے ٹکرا گئی۔ ہلکی سی کھٹ کی آواز ابھر کر معدوم ہو گئی۔ وہ کان لگا کر سننے لگی۔ اندر پُراسرار خاموشی تھی۔ اسے یہ ماننا پڑا کہ بیٹی سو رہی ہے۔ سونے کے دوران بجلی گئی ہے اس لیے نہ اس نے تاریکی دیکھی ہے' نہ خوف زدہ ہوئی ہے۔

وہ ایمرجنسی لائٹ آن کر کے اپنے یار دلدار کو تیزی سے تلاش کرنے آگے بڑھ گئی۔

سارہ اور وسیم نے دروازے پر ہلکی سی کھٹ کی آواز سنی تھی۔ پھر دونوں نے دم سادھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دروازے کے نچلے حصے سے ایمرجنسی لائٹ کی جھلک دیکھی۔ وہ روشنی دور ہوتی ہوئی معدوم ہو گئی۔ یہ یقین ہو گیا کہ وہ جا چکی ہے۔

خطرہ ٹل گیا تھا۔ وہ دونوں پھر آزاد ہو گئے۔ سارہ کروٹ لے کر اس سے چپک گئی۔ اتنی دیر میں وہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ آگے بھی پیار کے جذباتی مراحل سے گزرنا تھا لیکن وسیم پیچھے ہٹ گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

سارہ نے حیرانی سے سوچا۔ 'یہ کیوں الگ ہو گیا ہے؟'

وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا۔ پھر وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وسیم نے کان میں سرگوشی کی۔ "باتھ روم میں چلو۔"

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بیڈ سے اتر گئے۔ موبائل فون کی مدھم سی روشنی میں چلتے ہوئے باتھ روم میں آئے۔ سارہ نے دروازے کو بند کر دیا۔ پھر اس سے لگ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"
"میں... میں الجھن میں ہوں۔"
"کیا میں تمہاری سسٹر جیسی نہیں ہوں؟ اس کے پاس جانا چاہتے ہو؟"
اس نے فوراً ہی اسے بازوؤں میں سمیٹ کر کہا۔ "تمہیں پاکر یہ عقل آگئی ہے کہ میں سائے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سسٹر کسی مجاہد حارث کو چاہتی ہیں۔ میں ایک بچے کی طرح زبردستی ان کی توجہ چاہتا تھا۔"
وہ خوش ہو کر بولی۔ "تم بہت اچھے ہو۔ اب دانائی سے سوچ رہے ہو۔"
"میں نہیں جانتا تھا عورت کیا ہوتی ہے؟ پہلے سسٹر کو چھو کر سمجھا، اب تمہیں پاکر سمجھ رہا ہوں۔ تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔"
وہ گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "اور بولو..."
"میں یہاں سے جاؤں گا تو تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"
"میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے۔"
"کیسے رہوں گا؟ یہاں کب تک چھپا رہوں گا؟"
"جب تک حالات سازگار نہیں ہوں گے، تمہیں یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ جب بھی موقع ملے گا، میں تمہیں نکال لوں گی۔"
"میں جہاں بھی جاؤں گا، تمہارے لیے تڑپتا رہوں گا۔ کیا تم مجھے بھول جاؤ گی؟"
"مرتے دم تک نہیں بھولوں گی نہ تمہیں چھوڑوں گی۔ میرے دو فون نمبرز تمہارے پاس رہیں گے۔ تم سے بچھڑتے ہی میں لندن جاؤں گی۔ وہاں تمہیں بلاؤں گی۔ تم جب تک یہاں رہو گے، ہم اس سلسلے میں پلاننگ کریں گے۔"
"میں یہاں سے جانے کی جلدی نہیں کروں گا لیکن ایک اہم بات ہے۔"
"وہ کیا؟"
اس نے کہا۔ "خدا نے مجھے گناہوں کی دلدل میں جانے سے بچالیا ہے۔ میں آئندہ بھی گناہوں سے دامن بچاتا رہوں گا۔ تمہارے ساتھ بھی ناجائز تعلق نہیں رکھوں گا۔"
اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اسے پالینے کے لیے اس کے وجود میں اور زیادہ جذب ہونے لگی۔ پھر وہ بولی۔ "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہم ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی کمرے میں ایک دوسرے کے بغیر کیسے رہیں گے؟"
"ہاں۔ میں نہیں رہ سکوں گا۔ تمہیں ہمیشہ آغوش میں بھر کر رکھنا چاہتا ہوں مگر گناہ نہیں کروں گا۔"
"میں تمہاری منکوحہ بن سکتی ہوں۔ کیا ہم قاضی اور گواہوں کے بغیر ایک دوسرے کے نکاح میں نہیں آسکتے؟"
"میں نہیں جانتا۔"
"میں جانتی ہوں۔ دل میں خوفِ خدا ہو اور دو چاہنے والے پورے ایمان سے ایک دوسرے کو قبول کریں، آئندہ ایک دوسرے کو فریب نہ دیں۔ خدا کو حاضر جان کر قبول کیے ہوئے رشتے کو نہ توڑیں تو وہ ایک دوسرے کے لیے محرم ہو سکتے ہیں۔"
"میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔ ہم ابھی غسل کریں گے۔ پاک وصاف ہو کر کلمہ پڑھیں گے اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر ایک دوسرے کو ساری زندگی کے لیے قبول کرلیں گے۔"
انہوں نے فوراً ہی غسل کی تیاری کی۔ سارہ نے اپنے کزن کے لائے ہوئے کپڑوں میں سے دوسرا جوڑا نکال کر اسے دیا۔ انہوں نے ایمرجنسی لائٹ آن کر دی تھی۔ پہلے وسیم نے غسل کیا پھر سارہ غسل کرنے کے بعد ایک لباس پہن کر کمرے میں آگئی۔
ایسے وقت بیگم داؤد اپنے جذباتی مسیحا کو تلاش کرنے کے بعد مایوس ہو کر ادھر آئی تو بند دروازے کے نچلے حصے سے روشنی کی جھلک دیکھ کر رک گئی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے وہاں گھپ تاریکی تھی۔ اس نے سوچا۔ اس وقت سارہ سو رہی تھی۔ تاریکی سے خوف زدہ تھی۔ اب جاگ رہی ہے تب ہی اندر روشنی ہے۔
اسی وقت بجلی آگئی۔ سارا محل چکا چوند ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ سارہ اور وسیم نے چونک کر دروازے کو دیکھا۔ وہ اسٹور روم کی طرف جانا چاہتا تھا۔ سارہ نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اشارے سے کہا۔ "رک جاؤ۔"
وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے تھے۔ بہت خوش تھے۔ اسی وقت کباب میں ہڈی بن کر آگئی بیگم داؤد نے دوسری بار دستک دیتے ہوئے کہا۔ "سارہ! میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔"
وہ جھنجلا کر بولی۔ "واٹ نان سنس... کیوں اتنی رات کو آئی ہیں؟ کیوں میری نیند خراب کر رہی ہیں؟"
"تم جاگ رہی ہو۔ میں نے تمہیں نہیں جگایا۔"
"یا خدا! آپ کیوں آئی ہیں؟"
"ایک بات کرنی ہے پھر چلی جاؤں گی۔"
"تو کریں۔ میں سن رہی ہوں۔"
"دروازہ تو کھولو۔ کیا پردے میں رہ کر سنو گی؟"
اس نے وسیم کو جانے کا اشارہ کیا پھر کہا۔ "ذرا ٹائم دیکھیں۔ یہ باتیں کرنے کا نہیں، سونے کا وقت ہے۔ آپ جائیں۔ صبح بات ہوگی۔"
"ابھی نہیں کہوں گی تو پیٹ میں درد ہوگا۔ میری بیٹی! میری جان! دروازہ کھولو۔"
اس نے جھنجلا کر سوچا۔ "یہ بات کیے بغیر پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔"
اس نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اندازہ کیا کہ وہ اسٹور روم میں جاکر چھپ گیا ہے۔ تب وہ دروازہ کھول کر غصے سے بولی۔ "آپ کیوں پریشان کر رہی ہیں؟"
اس نے بیٹی کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے اتنی رات کو غسل کیا ہے؟"
وہ اپنی بھیگی زلفوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔ تو کیا ہوا؟ یہ کوئی انوکھی بات ہے؟"
وہ کمرے میں ہر طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔ بستر کی چادر پر اتنی زیادہ شکنیں پڑی تھیں جیسے وہاں خوب دھینگا مشتی ہوئی ہو۔ سارہ نے بھی ادھر دیکھا تو اسے غلطی کا احساس ہوا۔ پہلے بستر کی چادر کو درست کرنا تھا مگر وہ بھول گئی تھی۔
ماں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا تم پورے بیڈ پر ناچتی رہی ہو؟"
وہ جھنجلا کر بولی۔ "ہاں۔ [illegible]"
"تم تو سو رہی تھیں؟"
"ناچتے ناچتے تھک کر سو گئی تھی۔ جتنے بھی سوالات ہیں، جلدی جلدی پوچھیں اور یہاں سے جائیں۔"
وہ جیسے یاد کرتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔ میں یہ کہنے آئی ہوں کہ وہ لڑکا یہاں کے خفیہ کیمروں کے متعلق نہیں جانتا۔ پتا نہیں کہاں چھپا ہے؟ اگر بھوک پیاس سے مجبور ہو کر وہاں سے نکلے گا تو سیکیورٹی گارڈز اسے اپنے مانیٹرز پر دیکھ لیں گے۔ میں بہت فکرمند ہوں۔ بے چارہ پکڑا جائے گا۔"
وہ بیزاری سے بولی۔ "مام! وہ یہاں نہیں ہے۔ آپ کے دماغ میں گھسا ہوا ہے۔ اُسے نکالیں اور جاکر آرام سے سو جائیں۔"
اس نے ماں کو پکڑ کر اس کا رخ دروازے کی طرف کیا۔ وہ کمرے سے باہر آکر بولی۔ "میرا دل کہتا ہے، وہ کہیں چھپا ہوا ہے۔ میں صبح تک اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔"
"مام! خدا کا واسطہ ہے، اُسے بھول جائیں۔"
سارہ نے کمرے میں آکر دروازہ بند کرلیا مگر وہیں کھڑی رہی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ ماں آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے دروازے کے کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ وہ نظر آرہی تھی۔ وہاں سے جاتے جاتے رک گئی۔ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔
بیگم داؤد کو ان لحاف میں بستر کی شکنیں یاد آرہی تھیں پھر بیٹی نے اتنی رات کو غسل کیا تھا۔ ان دونوں باتوں کا تعلق اس کے دماغ میں چبھ رہا تھا۔
پھر یہ یاد آیا کہ وہ اندھیرے سے ڈرتی ہے جبکہ غسل کرنے سے پہلے اس کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا پھر وہ خوف زدہ کیوں نہیں تھی؟
یہ بات تو موٹی سی عقل میں بھی آجاتی ہے کہ کوئی جذبات کا چراغاں کرنے والا ہو تو لڑکی اندھیرے سے ڈرنا بھول جاتی ہے۔
بیگم داؤد سوچتے ہوئے دروازے کی طرف آنے لگی۔ وہ کی ہول سے دکھائی دے رہی تھی۔ قریب آتے آتے ایک طرف ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سارہ کی ہول سے ہٹ کر پھر دستک کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن دوسری طرف خاموشی رہی۔
وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ "کیا مصیبت ہے؟ مام دستک کیوں نہیں دے رہی ہیں۔ شاید دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے اور سمجھنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔"
اس نے فرش کی طرف دیکھا اور جھک کر فرش پر دو زانو ہو گئی۔ اُدھر بیگم داؤد نے سوچا۔ "دروازے کے نچلے حصے سے وہ نظر آسکتی ہے۔ دیکھوں تو کیا کر رہی ہے؟"
وہ بھی جھک کر فرش پر دو زانو ہو گئی۔ اپنے چہرے کو ٹھنڈے فرش سے لگا دیا۔ اُدھر سارہ نے اپنے چہرے کو قالین پر رکھ کر دیکھا تو ماں کی ایک آنکھ دکھائی دی۔
اُدھر سے ماں نے چونک کر دیکھا۔ بیٹی کی ایک آنکھ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دروازے کے نچلے حصے سے ہی چیخ پڑی۔ "مام! آپ کو شرم آنی چاہیے۔ کیا بیٹی کے کمرے میں اس طرح جھانکتے ہیں؟"
وہ بولی۔ "زیادہ نہ بولو۔ میں ماں ہوں۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرو گی تو جاسوسی کروں گی۔"
"میں نے کیا الٹی سیدھی حرکتیں کی ہیں؟"
"پہلے تم اندھیرے میں ڈرتی تھیں، اب نہیں ڈرتیں۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔ میری ایسی حرکت سے آپ کو کیا تکلیف پہنچ رہی ہے؟"
"تمہارا باپ سنے گا تو اسے بھی تکلیف پہنچے گی۔ وہ تمہیں گولی مارنے سے پہلے یہ نہیں کہے گا کہ جوان لڑکی کو تاریکی میں کب ڈر نہیں لگتا؟"
"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

www.pkdigest.com

”تم خوب سمجھ رہی ہو۔ پہلے تو تمہیں اندھیرے میں ڈر نہیں لگا۔ پھر لائٹ آتے ہی غسل کیا... اور کیوں کیا؟ یہ بستر کی شکنیں اب بھی بول رہی ہیں۔ ذرا سر گھما کر دیکھو۔“

وہ بری طرح گھبرا گئی۔ چوری پکڑی گئی تھی۔ اس نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ ”آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ کیا میں نے یہاں کسی کو چھپا کر رکھا ہے؟“

”میں کیا جانوں تم کیا کر رہی ہو؟ زمین پر رکھے رکھے گردن دُکھنے لگی ہے۔ دروازہ تو کھولو۔“

وہ اٹھ کر دروازہ کھول کر بولی۔ ”اندر آئیں اور اچھی طرح دیکھیں۔ میں نے یہاں کس کو چھپا رکھا ہے؟“

وہ کچھ نہ بولی۔ تیزی سے چلتی ہوئی واش روم گئی۔ سارہ نے وہاں آ کر وسیم کو موجودہ صورتِ حال سمجھانے کو تیز آواز میں کہا۔ ”آپ ماں ہو کر بیٹی پر شبہ کر رہی ہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”میں نے یہاں ایک ہلکی سی آواز سنی تھی۔“

وسیم ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹے پہلے باتھ روم میں پھسل کر گرا تھا۔ وہ خاتون اب انکوائری کرنے آئی تھی۔ اس نے اسٹور روم میں کھلنے والے دروازے کو دھکا مارتے ہوئے یقین کیا کہ وہ ہمیشہ اندر کی طرف سے بند رہتا ہے۔

سارہ نے کہا۔ ”اگر آپ کی تسلی ہو گئی ہو تو اسٹور روم میں چلیں؟“

یوں اس نے وسیم کو یہ سمجھا دیا کہ ماں اب اسٹور روم میں آ رہی ہے۔

بیگم داؤد باتھ روم سے نکل کر کمرے میں آئی۔ اس نے قالین پر اوندھے منہ لیٹ کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی ہوتا تو نظر آتا۔ اسٹور روم میں بھی وزنی سامان کا ذخیرہ تھا۔ مایوس ہو کر اس نے بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔

سارہ نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ بڑے کرب سے بولی۔ ”میں کیا کروں؟ وہ میرے اندر سے نہیں نکل رہا اس لیے تم پر شبہ کر رہی تھی۔“

وہ ماں کو تھپکتے ہوئے بولی۔ ”اب تو شبہ دور ہو گیا؟“

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ”تم نہیں جانتیں... ایک سہاگن اگر بیوہ بن کر زندگی گزارے، کبھی کوئی مرد اس کی تنہائی میں نہ آئے تو وہ اندر سے کیسے سلگتی ہے؟ میں زندہ جل رہی ہوں۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس نے ماں کو بڑی ہمدردی اور محبت سے دیکھا۔ پھر اس سے لپٹ کر بولی۔ ”مام! میں سمجھ رہی ہوں۔ آپ بہت مظلوم ہیں۔ میں آپ سے کہتی ہوں پاپا سے طلاق لے کر چلی جائیں۔ کسی کے ساتھ تسلی بخش ازدواجی زندگی گزاریں۔“

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ”نہیں میری جان! میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔“

”میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں عیش و آرام سے رہوں گی۔“

”یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میرے جاتے ہی یہاں سوتیلی ماں آ جائے گی۔ کروڑوں کی دولت اور جائداد پر قبضہ کرلے گی۔ داؤد ابتدا میں اس سے ازدواجی رشتہ رکھے گا جیسا کہ اس نے میرے ساتھ رکھا تھا اور تم پیدا ہوئی تھیں۔ اگر سوتیلی ماں سے اولاد ہو گئی تو تمہاری حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہے گی۔“

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ ”خدا جانتا ہے۔ میں تمہاری خاطر اپنے جذبات کو کچلتی آ رہی ہوں۔ اٹھارہ برس تو گزر چکے ہیں۔ کچھ اور برس گزر جائیں گے پھر زندگی تمام ہو جائے گی۔“

”ایسا نہ کہیں مام! مجھے دُکھ ہو رہا ہے۔ آپ نے میری خاطر آدھی جوانی یونہی گزار دی۔“

”کئی بار سوچا کہ داؤد دن رات دوسروں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ میں بھی چھپ کر اپنے جذبات کی تسکین کر سکتی ہوں مگر میں نے کوشش بھی کی تھی مگر تمہارا باپ بہت ظالم ہے۔ تم دیکھتی ہو اس نے ہم ماں بیٹی کو کیسی سخت نگرانی میں رکھا ہے؟“

سارہ نے دیکھا تھا۔ وہ ماں بیٹی لندن، پیرس اور کینیڈا جاتی تھیں۔ وہاں بھی مخنث باڈی گارڈز ان کی نگرانی کرتے تھے۔ داؤد محل میں بھی دن کے وقت وہی مخنث آتے تھے۔ جب تمام ملازمین شام کو واپس چلے جاتے تو وہ مسلح خواجہ سرا بھی محل سے باہر نکل جاتے تھے۔

داؤد اپنی بدذوقی کے مطابق وہاں لڑکے لاتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں سارہ کو اور اس کی ماں کو ان سے باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے وقت دو مخنث گارڈز حرم سرا میں رہتے تھے۔

بیگم داؤد بڑی مدت کے بعد وسیم کو حاصل کرنے والی تھی مگر اسے بیٹی لے اڑی تھی۔ اب وہ دل کی گہرائیوں سے ماں کے دُکھ کو سمجھ رہی تھی۔ شوہر تو اس پر ظلم ڈھا رہا تھا، بیٹی بھی کم و بیش یہی کر رہی تھی۔ پیاسے ہونٹوں تک پہنچنے والے پیالے کو ماں سے چھین رہی تھی۔

بیگم داؤد آنسو پونچھتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔ سارہ اس کے پیچھے دروازے تک آئی۔ اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا پھر کہا۔ ”میری دعا ہے تمہاری زندگی میں ایسا شخص آئے جو کبھی لڑکے لڑکیوں کے چکر میں نہ پڑے۔ اس کے شب و روز صرف تمہارے لیے ہوں۔“

وہ بیٹی کو دعائیں دے کر وہاں سے چلی گئی۔

وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی کہ ماں اسے کس قدر چاہتی ہے۔ مائیں اپنی اولاد کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیتی ہیں۔ اس کی ماں اس کی خاطر جوانی کے حسین اور بہترین شب و روز ضائع کر چکی تھی۔

یہ آج معلوم ہوا کہ اسے کروڑوں کی واحد وارث بنائے رکھنے کے لیے وہ محرومیوں اور نامرادیوں کے آتش کدے میں سانسیں لیتی رہی ہے۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ماں جا چکی تھی۔ وہ کمرے میں آ گئی۔ دروازے کو اندر سے بند کر کے باتھ روم کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

واقعی وہ دو بیماروں کے درمیان ایک انار تھا۔ ایک مسیحا تھا۔ کسی ایک کو شفا دے سکتا تھا۔ وہ ایک مریضہ کون تھی؟ کون قابلِ رحم تھی؟

سارہ کے دل نے کہا۔ ”میں ہوں۔“

ضمیر نے کہا۔ ”ماں ہے۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باتھ روم میں آئی۔ اسٹور روم کے دروازے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”آ جاؤ۔“

وہ باہر آ کر بولا۔ ”خدا کا شکر ہے وہ چلی گئیں۔ مگر پھر کسی وقت نہ آ جائیں۔“

وہ اسے بازوؤں میں بھر کر بولا۔ ”ہم باتھ روم میں مقدس آیتیں نہیں پڑھیں گے۔ اسٹور روم میں چلو۔ وہاں ایک دوسرے کو قبول کریں گے۔“

وہ چپ تھی۔ ایک مضبوط بازو کے حصار میں اس کے ساتھ چلتی ہوئی اسٹور روم میں آ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”اتنی خاموش کیوں ہو؟“

وہ بولی۔ ”تم نے کہا تھا، اتنی بڑی دنیا میں تمہارا لہو کا کوئی رشتہ نہیں ہے؟“

”ہاں۔ کوئی نہیں ہے۔“

”تمہاری ماں کیسی تھی؟“

وہ بڑے جذب سے بولا۔ ”میری ماں جیسی کوئی نہیں ہو سکتی۔ مائیں اولاد کے لیے جان دیتی ہیں۔ وہ پورے عراق کی ماں تھیں۔ انہوں نے وطنِ عزیز کی خاطر جان دے دی۔ میں ایک شہید ماں کا بیٹا ہوں۔“

سارہ نے پوچھا۔ ”کیا مائیں صرف قربانیاں دینے کے لیے اولاد پیدا کرتی ہیں؟ کیا ہم اپنی ماں کے لیے قربانیاں نہیں دے سکتے؟“

”ضرور دے سکتے ہیں۔“

وہ اپنی مام کے بارے میں اسے بتانے لگی کہ وہ سہاگن ہے مگر ابھاگن ہے۔ ایک بیوہ صبر کر لیتی ہے جب شوہر مر جاتا ہے... مگر شوہر زندہ ہے اور وہ بیوہ بن کر رہتی ہے۔

وہ ماں صرف بیٹی کو عیش و عشرت کے جھولے میں جھلانے کے لیے پچھلے اٹھارہ برسوں سے پیار کے لیے ترس رہی ہے۔

اتنی مدت کے بعد ایک نوجوان اس کی زندگی میں آیا ہے۔ اگرچہ ماں کے مقابلے میں بہت کم سن ہے مگر مرد ہے۔ مرد کی عمر نہیں دیکھی جاتی۔ اپنی ضرورت دیکھی جاتی ہے۔ اگر وہ اسے نہ ملا تو محل کے اس قید خانے میں پھر شاید کوئی نہیں آئے گا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ اس نوجوان کے بعد پھر کوئی دیدہ ور نہیں آئے گا۔

اس نے سر اٹھا کر وسیم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا میری مام کو اس نوجوان کا پیار نہیں ملنا چاہیے؟“

وہ بولا۔ ”ضرور ملنا چاہیے۔“

”اس نوجوان کو عمر کا حساب کرنا چاہیے؟“

”نہیں۔ تمہاری مام کی محرومیوں اور مجبوریوں کا علاج کرنا چاہیے۔“

وہ ذرا دور ہٹ کر بولی۔ ”تو پھر کرو۔“

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”کیا کروں؟“

”علاج کرو۔ وہ نوجوان تم ہو۔“

وہ گھور کر بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ تم ہوش میں تو ہو؟“

”میں ہوش و حواس میں رہ کر بول رہی ہوں۔ تمہاری ماں نے وطن کے لیے اپنی قوم کے لیے ایک بار جان دی۔ میری مام زندہ لاش ہیں۔ پچھلے اٹھارہ برسوں سے ہر پل میرے لیے مرتی آ رہی ہیں۔“

”میں اُن کی قدر کرتا ہوں۔ اگر انہیں میرے خون کی ضرورت ہے تو میں خون دوں گا۔ میری جان کی ضرورت ہے تو جان دوں گا۔ مگر یہ دل اس کی دھڑکنیں اس کے سارے جذبے صرف تمہارے لیے ہیں۔“

”تم میرے لیے قربانی دو۔ مام کے آنسو پونچھو۔“

”بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ میں ان کے سامنے بچہ ہوں۔“

”ابھی تم نے کہا ہے عمر کا حساب نہیں کرنا چاہیے۔“

”میری بات نہ پکڑو۔ ایسی ضد کرو گی تو میں جان کی پروا کیے بغیر یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔“

وہ بولی۔ ”میری آنکھوں میں دیکھو۔“

www.pkdigest.com

اس نے دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں۔ وہ بولی۔ "میں تم سے نظریں ملا کر قسم کھاتی ہوں۔ یہاں سے جاؤ گے تو اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔"

اس نے گہری سنجیدگی سے سوچتے ہوئے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ "نہیں جاؤں گا۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

وہ خواب گاہ سے گزر کر باتھ روم میں آیا پھر دروازہ کھول کر اسٹور روم میں جا کر بولا۔ "نہ یہاں سے جاؤں گا' نہ تم جان دو گی۔ اور اس وقت تک یہاں سے نہیں نکلوں گا جب تک تم یہ بے ہودہ فیصلہ نہیں بدلو گی۔"

اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ دستک دیتے ہوئے بولی۔ "باہر آ جاؤ۔ کمرے میں آرام سے سو جاؤ۔ تمام رات جاگتے ہوئے گزر جائے گی۔"

"مجھے کس رشتے سے تمہارے کمرے میں سونا چاہیے؟ تم مجھے محبت اور عزت نہیں دے رہیں۔ ہوا رے کا مال بنا رہی ہو۔ میں نہیں آؤں گا۔"

اس کی ناراضی دکھ پہنچا رہی تھی۔ ماں کا دکھ بھی بھاری تھا۔ یہ محبوب تھا' وہ ماں تھی۔ بیٹی کی خاطر بدترین نفسیں امارہ سے لڑتی آ رہی تھی۔

وہ الجھ کر رہ گئی... کیا کرے کیا نہ کرے؟

☆☆☆

یاقوت پریشان تھی۔ کئی دن گزر گئے۔ وسیم کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ اچانک ایسے گم ہو گیا جیسے اب اس دنیا میں نہ رہا ہو۔

وہ دعائیں مانگ رہی تھی۔ خود کو تسلیاں دے رہی تھی کہ وہ زندہ ہے اور جہاں بھی ہے خیریت سے ہے۔

اسے اغوا کرنے اور شرمناک دھندے سے لگانے والے پولیس افسر ابو ولاد اور داؤد اسرار بھی اسے تلاش کر رہے تھے۔

داؤد نے حکم جاری کیا تھا کہ وسیم نہ ملے تو اس کے رشتے داروں کو پکڑ کر حوالات میں ڈالا جائے۔ انہیں ٹارچر کیا جائے' تب وہ روپوش رہنے والے کو پیش کر دیں گے۔

پولیس کی گاڑی اس کے دروازے پر آئی تو معلوم ہوا کہ اس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ سب مر چکے ہیں۔ وہ یاقوت کے گھر میں رہتا تھا۔

یاقوت آرمی اسپتال میں تھی۔ پولیس والے اس کی ماں کو اٹھا کر لے گئے۔ اس نے تھانے سے بیٹی کو فون کیا۔ بیٹی نے اپنے سینئر انگریز ڈاکٹروں سے التجا کی۔ "سر! میں اپنا گھر چھوڑ کر ہفتے میں پانچ دن یہاں ڈیوٹی پر رہتی ہوں۔ پولیس والوں نے کسی جھوٹے الزام میں میری ماں کو گرفتار کیا ہے۔ میں اپ سیٹ ہوں۔ حاضر دماغی سے فرائض ادا نہیں کر سکوں گی۔ پلیز! میری ماں کو رہائی دلائیں۔"

آرمی کے ایک افسر نے پولیس افسر کو حکم دیا کہ یاقوت کی ماں کو رہا کرو اور آئندہ اسے پریشان نہ کرنا۔

فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس کی ماں کو حوالات سے نکال کر بڑی عزت سے گاڑی میں بٹھا کر گھر پہنچا دیا گیا۔ یوں ان ماں بیٹی کو آئندہ کے لیے پولیس کے مظالم سے نجات مل گئی۔ وہ وسیم کے معاملے میں انہیں پھر کبھی پریشان کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

یاقوت حیران تھی کہ پولیس والے وسیم کو تلاش کیوں کر رہے ہیں؟ اتنی سختی سے کیوں پیش آ رہے تھے جیسے کسی عادی مجرم کو ڈھونڈ نکالنا چاہتے ہوں؟

اس کی ماں نے کہا۔ "میں نے انسپکٹر سے پوچھا وہ کہہ رہا تھا کہ کم عمر جوانوں نے ایک گروہ بنایا ہے۔ اس گروہ میں وسیم ہے۔ یہ لوگ گھروں میں گھس کر چوریاں کرتے ہیں۔ وسیم نے ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار کے گھر میں چوری کی ہے۔"

یاقوت نے کہا۔ "وہ انسپکٹر بکواس کرتا ہے۔ آپ جانتی ہیں ہمارا وسیم کتنا معصوم ہے۔"

ماں نے کہا۔ "تعجب ہے ایسے نیک اور شریف لڑکے پر جھوٹا الزام کیوں لگایا جا رہا ہے؟"

یاقوت نے کہا۔ "اسی لیے وہ میرے پاس نہیں آیا۔ پولیس کے خوف سے کہیں چھپا ہوا ہے۔ میں اپنے سینئر ڈاکٹروں سے درخواست کروں گی کہ وہ وسیم کو جھوٹے الزامات سے بری کرائیں۔ اسے میرے پاس آ کر رہنے کی آزادی دیں۔ یہ یقین دلائیں کہ پولیس بھی اسے گرفتار نہیں کرے گی۔"

اس نے دوسرے ہی دن وسیم کو تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے میں درخواست لکھ کر دی۔ اس اسپتال کے ڈاکٹر آرمی افسر تھے۔ انہوں نے کہا۔ "لڑکے کو یہاں پیش کرو۔ اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔"

وہ اسے کیسے پیش کرتی؟ وہ کہاں تھا' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے دی لائن آف اللہ بریگیڈ کے مجاہدین سے رابطہ کیا۔ ان سے التجا کی کہ وہ وسیم کو تلاش کریں۔ معلوم کریں' اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ وہ کیوں روپوش ہے؟

ایک مجاہد نے کہا۔ "وہ پچھلے ایک ہفتے سے لاپتا ہے۔ جہاں بھی ہو گا' وہاں سے کسی بھی طرح تم سے رابطہ کر سکتا

ہے۔ تمہارا فون نمبر جانتا ہے۔ تمہیں تسلیاں دے سکتا ہے کہ زندہ سلامت ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے' وہ زندہ ہو گا؟"

"ہاں۔ میں اس کی موت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ بہت اچھا ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے۔ پلیز! اسے تلاش کرو۔"

انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اسے ڈھونڈیں گے... مگر کہاں ڈھونڈ سکتے تھے؟ وہ ایسے گھر میں تھا کہ گھر والا بھی اسے باہر تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

ایک پولیس افسر نے داؤد اسرار کو اطلاع دی۔ "سر! وسیم کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ وہ ایک پڑوسن کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم نے اس عورت کو گرفتار کیا تھا لیکن ایک آرمی افسر کے حکم سے اسے واپس گھر پہنچانا پڑا۔"

داؤد نے پوچھا۔ "اس عورت نے آرمی افسر کی سفارش کیسے حاصل کر لی؟"

"یاقوت نامی ایک لیڈی ڈاکٹر آرمی اسپتال میں جاب کرتی ہے۔ وہ اپنے ذرائع استعمال کر رہی ہے۔ اس نے وسیم کے لیے بھی یہ رعایت حاصل کی ہے کہ وہ گھر آئے گا تو ہم اسے گرفتار نہیں کریں گے۔ اس پر جو بھی الزامات ہیں' ان کی مکمل رپورٹ ہمیں آرمی افسران کو پیش کرنی ہو گی۔"

"ایسی رپورٹ تیار کرو کہ وہ اتحادی فوج کا دشمن ثابت ہو جائے۔"

"سر! سچ تو یہ ہے اس کا خاندان امریکی اتحادیوں کا دشمن ہے۔ آپ نے سنا ہو گا' اُم حفصہ نے فوجی ٹرکوں کے درمیان آ کر خودکش حملہ کیا تھا۔ وسیم اسی عورت کا بیٹا ہے۔"

"یہ ہوئی نا بات... اب تو میں اس لڑکے کو نچوڑ کر رکھ دوں گا۔"

"صرف اتنا ہی نہیں سر! آپ سراج مصطفیٰ کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔ اس نے کیس چیمبر میں سزائے موت پائی تھی۔ وہ وسیم کا بڑا بھائی تھا۔"

"یعنی اس کا پورا خاندان دہشت گرد ہے۔ فوراً یہ رپورٹ آرمی افسران تک پہنچاؤ۔ وہ اس لڑکے کو گولی مارنے کا حکم دیں گے۔"

وسیم نے کبھی ایک چیونٹی بھی نہیں ماری تھی۔ اب اس پر اتحادی فوجیوں کو قتل کرنے کا الزام عائد ہو رہا تھا۔ یہ رپورٹ پیش کی جانے والی تھی کہ اس دہشت گرد خاندان کا لڑکا اسی لیے روپوش ہو گیا ہے کہ چھپ کر فوجیوں پر حملہ کرنے والوں کی مدد کر رہا ہے۔

آرمی افسران نے جب وہ رپورٹ پڑھی تو یاقوت کو طلب کیا۔ پھر اس سے کہا۔ "تم نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ تم جس لڑکے کے لیے سیکیورٹی چاہتی ہو' وہ اُم حفصہ کا بیٹا اور سراج مصطفیٰ کا بھائی ہے؟"

"سر! اس لیے نہیں بتایا کہ اس کا پورا خاندان نابود ہو چکا ہے۔ یہ لڑکا معصوم ہے۔ مجاہدین کے کسی گروپ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ہم کیسے یقین کریں کہ وہ باغی نہیں ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو روپوش کیوں ہے؟"

"وہ روپوش نہیں ہے۔ پتا نہیں' کن مصیبتوں میں گرفتار ہے؟ مجھ سے رابطہ نہیں کر رہا۔ یقیناً کہیں مجبور ہو گیا ہے۔"

"وہ اپنی ماں اور بھائی کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ پولیس کی اطلاع کے مطابق اسے باغیوں کے ایک ایسے گروہ میں دیکھا گیا ہے جو ہمارے فوجیوں پر حملہ کر کے فرار ہو رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ فرار ہو گیا ہے۔"

"پولیس والے جسے چاہتے ہیں' مجرم بنا دیتے ہیں اور جس مجرم کو چاہتے ہیں' اسے شرافت کا سرٹیفکیٹ دے دیتے ہیں۔"

"تم پولیس والوں کو غلط ثابت کرو۔ اسے خفیہ پناہ گاہ سے نکالو اور یہاں پیش کرو۔ ہم اس سے انصاف کریں گے۔"

وہ قسمیں کھا کر کہنے لگی کہ وہ باغی نہیں ہے۔ جب بھی اس سے رابطہ ہو گا تو وہ اسے آرمی افسران کے سامنے پیش کرے گی اور افسران کہہ رہے تھے کہ وسیم پیش ہونے کے بعد ہی الزامات سے بری ہو سکتا ہے۔

وہ دو دن کے لیے اسپتال سے گھر آئی تو ایک مجاہد اکبر علی سیستانی نے فون پر کہا۔ "یاقوت! تم پر بڑی مصیبتیں آنے والی ہیں۔ فوراً گھر سے نکلو۔ ہماری گاڑی آ رہی ہے۔ ہم کسی بھی گلی سے تمہیں اٹھا کر لے آئیں گے۔"

وہ ایک بیگ میں ضروری سامان رکھ کر گھر سے نکلتے ہوئے بولی۔ "میں اپنی گلی سے نکل کر دوسری گلی میں جا رہی ہوں۔ مجھے کچھ تو بتاؤ' یہ سب کیا ہے؟"

رابطہ ختم ہو گیا۔ دوسری گلی میں پہنچتے ہی ایک گاڑی اس کے قریب آ کر رکی۔ اس میں چھ مسلح مجاہدین تھے۔ وہ اکبر علی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گاڑی فوراً ہی آگے روانہ ہو گئی۔

یاقوت نے کہا۔ "سی آئی اے والے مجھے تم لوگوں کے ساتھ دیکھ لیں گے۔"

اکبر علی نے کہا۔ "وہ تمہیں گرفتار کرنے کسی بھی وقت تمہارے گھر آ سکتے ہیں۔ یہ بھید کھل گیا ہے کہ تم ہمارے لیے کام کرتی ہو۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ راز کیسے منکشف ہو گیا؟"

"ہم نے تمہاری بہن اور تمہارے باپ کے قاتلوں کو

www.pkdigest.com

ہلاک کرنے سے پہلے اُن سے کہا تھا کہ انہوں نے یاقوت کے گھر جو واردات کی ہے انہیں اس کی سزا مل رہی ہے۔"

دوسرے مجاہد نے کہا۔ "ہمارا خیال تھا' وہ اسی وقت مر جائیں گے۔ ہماری باتیں کسی سے کہہ نہیں سکیں گے لیکن ان میں سے ایک زخمی ہو کر وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ اس نے بیان دیا ہے کہ اس تقریب میں گولیاں چلانے والے اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کرنے والے یاقوت کے حمایتی تھے۔"

اکبر علی نے کہا۔ "جس پولیس انسپکٹر کو میں نے گولی ماری تھی' اس نے مرتے مرتے کاغذ پر میرا نام اکبر علی سیستانی اور دی لائن آف اللہ بریگیڈ لکھا تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ تم ہمارے گروہ سے تعلق رکھتی ہو اور اتحادیوں کے خلاف ہمارے لیے کام کرتی ہو۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "کیا میں بے گھر ہو چکی ہوں؟ میری ملازمت ختم ہو چکی ہے؟ وہاں جاؤں گی تو مجھے حراست میں لے لیا جائے گا؟"

"ہاں۔ تم پر تشدد کیا جائے گا۔ ہمارا نام اور پتا ٹھکانا اُگلوایا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے۔ اب تم ان کی گرفت میں نہیں آؤ گی۔ ہماری گروہ کی خواتین کے ساتھ رہو گی۔"

"اس طرح تو میری امی تنہا اور بے یار و مددگار ہو گئی ہیں۔ پھر یہ کہ وسیم کہیں سے بھٹکتا ہوا گھر آ سکتا ہے۔ وہ پکڑا جائے گا۔"

اکبر علی نے کہا۔ "ہم تمہاری ماں اور وسیم پر نظر رکھیں گے۔ انہیں گرفتار کرنے والوں سے نمٹنے کی کوششیں کرتے رہیں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "فی الحال تمہیں تحفظ فراہم کرنا لازمی تھا۔ اس اسپتال کے ڈاکٹرز اور آرمی افسران دھوکا برداشت نہیں کریں گے۔ تمہیں دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم دیں گے۔"

وہ سر جھکا کر اپنی ماں اور وسیم کے بارے میں سوچنے لگی۔ فی الحال صرف سوچ ہی سکتی تھی' کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

اور واقعی مجاہدین کی معلومات درست تھیں۔ ایک پولیس وین یاقوت کے دروازے پر آئی تھی۔ بیٹی نہ ملی تو وہ ماں کو اٹھا کر لے گئے۔ اس بے چاری کو حوالات میں ڈال کر اس پر ظلم کرنے لگے۔ پوچھنے لگے۔ "بولو! بیٹی کہاں چھپنے گئی ہے؟ وہیں وسیم بھی ہو گا۔ اس کا پتا ٹھکانا بتاؤ۔"

وہ کچھ جانتی نہیں تھی اس لیے مار کھاتی رہی۔ داؤد اسرار نے کہا۔ "وہ وسیم کے پاس چھپنے نہیں گئی ہو گی۔ اسے مجاہدین پناہ دے رہے ہیں۔ وسیم تک پہنچنے کی ایک تدبیر ہے۔ ٹی وی چینلز کے ذریعے اس کی تصویر نشر کی جائے اور یاقوت کی طرف سے یہ پیغام دیا جائے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے' فون کے ذریعے اپنی مسنز سے رابطہ کرے۔"

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "یاقوت کہہ رہی تھی' وہ فون کے ذریعے بھی اس سے رابطہ نہیں کر رہا ہے... کیونکہ نہ اس کے پاس موبائل فون ہے' نہ وہ یاقوت کا نمبر جانتا ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "ہم اپنی طرف سے ایک نمبر نشر کریں گے۔ یہ کہا جائے گا کہ وہ یاقوت کا نیا فون نمبر ہے۔ اس طرح وہ ضرور اس پر کال کرے گا۔"

انہیں یقین تھا کہ اس تدبیر پر عمل کر کے خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جاسکیں گے۔ داؤد کے لیے یہ بڑی تذلیل کی بات یہ تھی کہ اس کے عیش کدے میں آنے والے لڑکے نے ایک مضبوط سیکیورٹی کو توڑ کر اور وہاں سے فرار ہو کر اس کا سر جھکا دیا تھا۔

ابھی اسے خبر نہیں تھی کہ بیٹی کے حوالے سے بھی ایسا سر جھکے گا کہ وہ شرم سے ڈوب مرے گا یا لوگوں سے منہ چھپاتا پھرے گا... یا پورے گھر کو آگ لگا کر جل مرے گا۔

ایک لڑکے کے ساتھ کھلواڑ کرنے والا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے اپنے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

☆☆☆

عجیب حالات درپیش تھے۔ سارہ بڑی آسانی سے کسی روک ٹوک کے بغیر وسیم سے ازدواجی رشتہ قائم کر سکتی تھی۔ انہوں نے بڑی [illegible] اور نیک [illegible] فیصلہ کیا تھا کہ [illegible] جذبات میں [illegible] کر گناہ [illegible] نہیں [illegible] گے۔ احکامات کے مطابق پہلے ایک دوسرے کے نکاح میں آئیں گے' یوں اپنے ضمیر کو مطمئن رکھیں گے۔

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ سارہ کا ضمیر اسے ماں کی قربانیوں کا شدت سے احساس دلا رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ جذباتی ہو کر سوچ رہی تھی کہ اسے ماں کی خاطر اپنے پیار کی قربانی دینی چاہیے اور وسیم سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

ان جذباتی لمحات میں وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کا ضمیر انتہائی بچکانا اور احمقانہ انداز میں قربانی چاہتا ہے۔

وسیم اسٹور روم میں جا کر بند ہو گیا۔ وہ خواب گاہ میں آ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت رات کے چار بج رہے تھے۔ ایک آدھ گھنٹے میں صبح ہونے والی تھی۔ وہ اس کی سہاگ رات ہو سکتی تھی مگر اب گزر رہی تھی اور گزرتے ہوئے وقت کو روکا نہیں جا سکتا۔

ان لمحات میں اسے ماں کی ایک بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔ "جب تک کوئی ہاتھ نہ لگائے' تب تک خیر ہے۔ ہاتھ لگانے کے بعد عورت پھر ویسی ہی گرفت ڈھونڈتی رہتی ہے۔"

داؤد اسرار نے اسے ایک بیٹی کی ماں بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ ایک مرد کی قربت سے دور کر دیا تھا۔ بیگم داؤد نے اسی قربت اور دوری کے حوالے سے اپنا دکھ بیان کیا تھا۔

لیکن یہی دکھ بیٹی کا بھی ہو سکتا تھا کیونکہ وہ کسی حد تک وسیم کے لمس سے آشنا ہو چکی تھی اور اب تنہائی میں اس کی قربت چاہ رہی تھی۔ وہ بے چین ہو کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔

تنہائی میں بہکنے کی یہی خرابی ہوتی ہے۔ بعد میں دل و دماغ کے اندر شیطان اُچھلتا رہتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے تیسرے گناہ کی طرف لے جاتا ہے۔ جیسے اس کی ماں کو لے جا رہا تھا۔

سارہ نے چونک کر سوچا۔ 'ہاں۔ مام تو گناہ کی طرف جانا چاہتی ہیں۔ پاپا سے طلاق نہیں ہوئی ہے۔ پھر وہ وسیم کے ساتھ کیسے تعلق قائم کر سکتی ہیں؟'

اس نے حیرانی سے سوچا۔ 'یا خدا! یہ بات میرے دماغ میں پہلے کیوں نہیں آئی؟'

اس لیے نہیں آئی کہ ماں کی محرومیاں دور کرنے کے لیے وہ جذبات میں اندھی ہو گئی تھی۔ دماغ سے سوچنا بھول گئی تھی۔

وہ اس پہلو سے بار بار سوچنے لگی۔ جب وہ گناہ نہیں کرنا چاہتی تھی' پہلے وسیم کے لیے جائز ہو جانا چاہتی تھی تو پھر اسے ماں کے ناجائز ارادوں پر اعتراض کرنا چاہیے تھا۔ اس کے... برعکس وہ اپنی مام کی مظلومیت کو اہمیت دے رہی تھی۔

وہ بیڈ سے اتر کر باتھ روم میں آئی۔ پھر اسٹور روم کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے بولی۔ "میں ہوں سارہ... دروازہ کھولو۔"

اندر خاموشی رہی۔ وہ ناراض تھا۔ اس سے بولنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں جانتی ہوں تم مجھ سے بات نہیں کرو گے مگر میں نے فیصلہ بدل دیا ہے۔ تم میرے ہو۔ صرف میرے ہی رہو گے۔ اب تو دروازہ کھولو۔"

وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ سارہ ایک دم ہی اس سے لپٹ گئی۔ "سوری! میں مام کی طرف سے بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ اب عقل سے سمجھ رہی ہوں۔ خدا نے تمہیں میرے لیے بھیجا ہے۔ میں تمہیں ایک پل کے لیے بھی دور جانے نہیں دوں گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک جذبات سے مغلوب رہے۔ پھر فوراً ہی الگ ہو گئے۔ کہیں دور سے فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ سارہ نے کہا۔ "تم نماز پڑھتے ہو؟"

"کبھی پڑھتا ہوں' کبھی نہیں پڑھتا۔"

"آج بھی پڑھو۔"

"آؤ' ہم کمرے میں پڑھیں گے۔"

"میں مام کے ساتھ پڑھوں گی۔ وہاں جا رہی ہوں۔ ان سے ضروری باتیں کروں گی۔"

وسیم نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "ابھی نہ جاؤ۔ ہم نماز کے بعد ایک دوسرے سے ایجاب و قبولیت کریں گے۔"

"ضرور کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے اپنی ماں کو اعتماد میں لینا چاہتی ہوں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم میرے مجازی خدا اور اُن کے داماد بننے والے ہو۔"

وسیم نے اعتراض کیا۔ "سارہ! گڑبڑ ہو جائے گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔ تم اطمینان رکھو۔ میں ابھی آ جاؤں گی۔"

"تم اپنی مام کے معاملے میں عقل سے سوچنا سمجھنا بھول گئی ہو۔ پہلے ایک غلطی کرنے والی تھیں۔ اب اس غلطی سے توبہ کر کے دوسری کرنے جا رہی ہو۔"

"میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ تمہاری بات نہیں بگڑے گی بلکہ بنے گی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے بولی۔ "وہیں رک جاؤ۔ دروازہ بند کر لو۔ بھول سے بھی باہر نہ آنا۔ خفیہ کیمروں کی آنکھیں تمہیں دیکھ لیں گی۔"

وسیم نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ محل کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی بیگم داؤد کے کمرے میں آئی۔ وہ نماز کے لیے مصلا بچھا رہی تھی۔ ماں بیٹی نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سارہ نے وضو کیا۔ پھر اس کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں نماز ادا کرنے لگیں۔

بیگم داؤد جیسی محرومیوں کا شکار رہنے والی عورتیں اگرچہ بہکتی ہیں' گناہ گار بھی بن جاتی ہیں لیکن خدا کا خوف لازمی رہتا ہے۔ وہ گناہوں سے توبہ کرنے کے لیے اور اپنا دھیان عبادت کی طرف لگائے رکھنے کے لیے نمازیں ضرور پڑھتی ہیں۔

بیگم بھی بہکتے اور ڈگمگاتے جذبات سے مغلوب رہتی تھی اور نمازیں بھی پڑھتی تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ صرف خیالات کی حد تک گناہ گار رہے۔ ورنہ آج تک داؤد کے سوا کسی بھی مرد سے تنہائی میں بات تک نہیں کی ہے۔

اور یہ پارسائی شاید اس لیے بھی تھی کہ اسے سخت پردے اور پابندیوں میں رکھا گیا تھا۔ نہ کوئی کھلاڑی آیا تھا' نہ کوئی کھیل کھیلا گیا تھا۔

وہ نماز کے بعد دعا مانگ کر اٹھنا چاہتی تھی۔ سارہ نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "بیٹھی رہیں۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

وہ بیٹی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ "آپ پورے محل میں اسے تلاش کر رہی ہیں۔ وہ مل جائے گا تو کیا اسے پاپا کی جگہ دیں گی؟"

www.pkdigest.com

وہ ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "یہاں سے اٹھو۔ صوفے پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

سارہ نے اٹھنے نہیں دیا پھر ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "خدا دلوں کے بھید جانتا ہے۔ آپ یہاں نماز پڑھتی ہیں۔ یہیں اپنے اندر کی باتیں کریں۔"

وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "ایسی باتیں مصلے پر نہیں کی جاتیں۔"

"کیا یہاں خدا سن رہا ہے اور صوفے پر نہیں سنے گا؟"

وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "یہ کیا ضد ہے؟ یہاں بیٹھ کر بات کیوں کرنا چاہتی ہو؟"

"یہاں آپ جلدی غلطی تسلیم کرلیں گی۔"

وہ گھور کر بولی۔ "کیسی غلطی؟"

"یہی کہ جب تک پاپا کے نکاح میں ہیں، تب تک کسی دوسرے مرد کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے مگر آپ کر رہی ہیں۔"

"اور وہ جو تمہارا باپ میری حق تلفی کرتا ہے، دوسری جگہ منہ کالا کرتا رہتا ہے... تو کیا وہ درست کرتا ہے؟"

"وہ بڑے گناہ گار ہیں۔ کیا آپ بھی ایسا کریں گی جو پاپا کرتے ہیں؟"

"جو وہ کریں گے، وہی میں بھی کروں گی۔"

"وہ نماز نہیں پڑھتے، آپ بھی نہ پڑھیں۔ وہ شراب پیتے ہیں، آپ بھی نوش فرمائیں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ جو میری خواہش ہوگی، میں وہی کروں گی۔"

"یہ مصلا، یہ نماز ہمیں خواہشات کی غلامی سے نکالنے کے لیے ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو یہاں بٹھا کر رکھا ہے۔ دیکھیں اور سمجھیں... ابھی آپ کہاں ہیں؟"

وہ مصلے پر پہلو بدلنے لگی۔ جو بے ایمان ہوتے ہیں، وہ مسجد میں بھی اپنی بے ایمانی تسلیم نہیں کرتے۔ سارہ نے کہا۔ "یہاں خدا ہے اور میں ہوں آپ کی بیٹی... آپ ایمان کے ساتھ کہیں گی کہ آپ کو خواہشات کی داشتہ بن کر نہیں رہنا ہے۔ فطری خواہشات حاوی ہو رہی ہیں تو آپ پاپا سے طلاق لے کر کسی کے ساتھ جائز ازدواجی زندگی گزاریں گی۔"

"میں داؤد سے طلاق لے کر تمہاری زندگی برباد نہیں کروں گی۔"

"مجھے بربادی سے بچانے کے لیے کہتا ہوں کی دلدل میں جائیں گی تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ خدا میرے ساتھ ہے۔ مجھے پاپا پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ مجھے جائز حقوق سے محروم نہیں کریں گے۔ آپ میرا سہارا لے کر گناہ کا راستہ ہموار نہ کریں۔"

بیگم داؤد نے بیٹی کو دیکھا پھر نظریں جھکالیں جیسے ڈھیلی پڑگئی ہو۔ وہ شکست خوردہ سی ہو کر بولی۔ "میں خوابوں اور خیالوں میں زندگی گزار رہی ہوں۔ جانتی ہوں، یہاں میری تنہائی میں کوئی نہیں آئے گا۔ وہ وسیم آیا تھا۔ میں نے اسے بہلا وا بنالیا۔ وہ جوان ہے مگر میرے لیے ایک کم سن لڑکا ہے۔ وہ فرار ہو گیا ہے مگر جب کہتی ہوں کہ وہ یہیں محل میں چھپا ہوا ہے تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ جیسے میں کبھی پورے نہ ہونے والے جذبوں کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ خود کو بہلا رہی ہوں۔ یہ سوچ کر اچھا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے چھپ رہا ہے۔ کسی وقت اچانک ہی سامنے آجائے گا۔" وہ مصلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "میں اسے چھو کر کہتی ہوں کہ وہ محل سے بھاگ گیا ہے۔ بس میں بہلتی ہوں، مجھے بہلنے دو۔"

"اگر وہ سچ مچ آجائے تو...؟"

"تو..." وہ سوچنے لگی۔

سارہ نے پوچھا۔ "پھر تو وہ دل کو بہلانے والا خواب و خیال نہیں رہے گا... تب آپ کیا کریں گی؟"

وہ بولی۔ "اونہہ... وہ یہاں سے جاچکا ہے۔"

"آپ میرے سوال کا جواب دیں۔ اگر وہ سامنے آجائے گا تب آپ کے خیالات اور جذبات کیا ہوں گے؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "کیا بولوں؟ نماز کی جگہ بیٹھی ہوں۔"

"یہی دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہاں سے ایمان کے ساتھ اٹھیں گی یا نہیں؟"

وہ ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ "میں ان لمحات میں دعا مانگتی ہوں، خدا میرا ایمان سلامت رکھے۔ اگر وہ آئے گا تو غصہ دکھاؤں گی کہ جب عزت بچا کر بھاگ گیا تھا تو پھر مرنے کیوں آیا ہے؟"

"وہ مرنے نہیں، میرے ساتھ جینے آیا ہے۔"

اس نے چونک کر بیٹی کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہ میرے دل و دماغ میں سما گیا ہے۔ میں اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"

"تم بھی میری طرح کھیل رہی ہو۔ یہ بھول رہی ہو کہ ایسے معاملات میں باپ کیسا ظالم ہے؟ تمہیں گولی ماردے گا۔"

"میں نہیں جانتی آئندہ کیا ہوگا؟ بس یہ حوصلہ ہے کہ موت آئے گی تو اسی کے ساتھ مروں گی۔"

"تم تو ایسے بول رہی ہو جیسے وہ سچ مچ تمہارے پاس آگیا ہے؟"

"یس مام! وہ میرے پاس ہے۔ میرے بیڈ روم میں ہے۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "تم جھوٹ بول رہی ہو۔ کیا اس محل سے بھاگنا اور پھر واپس آنا بچوں کا کھیل ہے؟"

"وہ فرار نہیں ہوا تھا۔ میں نے اسے محل سے چھپا کر رکھا ہے۔"

وہ حیرانی اور بے یقینی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ اور اٹھتے ہوئے بولی۔ "چلو اٹھو۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کروں گی۔"

سارہ نے پھر اسے بٹھالیا۔ "آپ ابھی اسے دیکھیں گی۔ پہلے یہ بتائیں کہ اس کے متعلق اب آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میری کیا رائے ہوگی؟ اگر وہ سچ مچ یہاں ہے تو مرنے کے لیے رہ گیا ہے۔ داؤد اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کی لاش ہی یہاں سے جائے گی۔"

"اس کے ساتھ میری بھی لاش جائے گی۔"

ماں نے کہا۔ "تمہارے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ واقعی تمہارے کمرے میں ہے۔"

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟ میں اسے اپنا لائف پارٹنر اپنا مجازی خدا تسلیم کررہی ہوں۔ اب اس کے متعلق آپ کے جذبات اور احساسات کیا ہیں؟"

"میں تم دونوں کے جنازوں پر فاتحہ پڑھوں گی۔ یہاں اس کے لیے پاگل ہو رہی ہو۔ بڑے بڑے گھرانوں سے تمہارے رشتے آرہے ہیں۔ نکالو اس لڑکے کو یہاں سے۔ اسے اس طرح محل سے بھگاؤ کہ وہ پکڑا جائے تو تم پر الزام نہ آئے۔"

"یعنی وہ آپ کے ہتھے چڑھتا تو یہی کرتیں؟ اپنا اُلو سیدھا کرتیں پھر اسے الٹا لٹکانے کے لیے سیکیورٹی گارڈز کے حوالے کردیتیں؟"

"عقل سے کام لو۔ میری مانو اور یہی کرو۔"

"سوری مام! میں نے ماں سمجھ کر آپ پر اعتماد کیا تھا۔ آپ جائیں۔ گارڈز کو میرے کمرے میں بھیج دیں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "وہاں ہم زندہ نہیں ملیں گے۔ یہ میرا عزم ہے کہ آخری سانسوں تک وسیم کے ساتھ رہوں گی اور یہ آخری سانسیں ابھی پوری ہوجائیں گی۔"

وہ جانا چاہتی تھی۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔ "کیا میں تمہاری دشمن ہوں؟ تمہاری خاطر جی رہی ہوں۔ تمہاری خاطر داؤد سے اور دنیا والوں سے لڑ جاؤں گی۔ مجھے لے چلو اس کے پاس... ہم تمام خطرات سے کھیلتے ہوئے اسے آخری دم تک یہاں چھپا کر رکھیں گے۔"

سارہ خوش ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ "آئی لو یو مام! خدا کے بعد آپ نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اب میرے دوبیدا کرنے والے ہمارے ایجاب و قبولیت کے گواہ رہیں گے۔"

اس نے بیٹی کو پیار کیا پھر وہاں سے نکل کر اس کے بیڈ روم کی طرف جانے لگی۔ وہ دونوں داؤد محل کے زنداں میں تھیں مگر بڑے حوصلے سے زنداں میں پھول کھلا رہی تھیں۔

☆☆☆

ساؤتھ زون کے چند اتحادی فوجی افسران غصے سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ غصہ اس بات کا تھا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر یاقوت اُن کی ناک کے نیچے رہ کر مخالفین کے لیے کام کررہی تھی اور امریکی سی آئی اے والے اسے پہچان نہ پائے۔ پچھلے کئی حملوں کی رپورٹس کی چھان بین سے انکشاف ہورہا تھا کہ یاقوت کی مخبری کے باعث درجنوں اتحادی فوجی موت کے گھاٹ اتر گئے تھے اور سیکڑوں زخمی اور اپاہج ہو کر گھروں کو چلے گئے تھے۔

غصہ اس بات پر زیادہ تھا کہ وہ گرفت میں نہیں آئی تھی۔ کہیں روپوش ہوگئی تھی۔ اس علاقے کے پولیس افسران سے جواب طلبی ہو رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے، انہوں نے اُس کی ماں کو گرفتار کیا تھا۔ وہ یاقوت کی پُراسرار سرگرمیوں تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن اسپتال کے آرمی افسران کی سفارش کے باعث اسے ڈھیل مل گئی اور وہ فرار ہوگئی۔

آرمی افسران کی ایک میٹنگ میں داؤد اسرار نے کہا۔ "خود کش حملہ کرنے والی اُم حفصہ کا بیٹا وسیم بہت اہم ہے۔ وہ یاقوت کے گھر میں رہا کرتا تھا۔ فی الحال وہ دونوں ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان فون پر ضرور رابطہ ہوگا۔ وہ ایک دوسرے سے ملنے کی کوششیں بھی کریں گے اور ایسے وقت ہمارے سپاہیوں اور جاسوسوں کی نظروں میں آجائیں گے۔"

ایک آرمی افسر نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ وہ فون سے رابطہ کررہے ہیں یا نہیں؟"

داؤد نے کہا۔ "ہماری معلومات کے مطابق وسیم کے پاس موبائل فون نہیں ہے اور نہ ہی وہ یاقوت کا نمبر جانتا ہے۔ ہم ٹی وی چینلز کے ذریعے وسیم کے لیے یاقوت کا پیغام نشر کررہے ہیں اور اس کا فون نمبر بھی پیش کررہے ہیں۔ اگر وسیم اس نمبر پر بات کرے گا تو ہماری ایک جاسوس لڑکی اسے یاقوت بن کر دھوکا دے گی۔ کہے گی کہ وہ ایک بہت ہی محفوظ پناہ گاہ میں ہے۔ وسیم کو فوراً وہاں آنا چاہیے۔"

ایک آرمی افسر نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں۔ اگر وہ لڑکا پوری طرح محفوظ نہیں ہوگا تو تمہاری جاسوس لڑکی کو یاقوت سمجھ کر دوڑا چلا آئے گا۔"

"یس سر! یہی ہماری پلاننگ ہے۔ وہ لڑکا گرفت میں آئے گا تو ہم پھر ویسی ہی چال چلیں گے۔ ٹی وی چینلز کے

www.pkdigest.com

ذریعے وسیم کا پیغام یاقوت کے لیے نشر کیا جائے گا۔ اس کا فون نمبر بھی بتایا جائے گا۔ وہ خود اس نمبر پر وسیم سے رابطہ کرے گی۔ اسے معلوم ہوگا کہ وہ بہت ہی محفوظ پناہ گاہ میں ہے تو وہ بے خوف و خطر اس سے ملنے چلی آئے گی۔"

اس پلاننگ میں جان تھی۔ انہیں یقین تھا کہ خاطر خواہ نتائج حاصل ہوں گے۔

ایک آرمی افسر نے کہا۔ "حارث الجمالی کو سزائے موت دی گئی ہے۔ اس سزا پر عمل درآمد کے لیے اسے ابوغریب جیل سے سلیمانیہ کے ڈیتھ ہاؤس میں منتقل کر دیا گیا ہے۔"

پھر اس نے ایک فائل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے حارث کی ہسٹری فائل میں یاقوت کا نام پڑھا ہے۔ ایک برس پہلے وہ دونوں میڈیکل کے اسٹوڈنٹس تھے اور شادی کرنے والے تھے۔ اس سے پہلے حارث دی لائن آف اللہ بریگیڈ میں شامل ہو گیا اور یاقوت ہاؤس جاب کے لیے آرمی اسپتال میں آ گئی۔"

افسر نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یاقوت ہاؤس جاب کرنے نہیں ہمارے دشمنوں کے لیے مخبری کرنے آئی تھی۔ ہم حکم دیتے ہیں اُسے آن دی اسپاٹ شوٹ کر دیا جائے۔"

یاقوت اور تمام مجاہدین اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے لیے سزائے موت کے احکامات جاری ہوتے رہتے ہیں۔ وہ سب ہی سر پر کفن باندھے پھرتے تھے۔ خوفِ خدا رکھنے والے موت سے خوف کھانا نہیں جانتے۔

مجاہدین کا کوئی ایک مستقل ٹھکانا نہیں تھا۔ اپنے ہی ملک کے سپاہی اور انٹیلی جنس والے ان کا سراغ لگاتے اور ان پر حملے کرتے رہتے تھے۔ وہ مقابلہ کرتے تھے۔ غلام سپاہیوں کو مار بھگاتے تھے، کبھی خود فرار ہو کر اپنے کسی خفیہ اڈے سے محروم ہو جاتے تھے۔

وہ پیچھے ہٹنا، ہٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا خوب جانتے تھے۔ میدانوں اور پیچ در پیچ پہاڑوں میں مورچے بنا کر رہتے تھے۔ پھر کسی سمت نکل جاتے تھے۔ اصل مسئلہ ان خواتین کا تھا جو ان کے ساتھ غاصبوں کے خلاف جنگ لڑ رہی تھیں۔ ان کے لیے کہیں بھی چھت اور چار دیواری لازمی ہو جاتی تھی۔

جو خواتین سی آئی اے والوں کی اور سپاہیوں کی نظروں میں نہیں آئی تھیں، وہ آزادی سے رہتی تھیں جیسا کہ یاقوت اب تک رہتی آئی تھی۔ وہ اپنے مکمل ریکارڈز اور تمام تصاویر کے ساتھ تمام مخالفین کی نظروں میں آ گئی تھی۔ اس کی تصاویر تمام پولیس اسٹیشنوں میں پہنچا دی گئی تھیں۔ ان کے ذریعے وسیم کو ٹریپ کیا جانا تھا۔ اس لیے ٹی وی اور ریڈیو چینلز کے ذریعے اسے مفرور اور دہشت گرد خاتون نہیں کہا جا رہا تھا۔ وسیم کو گرفتار کرنے تک حقیقت چھپائی جا رہی تھی۔

ٹی وی کے کئی چینلز کی اسکرین پر یاقوت اور وسیم کی تصویریں پیش کی جا رہی تھیں اور کہا جا رہا تھا کہ یہ یاقوت العزیزی ہے اور یہ وسیم مصطفیٰ ہے۔ یاقوت اپنے اس منہ بولے بھائی کو تلاش کر رہی ہے۔ اگر وہ کہیں یہ پیغام سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے تو اسکرین پر نظر آنے والے فون نمبر پر یاقوت سے رابطہ کرے۔

یہ پیغام بھی دیا جا رہا تھا کہ وسیم کی طرح یاقوت کا گھر اجڑ گیا ہے۔ اس کی بھی بہن اور ماں باپ ہلاک ہو چکے ہیں۔ وہ تنہا ہے اور اپنے وسیم کو پکار رہی ہے۔ لہٰذا وہ جہاں بھی ہے فوراً اس سے فون پر رابطہ کرے۔ ایسے مصائب میں اسے اپنی سسٹر کے ساتھ رہنا چاہیے یا کم سے کم فون پر دو باتیں کرنی چاہئیں۔

یاقوت چند مجاہدین کے ساتھ چھپتی پھر رہی تھی۔ اسے کسی چار دیواری میں رہ کر ٹی وی دیکھنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا تھا۔ اس گروہ کے سربراہ نے اس سے کہا۔ "جیسا کہ تم جانتی ہو عیسائیوں کی ریڈ کراس ٹیم دنیا کے تمام آفت زدہ علاقوں میں پہنچ کر زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی ہے۔ بیماروں کو مفت دوائیں اور بھوکے ننگوں کو روٹی اور کپڑے دیتی ہے۔ ایسی ریڈ کراس ٹیم عراق کے بھی کئی شہروں میں ہے۔"

یاقوت نے کہا۔ "جی ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ ہمارے گروہ کی دو خواتین اس ٹیم میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔"

"ہاں۔ ان عیسائیوں کو ہماری زبان بولنے والوں کی ضرورت رہتی ہے تاکہ وہ ہمارے ذریعے یہاں کے لوگوں کی باتوں کو اور ضرورتوں کو سمجھ سکیں۔ تم بھی ایسی ہی ایک ٹیم میں عیسائی نن بن کر رہ سکتی ہو۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "آپ مجھے عیسائی بننے کو کہہ رہے ہیں؟"

"گرفتاری اور سزائے موت سے بچنے کے لیے عارضی طور پر یہ ڈراما پلے کرنا ہوگا۔"

"کیا میں عیسائیت قبول کروں گی تو حملے کے اتحادی مجھے معاف کر دیں گے؟ مجھے بخش دیں گے؟"

"وہ کسی قیمت پر تمہیں معاف نہیں کریں گے۔ لیکن عیسائیت قبول کرتے ہی تم ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤ گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا میں انہیں دکھائی نہیں دوں گی؟"

"نہیں۔ عیسائی بننے والی عورتوں کو "کانونٹ" میں رکھا جاتا ہے۔"

"وہ کانونٹ بصرہ میں ہے؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہاں کسی مرد کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ وہاں ننیں بھی ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتیں۔ ہر نن کا آدھے سے زیادہ چہرہ گھونگھٹ جیسے نقاب کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ سب خدا کی خدمت کے لیے وقف ہو چکی ہوتی ہیں۔ انہیں خدا کے سوا کوئی نہیں دیکھتا۔"

"کیا میرے شناختی کاغذات دیکھے بغیر، میری ہسٹری معلوم کیے بغیر مجھے وہاں قبول کیا جائے گا؟"

وہ بولا۔ "ریڈ کراس سوسائٹی اس لیے قائم کی گئی ہے کہ آفت زدہ علاقوں میں بھوک اور بیماریوں سے مرنے والوں کو روٹی کپڑا اور دوائیں دے کر انہیں ایک نئی زندگی دے کر عیسائی بنایا جائے۔ اول تو وہ عیسائی بننے والوں کے بارے میں چھان بین نہیں کرتے۔ دوم یہ کہ کانونٹ میں ایک ملازمہ ہماری وفادار ہے۔ وہ بظاہر عیسائی ہے لیکن مسلمان ہے۔ وہ تمہاری مشکلیں آسان کرے گی۔"

وہ کانونٹ کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرنے اور معلومات حاصل کرنے لگی۔ اس وقت جہاں تھی، وہ کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن اتحادیوں سے بھرے ہوئے فوجی ٹرک ادھر سے گزرتے رہتے تھے۔ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس پناہ گاہ کو چھوڑنے سے پہلے اس طرف آنے والے فوجی ٹرکوں پر حملہ کیا جائے۔ پھر وہاں سے فرار ہونا تھا۔ اور اس سے پہلے یاقوت کو کانونٹ کی چار دیواری میں پہنچایا جانے والا تھا۔

☆☆☆

سارہ اور وسیم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے تھے۔ بیگم داؤد نے بیٹی اور داماد کو دعائیں دیں۔ پھر میاں بیوی کو ان کی خواب گاہ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئیں کیونکہ اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ حسبِ معمول محل کے دس ملازمین اپنی ڈیوٹی پر آنے والے تھے۔

تنہائی ملتے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں سما گئے۔ بلکہ یوں جذب ہو گئے جیسے برسوں سے بچھڑنے کے بعد مل رہے ہوں... جیسے اندیشہ ہو کہ پھر بچھڑ جائیں گے۔ اس لیے الگ نہیں ہو رہے تھے۔

مگر کیا کیا جائے؟ بار بار الگ ہونا پڑ رہا تھا۔ دروازے پر مدھم دستک سنائی دی۔ انہوں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ انہیں ایک دوسرے کو چھوڑنا پڑا۔ سارہ نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "جی میں ہوں۔ صفائی کے لیے آیا ہوں۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "ابھی میں سو رہی ہوں۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے۔ صفائی کی ضرورت ہوگی تو بلالوں گی۔"

باہر خاموشی چھا گئی۔ وہ چلا گیا تھا۔ وہ وسیم کے پاس آ کر سرگوشی میں بولی۔ "بڑی مشکل ہے۔ یہ تمام ملازم شام تک رہیں گے۔ ہمیں اٹھتے بیٹھتے... بھاگتے اور چھپتے رہنا ہوگا۔"

دوسرے پہلو سے ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ دنیا والوں کے لیے مجرم تھے۔ ایسے چپ تھے جیسے بولنا بھول گئے ہوں۔ محل کا کوئی ملازم پھر سے اُدھر آ سکتا تھا۔

ویسے کوئی نہیں آیا۔ بیگم داؤد نے ملازموں سے کہہ دیا تھا کہ سارہ بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسے سونے دیا جائے۔ آج اس کے کمرے کی صفائی نہ کی جائے۔

دوپہر کے دو بجے سارہ نے دروازہ کھول کر کھانا لانے کا حکم دیا۔ آدھے گھنٹے میں حکم کی تعمیل ہو گئی۔ کھانے کی ٹرالی آئی تو دروازہ پھر اندر سے بند ہو گیا۔

وہ دونوں ٹرالی کے اطراف بیٹھ گئے۔ ٹی وی کو دھیمی آواز میں آن کیا۔ خواب گاہ میں رہ کر باتیں نہیں کر سکتے تھے اس لیے خاموشی سے کھانے کے دوران حالاتِ حاضرہ کا پروگرام دیکھنے لگے۔

وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس محل سے باہر عراق میں کیا ہو رہا ہے؟ ایسے ہی وقت پروگرام کے وقفے میں ان دونوں نے وسیم اور یاقوت کی تصویریں دیکھیں۔ انہیں خلافِ توقع دیکھ کر چونک گئے۔

وسیم کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا۔ اس نے خوش ہو کر یاقوت کو دیکھا۔ پھر بڑے جذبے سے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ "سارہ! یہ میری سسٹر ہیں۔"

وہ دونوں اسے دیکھنے اور اس کا پیغام سننے لگے۔ پس منظر سے کوئی خاتون کہہ رہی تھی۔ "یہ یاقوت العزیزی ہے اور یہ وسیم مصطفیٰ ہے۔ یاقوت اپنے اس منہ بولے بھائی کو تلاش کر رہی ہے۔"

وہ سارہ کی طرف جھک کر بولا۔ "یہ سچ مچ پریشان ہوں گی۔ مجھے تلاش کر رہی ہیں۔"

سارہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "چپ رہو۔ سننے دو، کیا کہا جا رہا ہے؟"

کہا جا رہا تھا۔ "اگر وسیم دیکھ رہا ہے اور یہ پیغام سن رہا ہے تو اسکرین پر نظر آنے والے نمبر پر یاقوت سے رابطہ کرے۔"

وہ فوراً ہی نمبر پڑھنے اور یاد کرنے لگا۔ آگے کہا جا رہا تھا کہ وسیم کی طرح یاقوت کا گھر بھی اجڑ گیا ہے۔ اس کی بہن اور ماں باپ سب ہی ہلاک ہو گئے ہیں۔ وہ تنہا ہے اور اپنے وسیم کو پکار رہی ہے۔

ایسا جذباتی پیغام سن کر وہ تڑپ گیا۔ اس نے اشارے سے سارہ سے کہا۔ "میں ابھی فون کروں گا۔"

www.pkdigest.com

وہ سوچنے لگی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ پھر اس کے ساتھ واش روم میں آ کر بولی۔ "تمھیں سسٹر کو تسلی دینا چاہیے کہ جہاں ہو خیریت سے ہو لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مجھے اپنا فون دو۔"

"جلدی نہ کرو۔ سوچنے دو' کیا کسی طرح تمہاری فون کال پکڑی جاسکتی ہے؟"

"نہیں پکڑی جائے گی۔ اگر ڈر تی ہو تو کال کے بعد سم نکال دینا۔ تمہارے پاس دوسری سم بھی ہوگی۔"

"ہاں ہے۔ آئندہ میں دوسری استعمال کروں گی۔"

اس نے فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو! فون پر بالکل نہ کہنا کہ یہاں چھپے ہوئے ہو۔"

"میں بھولے سے بھی تمہارا اور اس جگہ کا ذکر نہیں کروں گا۔"

اس نے اسکرین پر جو نمبر پڑھے تھے، انہیں پنچ کیا پھر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ کسی وجہ سے اٹینڈ کرنے میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ سسٹر کی آواز سننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

داؤد اسرار اپنے آفس میں چند اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ایک عورت تیزی سے چلتی ہوئی دستک دیے بغیر اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا، کا رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "سر! یاقوت کے لیے کال ہے۔"

داؤد ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بے تابی سے بولا۔ "فوراً اٹینڈ کرو۔"

اس عورت نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہیلو... کون؟"

وسیم نے بڑی محبت سے کہا۔ "سسٹر! میں وسیم بول رہا ہوں۔"

وہ بولی۔ "ہائے وسیم! تم کہاں ہو؟ اپنی سسٹر کو بھول گئے ہو؟ میں تباہ و برباد ہو گئی ہوں۔ بالکل اکیلی ہو گئی ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک تم ہی میرا سہارا ہو۔ تم کہاں ہو؟ ابھی بتاؤ' ابھی دوڑتی چلی آؤں گی۔"

"سسٹر! میں ایک جگہ چھپا ہوا ہوں۔ جیسے ہی یہاں سے نکلنے کا موقع..."

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ "ہیلو! چپ کیوں ہو گئے؟"

اس نے پوچھا۔ "آپ کی آواز کیسی ہے؟ مجھے کچھ مختلف لگ رہی۔"

وہ بولی۔ "میں پچھلے ایک ہفتے سے اپنے گھر والوں کی موت کا ماتم کرتی رہی ہوں۔ بین کرتے رہنے سے آواز پھٹ گئی ہے۔ ذرا بدل گئی ہے۔"

وسیم نے فون پر ہاتھ رکھ کر سارہ کے کان میں کہا۔ "یہ سسٹر نہیں لگ رہی ہے۔"

سارہ نے کہا۔ "سسٹر کے بارے میں اس سے کوئی بات پوچھو۔"

اس نے فون پر ہاتھ ہٹا کر پوچھا۔ "آپ یہ بتائیں' ہم بچھڑنے سے پہلے آخری بار کس جگہ تھے؟"

وہ بولی۔ "یہ فون پر کیوں پوچھ رہے ہو؟ میرے پاس آؤ... یا مجھے بلاؤ۔ روبرو ہو کر جو پوچھنا چاہو' پوچھتے رہنا۔"

"آپ ابھی بتائیں' ہم اس رات کس حالت میں تھے اور کس طرح دیوار پھاند کر فرار ہوئے تھے؟"

"فار گاڈ سیک! اپنی سسٹر کا امتحان نہ لو۔ میں اکیلی ہوں۔ بے یار و مددگار ہوں۔ میرے کام آؤ۔"

"میں ابھی آپ کے پاس آؤں گا لیکن جو پوچھا ہے پہلے اس کا جواب دیں۔"

"وسیم! میں تمہاری سسٹر یاقوت ہوں۔ مجھ سے بحث نہ کرو، مجھ پر شک نہ کرو۔"

اس نے فون بند کر کے سارہ سے کہا۔ "یہ میرے اور سسٹر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ ایک ہفتے پہلے ہم کہاں تھے اور ہم کس طرح دیوار پھاند کر گھر سے نکل گئے تھے۔"

سارہ اس فون سے سم نکالتے ہوئے بولی۔ "مجھے اندازہ تھا کہ تمھیں ڈھونڈ نکالنے کے لیے ایسی ہی حرکتیں کی جائیں گی۔ اب ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔"

دوسری طرف داؤد نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

اس عورت نے کہا۔ "وہ یقین نہیں کر رہا ہے کہ میں سسٹر یاقوت ہوں۔ اس نے فون بند کر دیا ہے۔"

داؤد نے اس سے فون چھینتے ہوئے ایک اعلیٰ عہدے دار سے کہا۔ "اس کا نمبر نوٹ کرو اور یہ معلوم کرو کہ..."

وہ بولتے ہوئے نمبر پڑھ رہا تھا۔ حیرت کے مارے اچھل پڑا۔ فون کی ننھی سی اسکرین پر اس کے اپنے گھر کا، اپنی بیٹی کا نمبر دکھائی دے رہا تھا... کہ ہوس کدے میں آنے والا لڑکا فرار نہیں ہوا ہے۔ اسی کے محل میں چھپا ہوا ہے۔

اور یہ کہ محل کے باہر سیکیورٹی منظم اور مستحکم ہے۔ وہ نکل نہیں پا رہا ہے۔ کل سے وہاں کھا پی رہا ہے اور بیٹی کا فون بھی استعمال کر رہا ہے۔

وہ غصے سے چیخ پڑا۔ "کتے! میں تیری بوٹی بوٹی کتوں کو کھلاؤں گا۔ میں آ رہا ہوں..."

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

آخری رقص

تنویر ریاض

جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد کا عموماً جذبات سے دور دور کا تعلق نہیں ہوتا ...... سطحی سوچ رکھنے والے لوگ صرف نفع و نقصان کو پیشِ نظر رکھتے ہیں ...... لیکن کبھی کبھی سکوتِ عقل میں کلامِ دل ہلچل مچا دیتا ہے

اقتدار و اختیار رکھنے والے شخص کی بے اختیاری کا قصہ

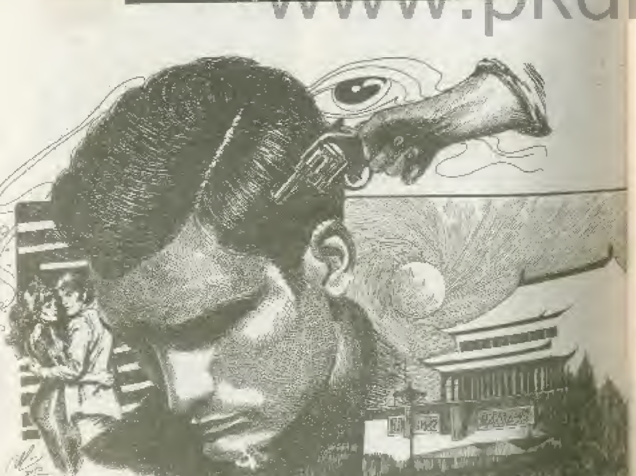

ٹیلی فون کی گھنٹی کی مسلسل آواز نے رائے کو گہری نیند سے بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ناگواری سے ریسیور اٹھایا اور جھنجلاتے ہوئے بولا۔ "ہیلو!"

"گڈ مارننگ مسٹر رائے!" دوسری طرف سے ایک لڑکی بول رہی تھی جسے اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ "مسٹر فین اپنے دفتر میں صبح نو بجے تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

رائے نے ٹیلی فون کے برابر میں رکھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت چھ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ اس نے بے دلی سے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔"

ٹیلی فون رکھ کر وہ سوچنے لگا کہ آخر مسٹر فین کو ایسا کیا کام آن پڑا کہ اس کی طلبی صبح صبح ہو گئی۔ اچانک ہی برابر میں لیٹی ہوئی لڑکی نے کروٹ بدلی اور آنکھیں مسلتے ہوئے پوچھا۔ "اس وقت کس کا فون آ گیا؟"

"تمہارے دادا کا۔" رائے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

فیونا فن سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "او گاڈ! کہیں انہیں ہمارے بارے میں معلوم تو نہیں ہو گیا؟"

"اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ فون کرنے کے بجائے میری خاطر تواضع کے لیے دو بدمعاش بھیج دیتا۔ اس نے مجھے نو بجے اپنے دفتر میں بلایا ہے۔"

www.pkdigest.com

''کس سلسلے میں؟''

''اس سے ملے بغیر کیا کہہ سکتا ہوں؟'' رائے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو وہاں جانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔''

☆☆☆

ٹھیک پونے نو بجے وہ اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیے فلائن فین انٹرپرائز کے دفتر میں موجود تھا۔ استقبالیہ پر وہی لڑکی بیٹھی تھی جس نے صبح اسے فون کیا تھا۔ رائے کو دیکھتے ہی وہ مسکرائی اور بولی۔ ''گڈ مارننگ مسٹر رائے! تم اندر جا سکتے ہو۔''

''شکریہ۔'' رائے نے کہا اور ان دو مہمانوں کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا جو فین سے ملاقات کے لیے پہلے سے وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور اندر چلا گیا۔ فلائن فین، شکاگو میں پیدا ہوا، وہیں پلا بڑھا۔ بچپن سے ہی وہ جرائم پیشہ لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا آیا تھا۔ ابتدا میں اس نے چھوٹے موٹے کام کیے پھر ترقی کرتے کرتے بڑے کارنامے سرانجام دینے لگا۔ اب ستر سال کی عمر میں وہ ''آؤٹ فٹ'' گروپ کے ان بارہ سرکردہ ارکان میں شامل تھا جو گروپ کے مختلف مالی معاملات کے ذمے دار تھے۔ ان میں جبری بھتا، لوٹ مار، غیر قانونی جوا، منظم قحبہ گری، قرضوں کی وصولی، الکحل کی ناجائز تجارت اور سیاسی غنڈا گردی وغیرہ جیسے امور شامل تھے۔ فلائن فین، ان مشینوں کی تیاری اور تقسیم کا ذمے دار تھا جو کیسینو میں جوئے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ وہ سفید بالوں، عقابی آنکھوں اور طوطے جیسی ناک والا طویل قامت شخص تھا اور اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر کوئی شخص اس کے سامنے جھوٹ بولے تو وہ ایک منٹ میں اس کا جھوٹ پکڑ لیتا ہے۔ رائے کو دیکھتے ہی اس نے کسی تمہید کے بغیر کہنا شروع کر دیا۔

''شاید تم اسے پسند نہ کرو لیکن میں تمہیں دوبارہ شنگھائی بھیج رہا ہوں۔''

''دوبارہ...؟'' رائے اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''میں گزشتہ مہینے تو وہاں گیا تھا۔''

''بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارا وہاں جانا کیوں ضروری ہے۔''

رائے اس کے سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ فین نے کہنا شروع کیا۔ ''تم تو جانتے ہو کہ مونٹانا میں واقع گریزی ہارس ریزورٹ اور کیسینو کا افتتاح چھ ہفتے بعد ہونے والا ہے۔ اس کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے اور اندرونی تزئین و آرائش بھی شیڈول کے مطابق جاری ہے۔ ہمیں معاہدے کے مطابق اس کے افتتاح سے پہلے پانچ ہزار سلاٹ مشینیں سپلائی کرنا ہیں اور مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہم نے جس کمپنی کو ان مشینوں کی تیاری کا آرڈر دیا تھا، وہ وقت پر ڈیلیوری نہیں دے سکے گی۔''

''میرے خیال میں ان مشینوں کی تیاری وانگ چنگ کے ذمے ہے، انھیں کیا مسئلہ ہے؟'' رائے نے پوچھا۔

''بال بیرنگ... یہی وہ پرزہ ہے جو سلاٹ کے سلنڈر کو گھماتا ہے اور اس کے بغیر سلاٹ کام نہیں کرتا۔'' فین آگے کی طرف جھکا اور میز پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''سارا مسئلہ انہی بال بیرنگز کی وجہ سے ہوا ہے۔ وانگ چنگ نے ان بال بیرنگز کی تیاری کا آرڈر مَن ہنگ میٹلز نامی اسٹیل مولڈنگ کمپنی کو دیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا پلانٹ ہے جسے مَن ہنگ نامی شخص نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد شروع کیا تھا اور اب اس کا بیٹا اور دو پوتے اسے چلا رہے ہیں۔ اس فیکٹری میں سو کے قریب مرد اور عورتیں کام کرتے ہیں اور وہاں بال بیرنگز کے علاوہ دوسرے پرزے بھی بنائے جاتے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے ہم سے پہلے ایک اور کام شروع کر رکھا ہے اور اس کے ختم ہونے سے پہلے وہ بال بیرنگ کی تیاری شروع نہیں کر سکتے۔ وانگ چنگ نے انھیں آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مَن ہنگ کا بیٹا اور پوتے اپنی بات سے ہٹنے پر تیار نہیں اور ان کا کہنا ہے کہ دوسرا کام زیادہ اہم ہے اس لیے وانگ چنگ کو انتظار کرنا ہوگا۔ اس کی وجہ سے ہماری پوزیشن بہت خراب ہو گئی ہے۔ اگر ہم یہ مشینیں وقت پر سپلائی نہ کر سکے تو نہ صرف یہ کہ سولہ ملین ڈالرز سے محروم ہو جائیں گے بلکہ پانچ ملین ڈالرز جرمانہ بھی ادا کرنا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہاری سمجھ میں ساری بات آ گئی ہوگی؟''

رائے نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟''

''تم وہاں جا کر وانگ چنگ کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھو۔ مَن ہنگ کے بیٹے سے مل کر اسے سمجھاؤ کہ وہ ہمارے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ انھیں بتاؤ کہ اس طرح وہ صرف وانگ چنگ کو ہی نقصان نہیں پہنچا رہے بلکہ امریکا کی ایک بڑی کمپنی بھی اس سے شدید متاثر ہوگی۔ انھیں راضی کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرو۔ اگر بدمعاشی دکھانی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرنا۔ مجھے انجام کی پروا نہیں۔ میں ہر قیمت پر بال بیرنگز حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ وقت پر مشینوں کی سپلائی ہو سکے۔''

رائے نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''او کے باس! میں اس بارے میں پورا خیال رکھوں گا۔''

فین کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ ہمیشہ اپنی مرضی کا جواب سن کر خوش ہوتا تھا، اسے غیر ضروری گفتگو پسند نہیں تھی۔ اس نے رائے کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری سیٹ بک کرا دی گئی ہے۔ شنگھائی ائرپورٹ پر تمہیں جن جن ملے گی جو وانگ چنگ اور مَن ہنگ سے گفتگو کے دوران تمہارے مترجم کے فرائض انجام دے گی۔ اس کے علاوہ تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، اس سے بلاتکلف کہہ سکتے ہو۔''

رائے نے سر ہلایا اور جانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ فین نے مزید کہا۔

''تم ڈینس وارڈ نامی وکیل کو جانتے ہو؟''

''بہت زیادہ نہیں۔ وہ ایک قانونی فرم کے لیے کام کرتا ہے جو فرینک پیانیتا کے قانونی معاملات دیکھتی ہے۔''

فرینک پیانیتا بھی آؤٹ فٹ کے سرکردہ رہنماؤں میں سے ایک تھا اور اس کا شعبہ غیر قانونی قرضوں کی وصولی سے متعلق تھا۔ رائے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''کیا وہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ پیدا کر رہا ہے؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' فین ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میری اس سے ملاقات پیانیتا کی باربی کیو پارٹی میں ہوئی تھی۔ میں فیونا کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا، گو کہ وہ ایسی جگہوں پر جانے سے کتراتی ہے۔ وہ اور ڈینس کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دو دن پہلے ڈینس نے فون کر کے کہا کہ اگر مجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ فیونا کو اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ میری اجازت کے بغیر ایسا نہیں کرے گا۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' رائے کا حلق خشک ہونے لگا۔ فیونا کی ذات کے حوالے سے اس گفتگو نے اسے مضطرب کر دیا تھا۔ فین نے اس کی کیفیت کو محسوس کیے بغیر نرم لہجے میں کہا۔

''تم جانتے ہو کہ میں فیونا سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ بیٹے اور بہو کے حادثے میں ہلاک ہو جانے کے بعد وہی میرے لیے سب کچھ ہے۔ گو کہ اس کی دادی، چچا اور کزن بھی ہیں لیکن اسے باپ جیسی شفقت میں ہی دے سکتا ہوں۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کی شادی ہو، بچے ہوں۔ اس کا گھر بس جائے لیکن مجھے اس کے جوڑ کا کوئی مناسب شخص نظر نہیں آتا۔ میرے جاننے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جائز آمدنی سے بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں لیکن ان کا تعلق عام خاندانوں سے ہے۔ میں اس کی شادی کسی ایسے لڑکے سے کرنا چاہتا ہوں جس کا آؤٹ فٹ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟''

''سمجھتا ہوں باس۔ وہ بہت ہی خاص لڑکی ہے اور ایک بہترین زندگی گزارنا اس کا حق ہے اور تم بھی یہی چاہتے ہو۔''

''بالکل۔'' فین نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رائے کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''ہم دونوں میں بہت سی باتیں ایک جیسی ہیں۔ کبھی کبھی تم مجھے بالکل اپنے پوتے جیسے لگتے ہو۔ اگر میرا کوئی پوتا ہوتا تو وہ بالکل تمہارے جیسا ہوتا۔ بہرحال، میں نے ڈینس کو اجازت دے دی ہے کہ اگر فیونا چاہے تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے۔ میں اس کی ذاتی زندگی میں دخل دینا مناسب نہیں سمجھتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ کسی سے چھپ کر ملتی ہے۔ تم شنگھائی سے واپس آ جاؤ پھر تمہیں یہ معاملہ بھی دیکھنا ہوگا۔ مجھے تم پر پورا بھروسا ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم رازداری سے اس شخص کا پتا چلا لوگے۔''

''یقیناً میں ایسا ہی کروں گا۔'' رائے نے فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا لیکن اندر ہی اندر وہ ڈر بھی

ثبوت

ہوٹل کا منیجر اس نوجوان کا انٹرویو لے رہا تھا جس نے اس ہوٹل میں بیرے کی حیثیت سے ملازمت کرنے کی درخواست کی تھی۔

''تم نے پہلے بھی کسی ہوٹل میں بیرے کا کام کیا ہے؟''

''جی ہاں جناب۔ چھ ماہ تک انٹرکان میں کام کر چکا ہوں۔''

''تمہارے پاس وہاں کی ملازمت کا کوئی سرٹیفکیٹ ہے؟''

''جی نہیں جناب۔'' امیدوار نے جواب دیا۔ ''سرٹیفکیٹ ملا تو تھا لیکن مجھ سے کھو گیا۔''

''پھر ہمیں کیسے معلوم ہو کہ تم انٹرکان میں کام کر چکے ہو؟''

''ثبوت کے لیے میں آپ کو انٹرکان کے چمچے پلیٹیں اور ایش ٹرے دکھا سکتا ہوں جناب!''

رہا تھا کہ کہیں فین کو اس کے اور فیونا کے تعلقات کی بھنک تو نہیں پڑ گئی؟

☆☆☆

فیونا کو جب معلوم ہوا کہ رائے شنگھائی جا رہا ہے تو وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ ”انہوں نے تمہیں ایک مہینا پہلے بھی وہاں بھیجا تھا۔ اگر کام اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے تو وہ وہاں اپنی برانچ کیوں نہیں کھول لیتے؟“

”اس کی ایک برانچ پہلے سے موجود ہے اور جن جن وہاں کے روزمرہ کے معاملات دیکھتی ہے لیکن یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ میں ذاتی طور پر اسے ہینڈل کروں۔“

”تمہیں وہاں کتنے دن لگ جائیں گے؟“ فیونا کچھ نرم پڑتے ہوئے بولی۔

”چار سے پانچ دن تو لگ سکتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اس مسئلے کو جلد از جلد حل کر سکوں، چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے۔“

فیونا چونکتے ہوئے بولی۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا... کوئی بھی طریقے سے کیا مراد ہے؟“

رائے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ”کسی بھی مسئلے کے بہت سے حل ہو سکتے ہیں اور مجھے ان میں سے بہترین کا انتخاب کرنا ہوگا۔“

اس نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کیا اور بولا۔ ”ہائے واوے میں نے سنا ہے کہ تم مجھ سے بے وفائی کر کے کسی ڈینس وارڈ نامی شخص سے پینگیں بڑھا رہی ہو؟“

فیونا ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹی اور بولی۔ ”کون... تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”ڈینس وارڈ!“ رائے نے اس کا نام دہرایا۔ ”تمہاری اس سے ملاقات فریک پیانیتا کی باربی کیو پارٹی میں ہوئی تھی۔“

”اوہ... وہ جو انکل فریک کی لا فرم کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے فون کر کے باہر چلنے کی دعوت دی تھی لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارے دادا کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم کسی ایسے شخص سے رشتہ استوار کر لو جو جائز آمدنی سے اچھی زندگی گزار رہا ہو۔“

”وہ تو بہت کچھ چاہتے ہیں۔“ فیونا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”ان کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ میں ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزاروں۔“

”تمہیں اس شخص کے ساتھ ایک دو بار باہر جانا چاہیے تاکہ مسٹر فین کی توجہ تم پر سے ہٹ جائے اور انہیں اطمینان ہو جائے کہ تم ان کی مرضی کے شخص کے ساتھ وقت گزار رہی ہو۔“

”تم چاہتے ہو کہ میں تم سے بے وفائی کروں؟“ وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی۔

”اچھا ہے تھوڑی سی تفریح رہے گی اور ویسے بھی تم سے قریب رہ کر یہ تماشا دیکھ رہا ہوں گا۔“

”یہ مشورے اپنے پاس ہی رکھو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“

☆☆☆

شنگھائی تک ساڑھے چودہ گھنٹے کا سفر خاصا اکتا دینے والا تھا اور فرسٹ کلاس کی تمام سہولتوں کے باوجود رائے کو یہ پرواز تکلیف دہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بوریت دور کرنے کے لیے لیپ ٹاپ سے کھیلنا شروع کر دیا اور جب اس کی کلائی میں درد ہونے لگا تو اس نے لیپ ٹاپ بند کر کے ایک کتاب کھول لی۔ اسے مطالعے کا بہت شوق تھا اور نوجوانی میں دوسرے لڑکوں کے برعکس وہ فلمیں دیکھنے یا تھیٹر جانے کے بجائے لائبریری میں بیٹھا کتابوں سے سر کھپاتا رہتا۔ اسے امریکی تاریخ سے بہت دلچسپی تھی۔ خاص طور پر پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے دوران پیش آنے والے واقعات پر اس کی گہری نظر تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتا کہ کاش وہ اس زمانے میں پیدا ہوا ہوتا تو اسے حقیقی گینگسٹرز مثلاً ڈیان اوبینین یا بگس موران کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔

جب وہ پڑھتے پڑھتے تھک گیا تو اس نے کتاب بند کر دی اور آنکھیں بند کر کے فیونا کے بارے میں سوچنے لگا۔ فیونا کے ساتھ اس کے تعلقات کا آغاز بڑے ہی غیر محسوس انداز میں ہوا تھا جب فین نے اسے فیونا کو کالج سے گھر تک لانے اور لے جانے کی ذمے داری سونپی تھی۔ ان چار سالوں میں وہ ایک دوسرے کے بے حد قریب آگئے۔ ڈرائیونگ کے دوران میں وہ نئی فلموں، موسیقی، فیشن اور ناولز پر گفتگو کرتے۔

ایک دن رائے نے فیونا کو بتایا کہ اس نے ایک ہائی رائز اپارٹمنٹ لیز پر لیا ہے۔ فیونا نے اس سے وہ اپارٹمنٹ دیکھنے کی فرمائش کی۔ رائے جانتا تھا کہ فیونا کو وہاں لے جانے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے اور شاید وہ بھی اس حقیقت سے باخبر تھی۔ اس کے باوجود رائے نے فیونا کی خواہش کا احترام

کیا۔ اس روز وہ تین گھنٹے کی تاخیر سے گھر پہنچے۔ مسٹر فین نے اسے اپنی اسٹڈی میں طلب کیا اور دیر سے آنے کی وجہ جاننا چاہی۔

”واپس آتے ہوئے ہماری گاڑی کا ایک ٹائر پنکچر ہو گیا۔“ رائے نے جھوٹ بولا۔ ”مجھے قریبی سروس اسٹیشن فون کر کے آدمی بلانا پڑا۔ پھر فیونا کو بھوک ستانے لگی تو ہم ہائی وے پر واقع ایک ریسٹورنٹ میں کھانے کے لیے چلے گئے۔ واپسی میں کافی ٹریفک بھی تھا اس لیے دیر ہوتی چلی گئی۔“

مسٹر فین نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کہیں تم میری پوتی کے بارے میں غلط انداز سے تو نہیں سوچ رہے؟“

”ہرگز نہیں باس!“ رائے نے وضاحت کی۔ ”میں فیونا کو اپنی بہن سمجھتا ہوں اور بڑے بھائی کی طرح اس کا خیال رکھتا ہوں۔“

”اوہ۔“ فین نے ایک گہری سانس لی۔ یہ سننے کے بعد اس کا غصہ کافی حد تک کم ہو گیا۔ رائے کو یوں لگ رہا تھا کہ اسے موت کی سزا سنائی جانے والی ہے۔ شاید ہی کوئی شخص فین سے جھوٹ بول کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا ہوگا اور رائے انہی میں سے ایک تھا۔

اس واقعے کے بعد رائے اور فیونا اور بھی قریب ہو گئے، گوکہ یہ خطرہ موجود تھا کہ جس دن فین کو یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ رائے کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ اسی لیے وہ دونوں بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ اس کے باوجود رائے جانتا تھا کہ یہ آتش فشاں کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ اسی لیے وہ چاہ رہا تھا کہ فین کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے فیونا اس وکیل سے تعلقات استوار کر لے۔ اس کی آڑ میں وہ دونوں اپنی ملاقاتیں جاری رکھ سکتے تھے۔ رائے نے سوچ رکھا تھا کہ شنگھائی سے واپس آنے کے بعد وہ ایک بار پھر فیونا کو قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔

☆☆☆

جہاز نے شنگھائی ائرپورٹ پر دوپہر دو بجے لینڈ کیا۔ یہ ائرپورٹ شہر سے پچیس کلومیٹر دور مشرق میں واقع ہے۔ جن جن، امیگریشن ہال میں اس کی منتظر تھی۔ وہ اپنے لمبے قد کی وجہ سے بہ آسانی پہچانی جا سکتی تھی کیونکہ عام چینیوں کی نسبت اس کا قد کچھ زیادہ یعنی پانچ فٹ دس انچ تھا۔ اس نے گرے سلک کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے بالوں کی چوٹی کمر تک لہرا رہی تھی۔ اس نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ رائے کا استقبال کیا اور بولی۔ ”اتنی جلدی تم سے دوبارہ

مایوسی گناہ ہے
ہم چھین لیں گے آپ کی ہر پریشانی اللہ کے کرم سے
روحانی اسکالر
پیرزادہ وسیم جعفری
کا اعلان
وہ کام جو بڑے سے بڑا عامل و جادوگر نہ کر سکے وہ میرے بزرگوں کی دعا سے ہو جاتا ہے مثلاً شوہر کے دل سے شک و نفرت کی آگ، سنگدل محبوب نے نیند حرام کر دی ہو تجارت میں دن بدن نقصان، رشتوں میں بندش، عزیزوں سے لڑائی جھگڑا عزت و وقار میں کمی یا دشمن حاوی ہو، بیٹی کی سسرال میں عزت نہیں، امیگریشن کے مسائل، لاٹری نمبر غرضیکہ ہر مشکل کیسی ہی کیوں نہ ہو اپنی آخری امید سمجھ کر رابطہ کریں
پیرزادہ وسیم جعفری
گجرات پاکستان
0300-7462777
0333-8217808

ملنے کی توقع نہیں تھی۔"

"میں خود بھی اس کی امید نہیں کر رہا تھا لیکن حالات ہی ایسے ہو گئے کہ مجھے دوبارہ آنا پڑا۔"

امیگریشن کاؤنٹر پر لمبی قطار تھی۔ جن جن اسے نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھی اور ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے میز پر بیٹھے آفیسر کی جانب رائے کا پاسپورٹ اور ایک لفافہ بڑھایا۔ آفیسر نے وہ لفافہ میز کی دراز میں ڈال دیا اور پاسپورٹ پر تیس دن کا ویزا لگا کر واپس کر دیا۔ اس کے بعد وہ ایک کوریڈور سے گزر کر بیرونی لاؤنج میں پہنچے جس کے باہر ایک سیاہ لیموزین کھڑی تھی اور ایک ہینڈسم نوجوان بہترین سوٹ میں ملبوس ان کا انتظار کر رہا تھا۔ جن جن نے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ میرا بھانجا کم ہے، میری بہن کا سب سے بڑا بیٹا۔ تم اس سے پہلے بھی مل چکے ہو، یاد کرو۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ گزشتہ سال تمہارے اپارٹمنٹ پر ہونے والی پارٹی میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

کم خیر مقدمی انداز میں تھوڑا سا جھکا اور اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ رائے کو اس کے انداز میں تھوڑی سی لاتعلقی محسوس ہوئی لیکن اس نے نظر انداز کر دیا۔ کچھ دیر بعد ان کی لیموزین ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔ جن جن نے ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے بنے ہوئے چھوٹے سے ریفریجریٹر کا دروازہ کھولا اور بولی۔ "تم کچھ پینا چاہو گے؟"

"صرف لائم واٹر برف کے ساتھ۔"

جن جن نے لائم واٹر کی بوتل نکالی اور گلاس بھرنے کے بعد اس میں برف کی دو ڈلیاں بھی ڈال دیں۔

رائے نے شکریہ کہہ کر گلاس تھاما اور پہلا گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ "بال بیرنگ کا کیا مسئلہ ہے؟"

"یہ سب ایک قدرتی آفت کی وجہ سے ہوا۔" جن جن کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تین ہفتے پہلے فوجیان صوبے کے جنوبی ساحل پر ایک زبردست طوفان آیا جس میں کئی فیکٹریاں ڈوب گئیں۔ ان میں سانتا جیل ورکس بھی تھی۔"

"اس واقعے کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق ہے؟" رائے نے بے چینی سے پوچھا۔

"عام حالات میں تمہیں اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ ویسے تو یہ بال بیرنگ سپلائی کرنے کی ذمے داری من ہنگ میٹلز کی ہے لیکن اس بار انہیں نارتھ کوریا کی لگژری سیڈان کے لیے ہُڈ بنانے کا آرڈر مل گیا۔ اس منصوبے میں چینی حکومت بھی برابر کی پارٹنر ہے۔ من ہنگ میٹلز کی اتنی استعداد نہیں کہ وہ بال بیرنگ کے ساتھ ساتھ ہُڈ بھی سپلائی کر سکیں اور نہ ہی وہ اتنے پرکشش آرڈر سے دست بردار ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بال بیرنگ بنانے کا کام سانتا جیل ورکس کو سونپ دیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے وقت پر پورا آرڈر مکمل کر لیا تھا کہ طوفان آ گیا اور ہمارے بال بیرنگ سمندر کی نذر ہو گئے۔"

رائے نے ایک گہری سانس لی۔ بہت ہی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ ایک طوفان آیا اور اس نے اس فیکٹری کو نگل لیا جس کا عام حالات میں اس سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا لیکن بیرنگ نہ ملنے تو سلاٹ مشینوں کی سپلائی بروقت ممکن نہ ہوتی اور فین کو لاکھوں ڈالرز کا نقصان ہو جاتا۔ اب رائے سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ وہ بوڑھے فین کی خاطر اس گتھی کو سلجھائے جسے اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ رائے اس کی پوتی کے ساتھ تعلق قائم کیے ہوئے ہے تو وہ بے دریغ اسے گولی مار دیتا۔

"غالباً مسٹر فین کو یہ بات نہیں بتائی گئی کہ من ہنگ والوں نے بال بیرنگ کا آرڈر کسی دوسری فیکٹری کو دے دیا تھا؟"

"اس کی فکر وانگ چنگ کو ڈر تھا کہ ایسی صورت میں مسٹر فین ساری ذمے داری اس پر ڈال دیتے۔ من ہنگ والوں کی خوشامد کی گئی کہ وہ ہنگامی بنیادوں پر کام کر کے معاہدے کے مطابق بال بیرنگ بنا دیں لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا... کیونکہ ان کی نظر میں ہُڈ کا آرڈر بہت اہم ہے جس کی بروقت تکمیل پر وہ دونوں حکومتوں کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔"

"ان کے لیے بہتر ہوتا کہ وہ مسٹر فین کی ناراضی کو بھی ذہن میں رکھتے۔" رائے نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں اسی لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔" جن جن اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی۔ "من ہنگ والوں کو بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ یہ سودا کس کی معرفت ہو رہا ہے۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ مشینوں کی بروقت سپلائی نہ ہونے سے اگر کسی امریکی کو پریشانی ہوگی تو وہ اتنی دور بیٹھ کر ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

کچھ دیر بعد ان کی گاڑی ایک ریستوران کے سامنے رک گئی۔ جن جن نے رائے سے پوچھا۔ "تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی... کیوں نہ پہلے کچھ کھا پی لیا جائے؟"

"اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ میں، تم اور وانگ چنگ کب من ہنگ سے مل سکیں گے؟"

"بے فکر رہو۔ کل صبح ہمارا پہلا کام یہی ہوگا۔" جن جن مسکراتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ کھانا کھانے کے بعد میں ایک لمبی نیند لوں گا تاکہ کل صبح من ہنگ سے دو دو ہاتھ کر سکوں۔"

جس ریستوران میں جن جن اسے لے کر گئی، وہ پہلی منزل پر واقع تھا جہاں خوب صورت اور مستعد ایشیائی لڑکیاں گاہکوں کی خدمت پر مامور تھیں۔ ہال میں ہلکی آواز میں میوزک بج رہا تھا اور ایک کونے میں نیم دائرے کی شکل میں ڈانس فلور بنا ہوا تھا جہاں کچھ نوجوان جوڑے جوتوں کے بغیر رقص کر رہے تھے۔ رائے نے بھی اپنے جوتے اتار دیے اور کرسی کے قریب رکھتے ہوئے ویلوٹ کشن پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گیا۔

"تم کوئی خاص ڈش لینا پسند کرو گے؟" جن جن نے پوچھا۔

"نہیں۔ جو چاہے منگوا لو۔"

جن جن نے مینیو پر ایک نظر ڈالی اور فرائیڈ چکن کے ساتھ دیگر لوازمات کا آرڈر دے دیا۔ کھانا آنے میں دیر تھی۔ جن جن نے معنی خیز نگاہوں سے رائے کو دیکھا اور بولی۔

"ڈانس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہاں ہاں... کیوں نہیں۔" وہ وقت گزارنے کے خیال سے بولا۔

جن جن فوراً ہی کھڑی ہو گئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈانس فلور کی جانب چل دی۔ اس کا قد لمبا تھا اس لیے رائے کے ساتھ رقص کرتے ہوئے اسے کوئی مشکل نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"میری بہن ہمیشہ پوچھتی ہے کہ میں نے کبھی تمہارے ساتھ وقت گزارا؟"

"پھر تم نے اسے کیا بتایا؟"

"وہی جو سچ ہے۔ میں اپنی بہن سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ شاید میں تمہارے لیے پُرکشش نہیں ہوں۔"

"یہ بہت بڑا جھوٹ ہے جو تم بول سکتی تھیں۔" رائے نے اس کی کمر کے گرد اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "تم سے زیادہ پیاری عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

"پھر تم مجھ سے دور کیوں رہتے ہو؟" جن جن نے شکوہ کیا۔

"اس لیے کہ میں پہلے ہی ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور اس سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔"

"لیکن وہ تو یہاں نہیں ہے پھر اسے ہمارے تعلق کے بارے میں کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟"

"تم جانتی ہو کہ عورتیں ان باتوں کو بہت جلد محسوس کر لیتی ہیں۔ میں لاکھ چھپانا چاہوں لیکن وہ جان جائے گی کیونکہ اس کی زندگی میں آنے والا میں واحد مرد ہوں۔"

"اسے میں اپنی بدقسمتی ہی کہوں گی۔" جن جن مایوس ہوتے ہوئے بولی۔

"ایک طرح سے یہ میری بھی بدقسمتی ہے۔" رائے شاعرانہ انداز میں بولا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنی میز پر آ گئے۔ انہوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اس دوران جن جن زیادہ تر خاموش ہی رہی پھر اس نے رائے کو اس کے ہوٹل چھوڑا اور گڈ نائٹ کہہ کر لابی سے ہی واپس چلی گئی۔

اسٹیم باتھ لینے اور مساج کروانے کے بعد اس نے آٹھ بجے کے قریب فیونا سے اس کے اپارٹمنٹ کے فون پر بات کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت شکاگو میں دن کے دو بج رہے ہوں گے اور شاید وہ گھر پر نہیں تھی اس لیے اس سے بات نہ ہو سکی۔ اس نے جان بوجھ کر اس کے سیل فون پر رابطہ نہیں کیا۔ نہ جانے وہ کس کے ساتھ ہو اور اسے بات کرنے کے لیے پرائیویسی میسر آ سکے یا نہیں۔ وہ زیادہ وقت اپنی دادی کے ساتھ گزارتی تھی اور کبھی کبھی اپنے کزن ڈیزی کے پاس بھی چلی جاتی تا کہ اس کے دو ماہ کے بیٹے کی دیکھ بھال کر سکے۔

رائے نے جونہی ناشتا ختم کیا، جن جن اور وانگ چنگ بھی آ گئے۔ ان تینوں نے لیونگ روم میں بیٹھ کر ہی چائے پی۔ وانگ چنگ ایک خوش لباس شخص تھا اور بڑی روانی سے انگریزی بول لیتا تھا۔ اس روز جن جن نے سادہ کاٹن کا سوٹ اور بغیر ہیل کے جوتے پہن رکھے تھے۔ آنکھوں پر چشمہ بھی تھا جو شاید چہرے کی خوب صورتی میں اضافے کے لیے لگایا گیا تھا اور بظاہر وہ ایک ترجمان کا کردار ادا کر رہی تھی جسے اس دن کے لیے عارضی طور پر ہائر کیا گیا تھا۔ من ہنگ فیملی کو وانگ چنگ یا فلائن فین کے ساتھ اس کے تعلقات کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔

"تم بالکل اسکول گرل لگ رہی ہو۔" رائے نے اسے چھیڑا۔

"تم کسی وقت بھی میرے ساتھ کلاس اٹینڈ کر سکتے ہو۔" جن جن نے بھی ذومعنی جواب دے کر حساب برابر کر دیا۔

چائے پینے کے دوران میں وہ تینوں من ہنگ سے

بات کرنے کے لیے مختلف نکات پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ وہ کسی ایسے نکتے کی تلاش میں تھے جس کے ذریعے من ہنگ کو قابو کیا جاسکے۔

"سچی بات تو یہ ہے۔" چنگ نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور رائے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے کوئی بھی پیشکش قابلِ قبول ہوسکتی ہے۔ خاص طور پر من ہنگ کے بیٹے کے ساتھ بات کرنا بہت مشکل ہے اور دونوں بیٹے کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور کبھی اپنے باپ کی مرضی کے خلاف نہیں جاتے۔"

"اس فرم کو شروع کرنے والا تو من ہنگ ہے... کیا اس کی بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی؟" رائے نے پوچھا۔

"عمر کے ساتھ اس کی عقل بھی موٹی ہوگئی ہے۔"

"اچھا۔" رائے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے۔ دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں جن جن سے ملیں۔ وہ ان الفاظ کا مفہوم خوب اچھی طرح سمجھتی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن وانگ چنگ بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رائے اپنا مسئلہ حل کرنے کی خاطر کسی کو قتل بھی کرسکتا ہے۔

ان کی لیموزین انڈسٹریل پارک پہنچی جہاں من ہنگ میٹلز پلانٹ واقع تھا۔ ان کی ملاقات ٹاپ فلور کے عالی شان دفتر میں کمپنی کے صدر ناتھن من ہنگ اور اس کے دو بیٹوں الیگزینڈر اور ہیزر سے ہوئی۔ رسمی جملوں کا تبادلہ کرنے اور چائے پینے کے بعد ان کے درمیان اصل موضوع پر گفتگو شروع ہوئی۔ رائے اور وانگ چنگ، ناتھن کے بالکل سامنے بیٹھے تھے جبکہ جن جن، رائے سے ذرا پیچھے اس طرح بیٹھی تھی کہ بہ آسانی اس کے لیے ترجمان کے فرائض انجام دے سکے جبکہ ناتھن کے دونوں بیٹے اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ رائے نے بڑی نرمی سے اپنا مسئلہ بیان کیا جسے جن جن، چینی زبان میں ترجمہ کرتی جارہی تھی۔ "میرے مالک نے ایک کیسینو کو پانچ ہزار سلاٹ مشینیں فراہم کرنے کا معاہدہ کیا ہے جو کیسینو کے افتتاح سے پہلے سپلائی کرنی ہیں۔ مسٹر وانگ چنگ کو ان مشینوں کی تیاری کا کام سونپا گیا تھا۔ وہ اپنے حصے کا کام مکمل کرچکے ہیں لیکن آپ کی جانب سے بال بیرنگ سپلائی نہ ہونے کی وجہ سے یہ مشینیں نامکمل ہیں..."

"پلیز، مسٹر رائے!" ناتھن من ہنگ نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا اور بولا۔ "مجھے اس کہانی کو سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسٹر وانگ چنگ پہلے ہی تمہارے مسئلے کے بارے میں تفصیل سے بتاچکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت بھی انہیں میری مداخلت پر صدمہ پہنچا ہے لیکن ہم سب کا قیمتی وقت بچانے کی خاطر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس سلسلے میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں کہ اس وقت...... بال بیرنگ سمندر کی تہ میں غرق ہوچکے ہیں۔"

رائے نے بھی جواب میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور آہستہ آہستہ بولنے لگا تاکہ جن جن کو ترجمہ کرنے میں آسانی ہو۔ "مجھے افسوس ہے لیکن میرے مالک کا خیال ہے کہ اس میں ساری غلطی تمہاری ہے۔ طوفان نے من ہنگ فیکٹری کو تباہ نہیں کیا جہاں معاہدے کے مطابق یہ بال بیرنگ بنائی جاتیں۔"

وہ دونوں آدھ گھنٹے تک ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ رائے کا اصرار تھا کہ ناتھن دوسرا کام چھوڑ کر پہلے بال بیرنگ تیار کرے لیکن ناتھن نے اسے ناممکن قرار دیا کیونکہ وہ ٹونڈ کی تیاری کے لیے اپنی فیکٹری میں ضروری انتظامات کرچکا تھا۔ اس موقع پر وانگ چنگ نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ "اگر انتظامات کو فوراً روک دیا جائے تو ایک یا دو دن ضرور ضائع ہوں گے لیکن اب بھی بال بیرنگ تیار کرکے سلاٹ مشینوں میں لگائے جاسکتے ہیں تاکہ انہیں وقتِ مقررہ پر امریکا پہنچایا جاسکے۔"

"بالکل نہیں۔" ناتھن نے قطعی لہجے میں کہا۔ اس کے خیال میں ہارتھ کوریا کی گاڑیوں کے لیے مُنڈ کی تیاری جوئے کی مشینوں سے زیادہ اہم تھی۔ اس مرحلے پر رائے جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جن جن اور وانگ چنگ نے بھی اس کی تقلید کی۔ "شاید کل ہم اس پر مزید گفتگو کرسکیں۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن ناتھن اپنی جگہ سے نہیں اٹھا۔ وانگ چنگ کو شدت سے اپنی بے عزتی کا احساس ہوا جسے اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ رائے کو بھی اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ وہ مایوسی کے عالم میں وہاں سے رخصت ہوئے۔ وانگ چنگ کو اس کے پلانٹ پر اتارا پھر رائے اور جن جن کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو شروع ہوگئی۔

"اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی ہم سے تعاون نہیں کرے گا۔" جن جن نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" رائے نے آہستہ سے جواب دیا۔ "وہ اپنے بیٹوں کی موجودگی میں ایک بار جو موقف اختیار کرچکا تھا، اس سے دست بردار نہیں ہوسکتا ورنہ ان کی نظر میں اس کی عزت گھٹ جائے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ بیٹوں پر رعب جمانے کے لیے اتنی سختی دکھا رہا ہے۔"

"ہاں، میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔" رائے نے ایک بار پھر دھیمی آواز میں کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر رائے نے فیصلہ کرلیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے جن جن سے کہا۔ "تم مجھے اس کے معمولات کے بارے میں بتاسکتی ہو؟"

"ہاں... جب سے اس نے ہمارے لیے یہ مسئلہ کھڑا کیا ہے، میں اس کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔"

جن جن نے اندرونی کمپارٹمنٹ سے ایک فولڈر نکالا اور رائے کو پکڑا دیا۔ اس میں ناتھن کی پچھلے دس روز کی نقل و حرکت کے بارے میں مکمل رپورٹ تھی۔ رائے نے اس کا بغور جائزہ لیا اور بولا۔ "وہ روزانہ اسی وقت فیکٹری سے نکلتا ہے؟"

"ہاں، تقریباً اندھیرا پھیلنے سے پہلے۔"

"اور ہر دوسرے روز متبادل راستے پر سفر کرتا ہے؟"

"ہاں، ایک روز وہ اپنی بیوی اور تین بیٹیوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے اور دوسرے دن اپنی محبوبہ کے پاس چلا جاتا ہے جسے اس نے علیحدہ اپارٹمنٹ میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے گھر پر تو کافی حفاظتی انتظامات ہیں لیکن جس اپارٹمنٹ میں وہ جاتا ہے، وہ درختوں سے گھرا ہوا نیم تاریک علاقہ ہے اور اس بلڈنگ میں ایک چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ ناتھن اپنی گاڑی جس جگہ کھڑی کرتا ہے، وہاں بھی زیادہ روشنی نہیں ہوتی۔"

"تمہارے خیال میں وہی جگہ مناسب رہے گی؟" رائے نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یقیناً۔"

"آج رات کس کی باری ہے... وہ گھر جائے گا یا اپارٹمنٹ کا رخ کرے گا؟"

جن جن مسکراتے ہوئے بولی۔ "آج وہ اپارٹمنٹ جائے گا۔"

☆☆☆

جن جن نے اس مقصد کے لیے رائے کو جو ہتھیار فراہم کیا، وہ اعشاریہ تین اٹھ دو کا انتہائی ہلکا آٹو میٹک پستول تھا جس میں سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اس کے لیے ایک کرائے کی گاڑی کا انتظام کیا گیا جسے کم چلا رہا تھا جبکہ رائے اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ گاڑی کو اس بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ میں کھڑا کردیا گیا جہاں ناتھن کی محبوبہ رہتی تھی۔ اس دوران جن جن ایک سفید رنگ کے ٹرک میں بیٹھی ناتھن کے فیکٹری سے نکلنے کا انتظار کرتی رہی۔ اس ٹرک کو کم کا بھائی لی ٹی چلا رہا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلتے ہی ناتھن کی گاڑی فیکٹری کے گیٹ سے برآمد ہوئی تو جن جن نے فوراً ہی فون پر رائے سے رابطہ کیا۔

"وہ یہاں سے نکل رہا ہے۔ اس کے پاس نئی ڈارک بلیو سیڈان ہے جسے وہ خود چلا رہا ہے۔ اس کا رخ رنگ بائی وے کی جانب ہے۔ ہم اس کا پیچھا کررہے ہیں اور تم سے رابطے میں رہیں گے۔"

سفید ٹرک نے کچھ فاصلہ رکھ کر ناتھن کی کار کا تعاقب شروع کردیا۔ ہر تین چار منٹ بعد جن جن، اس کی پوزیشن کے بارے میں رائے کو مطلع کرتی رہی جس نے اپنے سیل فون کا اسپیکر آن کر رکھا تھا تاکہ کم بھی جن جن کی آواز سن سکے۔ کم کے پاس شہر کا نقشہ تھا۔ جہاں وہ بیٹھے تھے، اس جگہ پر اس نے سرخ رنگ کا کراس لگا رکھا تھا اور جس راستے پر ناتھن کی کار آگے بڑھ رہی تھی، اسے وہ پیلے رنگ کی لائن سے واضح کرتا جارہا تھا۔ یہ لائن مسلسل آگے بڑھ رہی تھی اور اس کا فاصلہ سرخ رنگ کے کراس سے بتدریج کم ہورہا تھا۔

تقریباً تیس منٹ کے انتظار کے بعد کم نے رائے سے کہا۔ "اس کی گاڑی بس پہنچنے ہی والی ہے۔"

رائے نے سیٹ کے نیچے سے پستول نکالا اور اسے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ ایک بار پھر فون پر جن جن کی آواز ابھری۔ "اس کی گاڑی بلڈنگ میں داخل ہونے والی ہے۔ تمہیں وہ نمونہ تو یاد ہے نا... جس کے مطابق یہ کام ہونا ہے؟"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ ایسا ہی ہوگا۔" رائے نے جواب دیا۔

جیسے ہی ناتھن کی گاڑی بلڈنگ کی جانب مڑی، کم نے بھی اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کردیا۔ سورج کی آخری کرن بھی ڈوب چکی تھی اور بلڈنگ سے آنے والی روشنی اطراف کی گلیوں کے لیے ناکافی تھی۔ ناتھن کی گاڑی پرائیویٹ پارکنگ ایریا کی جانب بڑھی۔ کم نے بھی ناتھن کی گاڑی سے

www.pkdigest.com

تھوڑے فاصلے پر اپنی گاڑی کھڑی کردی۔ رائے اور ناتھن دونوں ایک ہی وقت میں اپنی گاڑیوں سے باہر نکلے۔ ان کے درمیان زیادہ سے زیادہ چار گز کا فاصلہ ہوگا۔

''ناتھن!'' رائے نے اپنی آواز اتنی اونچی رکھی کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہوجائے۔ جیسے ہی وہ پلٹا، رائے نے نشانہ لے کر تین فائر کیے۔ پہلی گولی ناتھن کے پیٹ اور ران کے درمیان لگی۔ دوسری سینے اور تیسری ماتھے کے وسط میں لگی۔ یہی وہ نمونہ تھا جس پر چین کے منظم جرائم یافتہ افراد عمل کرتے تھے اور اس طرح پولیس کو یقین ہوجاتا کہ ناتھن کو بھی ٹانگ نامی گروپ نے خفیہ طور پر قتل کیا ہے۔

دوسرے دن شام کو رائے کی روانگی تھی۔ جن جن اسے لینے ہوٹل آئی۔ کم، سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھ رہا تھا، تبھی جن جن نے کہا۔ ''تمہاری پرواز ایک گھنٹے لیٹ ہے، کیوں نہ ایک ڈرنک ہوجائے؟ اس کامیابی کا جشن بھی تو منانا ہے۔''

جن جن اور رائے اسی ریسٹورنٹ میں گئے جہاں انہوں نے کھانا کھایا تھا۔ شیمپین کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے جن جن بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ تم یہاں سے نہ جاؤ۔''

رائے نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ''میری بھی یہی خواہش ہے۔ کاش ایسا ممکن ہوتا...''

''فرض کرو کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہو... ایسی صورت میں تمہیں یہ افسوس نہیں ہوگا کہ تم میرے ساتھ کچھ وقت نہ گزار سکے؟''

''شاید۔'' رائے نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''مجھے تو بہت ہوگا۔'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اور جب میری بہنوں کو یہ معلوم ہوگا کہ میں اس بار بھی تمہاری قربت حاصل کرنے میں ناکام رہی تو وہ خاصی مایوس ہوں گی۔''

''انہیں سچ بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم ان سے اپنا بھرم رکھنے کے لیے جھوٹ بھی بول سکتی ہو۔''

''نہیں، ہمارے یہاں بہنوں سے جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ اس کے برعکس ہم ایک دوسرے کے رازدار ہوتے ہیں۔''

اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر موسیقی کی دھنوں پر اس کے قدم تھرکنے لگے اور وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

''کیوں نہ ایک آخری رقص ہوجائے؟''

رائے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''خوب کہا تم نے... ایک آخری رقص۔ چلو، میں تیار ہوں۔''

دونوں نے اپنے جوتے اتارے اور ڈانس فلور کی جانب چل دیے۔ اس نے رائے کے کان میں سرگوشی کی۔ ''کاش! ہم ساری رات اسی طرح رقص کرتے رہیں۔ پھر میں تمہیں اپنے اپارٹمنٹ لے جاؤں۔''

''ممکن ہے، اگلی مرتبہ تمہاری یہ خواہش پوری ہوجائے۔'' رائے نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر امریکا جانے کے بعد وہاں کے حالات اس کے لیے سازگار نہ ہوتے اور فیونا کے ساتھ اس کے تعلقات کا بھانڈا پھوٹ جاتا تو اس کے پاس راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا اور ایسی صورت میں وہ جن جن کی بانہوں میں ہی پناہ لے سکتا تھا۔

دھن ختم ہوئی تو وہ دونوں بھی اپنی میز پر واپس آگئے۔ انہوں نے گلاسوں میں بچی شیمپین کے آخری گھونٹ لیے اور ریستوران سے باہر آگئے۔ کم نے جن جن کے لیے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا جبکہ رائے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''رائے۔'' وہ کار کی چھت کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''رائے! مسٹر ٹیلن نے فیونا کو اس خوفناک کار ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتا دیا ہوگا جس میں تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔''

رائے کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ اس کا پورا جسم برف کے مانند سرد ہورہا تھا۔ جن جن کار میں بیٹھ چکی تھی۔ کم تیزی سے چلتا ہوا رائے کے قریب گیا اور اس نے بے آواز پستول سے تین فائر کردیے۔ اس نے بھی بدنام زمانہ گروہ ٹانگ کے نمونے پر عمل کیا تھا تاکہ پولیس اس قتل کو بہ آسانی پیشہ ور قاتلوں کے کھاتے میں ڈال سکے۔ اچانک ہی دو آدمی نمودار ہوئے اور رائے کے بے جان جسم کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

کم نے ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کی۔ جن جن نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی اور آنکھیں بند کرکے سوچنے لگی۔ 'یہ مرد بھی کتنے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ عورت کے پندار کو ٹھیس پہنچانے کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہی غلطی ناتھن نے بھی کی تھی۔ اگر وہ مجھے نہ ٹھکراتا تو رائے کو بلانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ پہلے ناتھن پھر رائے اور اب...' اس کی نظریں کم پر جم کر رہ گئیں۔ 'کاش! وہ یہ غلطی نہ دہرائے...'

انجانے

مریم کے خان

دنیا میں نہ جانے کتنے جیتے جاگتے نفوس ہیں جو انسانی آنکھوں سے اوجھل گمنامی کی زندگی جی رہے ہیں... ایک انوکھے اور منفرد جزیرے کی خوبصورتی کے گرد گھومتی تیز رفتار کہانی... اس کی سنسنی خیزی اور سحر انگیزی آپ کو اختتام تک جکڑے رکھے گی۔

انجانے راستوں اور خوف و دہشت کی فضا میں شکار ہوجانے والے گروپ کی مشکلات

ماریانا نے جب پہلی بار اس جزیرے کو دیکھا تو مبہوت رہ گئی۔ چاروں طرف سے مونگے کی چٹانوں میں گھرے اس جزیرے کے وسط میں ایک اونچی اور سرسبز پہاڑی تھی اور بلندی سے نیچے ساحل تک گھنا جنگل نظر آرہا تھا۔ سبزہ اتنا زیادہ تھا کہ آنکھوں کو تراوٹ دے رہا تھا۔ یہاں موسم بہت گرم تھا، اس وجہ سے بھی سبزہ اچھا لگ رہا تھا۔ ان کی کشتی بہت سست روی سے جزیرے کے ساحل کی طرف جارہی تھی۔ آسٹریلیا کے جنوب مشرقی ساحل سے کوئی دو ہزار میل مشرق میں بحرالکاہل کے کھلے سمندر میں کچھ غیر آباد جزائر کا مجموعہ ہے۔ ان کا کوئی نام نہیں۔ کہتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم میں ایک جاپانی دستہ ان جزائر تک پہنچنے میں

www.pkdigest.com

کامیاب رہا تھا لیکن جب اس نے جزائر کو غیر آباد پایا تو یہاں سے واپس چلا گیا۔

دراصل یہ مونگے کی چٹانوں سے بنے جزائر تھے اور یہاں سمندر اتھلا اور بہت خطرناک تھا۔ کشتیوں اور بحری جہازوں کو ہر وقت زیرِ آب چٹانوں سے خطرہ لاحق رہتا اس لیے یہاں اب تک انسانوں نے آباد ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جدید دور میں بھی کسی کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ مہم کا انچارج جوزن پیٹ تھا۔ جوزن پیٹ اشتہارات بناتا تھا اور اس کی کمپنی نے کچھ اشتہارات کی شوٹنگ ان جزائر پر کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ جوزن کو اس جگہ کا پتا ایک پرانی اشتہاری فلم سے چلا تھا۔ آج سے بیس سال پہلے مائیکل کین نامی شخص نے یہاں ایک ٹیم کے ساتھ شوٹنگ کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن ٹیم حادثے کا شکار ہو گئی اور اسے شوٹنگ ملتوی کر کے واپس جانا پڑا۔

مائیکل نے ان جزائر کے جو شاٹس لیے تھے انہوں نے جوزن کو بہت متاثر کیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں آ کر شوٹنگ کرے گا۔ اس کی ٹیم میں کل سات افراد تھے۔ جوزن کے ساتھ اس کا کیمرا مین اور نائب اسٹل مین تھا۔ سیٹ ڈائریکٹر کیرن ہیوم تھی۔ میک کارٹر کیمپ منیجر تھا اور ماریانا ماڈل گرل تھی جسے شوٹس میں کام کرنا تھا۔ باقی دو افراد میں ایک کشتی کا کپتان کرس جوزف اور اس کا نائب اور باورچی ینگ شامل تھے۔ کرس کی کشتی جوزن نے کرائے پر لی تھی اور وہ دو دن پہلے آسٹریلیا کی ایک غیر معروف بندرگاہ سے اس سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ چالیس فٹ لمبی یہ کشتی دو طاقت ور انجنوں کی مدد سے تیس ناٹ فی گھنٹا کی رفتار سے سفر کرتی تھی۔ اس میں رہائش کے لیے پورا ایک فلور تھا جس میں آٹھ افراد کے سونے اور رہنے کی گنجائش تھی۔

جوزن نے ماریانا کو آسٹریلیا سے ہائر کیا تھا۔ ماریانا اس سے پہلے چھوٹے موٹے کام کرتی رہی تھی، اسے پہلی بار بڑا کام ملا تھا۔ یہ دو الگ کمپنیوں کے لیے تین الگ شوٹس تھے۔ دونوں کمپنیاں معروف اور قومی سطح پر جانی پہچانی تھیں۔ جوزن نے ماریانا کا انتخاب دو وجوہات کی بنا پر کیا تھا۔ ایک تو ماریانا کے دلکش ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا، دوسرے کوئی اور معروف ماڈل صرف تین شوٹس کے لیے دو ہزار میل کا سمندری سفر کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ دو دن کے سفر میں کیرن نے اسے اس کا کام اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ ماریانا بالکل تیار تھی اور اب وہ عملی ریہرسل میں باقی کسر بھی پوری کر لیتی۔ وہ بہت خوش تھی۔ جوزن مہربان شخص تھا اور اس نے ماریانا کو بہت اچھے معاوضے پر سائن کیا تھا۔ اس نے پہلے کبھی ایک ساتھ اتنی رقم نہیں کمائی تھی۔ کیرن اور دوسرے لوگ بھی تعاون کرنے والے تھے اس لیے یہ سفر اس کے لیے بونس بن گیا تھا۔ سمندر میں طویل سفر کرنا اس کی پرانی آرزو تھی، وہ بھی اب پوری ہو گئی تھی۔

کرس اپنے کام میں ماہر تھا اور اس کی کشتی میں جہاز رانی سے متعلق جدید ترین آلات نصب تھے اس لیے انہیں سفر میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور وہ آسٹریلیا سے روانگی کے پچاس گھنٹے بعد ان جزائر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اس وقت شام ہو رہی تھی اس لیے جوزن نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کو آرام کر کے صبح اس جزیرے کی طرف روانہ ہوں گے جہاں انہوں نے شوٹنگ کرنی تھی۔ کرس نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر لنگر گرا دیا۔ دو دن کے مسلسل سفر نے ان سب کو تھکا دیا تھا اس لیے سب ہی سو گئے۔ صبح ماریانا کی آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ وہ باہر عرشے پر نکل آئی۔ میک سامان تیار کر رہا تھا جو انہیں لے کر جزیرے تک جانا تھا۔ شوٹنگ کے دوران ان کا کیمپ جزیرے میں ہی ہوتا اور وہ ایک ربڑ کی کشتی کے ذریعے جزیرے تک جاتے۔ یہاں ساحل بہت ہی اتھلا تھا اس لیے کرس کی کشتی جزیرے تک نہیں جا سکتی تھی۔

"کب نکلنا ہے؟" ماریانا نے میک سے پوچھا۔ میک نوجوان اور خوش شکل تھا۔ ماریانا نے محسوس کیا تھا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے لیکن اس نے عملی طور پر ماریانا کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں کی تھی۔

"ناشتے کے فوراً بعد۔" میک نے جواب دیا۔

"کون کون جائے گا؟"

"سوائے کرس کو چھوڑ کر سب جائیں گے۔"

ماریانا چونکی۔ "ینگ بھی...؟"

میک نے سر ہلایا۔ "ہاں، ینگ جزیرے پر ہمارے لیے کھانا بنائے گا۔"

اس پارٹی میں ینگ واحد شخص تھا جو ماریانا کو ناپسند تھا۔ وہ ملانو تھا یعنی سفید فام اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی ملی جلی نسل۔ اس کی رنگت سانولی اور نقوش کھرے تھے۔ دیکھنے میں وہ اچھا لگتا تھا لیکن نہ جانے کیوں ماریانا اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے جانے کا سن کر ماریانا کا منہ بن گیا۔ میک کو اس بات کا علم تھا، اس نے مسکرا کر کہا۔

"وہ کھانا اچھا بناتا ہے۔"

ماریانا نے منہ بنایا۔ "بس یہی ایک خوبی ہے۔"

ماریانا پیچھے آ گئی۔ اس نے ناشتا کیا اور تیاری کرنے

لگی۔ اس کا سامان ایک بیگ میں تھا اور اسے بس لباس تبدیل کرنا تھا۔ اس نے موسم کی مناسبت سے ایک ہلکی سی فراک پہن لی جو مشکل سے اس کی رانوں تک آ رہی تھی اور اوپر سے صرف دو ڈوریوں کے سہارے شانوں سے ٹکی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میک کی آنکھوں میں پسندیدگی کے تاثرات ابھرے۔

"تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

ماریانا مسکرائی۔ "شکریہ۔"

سمندر میں ربڑ کی بڑی کشتی اتار دی گئی اور اب اس پر سامان رکھا جا رہا تھا۔ جوزن کشتی میں تھا۔ ماریانا نے اوپر سے جھانکا۔ "ہمیں جانا کہاں ہے؟"

جوزن نے ذرا دور ایک ابھری ہوئی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "اس جزیرے تک جانا ہے۔"

کرس نے کشتی کھلے سمندر میں لنگر انداز کی تھی۔ اس کے آس پاس چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے۔ جوزن نے جس جزیرے کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ کئی میل دور تھا اور درمیان میں کئی چھوٹے جزیرے حائل تھے اس لیے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب سارا سامان کشتی میں بار کر دیا گیا تو باقی سب بھی کشتی میں آ گئے۔ ماریانا کو اترنے میں ذرا دشواری ہوئی تو میک نے اسے سہارا دیا۔ ینگ نے کشتی کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے چلانے لگا۔ وہ چھوٹے جزائر میں داخل ہوئے۔ یہاں سمندر کھاڑیوں کی صورت اختیار کر گیا تھا جس میں کہیں کہیں شارک مچھلیاں بھی تیرتی نظر آ رہی تھیں۔ شارک دیکھ کر ماریانا خوف زدہ ہو گئی۔ میک نے اسے تسلی دی۔

"ہم اس کشتی میں بالکل محفوظ ہیں۔"

لیکن جب کوئی شارک کشتی کے پاس آتی تو ماریانا سہم جاتی۔ شارکس کے چکر میں وہ جزیرہ بھی نہیں دیکھ سکی، جب جوزن نے اسے متوجہ کیا۔ یہاں سمندر وسیع ہو کر خلیج کی صورت میں آ گیا تھا اور اس سے یہ جزیرہ نکل کر بلند ہو رہا تھا۔ ماریانا مبہوت رہ گئی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ "کتنا حسین ہے۔"

یہاں پانی اتنا شفاف تھا کہ اس کی تہ میں موجود ایک ایک چیز بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ مونگے کی چٹانوں سے بچتے ہوئے وہ جزیرے کے ساحل تک پہنچے۔ ریتلا ساحل مشکل سے دس گز تک تھا اور اس کے بعد سبزہ شروع ہو جاتا تھا۔ گھنے درخت ساحل کے ساتھ تک آ رہے تھے۔ درختوں کے درمیان میں گھنی بیلیں اور جھاڑیاں تھیں۔ ینگ نے کشتی کا اگلا سرا ریت پر چڑھا دیا اور وہ سب باری باری کود کر ساحل پر آ گئے۔ مردوں نے مل کر کشتی کو ریت پر کھینچ لیا۔

غلطی

شوہر (غصے میں بیوی سے)۔ "بیگم آئے دن تم میری چیزوں کی تلاشی لے کر کوئی نہ کوئی چیز غائب کر دیتی ہو اور پھر کہتی ہو کہ غلطی ہو گئی۔ اب کے میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔ جلدی بتاؤ وہ میری سونے کی گھڑی کہاں گئی؟"

بیوی۔ "سرتاج! واقعی مجھ سے یہ غلطی سرزد ہو گئی ہے دراصل میں نے اسے جیولرز کو زیور بنانے کے لیے دیا ہے۔"

ماریانا، کیرن کے ساتھ کھڑی تھی۔ "کتنا خوب صورت جزیرہ ہے۔"

کیرن نے اس کی تائید کی۔ "اس سے پہلے بھی میں نے کئی جزائر پر شوٹنگ کی ہے لیکن اتنا قدرتی حسن رکھنے والا اور صاف ستھرا جزیرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"شاید اس لیے کہ یہ ابھی تک انسان کے وجود سے پاک رہا ہے۔"

کیرن نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، کم سے کم دو بار انسان یہاں آ چکے ہیں۔ ایک بار جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور دوسری بار مائیکل نامی ایڈ میکر اپنی ٹیم کے ساتھ آیا تھا۔"

ماریانا کو یاد آیا۔ "ہاں، جوزن نے بتایا تھا۔ شاید اس کی ٹیم کو حادثہ پیش آیا تھا اور وہ شوٹنگ ادھوری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے، اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

کیرن نے سوچ کر کہا۔ "مجھے صحیح سے تو نہیں معلوم لیکن شاید یہاں انہیں کسی حادثے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دو افراد مارے گئے تھے جس کے بعد انہوں نے شوٹنگ ختم کر دی تھی۔"

"انہیں کیا حادثہ پیش آیا تھا؟"

"پتا نہیں، وہ جزیرے میں کسی حادثے کا شکار ہوئے تھے۔"

اس بارے میں کیرن کو بھی صحیح سے نہیں معلوم تھا۔ پھر کشتی سے سامان اتارا جانے لگا تو وہ اس میں مصروف ہو گئی۔ ماریانا نے ناشتے سے پہلے دو گلاس اورنج جوس کے لیے تھے اور اس وقت وہ مثانے پر دباؤ محسوس کر رہی تھی۔ ان لوگوں کو مصروف پا کر وہ جھاڑیوں کی طرف بڑھی اور اندر داخل ہو کر اس نے کوئی موزوں جگہ تلاش کی۔ فارغ ہو کر وہ کھڑی ہوئی تھی کہ اسے سامنے جھاڑی میں کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ ایسا لگا

جیسے جھاڑی میں کوئی بڑی سی چیز حرکت کر رہی ہے۔ وہ ڈر گئی اور پیچھے ہٹی تو اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ نیچے گر گئی۔ گرنے کی آواز آئی تو جھاڑیوں میں موجود چیز زور سے غرائی۔ ماریانا کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ اٹھ کر اندھا دھند بھاگی اور کسی سے ٹکرائی۔ اس نے ماریانا کو جکڑ لیا۔ اس نے ایک چیخ اور ماری۔

"ارے! کیا بات ہے؟" میک نے اسے جھنجوڑا۔ "تم نے چیخ کیوں ماری؟"

ماریانا چونکی پھر اس نے سہم کر عقب میں جھاڑی کی طرف دیکھا۔ "وہ... وہاں کچھ ہے۔"

میک نے جھاڑی کی طرف دیکھا اور پھر جھاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک لکڑی اٹھائی اور اس سے جھاڑی کو ہلایا لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ پھر اس نے جھاڑی کو ہٹایا لیکن اس کے اندر بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ واپس پلٹ کر آیا۔ "یہاں تو کچھ نہیں ہے۔"

لیکن ماریانا اسے اپنا وہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے واضح طور پر جھاڑیوں کو ہلتے دیکھا تھا اور کوئی جان دار غرایا بھی تھا۔ غراہٹ اور جھاڑی کے ہلنے سے لگ رہا تھا کہ وہ خاصا بڑا جان دار تھا۔ ویسے یہ بہت بڑا جزیرہ تھا اور اس پر بڑے جان دار بھی ہو سکتے تھے۔ وہ باہر آئی تو ایک چھولداری نصب کی جا چکی تھی اور اس میں سارا سامان رکھ دیا گیا تھا۔ ایک طرح سے یہ جوزن کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ اپنے آلات سیٹ کر رہا تھا۔ کیرن نے ماریانا کو اشارہ کیا۔ وہ اس کے پاس آ گئی۔

"ہم نے آج تین شوٹس کرنے ہیں۔"

وہ ماریانا کو شوٹس کی تفصیل بتانے لگی لیکن اس کا ذہن حاضر نہیں تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کیرن نے غور سے اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے تمہارا دھیان کسی اور طرف ہے؟"

ماریانا ہچکچائی پھر اس نے کیرن کو جھاڑیوں میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ "جھاڑی میں کوئی چیز تھی۔"

"لیکن جب میک نے دیکھا تو کچھ نہیں تھا۔" کیرن پوری بات سن کر بولی۔ "ممکن ہے وہ اس دوران میں بھاگ گئی ہو۔"

کیرن نے اسے تسلی دی۔ "اگر اس جزیرے پر کوئی بڑا جانور بھی ہے، تب بھی ہمارے لیے خطرے کی بات نہیں ہے کیونکہ ہمارے پاس دو عدد پستول ہیں۔"

ماریانا کا خوف یہ سن کر کچھ کم ہوا۔ کیرن نے پھر اسے کام کی طرف متوجہ کیا۔ اس بار وہ سمجھنے میں کامیاب رہی۔ جب کیرن اپنا کام کر چکی تو ایسٹل نے کیمرا سنبھال لیا اور ماریانا جوزن کی ہدایات کے مطابق پوز دے کر شوٹنگ کروانے لگی۔ آنے والے دو گھنٹے میں اس نے تینوں شوٹس مکمل کرا دیے۔ جوزن اس کی کارکردگی سے بڑا خوش تھا۔ اس کے خیال میں ماریانا نے بہترین کام کیا تھا لیکن ابھی اسے اس کا نتیجہ دیکھنا تھا۔ وہ شوٹس کو اپنے لیپ ٹاپ پر چیک کرنے لگا۔ ماریانا تھک گئی تھی۔ اس نے کولڈ باکس سے اپنے لیے ایک کولڈ ڈرنک نکالی اور ایک ناریل کے درخت کے سائے میں بیٹھ گئی۔

ینگ ایک طرف کھڑا جزیرے کی چوٹی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پُرخیال قسم کے تاثرات تھے۔ پھر اس نے جوزن سے کہا۔ "جب ہم یہاں تک آ ہی گئے ہیں تو کیا خیال ہے، جزیرے کی سیر نہ کر لی جائے؟"

"کیا مطلب؟"

"کام مکمل ہونے کے بعد اگر ہم سیر کا پروگرام رکھ لیں؟" ینگ نے تجویز دی۔ "سیر کے لیے ایک دن کافی ہے، اس سے اگلے روز ہم یہاں سے جا سکتے ہیں۔"

جوزن کے پاس وقت کی کمی نہیں تھی، وہ پندرہ دن کے لیے یہاں آئے تھے۔ شوٹنگ کا کام [illegible] دو دن تک ختم ہو جاتا لیکن پھر بھی اس نے [illegible] سے گریز کیا۔ "دیکھیں گے، فی الحال تو اپنا کام مکمل کر لیں۔"

شام تک جوزن نے شوٹس چیک کر لیے اور وہ بڑا خوش تھا کیونکہ ماریانا نے اس کی توقع سے بڑھ کر اچھا کام کیا تھا۔ اگر وہ اسی طرح کام کرتی رہتی تو وہ شوٹ وقت سے پہلے مکمل کر سکتے تھے اور اس کے بعد ان کے پاس تفریح کے لیے خاصا وقت بچ جاتا۔ رات کو انہوں نے زمین پر ہوا بھرے گدے بچھائے اور سب ان پر دراز ہو گئے۔ یہاں کیڑے مکوڑے اور مچھر نہیں تھے اس لیے انہیں فکر نہیں تھی۔ دن میں شدید گرمی تھی لیکن شام کو سمندر کی طرف سے ٹھنڈی تیز ہوا چلنے لگی تھی۔

ینگ نے ایک طرف چھوٹا سا خیمہ لگا کر اس میں اپنا باورچی خانہ سجا لیا تھا۔ رات کو اس نے شان دار کھانا بنایا۔ سب نے زیادہ ہی کھا لیا اور اسی وجہ سے سونے کے لیے لیٹے تو غافل ہو گئے۔ صبح سب سے پہلے جوزن کی آنکھ کھلی اور اس نے اٹھ کر اپنی چھولداری کی طرف دیکھا تو دہل گیا۔ اسے اندر ہر چیز بکھری نظر آئی۔ وہ چھولداری کی طرف جھپٹا۔ اندر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے ہر چیز کو توڑ پھوڑ دیا ہو لیکن جب اس نے چیزوں کا معائنہ کیا تو اسے تسلی ہوئی۔ چیزیں بکھری

ہوئی ضرور تھیں لیکن ٹوٹی نہیں تھیں۔ خاص طور سے اس کا لیپ ٹاپ اور دوسرے آلات ٹھیک تھے۔ جو واحد چیز ٹوٹی تھی، وہ اس کی فولڈنگ چیئر کا تختہ تھا۔ وہ پشت سے الگ ہو گئی تھی۔ جوزن چیزیں ٹھیک کر کے رکھ رہا تھا کہ عقب سے ماریانا کی حیرت زدہ آواز آئی۔ "یہ کیا ہوا ہے؟"

جوزن نے مڑ کر دیکھا۔ "پتا نہیں، رات کوئی جانور گھسا تھا، شاید اسی نے یہ ساری تباہی مچائی ہے۔"

ماریانا کو کل والا واقعہ یاد آ گیا۔ اس نے صرف میک اور کیرن کو بتایا تھا، جوزن اور دوسرے لوگوں کو اس بارے میں نہیں معلوم تھا۔ اس نے جوزن کو بتایا۔ "جزیرے پر کوئی بڑا جانور ہے۔ کل میں نے جھاڑیوں میں محسوس کیا تھا؟"

جوزن چونکا۔ "کیا تھا؟"

"پتا نہیں... نظر تو نہیں آیا لیکن جھاڑیاں ہلنے اور اس کے غرانے کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی بڑا جانور ہے۔ کم سے کم کتے جتنا بڑا۔"

جوزن نے تشویش سے سر ہلایا۔ "اب ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔ خوش قسمتی سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

ماریانا اس کے ساتھ چیزیں ٹھیک کر کے رکھنے لگی۔ اس دوران میں باقی بھی ایک ایک کر کے بیدار ہو گئے اور جب انہیں پتا چلا کہ رات چھولداری میں کوئی جانور گھسا تھا تو وہ بھی فکر مند ہو گئے۔ ینگ نے چھولداری کے پاس ریت پر پنجوں کے نشانات تلاش کیے لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس جانور کے پنجوں کے نشانات ہیں۔ ان میں سے کوئی جانوروں کے پیروں کے نشان پہچاننے کا ماہر نہیں تھا۔ جوزن نے احتیاطاً دونوں پستول نکال لیے۔ ایک اس نے خود رکھ لیا اور دوسرا میک کے حوالے کر دیا۔ اس واقعے نے انہیں تھوڑا سا پریشان کر دیا تھا لیکن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد سب نارمل ہو گئے۔

کیرن اس دن کے شوٹس ماریانا کو سمجھانے لگی۔ ایک گھنٹے تک سمجھانے اور ریہرسل کے بعد شوٹنگ کا آغاز ہوا۔ سوائے ینگ کے باقی سب کا تعلق شوٹ سے تھا اس لیے ینگ ایک طرف بیٹھ گیا۔ ناشتے کے ساتھ ہی اس نے دوپہر میں سب کے کھانے کے لیے سینڈوچز تیار کر لیے تھے۔ اب اسے رات میں کھانا بنانا تھا۔ وہ فارغ ہی تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ شوٹ دیکھتا رہا۔ ماریانا کو شوٹ کراتے دیکھنا کسی خوش گوار تجربے سے کم نہیں تھا۔ لیکن ینگ بور ہو گیا۔ اس نے جوزن سے کہا۔

"میں ذرا جزیرے کے اندرونی حصے میں جا رہا ہوں۔"

"احتیاط کرنا۔" جوزن نے اسے خبردار کیا۔ "جزیرے میں کوئی بڑا جانور ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ کوئی گیدڑ یا اسی نسل کا جانور ہوگا۔" ینگ نے بے پروائی سے کہا۔ "اگر خطرناک ہوتا تو کل رات ہم سب کھلے میں سو رہے تھے اور وہ چاہتا تو آرام سے حملہ کر سکتا تھا۔"

"پھر بھی تم احتیاط کرو۔" میک نے کہا اور اپنا پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لے جاؤ... اگر کوئی مشکل ہو تو تم فائر کر کے ہمیں خبردار کر سکتے ہو۔"

ینگ کو یہ آئیڈیا پسند آیا اور اس نے میک سے پستول لے لیا ورنہ اس کے خیال میں جزیرے میں موجود جانور سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے پستول اپنی بیلٹ میں لگا لیا اور درختوں کی طرف بڑھ گیا۔ شروع میں جھاڑیاں بہت گھنی تھیں لیکن جب وہ اونچے درختوں تلے آیا تو یہاں جھاڑیاں کم تھیں اور راستے موجود تھے۔ جنگل کی حالت بتا رہی تھی کہ یہاں کبھی کسی انسان کا گزر نہیں ہوا۔ ذرا آگے جانے کے بعد ینگ کو ایک ندی ملی جو اوپر کہیں سے بہتی آ رہی تھی۔ اس نے پانی چکھا جو میٹھا اور نباتات کی خوشبو لیے ہوئے تھا۔ وہ خوش ہو گیا۔ اگرچہ وہ اپنی ضرورت کا پانی ساتھ لے کر آئے تھے مگر یہ صرف پینے کے لیے تھا۔ انہیں سمندر کے پانی سے نہانا اور دوسرے کام کرنے پڑتے تھے۔ میٹھا پانی دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ اس نے آس پاس دیکھ کر کپڑے اتارے اور ندی میں اتر گیا۔ یہ زیادہ گہری نہیں تھی لیکن اس کے وسط میں بعض جگہیں ایسی تھیں جہاں گہرائی چار فٹ تھی۔ وہ اس جگہ آ کر نہانے لگا۔ سمندر میں سفر سے جسم پر جو نمک کی تہ سی جم گئی تھی، وہ میٹھے پانی سے اترنے لگی۔ ینگ کو بہت لطف آ رہا تھا۔ پانی سرد بھی تھا جو اس گرمی میں کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

اچانک اسے اپنے کپڑوں کے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ ندی سے نکلا تھا اور آنکھوں کے آگے پانی کی چادر سی تھی اس لیے اسے صحیح سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے غصے سے کہا۔ "کون ہے؟"

اس کا خیال تھا کہ یہ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی ہے۔ لیکن جواب میں اسے کسی جانور کی غراہٹ سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں صاف کیں تو اسے کسی گول سی چیز کی ایک جھلک نظر آئی جو درختوں کے پیچھے غائب ہو رہی تھی۔ وہ صحیح سے نہیں دیکھ سکا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ اس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر پانی سے نکل آیا... اس

www.pkdigest.com

نے اپنے کپڑے دیکھے، اس کی شرٹ غائب تھی البتہ پتلون اور پستول اپنی جگہ پر تھے۔ اس نے جلدی سے پتلون پہنی اور پستول اٹھا کر چاروں دیکھا۔ اسے لگا جیسے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ جیک کو خوف محسوس ہوا۔ جانور اس کی شرٹ لے گیا تھا۔ وہ دیکھ نہیں سکا کہ جانور کون سا تھا لیکن جسامت سے وہ کسی بڑے کتے جتنا لگ رہا تھا۔

جیک تیزی سے کیمپ کی طرف جانے لگا۔ اس نے پستول ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اچانک اسے عقب سے غراہٹ سنائی دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا لیکن اس کے عقب میں کوئی نہیں تھا۔ اس کا خوف بڑھ گیا اور اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ اسے عقب سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے کوئی بھاری چیز جھاڑیوں میں اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ وہ بھاگتا ہوا درختوں سے باہر آیا تو اس کی حالت دیکھ کر میک چونک گیا۔ وہ اس کے پاس آیا۔ ”کیا ہوا... تمہاری شرٹ کہاں ہے؟“

”وہاں جنگل میں... کوئی جانور ہے۔“ جیک نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں ندی میں نہا رہا تھا کہ وہ میری شرٹ اٹھا کر لے گیا۔“

میک بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ”تم نے اسے دیکھا تھا؟“

”بس ایک جھلک دیکھی تھی... بڑے بڑے بال تھے اور گول مول سا تھا۔ وہ بہت تیزی سے درختوں میں غائب ہو گیا اور جسامت کسی بڑے کتے جتنی تھی۔“

”اس نے تم پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی، اس کا مطلب ہے کہ وہ بے ضرر جانور ہے۔“ میک نے جیک کو اس کی بات یاد دلائی تو وہ کھسیا گیا۔

”ہاں، یہ تو ہے لیکن اس وقت میں بوکھلا گیا تھا۔“

میک نے درختوں کی طرف دیکھا۔ ”یہاں اس جزیرے میں کچھ ہے۔ جب تک ہم اسے دیکھ کر اس کے بے ضرر ہونے کا یقین نہیں کر لیتے ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ جیک نے اس کی تائید کی اور ماریانا کی طرف دیکھا۔ وہ بکنی سوٹ میں شوٹ کروا رہی تھی۔ جیک کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس شوٹ کے بعد اس نے سب کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ جوزن نے سر ہلایا۔

”ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔“

آج کی شوٹنگ نے ماریانا کو تھکا دیا تھا۔ گھنٹوں پوز دینا آسان نہیں تھا۔ وہ ایک طرف بیٹھی سستا رہی تھی۔ پھر وہ ان کے پاس چلی آئی۔ اس نے ایک شال لے لی تھی۔ جیک نے اسے بھی بتایا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ وہ کوئی خطرناک جانور ہے۔“

ماریانا خوف زدہ ہو گئی۔ ”اب تو مجھے رات کو نیند نہیں آئے گی۔“

کیرن بھی ان کے پاس چلی آئی۔ اس نے کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم رات کو کشتی پر واپس چلے جایا کریں؟“

لیکن جوزن نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ ”اتنے سارے سامان کے ساتھ یہ ممکن ہی نہیں ہے اور ہم سامان یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ دوسرے یہ کہ کشتی جہاں کھڑی ہے، وہاں سے یہاں آنے میں پورا ایک گھنٹا لگتا ہے اور رات میں سفر کرنا ممکن نہیں ہے۔“

اس جزیرے کے آس پاس مونگے کی چٹانیں بھول بھلیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان سے ہی گزر کر کھلے سمندر تک رسائی ممکن ہوتی تھی اور چٹانوں کے درمیان سے گزرنے کا کام صرف پوری روشنی میں کیا جا سکتا تھا۔ شام کے بعد وہ یہاں سے نہیں جا سکتے تھے۔ ماریانا نے کہا۔

”میں رات کو کھلے میں نہیں سوؤں گی۔“

ان کے پاس خیمے بھی تھے لیکن گرمی کی وجہ سے ان کا استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس رات کھانے کے بعد ماریانا اور کیرن کے لیے خیمے لگا دیے گئے۔ یہ ایسے خیمے تھے جو صرف ہوا بھرنے سے قائم ہو جاتے تھے اور ان کی ساخت ایسی تھی کہ آدمی ان میں گھس کر صرف لیٹ سکتا تھا، ان میں اٹھنے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ ہوادار بھی تھے اس لیے ماریانا اور کیرن کو خاص مشکل پیش نہیں آئی اور وہ بے فکری سے سو گئیں۔

اگلے تین دن تک کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا اور شوٹنگ تواتر سے چلتی رہی۔ ماریانا اور کیرن عام طور سے سہ پہر کے وقت کام سے فارغ ہو کر تھکن اتارنے کے لیے سمندر میں تیراکی کرتی تھیں۔ انہوں نے مونگے کی چٹانوں سے گھری ایک ایسی کھاڑی دریافت کر لی تھی جس میں بڑی جسامت کی کوئی مچھلی نہیں آ سکتی تھی۔ وہ بے فکری سے اس میں تیراکی کرتی تھیں۔ جب وہ تیراکی کرنے جاتیں تو باقی بھی کسی نہ کسی بہانے سمندر میں اتر جاتے۔ خاص طور سے جیک ماریانا کو تاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ماریانا یہ بات جانتی تھی لیکن وہ انجان بن جاتی۔ اسے جیک ناپسند تھا لیکن وہ اس کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس کی حرکت کو نظر انداز کر دیتی۔

چوتھے دن جوزن کی ریکارڈنگ مشین میں کوئی نقص آ گیا اور اسے ٹھیک کرنے میں سارا دن لگ گیا اس لیے شوٹنگ نہیں ہو سکی۔ ماریانا خوش تھی کہ اسے ایک پورا دن آرام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ دن کی شدید گرمی اور دھوپ میں کام کرنا آسان نہیں تھا۔ پورے ایک ہفتے سے وہ میٹھے پانی سے نہیں نہائی تھی۔ اس نے کیرن سے کہا۔ ”کیا خیال ہے اندر ندی پر چل کر نہاتے ہیں؟“

لیکن کیرن جزیرے میں پائے جانے والے جانور کا سوچ کر ہچکچا رہی تھی۔ ”اگر اس نے ہمیں کچھ نہ کہا اور ہمارے کپڑے اٹھا کر لے گیا، تب بھی نقصان تو ہوگا۔“

ماریانا کا خوف اب قدرے کم ہو گیا تھا۔ اس نے جرأت مندی سے کہا۔ ”ہم دو ہوں گے تو کوئی پاس نہیں آئے گا۔“

”کسی کو ساتھ نہ لے چلیں؟“

”نہیں... پھر ہم سکون سے نہائیں گے کیسے؟“

کیرن نے سوچا اور راضی ہو گئی۔ اس کو بھی جسم پر چڑھی نمک کی تہ بری لگ رہی تھی اور سمندری پانی نے بالوں کا بھی حشر کر دیا تھا۔ انہیں میٹھے پانی سے صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ کیرن نے جوزن کو مطلع کیا۔ ”ہم ندی تک نہانے جا رہے ہیں۔“

”تم دونوں...“ وہ فکر مند ہو گیا۔ ”کوئی مسئلہ نہ ہو؟“

”نہیں ہوگا۔“ کیرن بولی۔ ”میں وسل لے جا رہی ہوں، اگر کوئی مسئلہ ہوا تو میں وسل بجاؤں گی۔“

جوزن مان گیا کیونکہ اس دن کے بعد کسی نے ان کے کیمپ کو نہیں چھیڑا تھا اور نہ ہی کسی کو کچھ نظر آیا تھا۔ انہوں نے اپنے شیمپو اور صابن لیے اور ندی کی طرف چل پڑیں۔ جیک سے سن کر ان کو اندازہ تو ہو گیا تھا کہ ندی کس طرف ہے۔ یہ کوئی سو گز اندر تھی اور یہ جگہ ساحل سے اتنی دور نہیں تھی لیکن ندی کا رخ دوسری طرف تھا۔ انہوں نے کپڑے اتارے اور پانی میں اتر گئیں۔ کپڑے انہوں نے احتیاطاً بالکل کنارے پر رکھے تھے۔ ندی کے فرحت بخش تازہ پانی نے انہیں تر و تازہ کر دیا۔

”یہ تو بہت مزے کا ہے۔“ کیرن نے کہا اور پانی میں ڈبکی لگائی۔ وہ کچھ دیر نہاتی رہیں پھر بالوں کو شیمپو کیا اور بال دھونے لگیں۔ اسی وقت ماریانا کو محسوس ہوا کہ آس پاس کوئی ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ جلدی سے پانی میں ہو گئی۔ کیرن اس کے انداز سے چونکی۔

”کیا بات ہے؟“

”کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔“ ماریانا نے آہستہ سے کہا۔

کیرن نے آس پاس دیکھا تو اسے ایک درخت کے پیچھے جیک کی جھلک نظر آئی۔ کیرن نے آہستہ سے کہا۔ ”جیک ہے... حرامزادہ کہیں کا۔“

”یہ بہت ذلیل فطرت شخص ہے۔ مجھے اسی وجہ سے اس سے نفرت ہے۔“ ماریانا نے نفرت سے کہا۔

”تم رکو... میں اسے سبق سکھا کر آتی ہوں۔“ کیرن نے کہا اور اپنی شرٹ اٹھاتی ہوئی اوپر چڑھ گئی۔ اس نے شرٹ پہنی اور دبے قدموں اس درخت کی طرف بڑھی جس کے عقب میں اسے جیک کی شرٹ کی جھلک نظر آئی تھی۔ ماریانا دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیرن نے وسل منہ میں دبالی تھی اور شاید اس کا ارادہ جیک کے بالکل پاس جا کر وسل بجانے کا تھا۔ کیرن درختوں کے عقب میں غائب ہو گئی۔ کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

اچانک ہی کیرن کی دبی دبی سی چیخ سنائی دی اور پھر ماریانا نے ویسی ہی غراہٹ سنی جیسی اس نے پہلے دن جھاڑیوں میں سنی تھی۔ وہ دہل گئی۔ اس نے چیخ کر کیرن کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ماریانا جلدی سے پانی سے نکلی اور اپنے کپڑے پہننے لگی۔ اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ وسل کیرن کے پاس تھی اور وہ مدد کے لیے کسی کو بلا بھی نہیں سکتی تھی۔ کپڑے پہن کر ماریانا لرزتے قدموں سے اس طرف بڑھی لیکن اسے درختوں کے درمیان کہیں کیرن نظر نہیں آئی۔ وہ اسے سہمے انداز میں آوازیں دے رہی تھی۔ انہیں دیکھنے والا جیک نہیں تھا بلکہ وہی جانور تھا۔ جیک اس انداز میں کیسے غرا سکتا تھا۔ اچانک اس کی نظر زمین پر پڑی کیرن کی وسل اور اس کے پاس خون کے دھبوں پر گئی۔ ماریانا کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر وہ چیختی ہوئی ساحل کی طرف بھاگی۔

اس کی چیخیں سن کر باقی سب جنگل کی طرف بھاگے اور سب سے پہلے میک نے ماریانا کو دیکھا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔ میک نے اسے جھنجوڑا۔ ”کیا بات ہے؟ کیرن کہاں ہے؟“

”وہ اسے... لے گیا... وہاں وسل... خون...“ الفاظ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ جوزن تیزی سے اس طرف بڑھا جس طرف ماریانا اشارہ کر رہی تھی۔ اس نے پستول نکال لیا تھا۔ جیک بھی اس کے ساتھ تھا۔ اسٹیل اور میک ماریانا کو سمجھا رہے تھے۔ جوزن کچھ دیر میں واپس آیا۔

”کچھ ہوا ہے... وہاں کچھ خون ہے اور وسل پڑی ہے۔ زمین پر پنجوں کے ایک دو نشانات بھی ہیں۔“

”ہمیں کیرن کو تلاش کرنا ہوگا۔“ جیک بولا۔ ”اگر اسے وہی جانور لے گیا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ

www.pkdigest.com

بہت خطرناک ہے۔"

وہ سب کیمپ میں واپس آئے۔ انہوں نے پستول لیے اور جنگل میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جوزن نے دو واکی ٹاکی سیٹ بھی نکال لیے تھے۔ ایک اس نے اپنے پاس رکھا اور دوسرا میک کو دے دیا۔ پھر اس نے ماریانا سے کہا۔ "تم یہیں رکو، ہم کیرن کو تلاش کر کے لاتے ہیں۔"

"میں اکیلے۔" ماریانا کانپ گئی۔ "ہرگز نہیں۔"

میک نے بھی کہا۔ "اسے اکیلے چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔"

"تب تم اسے ساتھ لے جاؤ۔ میں ینگ کے ساتھ جاتا ہوں۔ ہم ندی کے دوسری طرف جائیں گے اور تم اسی طرف تلاش کرنا۔"

ماریانا، میک اور ایسٹل کے ساتھ تھی۔ انہوں نے جوتے بھی پہن لیے تھے۔ ینگ اور ایسٹل کے پاس چاقو تھے اور ماریانا کو انہوں نے ایک بیس بال کا بلا دے دیا تھا۔ اس طرح وہ سب ہی کسی نہ کسی طرح مسلح ہو گئے تھے۔ جوزن اور ینگ ندی پار کر کے دوسری طرف چلے گئے۔ ماریانا، میک اور ایسٹل کے ساتھ تھی۔ وہ جنگل میں اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں کیرن کو لے جایا گیا تھا۔ وہ رک رک کر کیرن کو آوازیں دے رہے تھے۔ انہیں صرف اسی جگہ کچھ خون نظر آیا تھا جہاں کیرن کی وسل پڑی تھی۔

"فرض کرو، اسے اٹھا لے جانے والا کوئی جانور ہے تو کیا اس نے ابھی تک کیرن کو زندہ چھوڑا ہوگا؟" ایسٹل نے سوال کیا۔

"خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔" ماریانا کانپ گئی۔

"بہتری کی امید رکھو۔ ممکن ہے کیرن خوف سے بے ہوش ہو گئی ہو اور وہ جانور اسے گھسیٹ کر لے گیا ہو۔" میک نے کہا۔ "میرے حساب سے اس چھوٹے سے جزیرے پر کسی بڑے گوشت خور جانور کی موجودگی ممکن نہیں ہے کیونکہ یہاں اس کے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ممکن ہے وہ سمندر میں مچھلیاں شکار کرتا ہو۔" ایسٹل نے کہا۔

"نہیں... خشکی کے جانور سمندر میں شکار نہیں کرتے۔"

وہ رفتہ رفتہ پہاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دو بار میک نے واکی ٹاکی پر جوزن سے رابطہ کیا۔ وہ ندی کے دوسری طرف تھے لیکن انہیں بھی کیرن کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ندی کے دوسری طرف زمین ہموار تھی اور وہاں کسی کو تلاش کرنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ میک اور اس کی پارٹی ایک گھنٹے بعد پہاڑی کے پاس پہنچ گئی۔ یہاں جنگل بہت گھنا اور بہت دشوار گزار تھا۔ بعض جگہ تو دن میں بھی تاریکی تھی۔ جب ایسی کوئی جگہ آتی... تو ماریانا سہم کر میک سے لگ جاتی تھی۔

ایسٹل ان سے ذرا پیچھے چل رہا تھا۔ اسے ڈھلان میں ایک جگہ سوراخ نظر آیا۔ وہ اس میں جھانکنے لگا۔ پھر اس نے اپنی کمر سے لگی ٹارچ اتار کے اس کی روشنی اندر ڈالی اور بولا۔ "یہ شاید غار ہے۔"

میک اور ماریانا بھی پلٹ آئے۔ میک نے اندر جھانکا۔ "ہاں، غار ہی لگ رہا ہے۔"

"ممکن ہے یہ اسی جانور کا مسکن ہو اور وہ کیرن کو یہاں لایا ہو۔"

اچانک ماریانا کو لگا کہ نزدیک درخت سے کوئی چیز تیزی سے گزر گئی ہو۔ وہ ڈر کر میک سے چمٹ گئی۔ میک چونکا۔ "کیا ہوا؟"

"اس درخت کی شاخوں سے کوئی چیز گزری ہے۔"

لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ وہ لوگ کچھ دیر درختوں کا معائنہ کرتے رہے پھر میک نے غار میں جانے کا فیصلہ کیا۔

"میں اندر اترتا ہوں۔"

"نہیں، تم اکیلے مت جاؤ۔" ایسٹل نے کہا۔ "میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔"

ماریانا بولی۔ "میں اکیلے نہیں رہوں گی۔"

انہوں نے مختصر سی بحث کی اور پھر تینوں ہی غار میں جانے پر متفق ہو گئے۔ دہانہ چھوٹا تھا لیکن اندر سے غار وسیع تھا۔ ان کے پاس دو ٹارچیں تھیں اور ان کی روشنی میں سب واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اندر گھستے ہی انہیں بدبو کا شدید احساس ہوا۔ وہاں جا بجا خشک ہوتا فضلہ پڑا تھا۔ میک نے روشنی نیچے کی۔ "یہ دیکھو... اس غار میں یقیناً کوئی جانور رہتا ہے۔"

ایسٹل نے ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے فضلے کا معائنہ کیا۔ "یہ کسی بڑے جانور کا ہے۔ ماریانا نے ٹھیک کہا ہے، وہ جانور کسی بڑے کتے جتنا ہے۔"

غار میں ایک طرف سرنگ جاتی نظر آ رہی تھی۔ میک نے پستول سامنے کر لیا اور وہ سرنگ کی طرف بڑھے۔ میک نے آہستہ سے کہا۔ "اب بلا ضرورت آواز نہ نکلے۔"

ماریانا میک سے چپک کر چل رہی تھی۔ ایسٹل ذرا پیچھے تھا اور وہ پیچھے کا خیال بھی رکھ رہا تھا کہ جانور عقب سے حملہ نہ کر دے۔ ذرا آگے جا کر سرنگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایسٹل نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"میں اس سرنگ میں جا رہا ہوں۔"

میک نے سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا اور ایسٹل اس سرنگ میں داخل ہو گیا۔ میک نے ماریانا کے ہمراہ سیدھے راستے پر سفر جاری رکھا۔ ایک ٹارچ کی وجہ سے روشنی محدود ہو گئی تھی۔ پوری سرنگ دیکھنے کے لیے میک کو ٹارچ گھمانی پڑ رہی تھی۔ ماریانا نے اس سے ذرا دور ہو کر بلا سنبھال لیا تھا۔ اس وقت وہ حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے میک سے کہا۔

"اگر جانور سے سامنا ہو گیا تو ہم کیا کریں گے؟"

"سب سے پہلے ہمیں کیرن کو تلاش کرنا ہوگا۔" میک نے کہا۔ "یہ بات یقینی ہے کہ یہاں ایک جانور نہیں ہوگا۔"

ماریانا کا دم خشک ہو گیا۔ "اور بھی ہوں گے؟"

"ہاں، اکیلا جانور کہاں سے آئے گا؟" میک نے نرمی سے کہا تو ماریانا اپنے احمقانہ سوال پر شرمندہ ہو گئی۔

"سوری! مجھے خیال نہیں رہا۔"

آگے ان کو کئی سرنگیں ملیں لیکن میک نے سیدھ میں سفر جاری رکھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ غار کتنا بڑا ہے۔ شاید پوری پہاڑی کے اندر اس غار کا جال بچھا تھا۔ لازمی بات تھی کہ اس میں آمدورفت کے اور بھی راستے ہوں گے۔ ابھی تک نہ تو کوئی جانور ملا تھا اور نہ ہی کوئی آواز آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سوائے داخلی راستے کے باقی غار ویران ہی ہے۔ اچانک ہی انہیں کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ آواز بہت ہی دور سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ماریانا ڈر کر میک سے چمٹ گئی۔ اس نے کہا۔

"یہ شاید ایسٹل کی آواز ہے۔"

وہ تیزی سے واپس آئے لیکن واپسی کے سفر میں انہیں سرنگیں پہچاننے میں بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسٹل کون سی سرنگ میں مڑا تھا۔ میک ہر سرنگ میں جھانک کر ایسٹل کو آواز دیتا لیکن اس کے پہلی بار چلانے کے بعد پھر کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ میک اندازے سے ایک سرنگ میں گھس گیا۔ ماریانا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

☆☆☆

جوزن اور ینگ ندی کے دوسری طرف کیرن کو تلاش کر رہے تھے۔ یہ سارا علاقہ جو گھنے جنگل پر مشتمل تھا، تقریباً ہموار ہی تھا۔ ندی، پہاڑی کو اس علاقے سے جدا کر رہی تھی۔ میک سے دو بار گفتگو کے دوران انہوں نے اس علاقے کا کافی حصہ دیکھ لیا تھا لیکن کیرن انہیں کہیں نظر نہیں آئی۔ ینگ نے کہا۔ "اگر وہ جانور اتنا بڑا ہے کہ کیرن جیسی عورت کو اٹھا کر لے جائے تو اس کے طاقت ور ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔"

جوزن نے اس کی تائید کی۔ "کیرن کا وزن ایک سو دس پونڈز سے کسی طرح کم نہیں ہے۔"

"اگر میں کیرن کو اٹھا کر اس جنگل میں سفر کروں تو شاید میں ایک فرلانگ بھی سفر نہ کر سکوں۔" ینگ نے سوچ کر کہا۔ "یعنی جو بھی جانور ہے، وہ عام انسان سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔"

وہ دونوں ایک درخت کے نیچے رکے ہوئے تھے۔ اچانک کوئی نم سی چیز ینگ کی گردن پر گری اور اس نے چونک کر ہاتھ مارا تو اس کے ہاتھ پر خون لگ گیا۔ اس نے بے ساختہ اوپر کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

میک اور ماریانا سرنگ میں تقریباً بھاگ رہے تھے۔ ماریانا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "کیا ضروری ہے کہ ایسٹل اسی سرنگ میں ہو؟"

"نہیں، ہمیں اسے تلاش تو کرنا ہے۔" میک بولا۔ وہ ٹارچ کو ادھر ادھر گھما رہا تھا۔ اچانک اسے ایک طرف ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا۔ میک رک کر اس میں دیکھنے لگا۔ اسے روشنی میں کچھ سامان نظر آیا۔ یہ کوئی کمرے جیسی جگہ تھی اور یہاں صندوق اور اس جیسی کچھ چیزیں رکھی تھیں۔ میک بھی اسی طرف متوجہ تھا کہ ماریانا کو ایک طرف سے ایک سایہ سا آتا نظر آیا اور پھر وہی خوفناک غراہٹ سنائی دی۔ ماریانا نے چیخ ماری۔ میک جب تک روشنی اس طرف کرتا، وہ غائب ہو چکا تھا۔

"وہی جانور... تھا۔" ماریانا کانپتی آواز میں بولی۔

میک نے اسے دیکھا نہیں تھا لیکن اس نے اس کی غراہٹ یقینی طور پر سن لی تھی۔ اب اس میں شبہ نہیں تھا کہ اس غار میں کوئی پراسرار جانور ہے۔ میک نے واکی ٹاکی نکالا اور جوزن سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن غار میں یہ کام نہیں کر رہا تھا۔ ماریانا بولی۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"نہیں... جب تک ہم ایسٹل اور کیرن کو تلاش نہیں کر لیتے، یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

ماریانا نے سر ہلایا۔ "لیکن ہم یہاں اکیلے انہیں تلاش نہیں کر سکتے۔ اگر الگ ہو کر تلاش کریں گے تو اسی طرح غائب ہو جائیں گے۔"

میک نے سوچا اور ماریانا کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم باہر چل کر جوزن اور ینگ کو بھی بلا لیتے ہیں لیکن پہلے میں اس کمرے کو دیکھنا پسند

کروں گا۔"

"اسے ہم بعد میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔" ماریانا نے اصرار کیا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ میک مجبوراً اس کی بات مان گیا لیکن جب انہوں نے واپسی کے لیے سفر شروع کیا تو خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ سرنگ نہیں آئی جس سے وہ اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ وہ شاید ایک نیم دائرے میں سفر کرتے رہے تھے۔ ماریانا نے خدشے کا اظہار کیا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔"

"تب ہم یہاں سے کیسے باہر جائیں گے؟" ماریانا نے وہ سوال کیا جس کا میک کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

ایسٹل سرنگ میں سفر کر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں چاقو تھا۔ وہ کسی بھی خطرے کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ ایک بار اسے آہٹ سی سنائی دی تو وہ رک گیا لیکن خاصی دیر رکے رہنے کے بعد بھی آہٹ دوبارہ نہیں سنائی دی تو وہ پھر چلنے لگا۔ چلنے کے دوران آہٹ ایک بار پھر محسوس ہوئی ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے آس پاس موجود ہو۔ اس نے رک کر ٹارچ سے چاروں طرف روشنی کی لیکن کوئی نظر نہیں آیا اور پھر جیسے ہی اس نے آگے کی طرف دوبارہ سفر شروع کیا، کوئی چیز اس پر اوپر سے گری اور اس کے سر سے کوئی سخت چیز ٹکرائی۔ ایسٹل کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ چکرا کر گر پڑا۔ ٹارچ گرنے کی وجہ سے بجھ گئی تھی۔ اندھیرے میں ایسٹل کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اسے کسی جانور کی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں اور اس کے جسم سے اٹھتی بو محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس جانور نے اس کا جسم ٹٹولا اور پھر اس کے لمبے بال پکڑ کر اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ ایسٹل تکلیف سے چلانے لگا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

☆☆☆

میک نے اوپر کی طرف دیکھا اور پھر بے ساختہ چیخ اٹھا۔ "اے! وہ دیکھو... کیرن۔"

جوزن نے اوپر دیکھا تو کیرن اسے درخت کی ایک شاخ پر لیٹی نظر آئی۔ اس کے بازو سے خون نیچے ٹپک رہا تھا۔ جوزن چوکنا ہو گیا۔ اس نے آس پاس دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "وہ جانور بھی کہیں پاس ہی ہوگا۔"

میک کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جوزن پستول سنبھال کر مستعد ہو گیا۔ "تم اسے جا کر نیچے لاؤ۔"

"میں کیسے نیچے لاؤں؟ دیکھ نہیں رہے ہو، وہ کتنی بلند جگہ پر ہے۔"

جوزن نے سوچا اور پستول میک کو تھما دیا۔ "او کے! تم نگرانی کرو، میں اسے لاتا ہوں۔"

جوزن درخت پر چڑھا۔ اس کا خیال تھا، شاید کیرن زندہ نہیں ہے لیکن جب وہ بہ مشکل اس شاخ تک پہنچا جس پر کیرن بے سدھ پڑی تھی تو اس نے اسے سانس لیتے پایا۔ اس کا بازو زخمی تھا اور اس کی شرٹ بھی غائب تھی۔ وہ بالکل عریاں تھی۔ شاید یہاں لانے کے دوران اس کی شرٹ اتر گئی تھی۔ جوزن نے اس کا چہرہ تھپتھپایا۔

"کیرن... کیرن... ہوش میں آؤ۔"

کیرن کو بہ ظاہر کوئی چوٹ نہیں آئی تھی اور وہ شاید صدمے سے بے ہوش تھی۔ جوزن مسلسل اس کا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے اسے آوازیں دیتا رہا۔ اس کی کوشش رنگ لانے لگی۔ کیرن کراہی اور پھر رفتہ رفتہ ہوش میں آ گئی۔ جوزن نے احتیاطاً اسے تھام لیا تھا کہ وہ ہلنے سے نیچے نہ گر جائے۔ وہ اسے آواز دے رہا تھا تا کہ وہ ہوش میں آنے پر بھڑک نہ جائے۔ کیرن نے آنکھیں کھولیں اور جوزن کو دیکھ کر اس کی وحشت کم ہوئی۔

"وہ کہاں ہے؟"

"کون؟"

"وہ جانور...!" کیرن نے آس پاس دیکھا اور چیخ مار کر جوزن سے لپٹ گئی۔ وہ اس سمیت گرتے گرتے بچا۔ کیرن تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بالکل عریاں ہے۔

"کیرن! ہوش کرو... ہم دونوں گر جائیں گے... شاباش! خود کو سنبھالو... ہم نیچے اتریں گے۔"

کیرن نے خود کو سنبھال لیا اور جب وہ جوزن سے الگ ہوئی تو اسے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ وہ کٹ کر رہ گئی۔ جوزن نے اس کی شرمندگی محسوس کر کے کسی نہ کسی طرح اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی۔ اس نے فوراً اسے پہن لیا۔ اسی لمحے نیچے سے میک کی چیخ سنائی دی۔ جوزن نے نیچے دیکھا تو اسے میک نظر نہیں آیا۔ وہ چلایا۔ "میک! کیا ہوا؟"

لیکن میک کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ جوزن فکر مند ہو گیا۔ اس نے کیرن سے کہا۔ "تم ٹھیک ہو نا... نیچے اتر سکتی ہو؟"

کیرن کو بازو پر زخم کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ "ہاں، میں اتر سکتی ہوں۔"

"میرے پیچھے آؤ۔"

جوزن نیچے اترنے لگا، کیرن بھی اس کے پیچھے تھی۔ جوزن اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا لیکن وہ بے چاری خود سے زیادہ قمیص کو سنبھال رہی تھی۔ وہ نیچے آئے۔ جوزن نے چاروں طرف دیکھا۔ میک غائب تھا اور آواز دینے پر بھی اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔

"یہ کہاں چلا گیا؟" جوزن فکر مند ہو گیا۔

"اسے بھی وہی درندہ لے گیا ہوگا۔" کیرن نے کہا۔ "جو مجھے لے گیا تھا۔"

جوزن چونکا۔ "ہاں اس کے بارے میں تو میں نے پوچھا ہی نہیں... وہ کیسا جانور ہے جو تمہیں اتنی آسانی سے اٹھا کر لے گیا؟"

☆☆☆

میک ذرا دیر کے لیے غافل ہوا تھا۔ اصل میں جب کیرن ہوش میں آ کر شاخ سے اٹھی تو میک اس میں کھو گیا۔ کیرن اگرچہ تیس برس سے زیادہ کی تھی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت دلکش عورت تھی۔ میک اس معاملے میں شوقین مزاج آدمی تھا اس لیے کیرن کو اس حال میں دیکھ کر مبہوت رہ گیا... اور اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کوئی اس کے پاس آ گیا ہے۔ ایک زبردست غراہٹ کے ساتھ کوئی چیز اس پر جھپٹی اور اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور ایک لمحے کو اس کے حواس ہی گم ہو گئے۔ اس نے دیکھنے کی کوشش کی تو اسے سوائے بھورے بالوں کے ایک گول مٹول سے وجود کے کچھ نظر نہیں آیا۔ ایک انسانی ہاتھ سے ملتا ہوا پنجہ اس کا بازو جکڑے اسے کھینچے لیے جا رہا تھا اور وہ اس کے سامنے بالکل بے بس تھا۔ پھر اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ایسٹل کو کھینچ کر لانے والے جانور نے اسے کسی تاریک جگہ لا کر چھوڑ دیا۔ البتہ اس کی سانسوں کی غراتی آواز پاس سے آ رہی تھی۔ ایسٹل کا خوف کے مارے برا حال تھا۔ اس کا سر اب بھی چکرا رہا تھا۔ پتا نہیں اس جانور نے کس چیز سے ضرب لگائی تھی۔ ایک دو بار اس نے چیخنے کا سوچا لیکن جانور کے ڈر سے رک گیا کہ وہ مشتعل ہو کر اس پر حملہ نہ کر دے۔ اس لیے بجائے وہ دم سادھے پڑا رہا۔ وہ کچی زمین پر تھا اور یہاں مکمل طور پر تاریکی تھی۔ جانور کچھ دیر اس کے پاس غراتا رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی ایسٹل بہت دیر تک ساکت رہا۔ اس کے کان کسی آہٹ پر مرکوز تھے لیکن جب ایسی کوئی آہٹ سنائی نہیں دی اور نہ جانور کی واپسی ہوئی تو وہ آہستہ سے اٹھا اور زمین پر ہاتھ ... کر ٹٹول کر آگے بڑھا۔ چند فٹ بعد اس کا ہاتھ دیوار سے ٹکرایا۔ وہ اس کے سہارے کھڑا ہو گیا اور دیوار ٹٹول ... کر آگے بڑھنے لگا۔ یہ غار کا کوئی حصہ تھا۔ وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اسے ٹھوکر کھانے سے زیادہ خوف ... جانور کی واپسی کا تھا۔

ذرا دیر میں ایسٹل کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی بند سرنگ میں ہے۔ وہ اس کے سرے کی طرف جانے لگا۔ اسے ایک خوف فرش میں کسی گڑھے کا تھا اس لیے وہ بہت سنبھل کر قدم آگے رکھ رہا تھا۔ تاریکی میں اسے بالکل اندازہ نہیں ... رہا تھا کہ وہ غار کے کس حصے میں ہے لیکن وہ ایک جگہ رک نہیں سکتا تھا، وہ بڑھتا رہا۔ ہر دس بارہ قدم کے بعد رک کر وہ ... گن لیتا کہ کہیں آس پاس کوئی جانور تو نہیں۔ اس وقت اسے وہ تمام فلمیں یاد آ رہی تھیں جن میں انسان کسی جزیرے پر ... کر وہاں پائی جانے والی کسی پراسرار اور خوں خوار مخلوق ... نشانہ بن جاتے ہیں۔ وہ ان فلموں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا ... لیکن آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس قسم کے واقعات حقیقت میں بھی ہوتے ہیں۔

جب جانور نے اس پر حملہ کیا تھا تو اس کے ہاتھ سے ٹارچ کے ساتھ چاقو بھی چھوٹ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اسے کوئی ہتھیار مل جائے، کوئی پتھر ہی مل جائے تا کہ جانور کے حملے کی صورت میں وہ اپنا کچھ دفاع تو کر سکے لیکن زمین ٹٹولنے کے باوجود اسے کوئی پتھر نہیں ملا۔ بند سرنگ سے باہر آنے کے بعد اس نے کئی اور سرنگوں میں سفر کیا۔ یہ شاید ... در شاخ تھیں اور اسے امید تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں جا کر تو نکلے گا۔ چلتے چلتے اچانک اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ وہ چیز ذرا آگے کھسکی۔ غار کی فضا میں ایک آہنی جھنکار گونجی۔ ایسٹل جلدی سے فرش پر بیٹھ کر اس چیز کی تلاش میں ہاتھ مارنے لگا اور پھر اس کے ہاتھ میں ٹارچ آ گئی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے جلدی سے ٹارچ جلائی۔ روشنی ہوتے ہی اس نے فرش پر چاقو کی تلاش شروع کی اور کچھ دیر بعد اسے چاقو بھی مل گیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ سیدھا اسی جگہ آیا تھا جہاں جانور نے اس پر حملہ کیا تھا۔ چاقو ہاتھ میں آتے ہی اس کے اعتماد میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ جیسے ہی سیدھا کھڑا ہوا، سامنے اسے ایک بھیانک صورت نظر آئی۔ ایسٹل لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ بھیانک صورت نے ایک خوفناک سی آواز نکالی۔ ایسٹل پلٹ کر اندھا دھند بھاگا تھا کہ کسی سے ٹکرایا اور

اسے لیتا ہوا زمین پر جا گرا۔ غراہٹ کی آواز پھر آئی، ٹارچ ایک بار پھر بجھ گئی تھی۔

☆☆☆

ینگ کا سر چکرا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ جانور اسے بڑی بے دردی سے زمین پر کھینچ رہا تھا۔ پتھروں اور جھاڑیوں کی رگڑ سے اس کے کپڑے پھٹ رہے تھے اور جسم پر خراشیں آرہی تھیں۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ کاش اردگرد پر نظر رکھتا تو اتنی آسانی سے اس درندے کا شکار نہ ہوتا۔ جانور اسے جس طرح کھینچے لیے جا رہا تھا، اس سے اس کے عزائم درست نہیں لگ رہے تھے۔ ایک دو بار ینگ نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن یہ مزاحمت ایسی تھی جیسے کوئی حقیر تنکا سیلاب کے منہ زور ریلے کے سامنے مزاحمت کرتا ہے۔

جب اس کے حواس کسی قدر بحال ہوئے، تب بھی اس نے آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی پایا۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب گیا کہ سر کی چوٹ نے اس کی بینائی چھین لی ہے۔ اسے ذرا بھی نظر نہیں آرہا تھا جبکہ جانور اسے جس طرح کھینچ رہا تھا، صاف لگ رہا تھا کہ اسے سب نظر آرہا ہے۔ پھر اس نے ینگ کو کہیں پھینک دیا اور اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ اس پر جانور نے زور سے غرایا کہ ینگ کی گھگی بندھ گئی اور اس نے دم سادھ لیا۔ جانور کچھ دیر اسے الٹا پلٹتا رہا۔ ینگ اس کے سامنے بالکل کھلونا بنا ہوا تھا۔ اس الٹنے پلٹنے میں اسے چوٹیں بھی آئیں مگر اس بار اس نے آواز نکالنے کی غلطی نہیں کی۔ جب جانور کو یقین ہو گیا کہ وہ ہوش میں نہیں ہے تو اس نے ینگ کو چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر وہیں بیٹھ کر ہانپتا رہا پھر اٹھ کر کہیں چلا گیا۔

ینگ نے اندازہ لگایا کہ وہ کہیں سائے میں ہے کیونکہ یہاں سورج کی تمازت بالکل نہیں تھی اور سائے کی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اس جزیرے پر کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں اتنی مکمل تاریکی ہو۔ وہ یقیناً اندھا ہو گیا تھا۔ خاصی دیر تک تو مارے صدمے کے وہ ہلا بھی نہیں پھر جب سر کی تکلیف کم ہوئی اور ہوش بھی پوری طرح بحال ہو گئے تو اس نے کھڑے ہو کر چلنے کی کوشش کی اور فوراً ہی اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرایا۔ اس کی کراہ نکل گئی پھر اس نے آواز دباتے ہوئے اس پتھر کو ٹٹولا تو وہ پتھر کی چھت ثابت ہوئی۔ وہ کسی غار میں تھا۔ اسے تعجب ہوا۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر غار کا حدود اربع دریافت کیا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی بند جگہ پر ہے۔ شاید کسی بہت گہرے غار میں جہاں روشنی کی ایک کرن بھی نہیں آرہی تھی۔ یہ سوچ کر اسے امید بندھی کہ وہ اندھا نہیں ہوا بلکہ یہ جگہ مکمل طور پر تاریک تھی۔ وہ دیوار کو ٹٹول کر چلنے لگا۔ لیکن وہ بے احتیاطی سے چل رہا تھا۔ کبھی اس کا سر کسی پتھر سے ٹکراتا اور کبھی پاؤں کو ٹھوکر لگتی۔ لیکن وہ تکلیف برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ غاروں کے کسی طویل سلسلے میں ہے۔ اسے تعجب ہوا کہ اس جزیرے میں ایسے غار بھی ہیں۔

چلتے چلتے اچانک اسے ایک جگہ ٹھوکر لگی اور جب وہ گرا تو اسے سامنے کہیں ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور چوٹ کی پروا کیے بغیر اس طرف بڑھا۔ جیسے جیسے وہ پاس جا رہا تھا، روشنی تیز ہو رہی تھی۔ وہ ایک سرنگ کے دہانے کے سامنے پہنچا تو روشنی تیز ہو گئی۔ پھر اسی لمحے جانور کی غراہٹ سنائی دی۔ جس کے پاس روشنی تھی، وہ آکر اس سے ٹکرایا اور جانور کی غراہٹ دوبارہ سنائی دی۔ ینگ نے بدحواس ہو کر چیخ ماری تو ایسٹل کا ہاتھ رک گیا ورنہ وہ اسے تاریکی میں چاقو مارنے والا تھا۔ جانور کی غراہٹ سے پتا چل رہا تھا کہ وہ قریب آرہا ہے، ایسٹل نے پلٹ کر چاقو والا ہاتھ گھمایا تو جانور دردناک انداز میں غرایا۔ پھر وہ بھاگا تو اس کی غراہٹیں معدوم ہونے لگیں۔

ٹارچ اصل میں ابھی بجھی نہیں تھی بلکہ ینگ کے نیچے دب گئی تھی۔ جب وہ اس پر سے ہٹا تو روشنی نظر آنے لگی۔ ینگ نے ٹارچ اٹھائی اور ایسٹل کو دیکھ کر چونکا۔ "تمہیں... کیا ہوا ہے؟" ایسٹل کا حلیہ بھی خراب تھا۔ وہ بولا۔ "وہی جو تمہیں ہوا ہے۔ اس جانور نے تم پر بھی حملہ کیا تھا؟"

"ہاں، یہ مجھے ندی کے پاس جنگل سے پکڑ لایا ہے۔ ہم کس جگہ ہیں؟"

"پہاڑی کے اندر غار میں سرنگوں کا ایک جال ہے۔"

"میں پہاڑی میں ہوں؟" ینگ حیران ہوا۔ "لیکن میں نے تو کہیں سے ندی پار نہیں کی ہے۔"

"تمہیں ہوش نہیں رہا ہوگا۔"

"نہیں، اس صورت میں میرے کپڑے تو گیلے ہوتے۔" ینگ نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا پھر وہ چونکا۔ "ماریانا اور میک کہاں ہیں؟"

"اسی غار میں... لیکن مجھے نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں۔ وہ کیرن کو تلاش کر رہے ہیں۔"

"کیرن ہمیں مل گئی تھی، وہ ایک درخت پر پڑی تھی۔ جوزن اسے اتارنے گیا تھا کہ جانور نے پیچھے سے مجھ پر حملہ کر دیا۔"

"کیرن مل گئی ہے۔" ایسٹل خوش ہو گیا۔ "نہ جانے اس

جزیرے پر کون سی بلا ہے اور ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔"

"میں بھی اس جانور کو دیکھ نہیں سکا ہوں۔" ینگ نے اعتراف کیا۔ وہ دونوں گفتگو کے دوران غار کے دونوں طرف نظر رکھے ہوئے تھے کہ جانور ان کی بے خبری میں حملہ نہ کر دے۔ ایسٹل کے چاقو پر خون لگا تھا۔ یعنی جانور زخمی ہوا تھا اور زخمی زیادہ خطرناک ہوتا ہے، وہ پلٹ کر حملہ کر سکتا تھا۔ ایسٹل نے کہا۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"لیکن راستہ کس طرف ہے؟"

"میرا خیال ہے اس طرف۔" ایسٹل نے ایک طرف اشارہ کیا اور دونوں اس طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

ماریانا اور میک غار میں بھٹک رہے تھے اور انہیں ابھی تک راستہ نہیں ملا تھا۔ کئی بار انہیں ایسا لگا جیسے سرنگوں میں ان کے آس پاس کوئی ہے لیکن روشنی میں کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ ایک سرنگ سے نکل کر دوسری میں داخل ہوتے اور کبھی کوئی سرنگ بند ملتی تو انہیں پلٹنا پڑتا۔ ایک سرنگ میں وہ داخل ہوئے تو وہ نشیب کی طرف جانے لگی اور پھر وہ ایک زیر زمین جھیل تک جا پہنچے۔ یہ شاید سمندر کا پانی تھا جو کسی سرنگ کے راستے اس غار میں داخل ہو گیا تھا۔ میک نے پانی چکھ کر اس کی تصدیق کی۔ وہ پانی سمندر کا تھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان چٹانوں میں سرنگوں کا جال پورے جزیرے میں پھیلا ہوا ہے۔"

وہ واپس پلٹے اور سرنگ کے داخلی راستے کی طرف آنے لگے کیونکہ جھیل والی جگہ بند تھی اور وہاں سے مزید کوئی راستہ نہیں نکل رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اس سرنگ سے باہر آئے، تاریکی سے ایک سایہ لپکا اور اس نے میک پر چھلانگ لگائی۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ جانور سمیت زمین پر گر گیا۔ ماریانا چلانے لگی۔ میک نے حواس بحال رکھے۔ گرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ٹارچ نکل گئی تھی لیکن اس نے پستول پر گرفت رکھی اور پھر سنبھلتے ہوئے پستول کا رخ جانور کی طرف کر کے فائر کر دیا۔ اس محدود جگہ میں فائر کی آواز بڑی طرح گونجی۔ جانور غرایا اور فوراً ہی چھلانگ مار کر کہیں غائب ہو گیا۔ ماریانا نے بھی نہیں دیکھا کیونکہ وہ آنکھیں بند کر کے چلانے میں مصروف تھی۔ میک جلدی سے اٹھا اور اس نے ٹارچ اٹھائی۔

"خدا کے لیے چپ کر جاؤ... وہ جا چکا ہے۔"

ماریانا چونکی۔ "وہ چلا گیا... میرے خدا! کتنی خوفناک چیز تھی۔"

"وہ چیز نہیں جانور ہے۔" میک نے کہا اور ماریانا کا بازو پکڑ کر تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ کئی سرنگوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک سرنگ میں داخل ہوئے جو دور تک سیدھی جا رہی تھی۔ میک کو امید ہوئی کہ شاید یہ سرنگ انہیں اس غار سے باہر نکال دے۔ وہ اس سرنگ میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ماریانا کو عقب سے غرانے کی آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو کئی سائے اسے اپنی جانب لپکتے نظر آئے۔ ان کا رخ انہی کی طرف تھا۔ میک نے چلا کر کہا۔

"بھاگو۔"

وہ بھاگے۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ غار ان خوفناک جانوروں کا مسکن ہے۔ سرنگ سیدھی چلی جا رہی تھی اور ماریانا دوڑنے کے دوران بار بار مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ عقب میں آنے والے جانور رفتار میں کسی طرح ان سے کم نہیں اور ان کا فاصلہ کم یا زیادہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ راستہ بند نہ ملے ورنہ ان کے بچنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایک پستول سے میک کتنوں کو مار سکتا تھا۔

"تیز دوڑو... تیز۔" میک بار بار کہہ رہا تھا۔

"میں... اس سے... زیادہ... تیز نہیں... دوڑ سکتی۔" ماریانا ہانپتے ہوئے بولی۔ میک نے محسوس کیا کہ اسے ان جانوروں کو خود سے دور رکھنے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔ اس نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر فائر کیے۔ اس پر جانور رک گئے لیکن انہوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ ذرا فاصلے پر رہ کر ان کے پیچھے آرہے تھے۔ ماریانا آگے تھی، اس نے ذرا فاصلے پر روشنی دیکھی۔ یہ قدرتی روشنی تھی۔ اس نے میک کو بتایا۔ "وہ باہر جانے کا راستہ ہے۔ ہم وہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

لیکن جب وہ اس جگہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا، یہ زمین سے کوئی دس فٹ اوپر ایک سوراخ تھا اور وہ کسی مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ ان کے پیچھے جانور دوڑتے آرہے تھے اور ان کی غراہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

☆☆☆

جوزن اور کیرن درخت کے نیچے موجود تھے۔ جوزن نے حیرت سے کیرن کی طرف دیکھا۔ "بڑی نسل کے بندر... لیکن بندر یہاں کہاں سے آگئے؟"

کیرن نے شانے اچکائے۔ "میں کیا کہہ سکتی ہوں... لیکن مجھے لے جانے والا بندر ہی تھا۔ وہ درخت کے عقب

www.pkdigest.com

میں تھا اور اس کے پاس ینگ کی شرٹ تھی۔ میں اور ماریانا سمجھے کہ ینگ چھپ کر ہمیں نہاتے دیکھ رہا ہے۔"

"کیسا بندر ہے... میرا مطلب ہے اس کی جسمانی ساخت کیسی ہے؟"

"بہت بڑا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، جب کھڑا ہوتا ہے تو اس کا قد چار فٹ ہوگا لیکن جسمانی طور پر بہت مضبوط اور طاقت ور ہے۔ اس نے کسی کھلونے کی طرح مجھے اٹھا لیا تھا اور اس کا ناخن میرے بازو پر لگا تو مجھے زخم آگیا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ شاید میں ڈر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔"

جوزن کو بندر کا سوچ کر ہنسی آنے لگی۔ اس نے کہا۔ "کہیں وہ تم پر عاشق تو نہیں ہوگیا تھا؟"

کیرن کا چہرہ سرخ ہوگیا اور اس نے خفگی سے جواب دیا۔ "مجھے کیا معلوم... جب مجھے ہوش آیا تو تم میرے سامنے تھے۔"

جوزن کو یاد آیا کہ ینگ بھی غائب ہوگیا ہے اور اسے بھی وہی بندر لے گیا ہوگا۔ اس نے واکی ٹاکی پر میک سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ جوزن نے واکی ٹاکی بیلٹ میں لگایا اور بولا۔ "چلو، ان کو تلاش کرنا ہوگا۔"

کیرن صرف شرٹ میں غیر مطمئن تھی۔ اس نے کہا۔ "کیا کیمپ چل کر پہلے میں لباس نہ پہن لوں؟"

"نہیں، وقت نہیں ہے۔ پتا نہیں وہ لوگ کس مصیبت میں پڑ گئے ہیں اور اگر دیر ہوئی تو یہ بندر انہیں مار نہ دے۔"

کیرن نے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" جوزن نے زمین پر نشانات تلاش کرتے ہوئے کہا۔ اگر بندر ینگ کو کھینچ کر لے گیا تھا تو زمین پر اس کے نشانات ہونے چاہیے تھے پھر اسے نشانات نظر آگئے۔ وہ اس کا تعاقب کرنے لگا۔ پستول ینگ کے پاس تھا اور وہ پستول سمیت غائب ہوا تھا۔ جوزن نہتا تھا اس لیے اس نے ایک سوکھی ہوئی شاخ اٹھالی۔ ایسی ہی ایک شاخ کیرن نے اٹھالی۔ ایک جگہ کیرن کو گھاس میں کسی سیاہ چیز کی جھلک نظر آئی۔ اس نے اٹھایا تو وہ پستول تھا۔ جوزن خوش ہوگیا۔ اس نے پستول لے کر چیک کیا اور بولا۔

"ہم درست راستے پر جارہے ہیں۔ بندر ینگ کو اسی طرف لے گیا ہے۔"

وہ آگے بڑھے تو انہیں ایک جگہ کئی گھنے درخت ایک ساتھ نظر آئے۔ گھسیٹنے کے نشانات یہیں تک آئے تھے۔ جوزن نے پریشان ہوکر درختوں کی طرف دیکھا۔

"اگر وہ ینگ کو یہاں لے آیا ہے تو اسے اتنے درختوں پر کیسے تلاش کریں؟"

کیرن نے تائید کی۔ "یہ بہت گھنے ہیں۔"

اچانک ہی فائرنگ کی آواز گونجی تو وہ اچھل پڑے۔ فائروں کی آواز درختوں کے درمیان سے آئی تھی۔ جوزن ان کے ملے ہوئے تنوں پر پاؤں رکھتا ہوا اوپر چڑھنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے چلا کر کہا۔ "کون ہے... فائر کون کررہا ہے؟"

"جوزن!" جواب میں میک کے چلانے کی آواز آئی۔ "ہم یہاں ہیں۔"

"بولتے رہو، میں آرہا ہوں۔" جوزن بولا۔ وہ اس جگہ پہنچا جو تمام درختوں کے عین وسط میں تھی اور یہاں زمین میں سوراخ تھا۔ اس نے نیچے جھانکا تو اسے میک اور ماریانا نظر آئے۔ اسی لمحے میک نے ایک طرف دو فائر کیے اور پھر اس کا پستول خالی ہوگیا۔ "میک!" جوزن نے آواز دی۔ "یہ لو پستول۔"

میک خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ جانور مسلسل قریب آنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس کا پستول خالی ہوگیا تھا۔ جوزن نے سوراخ سے اپنا پستول پھینک دیا۔ میک نے کیچ کرکے کہا۔ "ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے کچھ کرو۔ ہم از خود نہیں نکل سکتے۔"

ماریانا اس کے عقب میں تھی اور جانوروں کی [illegible] سن کر کانپ رہی تھی۔ جوزن کی آواز سن کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ پستول لے کر میک جانوروں کو ڈرانے لگا۔ اس نے اب تک جتنے بھی فائر کیے تھے، وہ ان کو ڈرانے کے لیے کیے تھے۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی جانور کو گولی نہ لگے کیونکہ اس صورت میں باقی اشتعال میں بھی آسکتے تھے۔ وہ ان کو ڈرا کر دور رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس دوران میں جوزن نے درخت کی ایک لمبی سی جڑ موڑ کر سوراخ میں داخل کی۔ یہ اندر آگئی تو سب سے پہلے ماریانا اوپر چڑھی۔ موٹی اور کھردری جڑ پر ہاتھ بڑے آرام سے جم رہے تھے۔ ماریانا اوپر پہنچی تو جوزن نے اسے سہارا دے کے باہر نکلنے میں مدد دی۔ پھر اس نے میک کو اوپر آنے کو کہا۔ میک نے دو فائر کیے اور پھر تیزی سے جڑ پکڑ کر اوپر آگیا۔

جوزن نے میک کا ہاتھ پکڑا اور وہ درختوں کے درمیان سے نکل آئے۔ کیرن اور ماریانا ایک دوسرے سے لپٹی کھڑی تھیں۔ کیرن نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ بندر اسی راستے سے ینگ کو اندر لے گیا ہے۔"

میک اور ماریانا چونکے۔ "ینگ کو لے گیا ہے؟" میک

نے کہا۔ "ایسٹل بھی اندر کہیں غائب ہوگیا ہے۔ اندر تو پوری بھول بھلیاں ہیں، ہم بڑی مشکل سے باہر نکلے ہیں۔"

"یہ غار ان جانوروں کی رہائش ہے۔" ماریانا بولی۔

"یہ بڑی نسل کے بندر ہیں۔" کیرن نے انکشاف کیا۔ "بہت طاقت ور اور پھرتیلے۔"

"بندر؟" میک چونکا۔ "اس جزیرے میں بندر کہاں سے آئے؟ اور یہ عام طور سے تو نظر نہیں آتے۔"

"یہ اسی غار میں چھپے رہتے ہیں۔" جوزن نے کہا۔ "شاید رات میں یا کھانے کی تلاش میں باہر آتے ہیں۔"

"اگر ایسٹل اور ینگ اندر ہیں تو کیا وہ اب تک زندہ ہوں گے؟" ماریانا بولی۔

"ہم بھی زندہ ہیں۔" میک بولا۔ "ان کے لیے بھی یہی امید رکھو کہ وہ زندہ ہوں گے۔"

☆☆☆

ایسٹل اور ینگ غار میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے کئی سرنگیں دیکھیں لیکن باہر جانے کا راستہ نہیں ملا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ ہم ساری عمر اسی جگہ بھٹکتے رہیں گے۔"

"نہیں، یہاں سے نکلنے کا راستہ ہے۔" ایسٹل نے کہا۔ وہ ٹارچ کی مدد سے راستہ تلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا [illegible] یہاں آ پھنسے ہیں۔ [illegible] نے یہ بات ینگ سے کہی۔ اس نے جواب دیا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے اور ممکن ہے اسی سرنگ میں باہر جانے کا راستہ ہو۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اچانک ہی ایسٹل کو دیوار میں ایک سوراخ نظر آیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ "یہ کیا ہے؟"

"چھوڑو اسے۔" ینگ نے بے تابی سے کہا۔ "یہاں سے نکلنے کی کرو۔"

لیکن ایسٹل جھک کر سوراخ میں روشنی ڈال کر دیکھنے لگا۔ اسے دوسری طرف ایک کمرا جیسا نظر آیا جس میں سامان بھی رکھا تھا۔ صندوق تھے اور بھی کچھ چیزیں تھیں۔ "یہ کیا ہے؟" ایسٹل مارے تجسس کے اندر گھس گیا۔ ینگ اسے روکتا رہ گیا اور جب وہ اس سرنگ میں اکیلا رہ گیا تو ڈر کر خود بھی ایسٹل کے پیچھے آگیا۔ یہ ایک کمرا نما جگہ تھی۔ اسے تراشا گیا تھا یا پھر قدرتی ساخت ہی ایسی تھی۔ وہاں پیٹیاں رکھی تھیں اور فولادی صندوق تھے۔ ان پر جمی مٹی بتا رہی تھی کہ شاید نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود انہیں کسی نے چھوا تک نہیں۔ اسی لمحے انہیں باہر جانوروں کے غرانے کی آواز آئی۔

"جلدی کرو... صندوق سوراخ کے سامنے کرو۔" ایسٹل نے کہا۔

سوراخ زیادہ بڑا نہیں تھا اور انہوں نے ایک صندوق کھینچ کر اس کے سامنے کردیا۔ اب کوئی جانور اندر نہیں آسکتا تھا۔ جانور غرانے اور صندوق پر پنجے مارنے لگے۔ لیکن وہ اسے ہٹا نہیں سکتے تھے۔ ایسٹل ٹارچ کی روشنی میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک صندوق سے گرد جھاڑی تو اس پر جمی مٹی اڑنے لگی۔ جب گرد بیٹھی تو اس نے دیکھا، صندوق پر جاپانی زبان لکھی تھی۔ اس نے ینگ کی طرف دیکھا۔

"یہ تو جاپانی ہے۔"

لیکن ینگ کو اس وقت جاپانی یا کسی بھی زبان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی تو جان پر بنی ہوئی تھی اور باہر موجود جانوروں کی آوازیں اسے دہلائے دے رہی تھیں۔ "یہاں سے نکلنے کی کرو۔" اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"ادھر آؤ، میرے ساتھ مل کر یہ صندوق کھولو۔" ایسٹل نے کہا۔ وہ ایک صندوق کا تالا توڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ [illegible] خاصا مضبوط تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا تو اسے ایک سلاخ نظر آئی۔ اس نے سلاخ تالے میں پھنسائی اور زور لگایا تو تالا ٹوٹ گیا۔ اس نے تالا نکال کر صندوق کھولا۔ ینگ بھی اس کے پاس آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ صندوق میں کوئی قیمتی چیز ہوگی تبھی تو ان صندوقوں کو اس طرح یہاں چھپا کر رکھا گیا تھا لیکن جب ایسٹل نے اندر روشنی کی تو اسے لمبی لمبی پائپ نما چیزیں نظر آئیں۔

"یہ کیا ہے؟" ینگ نے پوچھا۔

ایسٹل نے ایک پائپ نکالا۔ "یہ تو گیس بم ہے۔" اس نے کہا۔

"اسے باہر پھینک دو۔" ینگ اضطرابی لہجے میں بولا۔ "ان جانوروں سے تو نجات ملے۔"

"تمہارا دماغ درست ہے؟ ان کے ساتھ ہم بھی دم گھٹ کر مر جائیں گے۔"

"تب ان کے ماسک دیکھو۔" ینگ بولا۔

انہوں نے باقی صندوقوں کے تالے بھی توڑ دیے۔ ان سب میں اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ گیس ماسک کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ کسی میں رائفلیں تھیں اور کسی میں ان کا ایمونیشن... کسی میں دستی بم تھے۔ ینگ نے دستی بم استعمال

کرنے کا مشورہ دیا لیکن ایسٹل نے اسے بھی مسترد کر دیا۔
"دھماکے سے غار بیٹھ گیا تو یہ ہمارا مدفن بن جائے گا۔"
"تو کیا ہم یہیں چھپے رہیں گے؟" ینگ بھنا گیا۔
ایسٹل اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک صندوق سے نکلنے والے کاغذات کا معائنہ کرنے لگا۔ اس میں شاید فوجی کاغذات بھی تھے اور نجی کاغذات بھی کیونکہ اس میں تصویریں بھی تھیں۔ ینگ کمرے کی باقی چیزوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک طرف رکھے سامان پر سے مٹی جھاڑی تو اس میں سے چند گیس ماسک نکل آئے۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔
"گیس ماسک مل گئے۔"
ایسٹل اس کی طرف آیا۔ اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "اب ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"
"لیکن پہلے یہ دیکھ لو کہ یہ بم کام بھی کرتے ہیں یا نہیں... بہت پرانے ہو چکے ہیں۔"
یہ خدشہ ایسٹل کے ذہن میں بھی تھا۔ انہوں نے پہلے گیس ماسک چڑھائے اور پھر صندوق ہٹا کر چھوٹے سے سوراخ سے ایک بم باہر پھینک دیا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ اس میں سے گیس نکلنے لگی اور جانور چیختے چلاتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلے۔ انہوں نے جلدی سے صندوق ہٹایا اور جتنے گیس بم اٹھا سکتے تھے وہ لے کر باہر نکل آئے۔ راستے میں جہاں انہیں کسی جانور کا شبہ ہوتا، وہ وہاں ایک بم دے مارتے۔ ذرا سی دیر میں غار میں اتنا دھواں پھیل گیا کہ انہیں راستہ ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

میک نے جوزن کو بتایا کہ اس نے غار کے اندر جانے والا راستہ پہاڑی کے ساتھ دیکھا تھا اور وہ اس جگہ سے کم سے کم دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ جوزن نے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے کہ زیرِ زمین سرنگوں کا سلسلہ اس پورے جزیرے میں پھیلا ہوا ہے؟"
"ہاں کیونکہ یہ سارا جزیرہ مونگے کی چٹانوں سے بنا ہے۔ کسی وجہ سے اس میں یہ سرنگیں وجود میں آ گئی ہیں۔"
وہ ندی عبور کر کے پہاڑی کی طرف بڑھے جہاں غار میں داخل ہونے کا راستہ تھا لیکن جب وہ دہانے تک پہنچے تو اس سے دھواں نکل رہا تھا۔ وہ تشویش زدہ ہو گئے۔ "یہ دھواں کیسا ہے؟" جوزن نے کہا۔
"کیا اندر کوئی آتش فشاں پھٹنے والا ہے۔" ماریانا خوف زدہ ہو گئی۔
"نہیں، یہ تو آنسو گیس کی بو ہے۔" میک نے کہا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ حالت بری ہو جائے گی۔"
"لیکن یہاں آنسو گیس کہاں سے آ گئی؟" جوزن نے پوچھا۔
دہانے سے گیس اتنی مقدار میں نکل رہی تھی کہ وہ اس سے دس گز دور گئے، تب انہیں سکون ملا۔ ورنہ قریب جانے پر وہ ان کی آنکھوں پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اسی لمحے انہیں غار کے دہانے پر کسی کی حرکت کا احساس ہوا۔ وہ ہوشیار ہو گئے پھر دو انسان نما عجیب خوفناک صورت چیزیں اندر سے نکلیں تو خواتین نے چیخ ماری اور میک نے بے اختیار پستول سیدھا کر لیا۔ آنے والوں میں سے ایک چلایا۔
"گولی مت چلانا، یہ ہم ہیں۔"
آواز ینگ کی تھی۔ میک نے پستول نیچے کر لیا۔ وہ دھوئیں سے ذرا دور آئے تو پتا چلا انہوں نے گیس ماسک چڑھا رکھے ہیں۔ انہوں نے گیس ماسک اتار دیے اور سب کو صحیح سلامت پا کر خوش ہوئے۔ سب ایک دوسرے کے گلے لگے۔ حد یہ کہ کیرن اور ماریانا بھی ینگ کے گلے لگ گئیں تو وہ اور بھی خوش ہو گیا۔ ایسٹل نے بتایا کہ اس نے گیس بم مار مار کر پورا غار دھوئیں سے بھر دیا ہے۔ "وہ کم بخت جانور مر گئے ہوں گے۔"
"وہ بندر ہیں۔" ماریانا نے کہا۔ "زیادہ بڑی نسل کے ہیں۔"
"لیکن یہ آئے کہاں سے؟" جوزن بولا۔ "میری معلومات کے مطابق اس پورے علاقے میں کہیں بندر نہیں پائے جاتے۔"
"میرا ایک خیال ہے۔" ایسٹل بولا۔ "لیکن پہلے ہمیں کیمپ پہنچنا چاہیے۔ اگر بندر بھی باہر نکل آئے تو وہ ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔"
اس بات نے سب کو فکرمند کر دیا کیونکہ ان کے پاس صرف ایک پستول تھا اور اس میں بھی دو تین گولیاں رہ گئی تھیں۔ وہ تیزی سے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر کیرن نے سب سے پہلے لباس پہنا اور میک نے ایک سینڈوچ کھایا کیونکہ اس بھاگ دوڑ سے اس کی بھوک کھل گئی تھی۔ جوزن نے پستولوں میں گولیاں لوڈ کیں۔ ان کی خوش قسمتی کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ ایسٹل نے انہیں غار میں موجود دوسری جنگِ عظیم کے جاپانی اسلحے کے بارے میں بتایا۔
ماریانا اور کیرن اس تجربے کے بعد اتنی خوف زدہ ہو گئی تھیں کہ ایک گھنٹے کے لیے بھی اس جزیرے پر رکنے کو تیار

نہیں تھیں۔ انہوں نے اصرار کیا تو جوزن نے باقی افراد کی رائے لی۔ میک اور ایسٹل نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا لیکن ینگ خواتین کا ہم نوا تھا۔ اس لیے وہ شام سے پہلے سامان سمیٹ کر جزیرے سے رخصت ہو گئے۔ کرس ان کو قبل از وقت دیکھ کر حیران رہ گیا اور جب انہوں نے جزیرے پر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتایا تو وہ اور بھی حیران ہوا۔
جوزن اور میک کو تجسس تھا کہ یہ بندر کہاں سے آئے اور جاپانی اپنا سامان وہاں کیوں چھوڑ گئے تھے؟ جوزن نے ایک اور جزیرے پر اپنا کام مکمل کیا۔ اس دوران میں وہ اور میک واپس جا کر بندروں والے غار کا معائنہ کرنے کا منصوبہ بناتے رہے۔ پھر کرس اور ایسٹل بھی ان کے منصوبے میں شامل ہو گئے۔ البتہ ینگ نے دوبارہ اس جزیرے پر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک صبح نکلے اور جزیرے پر جا اترے۔ اس بار وہ سب مسلح تھے۔ کرس کے پاس ایک رائفل اور ایک شاٹ گن بھی تھی۔ ان کے پاس گیس ماسک بھی تھے۔ اگرچہ اتنے دنوں میں گیس کا اثر لازمی ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ غار میں اترنے کے لیے ساری تیاری کر کے آئے تھے۔ ان کے پاس رابطے کے آلات تھے اور رسیاں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ بڑی سرچ لائٹس بھی تھیں۔
لیکن اس بار انہیں غار میں مزاحمت نہیں ملی کیونکہ مزاحمت کرنے والے مر چکے تھے۔ ان کو مختلف سرنگوں میں بندروں کی دو درجن سے زیادہ لاشیں ملیں اور اب ان کی لاشوں سے بدبو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ سرنگوں میں نشانیاں لگا کر سفر کرتے رہے۔ ایسٹل نے اس کمرے کی نشان دہی کی جس میں جاپانیوں نے سامان رکھا تھا۔ انہوں نے اسلحے والی پیٹیاں ایسے ہی چھوڑیں اور دستاویزات والا صندوق باہر نکال لائے۔ اس میں جاپانی کمپنی کی فوجی دستاویز بھی تھیں جو دوسری جنگِ عظیم میں ان جزائر تک آئی تھی۔ اتفاق سے جوزن کو جاپانی زبان آتی تھی، اس نے بتایا۔
"ایک جاپانی کمپنی تھی جس میں دو سو افراد تھے اور انہیں اس علاقے میں موجود جزائر کا سروے کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ جاپانیوں کا خیال تھا کہ یہاں اتحادی قابض ہیں لیکن جب انہوں نے جزائر کو خالی پایا تو وہ بھی یہاں سے چلے گئے۔ جاتے ہوئے وہ اپنا فالتو سامان اور اسلحہ یہاں چھپا گئے۔"
"ممکن ہے، انہیں بھی ان بندروں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔" میک نے کہا۔
اس دوران میں جوزن ایک چھوٹی سی ڈائری اٹھا چکا تھا۔ اس نے اس کی ورق گردانی کی اور بولا۔ "نہیں، یہ بندر جاپانی ساتھ لائے تھے۔ یہ اسی سپاہی کی ڈائری ہے جو انڈونیشیا سے آتے ہوئے اپنے ساتھ بندروں کی ایک جوڑی لے آیا تھا۔"
ایسٹل کو یاد آیا۔ "ایک منٹ... اس صندوق میں کچھ فوٹو گراف بھی ہیں۔" اس نے کہا اور سامان کھنگالنے لگا۔ کچھ دیر میں اسے تصویروں کا پلندا مل گیا۔ ایک تصویر میں جاپانی سپاہیوں کا ایک گروہ ساحل کے ساتھ بیٹھا تھا اور ایک سپاہی کے سامنے چھوٹی نسل کے بندر کا ایک جوڑا بھی بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ ایسٹل نے تصویر پر انگلی رکھی۔ "میرا خیال ہے کہ یہی وہ جوڑا ہے جس کی نسل اس جزیرے پر پھیلی ہے۔"
"لیکن یہ بہت چھوٹا ہے۔" کرس نے اعتراض کیا۔ "جبکہ جن بندروں کی لاشیں ہم نے دیکھی ہیں وہ بڑی نسل کے چمپینزیوں کے برابر ہیں۔"
"لیکن ان بندروں کے بالوں کا رنگ اور چہرے کی ساخت بالکل اسی جوڑے جیسی ہے۔" ایسٹل نے کہا۔
"ممکن ہے، آب و ہوا کی تبدیلی ان بندروں پر اثر انداز ہوئی ہو اور ان کے سائز بڑھ گئے ہوں۔" جوزن نے کہا۔
"ممکن ہے لیکن اب ان میں سے کوئی بندر زندہ نہیں بچا، سب مر چکے ہیں۔" ایسٹل نے کہا۔
مگر کرس کا خیال بالکل مختلف تھا۔ اس نے کہا۔ "تم لوگوں نے غور نہیں کیا کہ مرنے والے سارے بندر نر اور جوان ہیں۔ ان میں نہ تو مادائیں ہیں اور نہ ہی بچے ہیں۔"
"اس کا کیا مطلب ہوا؟" جوزن نے پوچھا۔
"اس کا مطلب ہے کہ جب بندروں نے اپنے مسکن میں کسی کی دخل اندازی دیکھی تو انہوں نے سب سے پہلے اپنی ماداؤں اور بچوں کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کیا اور پھر انسانوں کے خلاف کارروائی شروع کی۔ اس لیے جب یہاں گیس پھیلی تو سارے ہی جوان نر مرے۔"
"لیکن مادائیں اور بچے کہاں ہیں؟" جوزن نے سوال کیا۔
"اسی جزیرے پر کہیں ہوں گے۔" کرس نے کہا۔
وہ شام تک جزیرے پر رہے لیکن ان کو کہیں بھی کسی زندہ بندر یا اس کے بچے کی جھلک نظر نہیں آئی۔ اگر وہ جزیرے پر تھے، تب بھی انہوں نے خود کو بڑی کامیابی سے چھپا لیا تھا۔ شام کو وہ اس جزیرے سے رخصت ہو گئے جس کا پورا ایک دن ان کے لیے خوف و دہشت کی علامت بنا رہا۔
★

www.pkdigest.com

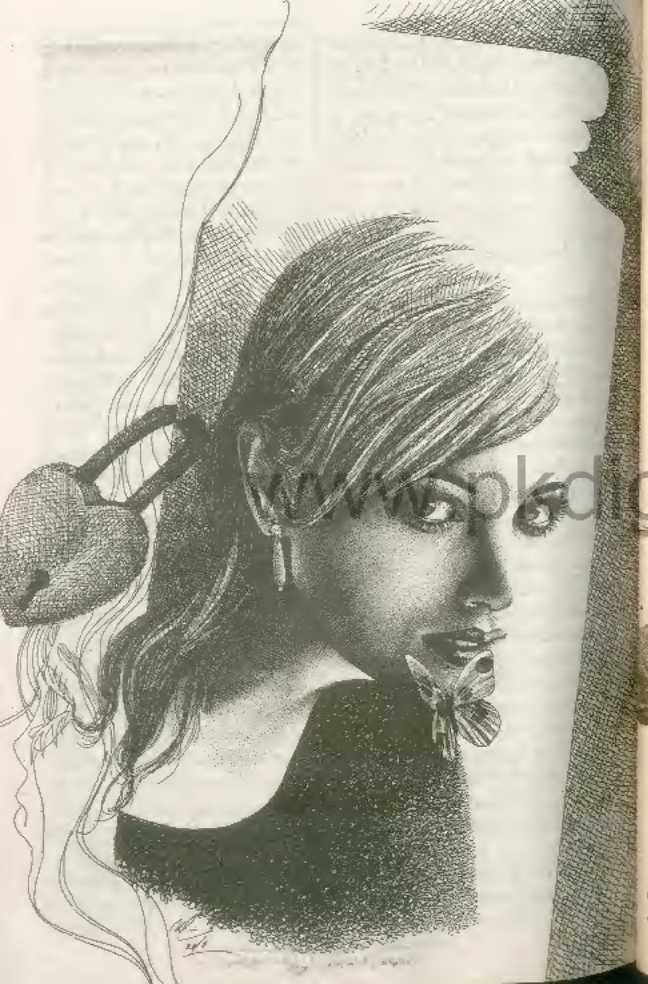

للکار

ان عاشق پروانوں کا ماجرا جو خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے..... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے۔ سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمع نظر مختلف ہے زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر..... عقل و شعور اور جذب عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیش نظر..... ایک للکار ہے۔

پہلی قسط

سیٹھ سراج کی للکارتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''وہ دیکھو... وہ ہے... وہ آرہا ہے۔'' اس نے عمران کو دیکھ لیا تھا۔

میں بھی عمران کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر حتی الامکان تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ شاید اب اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ مجھ تک پہنچے اور مجھے لے کر کنارے کے سرکنڈوں میں اوجھل ہو جائے۔

یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ میں نے ہیڈ لائٹس کی روشنی میں صاف دیکھا۔ ایک گولی عمران کے دائیں کندھے پر لگی۔ اس کا جسم ایک جھٹکے سے

پیچھے کی طرف گیا۔ وہ ایک دم لڑکھڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ماؤزر سیدھا کیا۔ وہ کمال کا نشانے باز تھا مگر یہاں مدِ مقابل ایک یا دو نہیں تھے، بہت سے تھے۔ عمران نے ایک فائر کیا اور اس کے جواب میں طاقتور آٹھ ایم ایم رائفل کا پورا ایک برسٹ اس کے سینے پر لگا... ہاں، اس رائفل کی ایک گولی بھی شاید انسانی جان لینے کے لیے کافی تھی اور یہ پورا برسٹ تھا۔ کم از کم پانچ چھ گولیاں۔ وہ اچھلا اور سر کے بل ڈیک نالے کے تند و تیز پانی میں جا گرا۔ یہ اپنے یار کی آخری جھلک تھی جو میں نے دیکھی۔ اس کے بعد میں جیسے کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس پُرآشوب رات میں، اس ڈیک نالے کے کنارے، ان سرکنڈوں میں عین اس وقت زمین کی گردش تھم گئی ہے اور کائنات ختم ہوگئی ہے۔ وہ ایسے جائے گا؟ اتنی جلدی... اتنا اچانک... ایسا غیر متوقع؟ میں کچھ دیر کے لیے شاید سکتے میں چلا گیا۔ جیسے دل سینے میں پھٹ جائے، نبضیں تھم جائیں اور آنکھیں پتھرا جائیں۔ پھر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے جسم کی ساری توانائی میری ٹانگوں میں منتقل ہو رہی ہے۔ جسم میں موجود خون کا ہر قطرہ میرے پاؤں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یہ شاید زندگی بچانے کی وہ فطری خواہش تھی جو قدرت نے ہر جاندار کی جبلت میں نصب کر رکھی ہے۔

ایک قیامت کا جھٹکا سہنے کے بعد میرے اندر بھی یہ خواہش جاگی اور میں اندھا دھند سرکنڈوں میں بھاگ کھڑا ہوا۔

''وہ دیکھو... وہ جا رہا ہے۔'' ایک بار پھر سیٹھ کی منحوس آواز ہوا میں تیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ آواز کم و بیش چالیس میٹر دور سے آئی تھی اور اس کا رخ میری دائیں جانب تھا۔ مجھے لگا کہ کچھ لوگ للکارتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے ہیں۔ تب یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔ ایک گولی بالکل میرے پاس سے گزری۔ میں نے اس مہلک سیسے کی قاتل سنسناہٹ اپنے سر کے عین اوپر سنی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ابھی کوئی میری کمر یا سر کے پچھلے حصے میں کہیں لگے گی۔ گولی لگنے کا احساس کیا ہوگا؟ کیا میں وہ تکلیف سہہ سکوں گا؟ کیا میں فوراً گر پڑوں گا... کیا میری موت آناً فاناً ہو جائے گی؟ ایسے کئی سوال سیکنڈ کے مختصر وقفے میں میرے دماغ کے اندر چمکے اور اوجھل ہوئے۔

مجھے بس اتنا یاد ہے، میں اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ میرے راستے میں اونچے سرکنڈے تھے، خودرو جھاڑیاں تھیں اور کیچڑ تھا۔ میں گر رہا تھا، اٹھ رہا تھا اور پھسل رہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے اندازاً سو قدم کی دوری پر ہوں گے۔ دفعتاً مجھے لگا کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شاخیں ٹوٹنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ میں ایک ساعت کے لیے یا شاید اس سے بھی کم وقت تک ہوا میں معلق رہا اور پھر کسی نیم ٹھوس جگہ پر گرا۔ میں کمر کے بل گرا تھا۔ میرے اوپر کچھ چیزیں گریں۔ جھٹکے کے سبب آنکھوں میں تارے سے ناچے اور ریڑھ کی ہڈی میں درد کی ایک بلند لہر اٹھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں جہاں گرا تھا، وہیں ساکت پڑا رہا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کیا میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی ہے؟ فی الحال کچھ بھی نتیجہ نکالنا مشکل تھا۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد میرے پیچھے آنے والے طوفانی رفتار سے میرے آس پاس سے گزرے۔ میں نے ان کی چنگھاڑتی ہوئی آوازیں سنیں۔ ان میں شاید شیرے کی آواز بھی شامل تھی۔ وہ لوگ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے اور بھاگتے ہوئے ایک دوسرے سے بات بھی کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کسی گڑھے میں ہوں اور میرے اوپر بہت سا جھاڑ جھنکاڑ گرا ہوا ہے۔ شاید یہی جھاڑ جھنکاڑ تھا جس نے مجھے تعاقب کرنے والوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد آوازیں مجھ سے دور چلی گئیں۔ پھر اتفاق سے تین چار فائر سنائی دیے اور لوگوں کی دور افتادہ چیخیں میرے کانوں میں پڑیں۔ میں بے حرکت پڑا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب عمران کو گولیاں لگنے کا منظر تھا۔ بلندی سے اس کا پانی میں گرتا ہوا جسم۔ میری آنکھوں میں نمی جاگی پھر یہ نمی گرم پانی کے دھاروں میں بدل گئی۔ میرا سینہ ہچکیوں سے دہلنے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹوں کو اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیا اور اپنے رونے کی آواز کو اپنے سینے کے اندر ہی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کیا ہوگیا تھا؟ کیسے ہوگیا تھا؟ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ... جو تھوڑے ہی عرصے میں میری رگ و جاں سے قریب ہوگیا تھا، میری زندگی کا لازمی جزو بن گیا تھا، اس طرح اچانک مجھ سے منہ موڑے گا، اس طرح آناً فاناً موت کے اندھیروں کی طرف جست لگا جائے گا؟ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔ کہیں یہ جاگتی آنکھوں کا خواب تو نہیں تھا... کہیں میرا تصور مجھے کوئی وحشت ناک دھوکا تو نہیں دے رہا تھا؟

میری کراہیں میرے ہونٹوں کی فصیل توڑنے لگیں۔ میں اوندھا ہوگیا۔ میں نے اپنا منہ گھاس اور کیچڑ میں دھنسا دیا۔ میرا پورا جسم ہچکیوں سے دہلنے لگا۔

''عمران... عمران!'' میرے دل نے پکار کر کہا۔ ''مجھے یوں اکیلے چھوڑ کر نہ جا یار! یہ تو کوئی بات نہیں ہے... یہ تو کوئی بات نہیں ہے۔ تُو تو مجھے زندگی کی طرف لا رہا تھا۔ اور ابھی تو میں پوری طرح زندہ بھی نہیں ہوا... اور تُو مجھے چھوڑ رہا ہے... اور کیسے حالات میں چھوڑ رہا ہے۔ مجھ پر رحم کر... میری ناتوانیوں کی اتنی کڑی سزا نہ دے یار۔ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دو قدم نہیں چل سکتا۔ تُو واپس آجا یار... نہیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا...''

میں رو رہا تھا۔ میرے آنسو گھاس میں اور کیچڑ میں جذب ہو رہے تھے۔ عمران کے جانے کا دکھ کے سوا ہر طرح کی جسمانی و ذہنی تکلیف جیسے پس منظر میں چلی گئی تھی۔

وہ نہیں مرا... وہ زندہ ہوگا۔ دل کی گہرائیوں سے ایک صدا بلند ہوئی۔ وہ خطروں کا کھلاڑی ہے۔ وہ ہر رات موت کو جل دیتا ہے، اس نے آج رات بھی جل دیا ہوگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ گیا ہوگا۔ اس کی جادو کی پٹاری سے کوئی نہ کوئی شعبدہ ایسا ضرور نکلا ہوگا جس نے ''وقت'' کو حیران کر دیا ہوگا اور اب وہ کہیں کھڑا وقت کی حیرانی پر مسکرا رہا ہوگا۔ اس کی مسکراہٹ ناقابلِ شکست تھی۔ آج اتنی جلدی یہ مسکراہٹ شکست کھا کر پانی میں کیسے ڈوب گئی؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں، یہ بعید از قیاس ہے۔ میں اپنے پارہ پارہ دل پر تسلیوں کا مرہم رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

...وہ میری زندگی کی دشوار ترین گھڑیاں تھیں۔ اب میری آنکھیں کسی حد تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ یہ جگہ ایک رکھ (درختوں کا ذخیرہ) تھی۔ میں قریباً سات فٹ گہرے ایک مستطیل گڑھے میں تھا۔ اس جنگل میں یہ گڑھا انسانی ہاتھوں نے بنایا تھا اور اس کا مقصد غالباً کسی جانور کا شکار تھا۔ گڑھے کی بالائی سطح کو پتلی شاخوں، پتوں اور مٹی کے ساتھ اس طرح ڈھانپا گیا تھا کہ یہ ایک پھندا بن گیا تھا اور آج اس تاریک بارشی رات میں، ان خوفناک گھڑیوں میں، میں اس پھندے کا شکار ہوا تھا۔ یہ پھندا جو کسی جانور کے لیے موت بننے والا تھا، میرے لیے زندگی بنا تھا۔ گڑھے میں میرے گرنے کے بعد میرے اوپر شاخیں، پتے اور بھربھری مٹی گری تھی اور میں مکمل کیموفلاج ہو گیا تھا۔

ہاں، وہ میری زندگی کی دشوار ترین گھڑیاں تھیں۔ ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ کچی زمین اور پتوں پر اس کے گرنے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ مجھے تلاش کرنے والے میرے قریب نہیں تھے تاہم میرے اردگرد موجود تھے۔ گاہے بہ گاہے مجھے فاصلے سے فائر سنائی دے جاتا یا کسی کے بولنے کی

دور افتادہ آواز کانوں میں پڑتی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ بارش کے باوجود مجھے سردی محسوس نہیں ہو رہی اور میرا منہ بالکل خشک ہے۔ شاید میرا ٹمپریچر پھر شوٹ اپ کر چکا تھا مگر ان حالات میں بخار اور جسمانی چوٹوں وغیرہ کی اہمیت میرے نزدیک ختم ہو چکی تھی۔ کسی جانور یا سانپ بچھو وغیرہ کا خوف بھی دور پس منظر میں چلا گیا تھا۔ میں نیم مردہ کیفیت میں اپنی جگہ پڑا رہا اور میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

مجھے یاد آیا کہ لاہور کی ٹکا شاپ سے ہماری گاڑی کا تعاقب شروع ہونے کے بعد عمران نے اقبال سے کئی بار رابطے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہو سکا تھا... تو کیا اب اقبال بھی میڈم کے ہرکاروں کی گرفت میں آچکا تھا؟ اگر ایسا ہوا تھا تو پھر یہ میرے اہلِ خانہ کے لیے بھی ازحد خطرناک تھا۔ اقبال کو معلوم تھا کہ میرے گھر والے کہاں ہیں۔ اس کے موبائل میں آصف کا فون نمبر بھی موجود تھا اور یہ آصف ہی تھا جو ڈیفنس والی کوٹھی کی سیکیورٹی کا ذمے دار تھا۔ کیا سیٹھ سراج اور اس کے مشتعل ساتھی میرے گھر والوں تک بھی پہنچ جائیں گے؟ یہ سوال ایک آتشیں نیزے کی طرح میرے سینے میں دھنس گیا اور مجھے بے حال کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ نادیہ مر چکی ہے اور اس کی موت نے میڈم صفورا اور اس کے ساتھیوں کو شعلہ جوالا بنا دیا ہے۔ وہ سب کچھ خاکستر کر دینا چاہ رہے ہیں۔ خاص طور سے سیٹھ سراج کی آواز میں، میں نے جو درندگی محسوس کی وہ بیان سے باہر تھی۔ یہ ایک ایسے شخص کی آواز تھی جس کے سر پر خون سوار ہو چکا ہو۔

اب بھی میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جونہی میں سراج اور شیرے وغیرہ کو نظر آیا، میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ مجھے ایک سیکنڈ کی مہلت دیے بغیر چھلنی کر دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میری لاش کو بھی چند برسٹ مارے جائیں۔ تیر تو میری

www.pkdigest.com

پہلے ہی کھدی ہوئی تھی، اس پر بس مٹی ڈالنے کی کسر تھی۔

قریباً دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میری بہن، میرا بھائی اور والدہ شدید خطرے میں تھے۔ میں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر یہاں سے کیسے نکلتا؟ میرے گرد موت کا پہرا تھا۔ قاتل شکاری ابھی تک مجھے اس ”رَکھ“ میں ڈھونڈ رہے تھے۔ میں ان کی موجودگی کو محسوس کر رہا تھا۔ پچھلے قریباً آدھ گھنٹے سے کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ میرے اردگرد موجود نہیں ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ بھی ان کی چال ہو۔ وہ اپنے نہ ہونے کا تاثر دے کر مجھے میری پناہ گاہ سے نکالنا چاہتے ہوں۔ ڈیک نالا اور نالے کے کنارے کھڑی گاڑیاں یہاں سے بہت دور رہ گئی تھیں۔ اگر انہیں اسٹارٹ کیا جاتا تو شاید آواز مجھ تک نہ پہنچ سکتی۔

جلد ہی اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ بڑھتی چلی گئی۔ میں نے خود کو کچھ اور بھی جھاڑ جھنکاڑ کے اندر چھپا لیا۔ رات ختم ہونے کے ساتھ ہی دل میں یہ خوفناک اندیشہ سر اٹھانے لگا کہ اب مجھے دیکھ لیا جائے گا۔ اردگرد سے آوازیں اب معدوم ہو چکی تھیں مگر کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔ میں وہیں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ دن ہونے کے باوجود وہاں نیم تاریکی ہی رہی۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ رات کو گاہے بگاہے ہونے والی تیز بارش نے میرے قدموں کے نشان بہت حد تک ختم کر دیے ہوں گے۔ یہ گڑھا یقیناً کسی جنگلی بلے، گیدڑ یا سور وغیرہ کو پکڑنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ گڑھا تیار کرنے والے یہاں پہنچ جائیں اور ان کی وجہ سے میں اپنا تعاقب کرنے والوں کی نگاہوں میں آ جاؤں۔

...دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میرے اردگرد کوئی موجود نہیں... اور اگر میں اس گڑھے سے نکلنا چاہوں تو نکل سکتا ہوں۔ مگر ایک بار پھر میرا فطری تذبذب مجھے ہلکان کرنے لگا۔ کیا دن کی روشنی میں میرا یہاں سے نکلنا ٹھیک ہوگا؟ کیا یہاں سے نکل کر میں درست سمت میں سفر کر سکوں گا؟ کیا اس رَکھ کے چوکیدار وغیرہ تو مجھے پولیس کے حوالے نہیں کر دیں گے؟

میں نے اس گڑھے میں تقریباً سات گھنٹے مزید گزار دیے۔ پچھلے تیس گھنٹے سے میں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ گلوکوز کی ڈرپ کے ذریعے جو توانائی میرے جسم میں پہنچی تھی، وہ کب تک ساتھ دیتی۔ میرے کندھے اور گردن کے زخم آگ کی طرح دہک رہے تھے۔ بخار کے سبب پورا جسم پھنک رہا تھا۔ گڑھے میں گرنے سے جو چوٹیں آئی تھیں، وہ اس کے علاوہ تھیں اور سب سے بڑی چوٹ جسمانی نہیں ذہنی تھی۔ کل رات عمران کے شوٹ ہونے کے منظر کو میں ایک لمحے کے لیے... صرف ایک لمحے کے لیے بھی بھلا نہیں سکا تھا۔ شاید میں اس کرب کو لفظوں میں بیان نہ کر سکوں اور اگر کرنا بھی چاہوں تو ہزاروں لاکھوں لفظ لکھ کر بھی بکسر ناکام رہوں۔ میں خود کو بس یہی دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے جو دیکھا وہ بعین وہ نہیں تھا جو نظر آیا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تو میں نے خود کو گڑھے کے گدلے پانی اور کیچڑ سے اوپر اٹھایا۔ اپنے جسم سے شاخیں اور پتے وغیرہ ہٹائے۔ میں بہ مشکل کھڑا ہو سکا۔ یہ بات تو اب تقریباً طے تھی کہ سیٹھ سراج اور اس کے ہرکارے اس جگہ سے جا چکے ہیں۔ اب مسئلہ یہاں سے باہر نکلنے کا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ اوپر اٹھائے تو وہ بہ آسانی گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے۔ تاہم گڑھے سے نکلنا آسان ثابت نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ میرا زخمی جسم بھی تھا۔ پانچ چھ منٹ کی کوشش اور کئی ایک تازہ خراشوں کے بعد ہی میں باہر نکل سکا۔ یہی وقت تھا جب قریبی درختوں میں تیز آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو جلدی سے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں چھپایا۔ چیلا [illegible] ذہن میں [illegible] [illegible] ہوں [illegible] لیتا رہا۔ یہ کوئی جنگلی جانور تھا جو بڑی سرعت سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ میں بس اس کی پرچھائیں ہی دیکھ سکا۔ یہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی بڑا جنگلی بلا، گیدڑ یا چھوٹے قد کا سور۔ عام حالات میں شاید یہ منظر مجھے سرتاپا لرزا دیتا مگر جب انسان جنگلی درندوں سے بڑھ کر ہلاکت خیز ہو جائیں تو پھر جانوروں کی دہشت ماند پڑ جاتی ہے۔

پانچ دس منٹ تک جھاڑیوں میں رکنے کے بعد میں نے اندازے سے ایک سمت چلنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں ڈیک نالے کی مخالف سمت میں جا رہا ہوں مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے ڈیک نالے کا منحوس شور سنا اور دل کے زخموں کے منہ پھر کھل گئے۔ تازہ خون رسنے لگا۔

اچانک انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے خود کو کیکر اور شیشم کے تناور درختوں کے پیچھے چھپایا۔ یہ ایک ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ اس پر بہت سی خشک ٹہنیاں اور درختوں کے چھوٹے چھوٹے تنے لدے ہوئے تھے۔ غالباً یہ سب کچھ ایندھن کے

لیے استعمال ہونا تھا۔ ایک اکیلا دیہاتی اس ٹریکٹر کو چلا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری ہمت بندھی اور میں دل کڑا کر کے اس کے سامنے چلا گیا۔ اس نے ٹریکٹر کی ہیڈ لائٹس میں مجھے دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ میرا حلیہ کسی کو بھی ششدر کر سکتا تھا۔ پورا جسم کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔

”کون ہو؟“ اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

”مسافر ہوں بھائی! میری جیپ پیچھے درخت سے لگ کر الٹ گئی ہے۔ سخت تکلیف میں ہوں۔ مجھے کسی ڈاکٹر تک پہنچا سکتے ہو؟“ میں نے ایک ہی سانس میں سب کہہ دیا۔ وہ ٹریکٹر سے اترا اور میرا جائزہ لینے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس کے ساتھ ٹریکٹر پر بیٹھا تھا۔ اس کا نام رحمت علی تھا اور وہ ایک قریبی دیہہ روہی نور کا رہنے والا تھا۔ میں اس کے ساتھ گاؤں جانے کا رسک ہرگز نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ مجھے تلاش کرنے والوں نے اردگرد کے دیہات کو بھی کھنگالا ہو اور وہاں کے لوگ کسی ”مفرور“ شخص کے لیے الرٹ ہو چکے ہوں۔

بہرحال، مجھے یہ جان کر تسلی ہوئی کہ رحمت علی اپنے گاؤں جانے کے بجائے اپنے ڈیرے پر جا رہا ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی وہیں تھے۔ اس کا ڈیرا اس رَکھ کے پاس ہی ایک بارانی رقبے میں تھا۔

رحمت علی کا رویہ دوستانہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پہنچ گئے۔ [illegible] کوئی [illegible] تھی۔ اس وسیع و عریض ہریالی کے درمیان رحمت علی کا ڈیرا بس تین چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک چھوٹا ٹیوب ویل بھی لگا ہوا تھا۔ دبلا پتلا رحمت علی اور اس کی فربہ اندام بیوی بالکل سادہ سے لوگ تھے۔ انہوں نے میری بات پر من و عن یقین کیا تھا۔ کسی طرح کے سوال جواب کیے بغیر انہوں نے پوچھا کہ وہ میری کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ ایک رات پہلے پیش آنے والے واقعات کا انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ فائرنگ کی دور افتادہ آواز انہوں نے ہو سکتا ہے کہ سنی ہو مگر یہاں شکاری بھی گھومتے رہتے تھے۔ اس طرح کی آوازیں آتی ہی رہتی ہوں گی۔

رحمت علی نے میرے لیے نہانے کا انتظام کیا اور ایک شلوار قمیص بھی مجھے پہننے کے لیے دی۔ یہ میرے سائز کی تو نہیں تھی مگر شلوار کو ذرا نیچے باندھ کر اور جسم کے گرد گرم چادر لپیٹ کر گزارہ ہو گیا۔ مجھے شدید نقاہت تھی مگر میں ایک گلاس دودھ کے سوا کچھ نہ لے سکا۔ قریباً اٹھارہ گھنٹے کیچڑ اور جھاڑ جھنکار میں رہنے کے بعد میرے زخموں کا برا حال تھا۔ بخار

51 واں حصہ شائع ہوگیا ہے
دیوتا
جس نے طویل عرصے سے قارئین سسپنس کو مسحور کر رکھا ہے
اسلوب، انداز بیان اور دلچسپی کے اعتبار سے اب تک شائع ہونے والے تمام سلسلوں میں سب سے زیادہ منفرد اور مقبول سلسلہ
51 حصے کتابی شکل میں دستیاب ہیں
موت کے سوداگر
17 واں اور 18 واں حصہ شائع ہوگیا ہے
مصنف: اقلیم علیم
ایک سرکش جوان کی خود نوشت، جب اس نے منشیات کے عالمی اسمگلروں کے خلاف ذاتی طور پر محاذ کھولا اور وطن عزیز سے ان ملک دشمنوں کا صفایا کرنا اپنا ایمان بنالیا تو موت کے سوداگر اس کی جان کے دشمن بن گئے۔ ایک جنگ جو ابھی جاری ہے۔
کتابیات پبلی کیشنز
فون: 021-5804300
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
kitabiat1970@yahoo.com

بھی برقرار تھا۔ بہر طور یہ جسمانی تکلیفیں میرے اندرونی کرب میں ڈوب کر رہ گئی تھیں۔

میں نے رحمت علی کو بتایا۔ ”میں فوری طور پر گھر جانا چاہتا ہوں۔ میرے گھر والے میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ واپسی پر میں کچھ بندے بھی لے کر آؤں گا تاکہ اپنی گاڑی کو لاہور واپس لے جاسکوں۔“

میری جیب میں کچھ بھیگے ہوئے، کیچڑ آلود کرنسی نوٹ موجود تھے۔ میں نے یہ نوٹ رحمت علی کو دے کر اس سے دوسرے نوٹ حاصل کرنا چاہے لیکن وہ مجھ سے پیسے لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوا۔ میرے بے حد اصرار کے باوجود اس نے چار پانچ سو روپے میری جیب میں ڈال دیے۔ میں اس کا یہ احسان رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا وقتِ رخصت چند بھیگے نوٹ خاموشی سے بستر کی چادر کے نیچے رکھ دیے۔ رحمت مجھے اپنے ٹریکٹر پر تقریباً چار کلو میٹر دور پختہ سڑک تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ یہاں اس نے اپنے کسی جاننے والے سے درخواست کی اور وہ مجھے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر جی ٹی روڈ تک لے آیا۔ جی ٹی روڈ سے مجھے بس پکڑنے اور لاہور پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

جب میں یادگار چوک میں اترا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ وہی یادگار چوک تھا جہاں سے میں اور عمران درجنوں بار موٹر سائیکل پر فراٹے بھرتے ہوئے گزرے تھے۔ آج یہ یادگار چوک بلکہ یہ پورا شہر مجھے ایک ویرانہ لگ رہا تھا۔ ایک ایسا ویرانہ جو کسی جوان بیوہ کی طرح بال کھولے آہ و بکا کر رہا ہو۔ آہ... کہاں تھا وہ شہر یار... کہاں تھا وہ خندہ جبیں؟ کہاں تھے اس کے قہقہے، اس کی باتیں؟ وہ ایک شخص پورے شہر کو کھنڈر کر گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے حالات کی بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ عمران کو پیش آنے والے سانحے کی اطلاع اس کے دوستوں اور ساتھیوں کو ہو چکی ہے یا نہیں۔ اگر ہو چکی ہے تو ان کا ردِعمل کیا رہا ہے... راوی روڈ والے گھر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ شاہین کے گھر کا رخ کروں لیکن یہ بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ پھر میں نے دل کڑا کیا اور براہِ راست ڈیفنس پہنچنے کا تہیہ کر لیا۔ میں پہلے ہی بہت تاخیر کر چکا تھا۔ اب مجھے جلد از جلد گھر والوں تک پہنچنا چاہیے تھا۔ میں جانتا تھا کہ عمران اور اقبال کے سوا میرے اہلِ خانہ کے ٹھکانے کا کسی کو علم نہیں۔ مجھے زیادہ اندیشہ بھی اقبال ہی کی طرف سے تھا۔ اگر عمران کی طرح وہ بھی سیٹھ سراج اور شیرے کے ہتھے چڑھ چکا تھا تو پھر اس کو بھی بدنصیب سلیم کی طرح تشدد کے شکنجے میں کسا جا سکتا تھا۔ وہ ایسا تشدد تھا کہ پتھر کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا... اور اگر اقبال جو پہلے ہی علیل تھا، بول پڑتا تو پھر سیٹھ سراج اور شیرے کی سفاکی میرے گھر والوں تک بھی پہنچ سکتی تھی۔

میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور اپنی بے پناہ دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوا، براستہ جیل روڈ ڈیفنس کی طرف روانہ ہو گیا۔ دیہاتی لباس میں میرا حلیہ کچھ ایسا مناسب نہیں تھا۔ راہ گیروں کی طرح ٹیکسی ڈرائیور نے بھی مجھے سر تا پا گھورا۔ مجھے اس چار دیواری کا پتا ذہن نشین تھا جہاں میں اپنی والدہ، بہن اور بھائی سے مل چکا تھا۔ میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوا دی۔ خوب صورت کوٹھی کے برآمدے میں روشنی تھی، تاہم گیٹ پر نیلی وردی والا ریٹائرڈ فوجی گارڈ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید وہ کیبن میں تھا۔

میں گیٹ پر پہنچا تو گارڈ فوراً باہر آ گیا۔ اس نے مجھے بغور دیکھا اور پہچان لیا۔ ”صاحب! آپ اس وقت یہاں؟ آپ خیریت سے تو ہیں؟“

”ہاں، خیریت سے ہوں۔“ میں نے کہا اور اندر چلا گیا۔ اندر عمران کا قریبی ساتھی آصف بھی موجود تھا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی عاطف سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ ابھی تک حالات کی سنگین ترین کروٹ سے بے خبر ہیں۔ میرے دیہاتی حلیے کی وجہ سے عاطف کو بھی مجھے پہچاننے میں تین چار سیکنڈ لگ گئے۔ پھر وہ تیزی سے میری طرف آیا اور بھائی جان کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ میرے ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ نکل گئی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹا۔ ”کیا ہوا بھائی جان؟“ اس نے کہا۔

میرے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میرے جسم پر زخم ہیں اور اس کے پُرجوش معانقے نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ ”اوہ... سوری بھائی جان!“ وہ ہکلایا۔ ”آپ کو شاید چوٹ لگی ہوئی ہے... اوہو... آپ تو زخمی لگتے ہیں۔ کک... کیا ہوا ہے بھائی جان! خیریت تو ہے نا... اور عمران بھائی... وہ کہاں ہیں؟ کل دو تین بار اقبال صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ وہ آپ کا اور عمران بھائی کا پوچھ رہے تھے۔ آپ دونوں کہاں تھے۔ اور... اور آپ کے یہ کپڑے؟“

اس نے حسبِ عادت ایک ساتھ کئی سوال پوچھ لیے۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے گہرے ہوتے چلے جارہے تھے۔

اب آصف بھی قریب آ گیا۔ اس نے مجھے سر تا پا دھیان سے دیکھا۔ اس کی معاملہ فہم نظر جان چکی تھی کہ کوئی

بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس نے ہولے سے کہا۔ ”اندر آجایئے تابش صاحب!“

میں لڑکھڑاتے قدموں سے انٹرنس کی طرف بڑھا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں عاطف سے کہا۔ ”امی اور فرح کو میری چوٹوں کے بارے میں نہیں بتانا۔“

ہم اندر پہنچے۔ پہلی منزل پر والدہ سو رہی تھیں تاہم فرح ابھی جاگ رہی تھی۔ وہ ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی اور ساتھ ساتھ سلائی مشین پر کچھ بنا رہی تھی۔ اس نے عاطف کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر ایک دم تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی ”بھائی“ کہہ کر میرے گلے لگی اور مجھے ایک بار پھر درد کی شدید ٹیسیں برداشت کرنا پڑیں۔ کچھ دیر بعد والدہ بھی جاگ گئیں۔ ان کے چہرے پر شدید نقاہت تھی۔ پتا چلا کہ پرسوں سے ان کے کندھوں میں سخت درد ہے۔ وہ کافی عرصے سے ”فریزڈ شولڈرز“ کی تکلیف میں مبتلا تھیں۔ سرد ہوا میں گھومنے پھرنے سے یہ تکلیف فوراً عود کر آتی تھی۔ ان کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پر تین چار دوائیں بھی رکھی تھیں۔ بہرحال، میری آمد کی خوشی میں وہ اپنی تکلیف بھول گئیں اور تکیے کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے کئی بار میرا ماتھا چوما۔ پھر میرے حلیے کی وجہ پوچھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کل عمران کے ساتھ ایک دیہاتی علاقے میں تھا۔ وہاں بارش اور کیچڑ کی وجہ سے کپڑے خراب ہو گئے تھے۔ عمران کے ایک مقامی دوست کے کپڑے پہننا پڑے۔ انہوں نے میرے چہرے کی خراشوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھا اور ایک دو سوال پوچھے۔

والدہ کی نگاہیں مسلسل عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ”لیکن وہ ہے کہاں؟“

اس سوال کا جواب دنیا کا مشکل ترین جواب تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور کہا۔ ”وہ ساتھ نہیں ہے امی جی۔“

فرح مسکرا کر بولی۔ ”وہ تو کہتے تھے کہ ہم جب آئیں گے، اکٹھے ہی آئیں گے... کیونکہ ہم ایک دوسرے کی دُم کی طرح ہیں۔ یہ دیکھیں، میں نے تو ان کی شرٹ بھی ٹھیک کر دی ہے۔“

اس نے پرانی شرٹ میرے سامنے پھیلائی۔ فرح نے شاید اس کو نئی سلائیاں لگائی تھیں۔

”یہ کیا ہے؟“ والدہ نے پوچھا۔

”عمران بھائی کی شرٹ۔ پچھلی دفعہ مجھے دے کر گئے تھے۔ کہتے تھے کہ میں اسے ٹھیک ٹھاک کر دوں۔“

”ہائے۔“ والدہ نے کہا۔ ”اتنی پرانی قمیص مرمت کرانے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ اللہ کا کرم ہے، اس کے پاس پیسوں کی کوئی کمی ہے؟“

”امی جی! کچھ چیزیں پیسوں سے نہیں خریدی جا سکتیں۔“ فرح مسکراتے لہجے میں بولی۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس قمیص سے عمران بھائی کی کچھ بڑی اچھی اچھی یادیں جڑی ہوئی ہوں۔ ہم نے بھی تو ابھی تک ابو جی کی دو شیروانیاں سنبھالی ہوئی ہیں نا... ہاں، شیروانی سے یاد آیا کہ عمران بھائی بھی شیروانی کی بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بچپن میں ان کی والدہ نے انہیں بھی شیروانی پہنائی تھی۔ وہ اتنی لمبی تھی کہ اس کے نیچے کچھ پہننے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی، بس ٹخنوں تک بٹن بند کرتے چلے جاؤ۔ دراصل عمران بھائی کی والدہ نے چالاکی دکھائی تھی۔ عمران بھائی ایک سیکنڈ بھی نچلے نہیں بیٹھتے تھے۔ ہر وقت بھاگ دوڑ کرتے تھے۔ انہوں نے ایسی شیروانی پہنا دی کہ وہ بھاگ ہی نہ سکیں...“ فرح ہنسنے لگی۔

والدہ بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ”کیا بات ہے تابش! تم... کچھ... چھپا رہے ہو... تمہیں چوٹیں بھی لگی ہوئی ہیں۔ کیا... بات... ہے۔ کہیں کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا ہے؟“

میں نے اپنا سر تھام کر جھکا لیا۔ آنسو ایک دم ہی گرم پانی کے آبشار کی طرح آنکھوں سے گرنے لگے۔ ”ہائے میں مر گئی۔“ والدہ نے کہا اور میرا چہرہ اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”کیا بات ہے بھائی... عمران بھائی تو خیریت سے ہیں؟“ فرح نے بھی روہانسی آواز میں پوچھا۔

میں نے دل کڑا کر کے کہا۔ ”ہاں، سب خیریت سے ہیں، کوئی ایسی بات نہیں۔ لل... لیکن یہاں اب آپ لوگوں کے لیے بہت خطرہ ہے۔ ہمیں فوراً یہاں سے چلنا ہوگا بلکہ... اسی وقت نکلنا ہوگا۔“ میری آواز بے طرح لرز رہی تھی۔

میرے انداز نے سب کو ایک دم ہراساں کر دیا۔

”مگر عمران بھائی آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟“ عاطف نے میرا شانہ تھاما۔ ”کل بھی ان کا کچھ پتا نہیں تھا... آج آصف بھی سارا دن فون کرتا رہا ہے، پر ان کی طرف سے یا آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔“

”یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تفصیل آپ لوگوں کو بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔“

"ہم... کہاں جائیں گے تابی... پہلے ایک دم اپنے گھر سے نکلے، اب تم ایک دم یہاں سے نکلنے کے لیے کہہ رہے ہو... کیا ہم اسی طرح بھاگتے ہی رہیں گے...؟"

"بس امی جی! حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے ہیں۔ ہم... مجھے عمران نے ہی بھیجا ہے... وہ چاہتا ہے کہ... ہم فوراً یہاں سے نکل جائیں۔"

"پر وہ تو کہتا تھا تابی... کہ یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہم دس سال بھی یہاں رہیں تو کوئی ڈر خطرہ نہیں۔"

"غیب کا علم تو کسی کو نہیں ہوتا نا امی! آپ بس چلنے کی تیاری کریں۔" میری آواز میں لرزش بڑھتی جارہی تھی۔

آصف مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی میں بولا۔ "تابش بھائی! آپ کچھ چھپا تو نہیں رہے؟" میں نے آنسو چھپا کر ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ "لیکن آپ یہاں سے جانے کی بات کیوں کررہے ہیں؟ آپ اس طرح کیسے جاسکتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"ہیرو بھائی نے اس بارے میں ہمیں سختی سے ہدایت کی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس چاردیواری سے باہر ماں جی، عاطف اور فرح بی بی کے لیے خطرہ ہے۔"

"لیکن اب یہاں خطرہ زیادہ ہے آصف۔"

"گستاخی معاف تابش بھائی! اگر ایسی بات ہے تو پھر ہیرو بھائی کو خود بات کرنی چاہیے۔ ان کے پاس میرے اور گارڈ خادم حسین، دونوں کے فون نمبرز ہیں۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے گھر والے یہاں یرغمال ہیں... وہ میری مرضی سے بھی نہیں جاسکتے؟" میں نے بھڑک کر کہا۔

"نہیں... نہیں تابش بھائی! آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں؟ ہماری اتنی جرأت ہے کہ ایسا سوچ سکیں۔ ہماری حیثیت تو آپ کے نوکروں کی ہے... مگر..."

"مگر کچھ نہیں آصف!" میں نے بڑے درد سے اس کا کندھا تھاما۔ "میں اس وقت تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ عمران اس وقت فون نہیں کرسکتا اور ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہے۔ جتنی دیر ہوگی، خطرہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔"

آصف کے چہرے پر الجھن ہی الجھن تھی۔ وہ پیشانی کھجاتے ہوئے بولا۔ "لیکن تابش صاحب! اقبال بھائی سے بھی رابطہ نہیں ہو پارہا۔"

"اور یہی زیادہ خطرناک بات ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ کوٹھی بڑی جلدی سراج وغیرہ کی نظر میں آنے والی ہے۔ اقبال کے سیل فون میں تمہارا نمبر بھی سیو ہے۔ تمہارے نمبر پر کوئی مشکوک کال تو نہیں آئی؟"

اس سے پہلے کہ آصف جواب میں کچھ کہتا، گراؤنڈ فلور سے سابق فوجی گارڈ کی آواز آئی۔ "آصف بھائی! ذرا نیچے آنا۔" اس کے لہجے میں عجلت تھی۔

"میں ابھی آیا۔" آصف نے مجھ سے کہا اور تیزی سے زینے اتر کر نیچے چلا گیا۔

میں ایک بار پھر والدہ اور فرح وغیرہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ اب پریشانیوں نے بھی ان کے چہرے پر ڈیرے جمالیے تھے۔ فرح بھی بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سب سمجھ گئے تھے کہ یہ رات ایک بار پھر ان کے لیے خانہ بدوشی کا اذن لے کر آئی ہے۔

اگلے پانچ منٹ میں، میں نے والدہ سمیت سب کو یہاں سے نکلنے کے لیے تیار کرلیا۔ فرح میری ہدایت کے مطابق جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگی۔ سامان تھا ہی کتنا؟ گھر سے نکلتے ہوئے والدہ نے فرح کے لیے بنایا ہوا کچھ زیور ساتھ لیا تھا، اس کے علاوہ [illegible] ہزار روپے نقد اور [illegible] کے کچھ ڈیفنس سرٹیفکیٹ تھے۔ باقی جو سامان تھا وہ ہمارے ذاتی گھر میں پڑا ہوا تھا۔

ضروری کپڑے اور دیگر چیزیں فرح نے کانپتے ہاتھوں سے ایک اٹیچی میں بند کرلیں۔ عاطف نے اپنی کتابیں، امی کی دوائیاں اور دیگر چھوٹا موٹا سامان ایک بڑے شولڈر بیگ میں رکھنا شروع کیا۔ میں اس کام میں اس کی مدد کررہا تھا۔ یہ اندیشہ ابھی تک میرے ذہن میں موجود تھا کہ آصف، ہمارے یہاں سے نکلنے میں کہیں رکاوٹ نہ ڈالے۔

اچانک مجھے زیریں منزل سے عجیب سی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی تیزی سے بھاگا ہو پھر کوئی وزنی چیز گری ہو۔ میں چونک کر کامن روم کی طرف آیا۔ یہاں میں نے جھک کر نیچے جھانکا تو میرا سر لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی یوں لگا جیسے میرا پورا جسم الیکٹرک شاک کی زد میں ہے۔ شاید یہ شب و روز ہی کچھ ایسے تھے۔ میری آنکھوں کی قسمت میں بدترین مناظر کی دید لکھ دی گئی تھی۔

میں نے آصف کو دیکھا۔ وہ ٹی وی ٹرالی کے قریب گرا ہوا تھا۔ دو بندے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ایک نے پوری طاقت سے اس کا گلا دبایا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے منہ پر دھنادھن گھونسے رسید کررہا تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ ہولناک منظر ایک اور تھا۔ مجھے داخلی دروازے کے بالکل قریب براؤن فرنچ ہاکر پر گارڈ خادم حسین کی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ گرا پڑا تھا اور بالکل بے حرکت تھا۔ اس کا بالائی دھڑ میری نظر سے اوجھل تھا، تاہم شواہد بتارہے تھے کہ وہ شدید زخمی ہے یا مرچکا ہے۔ اس کے بالائی دھڑ کی طرف سے خون بہہ کر ٹانگوں کی طرف آرہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ کامن روم سے گزرنے کے بعد میں نے جو سب سے پہلا کام کیا، وہ یہ تھا کہ درمیانی دروازہ لاک کردیا۔ اب کامن روم اور سیڑھیاں باقی کے پورشن سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر علیحدہ ہوگئے۔

میں چلایا۔ "عاطف! بھاگو یہاں سے... وہ آگئے ہیں۔" میری آواز دہشت سے بگڑی ہوئی تھی۔

"کون آگئے ہیں؟" عاطف نے بھی بلند آواز میں پوچھا۔

"میڈم کے لوگ۔ انہوں نے خادم حسین کو ماردیا ہے... وہ ماردیں گے سب کو... نکلو یہاں سے۔"

والدہ کے چہرے کا جیسے سارا خون نچڑ گیا تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ اپنی کمر اور گھٹنوں کی تکلیف کے سبب وہ فوری طور پر اٹھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ عاطف اٹیچی بند کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اٹیچی کو ٹھوکر ماری۔ "عاطف! لعنت بھیجو اس پر... نکلو، فرح کو لے کر نکلو۔"

عاطف، فرح کی طرف لپکا تو میں والدہ کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب کامن روم میں کھلنے والا دروازہ دھڑ دھڑ بجنا شروع ہوگیا۔ فرح کا چہرہ ہلدی ہوچکا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں پھر چلایا۔ "فرح... نکلو یہاں سے۔"

عاطف نے فرح کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں دوڑتے ہوئے ٹیرس کی طرف چلے گئے۔ وہ ٹیرس کی چار فٹ اونچی "سائڈ وال" کراس کرکے بہ آسانی ساتھ کی زیرتعمیر کوٹھی میں داخل ہوسکتے تھے۔ میں نے کراہتی ہوئی والدہ کو سہارا دے کر بہ مشکل بیڈ سے اتارا۔ ابھی میں ان کے ساتھ بیڈروم کے دروازے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ باہر سے لگنے والے زوردار دھکوں سے دروازہ ٹوٹ گیا۔ میری سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، میں والدہ کو لے کر ایک ساتھ والے دروازے میں گھس گیا اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کہاں گھسا ہوں۔ چند ہی سیکنڈ بعد یہ دروازہ بھی دھڑ دھڑ بجایا جانے لگا اور پھر میرے کانوں میں چھوٹے سر اور موٹے جسم والے سیٹھ سراج کی منحوس آواز داخل ہوئی۔

"دروازہ کھول دے کاکے! اج توں بچ نئیں سکدا۔"

اس کے ساتھ ہی دروازے کو زوردار دھکے مارے گئے۔

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میں جس کمرے میں داخل ہوا ہوں، یہ چاروں طرف سے بالکل بند ہے۔ کوئی کھڑکی، کوئی روشن دان موجود نہیں تھا۔ بس بلندی پر ایک چھوٹا ایگزاسٹ فین لگا ہوا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ بھی لکڑی کے بجائے لوہے کی وزنی چادر کا تھا۔ یہاں شفاف لیبورٹری میز پر دو تین کمپیوٹر پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کپڑے کی ایک اسکرین تھی اور اس کے سامنے آٹھ دس کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔

میں نے والدہ کو ایک کرسی پر بٹھایا اور خود خوف زدہ نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگا۔ دروازے پر شاید رائفلوں کے بٹ برسائے جارہے تھے۔ ساتھ ساتھ سراج، شیرے اور ان کے ساتھیوں کے گرجنے برسنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میری چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ وہی ہوا ہے جس کا خطرہ تھا۔ اقبال پکڑا جاچکا ہے اور اس کے ذریعے میڈم کے لوگ اس کوٹھی تک پہنچ گئے ہیں۔

والدہ نے میرا بازو تھاما اور کراہتی ہوئی آواز میں بولیں۔ "اب کیا ہوگا تابی! یہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں تم سے... ان کے سروں پر تو خون سوار ہے۔ ہائے ربا... اب کیا ہوگا؟"

میں والدہ کو کیا تسلی دیتا۔ میں تو خود خوف کے ایک عمیق سمندر میں ڈوبتا چلا جارہا تھا۔

"تمہارے پاس موبائل نہیں ہے تابی! تم ون فائیو پر فون کرو یا پھر عمران کو بتاؤ۔"

"نہیں امی، فون نہیں ہے۔" میری آواز بہ مشکل ہونٹوں سے نکل پائی۔

یوں لگتا تھا کہ والدہ کو کچھ ہوجائے گا۔ ان کی رنگت نیلی پڑتی جارہی تھی۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ لگالیا۔ ان کا سر چومنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی معجزے کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی ایسا کرشمہ جس سے میری اور والدہ کی جان بچ جائے۔ ان بدترین حالات میں اگر مجھے تھوڑی سی تسلی تھی تو صرف اس بات کی کہ فرح اور عاطف یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے مگر ابھی اس بارے میں بھی پورے یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ ٹیرس سے نکل کر ساتھ والی زیرتعمیر کوٹھی میں داخل ہوئے تھے۔ اگر سیٹھ سراج کے ساتھی

www.pkdigest.com

اردگرد نظر رکھے ہوئے تھے تو پھر ان کے پکڑے جانے کا امکان بھی موجود تھا۔

میں کسی پلاننگ کے تحت اس کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ تاہم لگتا تھا کہ اس کوٹھی کے اندر شاید یہ محفوظ ترین کمرا ہے۔ ایک دروازے کے سوا اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ دروازہ بھی آسانی سے کسی کو راہ دینے والا نہیں تھا۔ وہ لوگ دیوانہ وار دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ناکام تھے۔ اب وہ ضربیں نہیں لگا رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ اس طرح کا شور کسی قریبی کوٹھی کے مکینوں کو متوجہ کر سکتا ہے۔ وہ اب دروازے کو دھکیل رہے تھے اور کسی آہنی بار کے زور سے اس کا کھٹکا توڑنے کی سعی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ سراج کی غضب ناک وارننگ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ وہ دہاڑ رہا تھا۔ "دروازہ کھول دو۔ کہیں تو بڑی بھیڑی طرح پچھتاؤ گے۔ بڑا تڑپا کر ماروں گا تمہیں۔"

"گیس چھوڑ دیں جی کمرے میں۔ مر جائیں گے کتے یا باہر نکل آئیں گے۔"

پتا نہیں کہ وہ کس گیس کی بات کر رہا تھا؟ مگر ایک بات واضح تھی۔ یہ مضبوط دروازہ انہیں راستہ نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کمرے میں اندھا دھند ہاتھ چلا کر کوئی فون یا سیل فون ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا کہ یہ دروازہ کتنا بھی مضبوط ہو، بہت دیر تک ہمیں محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں گے اور اس کے بعد... اس کے بعد ایک وحشت ناک تاریکی کے سوا کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا تھا۔ والدہ نے نڈھال ہو کر کرسی کی لمبی نشست سے ٹیک لگائی۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"یا اللہ! میرے بچوں کو بچا لے۔ یا اللہ! تُو ہی ان کا حافظ و ناصر ہے۔" وہ بار بار یہی فقرہ بول رہی تھیں۔ میں نے ان کا لرزاں سر اپنے ساتھ لگایا۔ وہ کراہیں۔ "اب اس دنیا میں کوئی کس پر بھروسا کرے۔ اب، وہ تیرا یار کہتا تھا کہ ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دے گا... ہمیں کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہ ہو گی۔ اب وہ کہاں ہے؟ اس کے گھر میں ہی ہم پر یہ قیامت ٹوٹ رہی ہے۔" ان کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "امی جی! اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ میں ہی مجرم ہوں آپ سب کا۔ جو کچھ ہوا ہے، میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں... آپ سب کو لے ڈوبا ہوں۔"

اچانک سوئی گیس کی تیز بو محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی پائپ سے گیس کے خارج ہونے کی تیز آواز بھی سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ آواز چھت کے قریب لگے چھوٹے سے ایگزاسٹ فین سے آ رہی تھی۔ ان لوگوں نے سوئی گیس کا کوئی پائپ کاٹ کر وہاں تک پہنچایا تھا اور اب کمرے میں گیس داخل کر رہے تھے۔ والدہ بُری طرح کھانسنے لگیں۔ میری سمجھ میں کچھ اور تو نہیں آیا، میں نے ایگزاسٹ فین کا بٹن ڈھونڈ کر آن کر دیا۔ ایگزاسٹ فین بس ذرا سی حرکت کر کے رہ گیا۔ ان لوگوں نے اس میں کوئی چیز پھنسا کر اسے چلنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فین اتنی بلندی پر تھا کہ وہاں تک پہنچ کر اس کے خلا میں کوئی کپڑا وغیرہ بھی ٹھونسا نہیں جا سکتا تھا۔

دو منٹ کے اندر اندر ہمارے سانس اکھڑنے لگے۔ میں نے بے تاب ہو کر والدہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ان کی کمر سہلانے لگا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ سراج، شیرا اور ان کے ساتھی بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ ان کے چہرے وحشت سے بگڑے ہوئے تھے۔ سیٹھ سراج نے ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا اور میں لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔ شیرے نے رائفل کی نال میری کنپٹی سے لگا دی۔ کم از کم چار مزید افراد اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک دو کے ہاتھ میں [illegible] تھے۔ [illegible] دروازہ کھولنے کے فوراً بعد ہی کمرے میں سوئی گیس کی آمد بند ہو گئی تھی۔ تاہم تیز بو ابھی موجود تھی۔ والدہ بُری طرح کھانس رہی تھیں۔

ہمیں اس کمرے سے نکال کر ساتھ والے کمرے میں پہنچایا گیا۔ والدہ کو کھڑکی کے پاس ایک صوفے پر پھینک دیا گیا۔ پھر سیٹھ سراج اور شیرے نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور کھینچ کر والدہ کے قریب فرش پر پٹخ دیا۔ شیرے نے رائفل کا بٹ میرے سینے پر مارا۔ مجھے لگا کہ میری ایک آدھ پسلی چٹخ گئی ہے۔ جب اس نے دوسرا وار کرنا چاہا تو والدہ تڑپ کر میرے اوپر گر گئیں۔ "نہیں... خدا کے لیے نہیں... میرے بچے کو کچھ نہ کہو۔ میری جان لے لو۔"

سیٹھ سراج نے والدہ کو گھسیٹ کر مجھ سے جدا کیا۔ "تیری جان بھی ضرور لیں گے۔ پہلے تیرے اس بدمعاش پتر اور اس کے یاروں سے تو حساب کتاب برابر کر لیں۔"

"خدا کے لیے نہیں۔" والدہ سیٹھ کے پاؤں سے چمٹ گئیں۔

اس نے ایک ٹھوکر سے انہیں پیچھے کیا۔ یہ میری

برداشت سے باہر تھا۔ میں نے سیٹھ پر جھپٹنا چاہا لیکن راستے میں ہی شیرے کی رائفل کی زوردار ضرب میری گردن پر لگی اور میں الٹ کر ٹی وی کے اوپر جا گرا۔ ٹی وی نیچے گر کر چکنا چور ہوا اور ہر طرف چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ میری اس جرأت کی سزا دینے کے لیے شیرا اور اس کے کئی ساتھی مجھ پر پل پڑے۔ میرا جسم جیسے ایک دم ہی وزنی ہتھوڑوں کی زد میں آ گیا۔ مجھے کچھ ویسا ہی احساس ہوا جیسا سیٹھ سراج سے پہلی مڈبھیڑ پر ہوا تھا۔ چلڈرن پارک میں، میں سیٹھ سراج پر جھپٹا تھا اور اس کے فوراً بعد سیٹھ کے ہرکاروں نے مجھے بے دردی سے زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تب والدہ میرے پاس نہیں تھیں۔

آج وہ پاس تھیں... اور ایک ماں کے لیے اس سے بڑا امتحان اور کیا ہو سکتا تھا؟ سفاک لوگ آنکھوں میں قاتلانہ چمک لیے اس کے بیٹے کو اس کے سامنے روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔ وہ بیٹا جسے انہوں نے خاص ناز و نعم سے پالا تھا... جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ بچپن سے کمزور ہے اور اسے زیادہ توجہ و محبت کی ضرورت ہے۔ جس کی چھوٹی سی تکلیف پر وہ غیر معمولی بے تابی کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں۔

یکایک سیٹھ سراج کے ہاتھ کے اشارے نے گماشتوں کو روک دیا۔ انہوں نے میرا خون آلود چہرہ فرش کی طرف کیا اور میرے ہاتھ پیچھے موڑ کر کسی رسی سے باندھ دیے۔ تب مجھے گھسیٹ کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا گیا۔

والدہ صوفے پر تھیں اور ایک ہٹے کٹے غنڈے نے انہیں سر کے بالوں سے یوں جکڑ رکھا تھا کہ ان کی گردن ایک طرف مڑ گئی تھی اور وہ حرکت بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

"میری ماں کو چھوڑ دو۔ ان کا کوئی قصور نہیں۔" میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس حرامجادی کا یہ قصور کم ہے کہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔" سیٹھ سراج پھنکارا۔ تب اس نے ہم ماں بیٹے پر مشترکہ طور پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اسی دوران میں اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل آن کیا اور بھاری آواز میں بولا۔ "ہاں بختیارے! کیا بنا؟"

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے سن کر سیٹھ سراج کا غیظ بڑھ گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "اوئے کیا نامردوں جیسی گل کر رہا ہے؟ وہ تو طوطڑی سی کڑی ہے اور طوطڑا سا منڈا ہے۔ وہ تو زیادہ نج (بھاگ) بھی نہیں سکدے۔ ادھر ہی کہیں آلے دوالے ہوں گے۔ ڈھونڈو ان کو۔"

واضح تھا کہ سیٹھ سراج، فرح اور عاطف کی بات کر رہا ہے۔ ان لوگوں نے غالباً انہیں کوٹھی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور ان کے پیچھے لگ گئے تھے مگر شکر کی بات یہ تھی کہ وہ ابھی تک ان کے ہاتھ نہیں لگے تھے۔

پھر سیٹھ سراج کے فون پر ایک اور کال آ گئی۔ وہ بات کرتا ہوا باہر نکل گیا... دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تیرا موبائل کہاں ہے؟"

"موبائل نہیں ہے میرے پاس۔" میں کراہا۔

اس کے اشارے پر شیرے نے بڑی سختی سے میری جامہ تلاشی لی۔ موبائل نہیں ملا۔ عمران والی ڈائری ابھی تک میری قمیص کی بغلی جیب میں تھی۔ شیرے نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ سیٹھ سراج نے اپنے ایک ساتھی سے موبائل فون لیا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تیری بہن اور بھائی میں سے کسی کے پاس تو موبائل ہوئے گا۔ چل، کسی اک کا نمبر بتا۔ چل شاباش! جلدی کر۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ فرح یا عاطف کے ساتھ میرے ذریعے رابطہ کر کے ان تک پہنچنا چاہ رہا تھا اور یہ نہایت خطرناک صورتِ حال تھی۔

میں نے خاموشی اختیار کی تو اس نے شیرے کو اشارہ کیا۔ شیرے نے ایک "بریٹا پسٹل" اپنی براؤن قمیص کے نیچے سے نکالا اور ماں جی کی گردن پر رکھ دیا۔ اس پسٹل پر آٹھ دس انچ لمبا سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ شاید پیچھے خادم حسین کو اسی پسٹل سے گولی ماری گئی تھی۔ سراج پھنکارا۔ "میں تجھ کو صرف پندرہ سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں۔ ماں کو بچانا چاہندا ہے تو ان دونوں میں سے کسی کا نمبر بتا دے۔ میں پھر کہندا ہوں۔ پندرہ سیکنڈ ہیں تیرے پاس، گھڑی کے مطابق۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی گھڑی دیکھنی شروع کر دی۔ پانچ سیکنڈ پورے ہوئے تو اس نے کہا۔ "پانچ!"... دس سیکنڈ پورے ہونے پر کہا۔ "دس۔"

میرے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ محسوس ہوا کہ دل پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سراج بول رہا تھا۔ "بارہ... تیرہ... چودہ۔"

"ٹھہرو... ٹھہرو۔" میں بلکا۔ "ایسا مت کرو۔ میں قسم کھاتا ہوں..."

"بکواس بند کر۔" سیٹھ سراج نے بڑی وحشت سے میری بات کاٹی۔

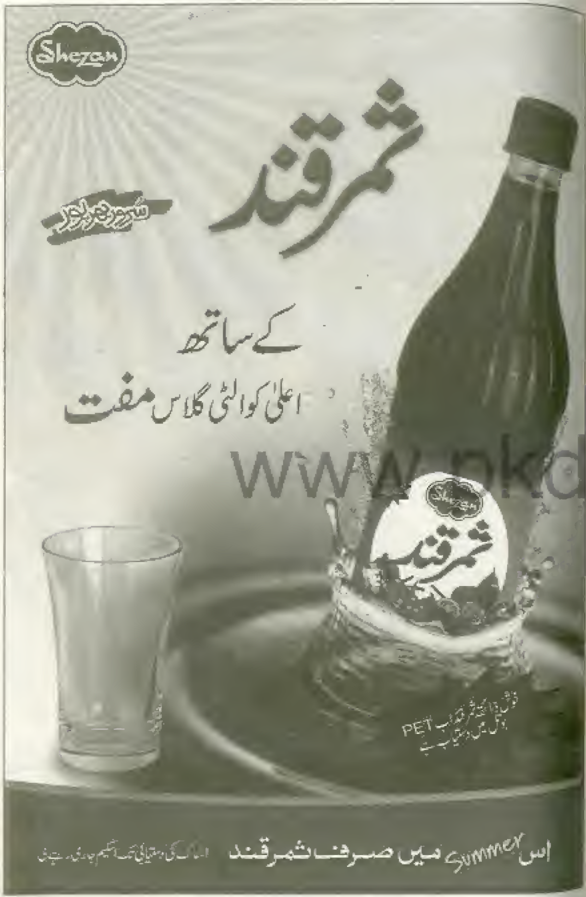

www.pkdigest.com

شیرے نے ماں جی کو بازو سے کھینچا اور سیدھا بٹھا دیا۔ وہ چلا اٹھیں۔ ''ہائے میرا مونڈھا۔''

''کیا ہوا ہے تیرے مونڈھے (کندھے) کو؟'' سیٹھ سراج نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

''ہم... میرے مونڈھے درد کرتے ہیں... ہل نہیں سکتے۔'' ماں جی کرب ناک آواز میں بولیں۔

''ہم بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیتے ہیں تیرے مونڈھے کو۔'' سیٹھ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی شیرے کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

شیرے نے بریٹا پسٹل کا سائیلنسر بے رحمی سے ماں کے ''فروزن شولڈر'' پر رکھ دیا۔ سیٹھ سراج نے مجھ سے مخاطب ہو کر زہر اگلا۔ ''بتا... اپنی بے بے کے مونڈھے پر ٹیکا لگواتا ہے کہ اپنی بہن اور بھائی کا نمبر دیتا ہے...؟''

میرا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ بولنے کی سکت ہی نہیں رہ گئی۔ میں نے بے بسی کی انتہا کو چھو کر سیٹھ سراج کی طرف دیکھا۔ اس نے شیرے کو اشارہ کیا... بے مثال سفاکی کے ساتھ شیرے نے ٹریگر دبا دیا۔ سائیلنسر لگے پسٹل میں سے ٹھک کی مخصوص آواز برآمد ہوئی اور ماں جی کا کندھا ایک جھٹکے سے پیچھے کو گیا... انہوں نے ماں جی کے کندھے میں گولی اتار دی تھی۔

وہ تڑپ کر صوفے پر گریں اور کرب کی انتہا کو چھو کر رہ گئیں... وہ بے حس درندے تھے۔ ایسی ہی سفید بالوں اور نم آنکھوں والی مائیں ان کے گھروں میں بھی ہوں گی... اور یہ ماں تو پہلے ہی بیمار تھی، درد سے بے حال تھی لیکن وہ سنگ دل ذرا پشیمان نہیں ہوئے۔ ماں جی کے زخمی کندھے سے خون بہہ کر نیلے صوفے پر گل کاریاں کرنے لگا۔

سیٹھ سراج کے اشارے پر شیرے نے پسٹل ماں جی کے دوسرے کندھے سے لگا دیا۔ سراج نے اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ پرور آنکھوں سے مجھے گھورا اور بولا۔ ''ہاں، اب بتا کاکا... اپنی بے بے کے دوجے مونڈھے پر بھی ٹیکا لگواتا ہے کہ کچھ بکتا ہے؟''

میرے لیے جیسے زمین آسمان کے قلابے مل چکے تھے۔ ایک طرف تڑپتی ہوئی ماں تھی، دوسری طرف بہن اور بھائی... لیکن بہن اور بھائی اوجھل تھے۔ ماں سامنے تھی اور جو کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، وہ زیادہ عذاب ناک ہوتا ہے۔

میرا منہ اتنا خشک تھا کہ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے پانی مانگا۔ ایک شخص نے گلاس میں پانی دیا۔ میرے ہاتھ غضب میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے خود ہی چند گھونٹ پلائے... اور بے رحم مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر چند قدم دور کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ سراج نے اپنے جوتے کی نوک سے میری ٹھوڑی اوپر کی اور اپنی زہریلی نگاہیں میری آنکھوں میں گاڑیں۔ اس کی ریچھ جیسی چمکیلی آنکھیں جیسے بزبان خاموشی کہہ رہی تھیں... تجھے کہا تھا نا مجھ سے مقابلہ لگانا، نہیں تو بات بہت دور تک جائے گی۔ تو نے میرے منہ پر چپیڑ ماری تھی اور اس چپیڑ کے لیے میں نے تجھے پوری معافی نہیں دی تھی۔ بس تھوڑا سا وقفہ دیا تھا۔ اب وہ وقفہ ختم شد ہو چکا ہے۔ اب تیرے نال نال تیری ماں اور تیری جوان بہن کو بھی تیرے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

میں سیٹھ سراج کی وحشی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا اور نظریں جھکا لیں۔ وہ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کاکا جی! زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ جلدی بکواس کرو۔ نہیں تو دوجے کندھے میں دوجا ٹیکا لگ جائے گا اور پھر شاید تیسرا ٹیکا لگے لگا اور یہ لگے گا بے بے جی کے سر کی ہانڈی میں۔ ہانڈی کے دو تین ٹوٹے ضرور ہو جائیں گے۔ چلو شاباش! فون نمبر بولو۔''

میں نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، ماں جی کی سانس پھنس کر آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گولی کندھے میں لگ کر پھیپھڑوں کی طرف چلی گئی ہے۔ شیرے نے پھر انگلی پسٹل کے ٹریگر پر رکھ دی تھی۔ کسی بھی وقت ٹھس کی منحوس آواز دوبارہ ابھر سکتی تھی۔ میں ٹوٹ گیا، ریزہ ریزہ ہو گیا۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں چھوٹے بھائی عاطف کا سیل نمبر بتایا اور اس کے ساتھ ہی دل کی گہرائیوں سے دعا کی کہ یہ نمبر اٹینڈ نہ ہو سکے۔

سراج نے فون نمبر موبائل سیٹ پر پریس کیا اور کال ملانے سے پہلے بولا۔ ''دیکھ کاکے! اپنے بھائی سے وہی بولنا پڑے گا جو تجھ کو بتا رہا ہوں۔ اک لفظ بھی دائیں بائیں کرے گا نا تو بے بے کے دوجے مونڈھے میں ٹیکا لگ جائے گا۔ بھائی سے پوچھ کہ وہ کتھے ہے۔ وہ جہاں کا بتائے، اس سے بول کہ وہ اوسے جگہ پر ٹھہر جائے۔ تو وہاں پہنچ رہا ہے۔ گل سمجھ وچ آ گئی نا۔ میں اک وار فیر کہندا ہوں۔ ایک لفظ بھی بے جا کیتے کرے گا نا تے گولی چلے گی۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے کال ملائی۔ میرا دل پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ عاطف کے فون پر بیل جا رہی تھی۔ سراج نے ہاتھ آگے بڑھا کر فون میرے کان سے لگا دیا۔ چوتھی، پانچویں بیل پر کال ریسیو ہو گئی۔ دوسری طرف سے عاطف کی ہنسی اور ہانپتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ''کون؟''

میں خاموش رہا۔

''کون بول رہا ہے؟'' عاطف نے پھر پوچھا۔

سراج نے مجھے فون کے ساتھ زور سے ٹہوکا دیا کہ میں بولوں۔ میں تو نہیں بولا لیکن سراج کے ٹہوکا دینے سے موبائل کا بٹن دب گیا اور کال ''ڈس کنیکٹ'' ہو گئی۔

سراج نے جھلا کر مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ اس کے ساتھ ہی گرانڈیل شیرے کا چہرہ بھی خون کے دباؤ سے سیاہی مائل ہو گیا۔ سراج بولا۔ ''یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس کی بے بے کی ہانڈی پر رکھ تالی اور اگر نہ بتائے تو توڑ دے کتیا کی ہانڈی...''

یہ بے بسی کی انتہا تھی، یہ ذلت کا ''عروج'' تھا، مجھے موت سہل لگ رہی تھی۔ اپنی سسکتی ہوئی خونچکاں ماں کو لاچاری کے ساتھ دیکھنا آنکھوں کا بدترین عذاب تھا۔ وہ درد کی انتہا سے گزر رہی تھیں لیکن پھر بھی وہ ماں تھیں۔ اس حالت میں بھی انہیں اپنے بچوں کی سلامتی عزیز تھی۔ ان کی مامتا آخری ہچکی تک اپنے بچوں کا تحفظ چاہتی تھی اور اس تحفظ کے لیے وہ اس سے دس گنا اذیت بھی جھیلنے کو تیار تھیں۔

سراج نے ایک بار پھر عاطف سے کال ملائی اور فون میرے کان سے لگا دیا۔

ماں جی نے لڑکھڑاتی آواز میں فریاد کی۔ ''نہیں بیٹا! مجھے مر جانے دینا۔ ان کو کچھ نہ بتانا میرے بچوں کا پتا کسی کو نہ بتانا۔''

''ٹھیک ہے۔ یہ نہ بتائے تو توڑ دو اس بڑھی کا کھوپڑا۔'' سراج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں میری بدقسمتی نے پھر زور مارا۔ عاطف سے کال مل گئی۔ اس مرتبہ عاطف کے فون پر فرح کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ''کون ہے؟ کون بول رہا ہے؟''

فرح کی آواز سن کر سیٹھ سراج کی آنکھوں میں شیطانی چمک نمایاں ہو گئی۔ اس نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ بہ زبانِ خاموشی کہہ رہا تھا... بول نہیں تو تیری ماں جا رہی ہے۔

میرے دل نے گواہی دی کہ وہ اور اس کے ساتھی ماں جی کو مار دیں گے اور اگلے چند سیکنڈ میں، میں اپنی ماں کی بے نور آنکھیں دیکھوں گا۔ ان کے ساکت ہونٹ جو پھر کبھی ہمارے لیے دعا کے لیے نہیں ہلیں گے اور ان کے منجمد ہاتھ جو کبھی ہمارے سر پر نہیں آ سکیں گے۔ نہیں، میں اپنی ماں کو یوں نہیں جانے دوں گا... کسی قیمت پر نہیں۔ میرے اندر ایک عجیب سی توانائی لہر لینے لگی۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''ہیلو... فرح... میں تابش۔''

''بھائی! کہاں ہیں آپ... آپ نکل آئے ہیں نا؟ امی کہاں ہیں؟ آپ ٹھیک ہیں نا... خدا کے لیے بتا دیں آپ ٹھیک ہیں نا؟ خدا کے لیے...'' وہ بولتی چلی گئی۔

میرے ہونٹ لرزاں تھے لیکن میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ سراج نے فون کے ماؤتھ پورشن کو انگلی سے ڈھانپا اور سرسراتی آواز میں بولا۔ ''اس سے پوچھ، وہ کہاں ہے... کس جگہ پر ہے۔ جلدی پوچھ... جلدی۔''

میں جانتا تھا کہ سراج اور شیرے کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اب میں نہ بولا تو وہ ماں جی کو مار دیں گے۔ وہ اگلے چند سیکنڈ میں ان کی جان لے لیں گے۔ شیرے نے اب ایک ہاتھ ماں جی کے ہونٹوں پر بڑی مضبوطی سے جما دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی آہ و بکا موبائل فون کے ذریعے فرح اور عاطف تک پہنچ جائے۔ ماں جی کسمسا رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے کراہتی آواز میں کہا۔ ''بیٹا فرح... میں ٹھیک... ہوں... تم... تم...'' میں نے بہت کوشش کی مگر آواز گلے میں رک رہی تھی۔ میں اتنا جگرا کہاں سے لاتا کہ فرح سے پوچھتا، وہ کہاں ہے؟

ماں جی کی سانس بند ہو رہی تھی۔ وہ بے طرح کھانس رہی تھیں پھر انہوں نے ہونٹ [illegible] کی طرف کر لیں۔ وہ [illegible]

شاید کچھ کرنا چاہ رہی تھیں مگر انہوں نے وہ کیا جو کوئی بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے خود کو قربان کر دیا... ہاں، مرتو انہوں نے شاید ویسے بھی جانا تھا کہ وہ بری طرح زخمی ہو چکی تھیں، انہوں نے اپنی موت کو بروقت بنا دیا۔ اس سے پہلے کہ میں ان کی جان کے خوف سے سیٹھ سراج کی ہدایت پر عمل کر گزرتا، ماں جی نے اپنی جان... جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ وہ قریباً ستر فٹ نیچے پختہ فرش پر گری تھیں۔ سراج، شیرا اور ان کے ساتھی حواس باختہ ہو کر کھڑکی سے نیچے جھانک رہے تھے۔ میں نے بھی نیچے دیکھا۔ وہاں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ میری ماں کا سر چشم کے ایک بڑے گملے سے ٹکرایا تھا۔ شاید سر کی FRONTAL BONE ٹوٹ گئی تھی۔ خون کا ایک ریلا سا سیاہی مائل فرش پر رینگتا ہوا ایک کیاری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ ماں تھی جو ابھی جینا چاہتی تھی۔ جس نے ابھی اپنے کسی بچے کی کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ جو اپنی بیٹی کے بڑے پیار سے بنائے ہوئے زیور ایک اٹیچی میں لیے لیے پھر رہی تھی اور ان زیوروں جیسے سیکڑوں ممتا بھرے ارمان اس کے دل میں موجود تھے۔ ان ارمانوں سمیت کچھ ہی دیر پہلے تو وہ

زندہ تھی، سانس لے رہی تھی، باتیں کر رہی تھی۔

میں مڑا اور اندھا دھند سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ میں نے اپنی ماں کا ٹوٹا ہوا سر دیکھ لیا تھا پھر بھی جیسے دل میں آس تھی کہ ان میں جان باقی ہو گی۔ میں ان کے سر کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر اپنی گود میں رکھوں گا اور ماتھے کو بوسہ دوں گا تو وہ پلکیں جھپکنے لگیں گی۔

''پکڑو... بھاگ رہا ہے۔'' شیرا دہاڑا۔

میں زینوں پر پہنچا۔ کچھ لوگ میرے پیچھے لپکے۔ ''ماں جی... ماں جی۔'' میں دودھ پیتے بچے کی طرح بلک رہا تھا۔ میں نے چار پانچ زینے طے کیے تھے کہ کسی نے عقب سے میری گردن پر ضرب لگائی۔ میں لڑکھڑایا۔ ابھی میرے سامنے بارہ تیرہ زینے باقی تھے۔ میں ان زینوں پر سے لڑھکتا ہوا سر کے بل سیاہی مائل فرش کی طرف گیا۔ فرش جس میں سفیدی مائل دھاریاں تھیں۔ جو بہت سخت تھا اور ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ میں اس فرش سے ٹکرانے والا تھا۔ بری طرح ٹکرانے والا تھا۔ میرے ہاتھ عقب میں بندھے ہوئے تھے پھر میں تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اپنی ساری کم ہمتی، لاچاری اور بدقسمتی سمیت۔ مجھے ہر طرف سے ایک گہری، سیاہ بے خبری نے ڈھانپ لیا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو میں چت لیٹا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پورا جسم پھوڑا بنا ہوا ہے۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کنپٹی کے قریب چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ یقیناً یہ سر کے زخم سے بہنے والا خون تھا۔

میری دھندلائی ہوئی نگاہیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اپنے سر پر کسی چھت کے بجائے درخت نظر آئے۔ یہ شاید شام کا وقت تھا۔ درختوں سے اوپر آسمان گہرے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ پھر زور سے بجلی چمکی۔ گڑگڑاہٹ ہوئی اور بوندیں برسنے لگیں۔ میں یہ سارے مناظر بالکل خالی خالی ذہن کے ساتھ دیکھ رہا تھا... پردۂ تصور خالی تھا۔ پھر جیسے دھیرے دھیرے ٹی وی اسکرین پر کوئی منظر ''فیڈ ان'' ہوتا ہے، میرے پردۂ تصور پر بھی دھندلے مناظر کی شبیہ بننے لگی۔ یہ شبیہ بہت آہستہ آہستہ ہی لیکن بنتی چلی گئی۔ ٹیڑھی میڑھی لکیروں اور بے ترتیب رنگوں نے موہوم شکلیں اختیار کرنا شروع کیں۔ ہوا کی سائیں سائیں نے آوازوں کا روپ دھارا۔ یہ آوازیں واضح ہوئیں۔ ان کے آہنگ، ان کے الفاظ باقاعدہ شکل اختیار کرنے لگے۔ ''پکڑو... بھاگ رہا ہے۔''

''یہ کس کی آواز تھی؟''

موٹے جسم اور چھوٹے سر والا ایک شخص میری نگاہوں کے سامنے دھیرے دھیرے ایک وجود اختیار کرنے لگا۔ کون تھا یہ؟... سیٹھ سراج۔

ایک دم اپنی والدہ کی صورت دھند کی دبیز چادر کو چاک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آئی۔ ''نہیں تابی... مجھے مر جانے دینا... ان کو کچھ نہ بتانا میرے بچوں کا۔''

مجھے لگا کہ میں نے یہ آواز بہت عرصہ پہلے کہیں سنی تھی۔ پھر اس آواز کے بعد کیا ہوا تھا؟ اچانک میری شریانوں میں تہلکہ مچ گیا۔ پاؤں کے ناخنوں سے سر کے بالوں تک پورے جسم میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ماں جی کا سر چشم کے گملے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی بے نور آنکھیں، ٹیوب لائٹ کی روشنی میں شیشے کی طرح چمک رہی تھیں۔

میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ''ماں جی... ماں جی۔'' میں نے سینے کی پوری قوت سے پکارا اور اٹھ بھاگا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ چاروں طرف بلند و بالا درخت تھے اور ان کے درمیان خودرو جھاڑیوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ بارش کی بوچھاڑوں کے سبب زمین پر کیچڑ بننا شروع ہو گیا تھا۔ میں پہلے تو چالیس پچاس قدم تک سیدھا بھاگا، پھر وہاں سے بائیں مڑ گیا پھر بائیں سے دائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بھاگنے کے ساتھ ساتھ میں پکار رہا تھا۔ ''میری ماں کو مار دیا تم نے... میری ماں کی جان لے لی۔ تم خونی ہو، قاتل ہو...''

لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں جو میری سنتا اور کسی طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا۔ چاروں طرف درخت تھے اور بارش کی بوچھاڑیں تھیں۔ میں ہانپ کر رک گیا۔ ارد گرد دیکھنے لگا۔ یہ بالکل اجنبی جگہ تھی۔ پھر میری نگاہ اپنے لباس پر پڑی۔ لباس بھی اجنبی تھا۔ یہ ایک پاجامہ کرتا تھا۔ اس کے اوپر سوتی کپڑے کی ہی واسکٹ سی تھی۔ جوتی بھی اجنبی سی تھی۔ یہ مجھے کہاں پھینکا گیا تھا اور کیوں؟ مجھے ہر چیز اجنبی لگ رہی تھی۔ درخت، ہوا، بارش اور خود اپنا آپ بھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ یہ سر سے بہنے والے خون کے سبب داغ دار تھا۔ مجھے یوں لگا کہ غیر ماحول میں یہ ہاتھ بھی اجنبی سا ہو گیا ہے۔

''کوئی ہے... کوئی ہے یہاں؟'' میں کرب کی انتہا کو چھو کر چلانے لگا۔

میری آواز بارش کی صدا سے بغل گیر ہو کر دور تک گئی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میرے سینے میں غم کا طوفان تھا۔ لگتا

www.pkdigest.com

تھا کہ میں کھل کر نہ رویا تو کلیجا پھٹ جائے گا۔ مجھے پُرسا چاہیے تھا۔ میں ایک درخت سے لپٹ گیا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ”میں یتیم ہو گیا۔ میری ماں مر گئی۔ میرا سب کچھ لٹ گیا۔“ میں رو رہا تھا اور درخت کے تنے سے اپنا چہرہ رگڑ رہا تھا۔ یہ درخت میرا قریبی عزیز بن گیا۔ میرا غم گسار، میرا دوست، بھائی، سب کچھ۔

ایک دم مجھے عاطف کا خیال آیا۔ عاطف... اور فرح کوٹھی سے نکل بھاگے تھے۔ کیا وہ بچنے میں کامیاب ہوئے؟ وہ کہاں تھے؟ کس حال میں؟ ایک دم بہت سے سوالوں نے ذہن پر یلغار کی... مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں۔ ان واقعات کو گزرے کتنا وقت گزر چکا ہے۔ چند گھڑیاں، چند دن یا ہفتے... میری نگاہ کلائی کی گھڑی کی طرف گئی۔ وہاں رسٹ واچ موجود نہیں تھی۔

میں بے دم سا ہو کر اپنے غم گسار درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بارش کا پانی پتوں سے چھن چھن کر میرے سر پر پڑنے لگا۔ یہ کیا ہوا تھا؟ میں کتنی دیر بے ہوش رہا... اب کہاں تھا میں؟

ماں کا مرا ہوا چہرہ نگاہوں کے سامنے آیا اور میں ایک بار پھر بے قرار ہو کر اس بھیگے ہوئے جنگل میں بھاگنے لگا۔ آوازیں دینے لگا۔ کبھی اپنی ماں کو، کبھی چھوٹے بھائی کو... اور فرح کو... کبھی کسی کو مدد کے لیے بلانے لگا۔

میں روتا رہا اور بھاگتا رہا۔ بے دم ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا اور پھر بھاگنا شروع کر دیتا۔ اب اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اردگرد کے مناظر ہیولوں کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ جیسے یہ ساری دنیا ایک ویرانے کی شکل اختیار کر گئی ہو۔ بس کسی وقت مجھے اپنے اردگرد کسی چھوٹے موٹے جانور، گلہری، بلی، نیولے وغیرہ کی موجودگی کا احساس ہوتا یا گھونسلے میں دبا ہوا کوئی پرندہ مدھم آواز نکالتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں سمتوں کا تعین کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ اگر میری آنکھوں کے سامنے اجالا... اندھیرے میں نہ بدلا ہوتا تو شاید میں وقت کا تعین کرنے سے بھی قاصر رہتا۔

نہ جانے میں کب تک اسی طرح بھاگتا رہا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ بول بول کر گلا بیٹھ گیا اور آنسو خشک ہو گئے۔ میرے اردگرد خاموش نباتات اور مسلسل برستی بارش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بالآخر ایک نشیب میں مجھے ایک چھوٹی سی کھوہ نظر آئی، میں اس میں داخل ہو گیا۔ یہ کچی زمین میں ایک پندرہ بیس فٹ لمبا سوراخ سا تھا اور بو بھی آ رہی تھی۔ شاید کوئی چھوٹا موٹا جانور یہاں مرا تھا۔ بہرحال، اس کھوہ میں داخل ہوتے ہی میں بارش سے محفوظ ہو گیا۔

میں نے ایک دیوار سے ٹیک لگائی اور اپنے اندرونی ہیجان کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں معروضی انداز میں سوچنا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے لباس پر توجہ دی۔ جیبوں کو ٹٹولا۔ کُرتے کی بغلی جیب میں سے ایک رومال نکلا۔ کپڑے کی ایک چھوٹی سی ملائم تھیلی نکلی۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا، اس میں بادام، چھوہارے اور مکھانے وغیرہ تھے۔ شادی بیاہ اور نکاح کے موقع پر ایسی تھیلیاں مہمانوں میں تقسیم کی جاتی ہیں پھر میری جیب سے سگریٹ کا ایک چھوٹا پیکٹ اور لائٹر نکلا۔ یہ دونوں اشیا پتا نہیں کس نے جیب میں رکھی تھیں، ورنہ میں تو سگریٹ پیتا نہیں تھا۔

میں نے لائٹر جلایا تو وہ جل گیا۔ چھوٹے سے زرد شعلے کی روشنی میں، میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کھوہ کی کچی دیواروں سے کئی جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ ایک کونے میں کسی پرندے کے پر پڑے تھے۔ ایک طرف خشک ٹہنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے ان ٹہنیوں میں سے کچھ کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور تھوڑی سی کوشش سے آگ جلانے میں کامیاب ہو گیا۔

آگ سے روشنی کے علاوہ حرارت بھی ملی۔ میں قدرے ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں کہاں ہوں اور میرے جسم پر یہ بالکل اجنبی لباس کیوں ہے؟ میں ماں جی کو پکارتا ہوا زینوں کی طرف بھاگا تھا... پھر کیا ہوا تھا؟ پھر وہ لوگ میرے پیچھے لپکے تھے۔ میں نے چند زینے ہی طے کیے تھے کہ عقب سے کسی نے مجھے رائفل کا بٹ رسید کیا تھا۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا سیاہی مائل فرش کی طرف گیا تھا۔ اس فرش میں سفید سفید دھاریاں تھیں۔ اس کے بعد کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ سب کچھ ایک دورافتادہ ”سیاہ دھند“ میں چھپ گیا تھا۔ مجھے سیٹھ سراج، شیرے اور بختیار وغیرہ کے سفاک چہرے یاد آئے۔ بختیار تو فرح اور عاطف کے پیچھے تھا۔ باقی لوگ مجھے زندگی میں موت کا مزہ چکھا رہے تھے۔ دلیل تو یہی کہتی تھی کہ انہیں، مجھے چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔ لیکن اگر میں یہاں اس ویرانے میں موجود تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ انہوں نے مجھے چھوڑا ہے۔ کیا اس کے پیچھے بھی کوئی چال تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب بھی کچھ لوگ میری بے خبری میں میرے اردگرد موجود ہوں۔ وہ میرے ذریعے کسی اور تک پہنچنا چاہتے ہوں... مثلاً فرح اور عاطف تک۔

لیکن ایسا ہوتا تو مجھے لاہور ہی میں کہیں چھوڑا جاتا، اس ویرانے میں چھوڑنے کی کیا وجہ تھی؟ میں غور کرنے لگا کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ شیشم کے علاوہ دھریک اور تھوہر وغیرہ کے پودے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ خودرو جھاڑیاں تھیں۔ لاہور کے اردگرد تو چھانگا مانگا ہی ایسی جگہ تھی جہاں اس قسم کے مناظر دیکھے جا سکتے تھے۔ مگر مجھے یہ چھانگا مانگا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر میرا دھیان اس ڈیک نالے اور اس ”ڈِکھ“ کی طرف چلا گیا جہاں میں نے اپنی زندگی کا ایک دل دوز ترین منظر دیکھا تھا۔ جہاں میرا یار، سینے پر برسٹ کھا کر میری آنکھوں کے سامنے قاتل پانی میں گرا تھا۔ دل میں ناقابلِ برداشت ٹیسیں اٹھیں اور سر چکرانے لگا۔ کیا یہ وہی گردو پیش تھے جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا؟ ذہن نے اس بات کو بھی ماننے سے انکار کیا۔

بارش کچھ ہلکی ہوئی تھی۔ میں کھوہ سے باہر نکلا اور کسی راہ گم کردہ بدحال مسافر کی طرح اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ آنسو خشک ہو چکے تھے مگر سینے میں ناقابلِ بیان دکھ کا الاؤ تو موجود تھا۔ میں پھر دل دوز انداز میں پکارنے لگا۔ ”کوئی ہے... کوئی ہے... میری مدد کرو۔“

جواب میں جنگل کے مہیب سناٹے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پکار پکار کر میرا گلا بیٹھ چکا تھا۔ اب تو آواز بھی ٹھیک سے نہیں نکل رہی تھی۔ میں بے دم ہو کر پھر کھوہ میں آ گیا اور بجھتی ہوئی آگ میں کچھ اور خشک ٹہنیاں ڈال کر قریب ہی لیٹ گیا۔ سر کے زخم سے شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے انگلیوں سے چھو کر دیکھا۔ زخم کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ تو کیا ڈیفنس کی کوٹھی میں پیش آنے والے واقعات کو زیادہ دیر نہیں گزری؟ یہ ایک دو روز پہلے کی بات ہی ہے؟ مگر ایسا لگ نہیں رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا، چہرے پر چھ سات روز کی شیو تھی۔ مجھے یاد آیا کہ رشید اور گلزار وغیرہ کے ہتھے چڑھنے کے بعد میں نے دو تین روز تو لالہ زار اکیم کے گھر میں ہی گزارے تھے۔ وہاں میری شیو بڑھتی رہی تھی، اس کا مطلب تھا کہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہونے کے بعد مجھے چار پانچ دن مزید گزر گئے ہیں۔

دماغ ایک بار پھر بری طرح چکرانے لگا۔ خیالات آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اپنی ماں جی کا مردہ چہرہ دیکھے مجھے بس ایک دو دن ہی ہوئے ہیں۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس واقعے کو صدیاں بیت چکی ہیں۔ میں کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ والدہ اور عمران کے لیے آنکھوں سے تازہ آنسو ابلنے لگے۔ میرے رخسار پر رینگنے لگے اور میری ناک کے بانسے سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ میں دل ہی دل میں پکارا۔ ”میں زندہ رہنے کے قابل نہیں ہوں... میں اپنے چاہنے والوں کے لیے ایک مجسم بدنصیبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ میرا پیارا دوست، میری بزدلی اور حماقت کی وجہ سے گولیوں سے چھلنی ہوا۔ میری ماں کی جان میری آنکھوں کے سامنے گئی... میں ان کی موت کا ذمے دار ہوں اور جو ابھی زندہ ہیں... ان پر میری وجہ سے ابھی نہ جانے کیا قیامت گزر رہی ہے...“ میں بزبانِ خاموشی بلکنے لگا۔ ”اے خدا! تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا؟ اور اگر ایسا بنایا تھا تو پھر اس طرح کے حالات سے کیوں دوچار کیا؟ میرا کیا قصور ہے میرے مالک... میں ہوں ہی ایسا۔ میں نے خود کو بدلنے کی ہزار کوششیں کیں مالک۔ جو کچھ میری سمجھ میں آیا، خلوصِ دل سے کیا اور کرتا رہا۔ خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر مضبوط بنانے کے بے شمار جتن کیے۔ ہر طرح کی بداخلاقیوں سے دور دور رہا۔ اپنے اندر چھپی ہوئی توانائیوں کو ڈھونڈنے کی سعی کرتا رہا۔ مگر جو کچھ میرے اندر تھا ہی نہیں... جو تو نے میرے اندر رکھا ہی نہیں تھا، میں اسے کیسے ڈھونڈ پاتا...

دکھ کی انتہا کو چھو کر میں اپنے رب سے شکوہ کناں ہو گیا۔ میری آنکھوں سے آتشیں آنسو، طوفانی دھاروں کی طرح ابلنے لگے... ”اے میرے رب! ہم نے تو یہی سنا تھا، تو اپنے بندے کو پیار کرتا ہے... ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ اے مالک! ماں تو اپنے ہر بچے کی کمزوریوں، خامیوں کو سمجھتی ہے۔ جو بچہ زیادہ کمزور ہوتا ہے، وہ اس کا اتنا ہی دھیان رکھتی ہے۔ اس کو کوئی کسر نہ لگ جائے، اس کی کوئی کمزوری اسے نقصان نہ پہنچائے، وہ ہر گھڑی اسی فکر میں رہتی ہے۔ تو اے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے مالک... تو نے مجھے کمزور و ناتواں پیدا کیا اور پھر میری طرف سے دھیان بھی ہٹا لیا۔ میں کہاں جاؤں مالک؟ میں کیا کروں؟ ماں کی ممتا تو اپنے بچوں میں سے کسی کو کوئی کمی نہیں ہونے دیتی۔ اگر کمی ہوئی بھی ہے تو اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔ اے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والے رب العزت! تو نے مجھے کم ہمتی و ناتوانی دی... اور اس کے بدلے میں بھی کچھ نہ دیا۔ کوئی تو صلاحیت رکھی ہوتی میرے اندر... کوئی ہنر... کوئی گن... جس سے میں اپنی لاچاریوں کا ازالہ کر سکتا۔

”... میں بہت رو چکا مالک... بہت دکھ سہہ چکا۔ اب تو ماں بھی نہیں رہی، اب اور ہمت نہیں ہے... اب یہ کھیل ختم

www.pkdigest.com

کر دے۔ اب اپنی زندگی واپس لے لے۔" میں نے اپنا چہرہ کیچڑ زمین میں دھنسا دیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ روتے روتے نہ جانے کس وقت جسم و جاں پر نقاہت طاری ہوئی اور میں غنودگی میں جانے کے بعد... سو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں بدستور اسی کھوہ میں تھا۔ آگ مدھم ہو چکی تھی مگر مکمل طور پر بجھی نہیں تھی۔ باہر تاریک فضا میں درختوں کے پتوں پر بارش تواتر سے برس رہی تھی۔ یکایک میں نے محسوس کیا کہ میرا سر کسی نرم گداز چیز پر ہے۔ یہ شاید کسی کے زانو پر تھا۔ پھر مجھے اپنے ہونٹوں پر بھی کسی کی نرمی اور گرمی کا احساس ہوا۔ کسی کی سانس میرے رخسار سے ٹکرائی۔ کسی کے ہونٹ مجھے بڑی نرمی سے بوسہ دے رہے تھے۔

میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ سر میں شدید ٹیس اٹھی۔ میں نے گھوم کر دیکھا اور سکتے میں رہ گیا۔ میرے بالکل قریب ایک لڑکی موجود تھی۔ آگ کی مدھم سرخ روشنی میں اس کے خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ درمیانی شکل و صورت کی تھی، تاہم اس کے چوڑے رخسار قندھاری اناروں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس کے بال بے حد گھنے اور لمبے تھے۔ چوڑی پیشانی پر ایک طرف زخم کا چھوٹا سا نشان تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دوپٹا بھی موجود تھا مگر وہ اس کے گلے میں لٹک رہا تھا۔ وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" وہ دکھی انداز میں بولی۔ "میں دیوانوں کی طرح ڈھونڈتی رہی ہوں تم کو... دیکھو میرے پاؤں بھی زخمی ہو گئے ہیں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ کہیں..." اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

"کک... کون ہو تم؟" میں نے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں نظر آنے والی حیرت اور پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔ پھر وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ "مذاخ (مذاق) کے لیے یہ وخت (وقت) اچھا نہیں ہے مہروج۔"

"مہروز... کون مہروز؟"

اس کی آنکھوں کی پریشانی فزوں تر ہوئی لیکن اس نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا اور ذرا مسکرا کر اور مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر ادا سے بولی۔ "مہروج... میرا شوہر، میرا شریکِ حیات، میری زندگی کا واحد سہارا۔ جو کج ادا ہے۔ ستاتا ہے... رلاتا ہے پھر بھی اچھا لگتا ہے۔" اس کے لب و لہجے میں حیدرآبادی آہنگ تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس سے بہت دور نظر آتی تھی۔ اس ویران جنگل میں، اس مسلسل برستی بارش میں اس کا یہاں پایا جانا اتنا ہی حیرت ناک و ناقابلِ فہم تھا جتنی وہ خود تھی۔ اس کے لباس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کافی دنوں سے اس ویرانے میں بھٹک رہی ہے۔ اس کی پھول دار قمیص دو تین جگہ سے پھٹی ہوئی تھی، کپڑوں پر سرخی مائل کیچڑ کے داغ بھی جا بجا تھے۔ سب سے عجیب چیز اس کا لب و لہجہ تھا۔ اس قسم کی زبان میں نے ایک دفعہ انڈین حیدرآباد میں سنی تھی۔ وہاں میں، فرح اور عاطف ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ یہ کئی برس پہلے کی بات تھی۔

وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر لگاوٹ سے بولی۔ "دیکھو، میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ تم کو نیند آ رہی ہے تم خود کو کسی کپڑے کے ساتھ درخت سے باندھ لو تو اچھا ہوئیں گا... مگر تم نے میری بات اچ نہیں مانی۔ یہ تو شکر ہے درخت زیادہ اونچا نہیں تھا، ورنہ بہت چوٹ آتی۔"

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی اور اسے مجھ پر کس شخص کا شبہ ہو رہا تھا۔ بہرحال، میں خاموش رہا۔ اس نے میری کنپٹی پر بڑی ملائمت سے انگلیاں چلائیں اور بولی۔ "میں نے پٹی کر دی ہے، خون بھی بند ہو گیا ہے مگر لگتا ہے کہ ٹانکے لگنے کی ضرورت ہوئیں گا۔ اللہ کرے ہم کل کی طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے خابل (قابل) ہو جائیں۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بول رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ وہ جو کہہ رہی ہے، وہی درست ہے۔ اس کے قریب ہی ایک جھولا سا رکھا تھا۔ لگتا تھا کہ کپڑے کے اس جھولے میں اس کا سفری سامان ہے۔ اس نے جھولے میں ہاتھ ڈال کر اِدھر اُدھر گھمایا اور کسی پودے کی دو تین شاخیں باہر نکال لیں۔ ان شاخوں کے ساتھ لمبوترے پتے بھی لگے ہوئے تھے۔ اس نے پتے شاخوں سے علیحدہ کیے اور بولی۔ "یہ ہے وہ بوٹا جسے ڈھونڈنے گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ کہیں آس پاس اچ ہوئیں گا لیکن کافی دور سے ملا۔ چوٹ کی جلن اور پیٹ درد کے لیے ایک دم اچھی چیز ہے۔ تم دیکھنا کتنی جلدی ٹھیخ ہوتے ہو۔"

میں اب بھی خاموش رہا۔ اس نے جھولے کے اندر سے ہی چھوٹی سی سل اور وٹا نکالا۔ ساتھ میں پلاسٹک کی بوتل بھی تھی جس میں پانی تھا۔ اس نے پتوں کو مروڑ کر سل پر رکھا اور وٹے سے انہیں پیسنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا سارا جسم ہلکورے لینے لگا۔ بھیگے ہوئے لمبے بال آگے کو ڈھلک آئے اور زمین کو چھونے لگے۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال

رہی ہوگی۔ وہ مضبوط ہاتھ پیر کی صحت مند لڑکی تھی۔ نقوش ذرا موٹے تھے تاہم ان میں جاذبیت موجود تھی۔ لگتا تھا کہ ذرا سی مشقت سے اس کے عارض، انار کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔

سل پر چند رگڑے لگانے کے بعد وہ ایک دم چونکی۔ اس نے اپنا ہاتھ روک کر ناک سکوڑی اور کچھ سونگھنے لگی۔ یقیناً کھوہ میں سے اٹھنے والی ہلکی بو اسے بھی تنگ کر رہی تھی۔ اس نے آگ میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور اس کی روشنی میں احتیاط سے کھوہ کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی وہ بو کا ماخذ ڈھونڈنے میں کامیاب رہی۔ یہ بلی کا مردہ بچہ تھا جسے شاید کسی نر نے ہی مار ڈالا تھا۔ اس کی انتڑیاں نکلی ہوئی تھیں۔ لڑکی نے اس منظر پر افسوس کا اظہار کیا۔ بہرحال، مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے کسی طرح کی کراہت کھائے بغیر بلونگڑے کی لاش کو دم سے پکڑا اور کھوہ سے باہر نکال کر جھاڑ جھنکاڑ میں پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے متاثرہ جگہ کو ایک گیلے کپڑے سے صاف کیا اور جھولے میں سے کوئی عطر قسم کی شے نکال کر کھوہ میں تین چار جگہ لگا دی۔ اس سے بھینی سی خوشبو پھیل گئی۔

میں نے اسے پہلی بار چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اس نے پاؤں میں [illegible] جوگرز ٹائپ جوتے پہن رکھے تھے۔ جب وہ بلونگڑے کو باہر جھاڑ جھنکاڑ میں پھینکنے گئی تو بارش کی بوچھاڑوں سے اس کا لباس پھر بھیگ گیا۔ اس کی پھول دار قمیص اس کے جسمانی خدوخال کو نمایاں کرنے لگی۔ اس کا جسم غیر معمولی طور پر منہ زور تھا... جیسے ہر حرکت پر لباس سے برسرِ پیکار ہو رہا ہو۔ وہ ایک بار پھر دوزانو بیٹھ کر سل پر پتوں کو رگڑنے لگی۔ "دیکھو تم نے کیا کیا؟" وہ اپنی روانی میں بولی۔ "میں تمہارے پیٹ درد کے لیے پریشان تھی اور تم نے اتنی بڑی چوٹ لگوا لی... اور چلو اگر چوٹ لگ اچ گئی تھی پھر وہیں تو رہتے... وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ تمہاری یہی باتاں پریشان کر دیتی ہیں۔ میرا دل تو رونے کو چاہ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ بس اب گم ہو گئے تم۔ وہ تو شکر ہے کہ جنگل خراب ہوتی یہاں پہنچی تو تھوڑی روشنی نظر آ گئی..."

وہ بولتی چلی جا رہی تھی۔ یہ جنگل، یہ بارش اور یہ تاریک کھوہ جس میں آگ کی طلسماتی روشنی تھی، کسی داستان کا منظر لگتا تھا۔ دل میں واہمہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ لڑکی واقعی وجود رکھتی ہے یا پھر کوئی بصری دھوکا ہے، آسیب ہے۔

میں جو کچھ بھی ہوں لیکن ٹھوس حقائق پر یقین رکھنے والا شخص ہوں۔ ہر چیز کو سائنسی بنیادوں پر پرکھنے والا اور مافوق الفطرت تصورات سے دور رہنے والا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ گوشت پوست کی لڑکی ہے اور میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، جاگتی آنکھوں سے اور پورے ہوش و حواس میں دیکھ رہا ہوں۔ اگر کوئی الجھن تھی تو وہ یہی تھی کہ میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے جہاں میں موجود ہوں۔

لڑکی نے پتوں کو پیس کر بالکل باریک کر دیا پھر اسے ایک پیالے میں ڈالا۔ پلاسٹک کی بوتل سے اس میں تھوڑا سا پانی ملایا اور میری طرف بڑھایا تاکہ میں چند گھونٹ پی لوں۔ اس میں سے عجیب سی نباتاتی بو اٹھ رہی تھی۔ میں نے پینے سے منع کر دیا۔ نہ جانے یہ مخبوط الحواس لڑکی کیا پلا رہی تھی۔

اس نے میرے انکار کا حتمی انداز دیکھا اور گہری سانس لے کر پیالا ایک طرف رکھ دیا۔ "اچھا، کوئی باتاں نہیں۔ ٹھہر کر پی لینا۔" وہ بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں بھوک لگی ہوئیں گی، کچھ کھا لو۔"

میں نے ایک بار پھر انکار کیا۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ تب اس نے آگے بڑھ کر میرے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا اور قدرے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "میں تو تمہاری یہ چوٹ دیکھ کر ڈر اچ گئی تھی۔" اس نے کہا اور اچانک میرے گال کا بوسہ لے کر پیچھے ہٹ گئی۔

میں اس کی اس حرکت پر ہڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ آگ کے پاس ایک چٹائی بچھا کر نیم دراز ہو گئی۔ انداز وہی تھا جو تنہائی میں ایک بیوی کا اپنے شوہر کے سامنے یا پھر محبوبہ کا اپنے چاہنے والے کے سامنے ہوتا ہے۔ بادل مسلسل پانی برسا رہے تھے۔ گاہے بگاہے گرج چمک بھی ہوتی تھی۔ یہ عجیب سا رومان انگیز افسانوی ماحول تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید دل میں گدگدی محسوس کرتا لیکن میرے لیے تو اس سے سو گنا زیادہ رومانیت بھی بے معنی تھی۔ میرے سینے میں دکھ کا جو دریا بہہ رہا تھا، اس کی اذیت ناقابلِ بیان تھی۔ لگتا تھا کہ میری شریانیں ٹوٹ جائیں گی اور جسم کا ریشہ ریشہ جدا ہو جائے گا۔

میں نے ایک بار پھر اس لڑکی سے پوچھنا چاہا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ مگر تب مجھے احساس ہوا کہ وہ پھر وہی جواب دے گی جو پہلے دیا تھا۔ میں نے گفتگو کا انداز بدلا اور ٹوہ لینے والے انداز میں پوچھا۔ "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم کہاں ہیں؟"

وہ میرے بولنے پر خوش ہوئی اور دیوار کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہم ٹھیک راستے پر آ گئے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا پچھلے برس گرمیوں میں "بچے" کے

www.pkdigest.com

پاس بہت سے درختوں میں آگ لگ گئی تھی۔ تین دن تک پیڑ جلتے رہے تھے۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔" میں نے کہا۔

"یہ جگہ "تل پانی" جانے والے رستے کی بالکل سیدھ میں ہے۔ ابھی شام سے پہلے مجھے نالے کے پار کچھ جلے ہوئے پیڑ نجر آئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اب ہمیں ناک کی سیدھ میں جانا ہے۔"

"کتنی دیر میں پہنچیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"بارش رک گئی تو بالکل سویرے اچ نکل جائیں گے۔ مجھے نہیں لگتا کہ سات آٹھ میل سے جیادہ کا سفر ہو میں گا۔" وہ "اچ" کو "ہی" کے معنوں میں استعمال کرتی تھی۔

میں نے سر کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ آس پاس کوئی اسپتال ہوتا تو اچھا تھا۔"

میرا خیال تھا کہ شاید اس کے جواب سے علاقے کے محل وقوع کا اندازہ ہو سکے لیکن وہ مسکرائی اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ "حکم جی کا بس چلے تو یہاں کوئی حکیم وید بھی دکھائی نہ دے۔ سب کچھ جنتر منتر سے کیا جائے۔ ہاں، بس ایک ڈاکٹر ہو، اس کو ہمارے حکم جی نے اپنی تجوری میں بند رکھا ہو۔ اس کو بس اس وخت نکالا جائے جب حکم جی صاحب خود بیمار ہوں یا ان کے خاندان کے کسی بندے کو جرورت پڑے۔"

پتا نہیں، وہ کہاں کہاں کی باتیں کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس اس کی اوٹ پٹانگ گفتگو سے اتنا پتا چلا کہ وہ میرے ساتھ (یعنی اپنے شوہر کے ساتھ) کسی "تل پانی" نامی جگہ پر جانا چاہ رہی ہے اور اس کا خیال ہے کہ وہاں پہنچ کر وہ اور اس کا شوہر محفوظ ہو جائیں گے۔ حکم جی نام کا شخص ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ جہاں سے آئی تھی، اس جگہ کا نام زرگاں تھا اور وہ وہاں سے بھاگ کر آئی تھی۔

اس کی گفتگو کے دوران میں ہی کچھ آہٹیں ہوئیں۔ وہ ایک دم چوکنا ہو گئی۔ اس کے انداز میں خوف کے بجائے ایک عجیب طرح کی حرارت اور چوکسی تھی۔ آہٹیں میں نے بھی سنی تھیں۔ بالکل یہی لگا تھا جیسے کئی افراد ہمارے بالکل آس پاس موجود ہوں۔ کھانسی سے ملتی جلتی صدا بھی کانوں میں پڑی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ لڑکی نے اپنے جھولے میں سے ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی نکال لی۔ اپنے دستے اور پھل کی بناوٹ کے سبب کلہاڑی خوب صورت نظر آتی تھی۔ اس نے کلہاڑی میری طرف بڑھائی اور پھر ویسی ہی ایک اور کلہاڑی اپنے ہاتھوں میں سونت لی۔ اس کی عقابی نگاہیں کھوہ کے باہر کی تاریکی میں پیوست تھیں اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے پلاسٹک کی بوتل اٹھائی اور اس کا پانی ادھ بجھی آگ پر ڈال کر اسے بالکل بجھا دیا۔ اس دوران میں اس کے کان باہر کی سن گن لیتے رہے۔ باہر اب بارش کی مدھم صدا کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ "کون ہو سکتا ہے؟" اس نے سرگوشی کی۔

"کھانسی کی آواز تو آئی تھی۔" میں نے کہا۔

"پر ہم تخمین (یقین) سے تو نہیں کہہ سکتے نا کہ وہ کھانسی اچ کی آواج تھی۔ کبھی کبھی جناور کی آواج بھی تو ایسی ہوئے ہے۔"

کافی دیر گزرنے کے بعد بھی جب کوئی مزید آہٹ، آواز سنائی نہیں دی تو وہ ہولے سے باہر نکلی اور کھوہ کے دہانے کے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ بارش اب بوندا باندی کی شکل میں ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ گئی اور اس نے سردی سے بچنے کے لیے خشک لکڑیوں کو ایک جگہ جمع کر کے آگ دوبارہ جلا لی۔

وہ میری طرف بڑی محبت سے دیکھ کر بولی۔ "تم بہت جیادہ تھکے ہوئے ہو۔ چوٹ میں درد بھی ہو رہا ہو گا۔ یہاں آگ کے پاس لیٹ کر آرام کرو۔ میں جاگتی ہوں۔ بعد میں، میں تھوڑی دیر کے لیے سو لوں گی۔"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

لیکن وہ اصرار کرتی رہی۔ میں آگ کے قریب لیٹ گیا۔ وہ کھوہ کی دوسری دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی رہی۔ چھوٹے دستے کی کلہاڑی اس کے قریب رکھی تھی۔ میری والی کلہاڑی وہ واپس جھولے میں ڈال چکی تھی۔ میں لیٹ تو گیا تھا لیکن سو نہیں سکتا تھا۔ یہ مخبوط الحواس لڑکی کلہاڑی بدست میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ یہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ پھر میرے ذہن میں ایک اور اندیشہ بھی سر ابھار رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس لڑکی کے پیچھے واقعی کچھ خطرناک لوگ ہوں۔ وہ اس کے پیچھے یہاں تک آ سکتے تھے اور نتیجے میں، میں بھی کسی غیر متعلقہ مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔ میرے سر پر پہلے ہی مصائب کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے تھے، اگر میں یہ کہوں کہ زندوں میں تھا نہ مردوں میں تو بے جا نہ ہو گا۔

میں آگ کے قریب لیٹا رہا۔ میرے سینے میں آنسوؤں کا آبشار گرتا رہا۔ کھوہ سے باہر بارش ایک بار پھر شدت اختیار کر گئی تھی۔ میں عجیب مخمصے میں تھا۔ مجھے یہ رات... یہ کھوہ... یہ لڑکی... یہاں تک کہ اپنا وجود... سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ بہت زور سے بجلی کڑکی۔ قریب دیوار لرز کر رہ گئے۔ لڑکی نے کچھ اور لکڑیاں آگ میں جھونک دیں اور میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

آگ کی حرارت اور مسلسل خاموشی نے میری آنکھوں میں دھیرے دھیرے غنودگی بھر دی۔ اپنے بے پناہ کرب سے لڑتے لڑتے میری آنکھ لگ گئی۔ اندازاً میں ایک ڈیڑھ گھنٹے تک سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو سینے پر بھاری بوجھ سا محسوس ہوا۔ کھوہ میں گہری تاریکی تھی۔ آگ کی راکھ میں بس چھوٹی موٹی چنگاریاں چمک رہی تھیں۔ میں نے اپنے سینے کو ٹٹولا تو وہاں لڑکی کا سر رکھا ہوا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے لائٹر جلایا۔ ننھے شعلے کی روشنی میں ارد گرد کا منظر دکھائی دیا۔ وہ میرے سینے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم میرے جسم سے چھو رہا تھا۔ اس کے نہایت گھنے بال میری گردن اور کندھوں پر بکھرے تھے۔

میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ وہ بھی بیدار ہو گئی۔ وہ چند سیکنڈ تک خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ تب اس نے اپنے سینے پر دوپٹا درست کیا اور بال سمیٹنے لگی۔ "شاید میں بھی سو گئی تھی۔" وہ ہولے سے بولی۔

اس نے آگ دوبارہ جلائی۔ آگ روشن ہوئی تو وہ پہلے سے کھیانی۔ میرے سر کی چوٹ کا پھایا دیکھنے لگی۔ اس نے سر کی پٹی کو چھوا اور بولی۔ "خدا کا شکر ہے، خون رسنا بند ہو گیا ہے۔ کیا پتا کہ ٹانکوں کی جرورت اچ نہ پڑے۔"

کھوہ سے باہر ابھی گہری تاریکی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ بس کسی وقت بجلی چمک جاتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اچانک وہی آہٹ سنائی دی جو میرے سونے سے پہلے سنائی دی تھی۔ اس مرتبہ یہ آہٹ دہانے کے بالکل پاس سے ابھری تھی اور خاصی واضح تھی۔ یہ انسانی قدموں کی آواز لگتی تھی۔

لڑکی نے اپنی کلہاڑی کی تلاش میں تیزی سے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ تھوڑی دور، اس کے جھولے کے پاس ہی پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کلہاڑی تک جاتی، ایک ایک شخص کھوہ کے دہانے پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ یہ منظر اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چند سیکنڈ کے لیے لڑکی بھی سکتہ زدہ رہ گئی۔ رائفل بردار کے سر پر بڑا سا پگڑ تھا... اس نے تہ بند، کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا ایک کڑیل دیہاتی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رائفل پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسلحہ شناس ہے اور غالباً اسے چلانے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ اس نے دانت کچکچائے اور لڑکی کو مخاطب کر کے زہریلے لہجے میں بولا۔ "حکم جی کی حد سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے سلطانہ... اتنی ہمت اور چالاکی دکھانے کے لیے تجھے دوسری، تیسری بار جنم لینا پڑے گا، پھر بھی جروری نہیں کہ تو کامیاب اچ ہو جائے۔"

لڑکی جسے سلطانہ کہا گیا تھا، اپنی جگہ پتھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ رائفل کا رخ اس کی طرف ہے اور اس کی کوئی بھی غلط حرکت اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" وہ بولی۔

"میں چاہنے والا یا نہ چاہنے والا کون ہوتا ہوں۔ چاہنے والا تو وہی تمہارا عاشق (عاشق) کوراصاحب ہے اور وہ تم کو اپنی جورو بنا کر اچ رہے گا۔ چلو شاباش، اٹھو۔ اب تم کو واپس جانا ہو میں گا۔"

"نہیں... میں ہرگج نہیں جاؤں گی۔" وہ سینہ تان کر بولی۔ "ہر کسی کو پتا ہے کہ میں بیاہتا ہوں۔ بیاہتا پر حکم جی کا ادھکار ہے اور نہ ان کے کسی یار دوست کا۔"

"لیکن وہ تمہیں بیاہتا نہیں مانتے۔ پنڈت جی نے فیصلہ دے دیا ہے اور تم بھی اس فیصلے کو اچھی طرح جانتی ہو۔"

"میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتی کہ پنڈت نے اپنے دھرم کو موم کی ناک بنایا ہوا ہے۔ حکم جی کے اشارے پر وہ اس ناک کو جدھر چاہے موڑ لیتا ہے۔"

"بکواس بند کر۔ وہ تیری یہ گوری چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھس بھر دیں گے۔ ایسی سجا دیں گے کہ مر کر بھی چین نہ پائے گی۔ اب بھی وخت ہے، جا کر حکم جی کے پاؤں میں گر جا اور گڑگڑا کر معافی مانگ لے۔"

"ہارون! تو جانتا ہے کہ میں کس ماں کی بیٹی ہوں۔ مر جاؤں گی پر عجت کے لٹیروں کے آگے سر نہ جھکاؤں گی۔ مجھے شرم آ رہی ہے تیرے کرتوتوں پر۔ کہنے کو تو مسلمان ہے پر حکم جی کے پیچھے ہوئے، بے غیرتی کے ٹکڑے کھا کھا کر تیرا جمیر مر گیا ہے۔ جو بندوخ تو نے میری طرف اٹھائی ہوئی ہے، یہ ان لوگوں کی طرف اٹھا جو تیری آنکھوں کے سامنے دن رات سکینہ اور اس جیسی دوسری لڑکیوں کی عجت کے جنازے نکال رہے ہیں۔"

"بکواس بند کر حرام جادی... جبان کھینچ لوں گا۔"

یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوندی۔ اشتعال میں آ کر بندوق بردار تھوڑا سا آگے آ گیا تھا۔ لڑکی نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا۔ وہ تیزی سے جھپٹی اور اس پر جا پڑی۔ بندوق بردار جس کا نام لڑکی نے ہارون لیا، اس حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ دونوں اوپر

www.pkdigest.com

نیچے گرے۔ لڑکی نے بندوق کی نال پکڑ کر اوپر اٹھا دی تھی۔ ہارون نامی وہ شخص فائر کرتا بھی تو گولی کھوہ کی چھت میں کہیں لگتی۔ بہرحال، اس نے فائر نہیں کیا۔ شاید اسے موقع نہیں ملا یا پھر ہمت ہی نہیں ہوئی۔ جلد ہی بندوق بردار سنبھل گیا۔ اس نے پلٹا کھا کر لڑکی کو اپنے نیچے کرلیا اور بندوق کو کسی لاٹھی کی طرح لڑکی کی گردن پر آڑھا رکھ کر اس کی گردن دبانے لگا۔ وہ بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ میں مزید اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں رہ سکا۔ میں نے بندوق بردار کے کرتے کا کالر عقب سے پکڑ لیا اور اسے لڑکی پر سے کھینچنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خاصا زور آور تھا، ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کا پٹکا کھل گیا تھا اور گلے میں پڑا تھا۔ میں نے ایک ٹکری سے اس کے سر پر چوٹ لگائی اور پھر اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر پوری طاقت سے پیچھے کی طرف کھینچا۔

یک دم اس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور وحشیانہ انداز میں مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے بندوق کے چوبی دستے سے مجھے ضرب لگائی۔ یہ ضرب میرے چہرے پر لگتی مگر میرے پیچھے ہٹنے سے میرے کندھے پر لگی۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گیا۔ وہ مجھ پر پل پڑا اور بندوق کے دستے سے مجھے اندھا دھند مارنے لگا۔ میں نے کچھ ضربیں اپنی کلائیوں پر روکیں، کچھ میری پسلیوں اور سر پر لگیں۔ سلطانہ نامی لڑکی نے جب یہ منظر دیکھا تو بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بندوق بردار کی طرف آئی۔ وہ عقب سے اس سے چمٹ گئی۔ چلّانے لگی۔ ''چھوڑ دو اس کو۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دو۔ میں تمہاری جان لے لوں گی۔ کتے... حرام جادے...'' وہ جیسے دیوانی ہو گئی تھی۔ اس کے لمبے بال دائیں بائیں لہرا رہے تھے، اس کا توانا جسم ایک دم سرکش نظر آ رہا تھا۔

بندوق بردار ہارون نے اس کی طرف مڑے بغیر اسے کہنی سے شدید ضرب لگائی۔ وہ اپنا منہ پکڑ کر کئی فٹ پیچھے جا گری۔ جہاں وہ گری، وہیں پر چھوٹے دستے کی کلہاڑی پڑی تھی۔ ایک لمحے میں لڑکی نے کلہاڑی پکڑی اور واپس بندوق بردار پر جھپٹی۔ اس مرتبہ اس نے بے دریغ بندوق بردار کے سر کو نشانہ بنایا۔ کلہاڑی اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگی۔ ہڈی اور لوہے کے تصادم کی آواز صاف سنائی دی۔ یکایک بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھاما اور میرے پہلو میں گرا۔ لڑکی دیوانہ وار اسے کلہاڑی سے ضربیں لگانے لگی۔ تاہم اب وہ کلہاڑی کو الٹی طرف سے استعمال کر رہی تھی۔ کند لوہے کی چوٹوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ہارون نامی اس حملہ آور کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ وہ ایک دم نیم مردہ دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کا ہاتھ روکا۔ وہ اب بھی بپھری ہوئی تھی۔ میں اسے پیچھے لے گیا... اسے کھوہ کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ وہ شعلہ فشاں نظروں سے بے سدھ پڑے بندوق بردار کو دیکھتی رہی۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن وہ گہری بے ہوشی میں دکھائی دیتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے کلہاڑی ایک طرف پھینکی اور کھوہ کی دیوار کے ساتھ پھسلتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپایا اور... ہچکیوں سے رونے لگی... ''جو تمہیں نقصان (نقصان) پہنچائے گا، میں اسے نقصان پہنچاؤں گی... میں... اس کی جان لے لوں گی... میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی... کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تمہیں کچھ ہوئیں گا تو اس وخت ہوئیں گا... جب میری لاش گر چکی ہوئیں گی...'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھی اور ہچکیوں سے روتی جا رہی تھی۔

میں دم بخود کھڑا تھا، میں نے اس کا عجیب روپ دیکھا تھا۔ پھر میں جیسے چونک کر بندوق بردار ہارون کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کے ایک دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ کاری زخم کلہاڑی کے پھل سے آیا تھا۔ یہ سر کے پچھلے حصے پر تھا۔ وہاں سے کٹی ہوئی چربی کے اندر سے [illegible] خون رس رہا تھا۔ اس شخص نے دیسی ساخت کی جوتی پہن رکھی تھی۔ اس کا لباس بھی مجھے نامانوس سا لگا۔ لڑکی سلطانہ کی طرح ہارون نے بھی نامانوس حیدرآبادی لہجے میں بات کی تھی۔ ایک دو لفظ ہندی کے بھی بولے تھے۔ پھر کسی پنڈت جی کا ذکر بھی کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں ہندو آباد ہیں۔ کئی جگہ ان کی پوری پوری بستیاں ہیں مگر میں سندھ میں تو نہیں تھا، پنجاب میں تھا... بلکہ مجھے لاہور کے گردونواح میں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ شروع میں، میں نے جب اپنے اردگرد گھنے درخت دیکھے تو سوچا تھا کہ شاید میں چھانگا مانگا یا شیخوپورہ کے علاقے میں کہیں ہوں۔ مگر اب یہ خیال باطل محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ویسا علاقہ ہرگز نہیں تھا۔ تو پھر کیا میں اندرونِ سندھ میں کہیں تھا؟

ہارون نامی شخص بالکل بے سدھ تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے سانس لے رہا ہے۔ اس کی کمر سے گولیوں والی پیٹی بندھی تھی اور چھوٹی نال والی چینی ساخت کی رائفل پاس ہی پڑی تھی۔

سلطانہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے اپنے بکھرے

ہوئے بالوں کو ایک بار پھر سمیٹا۔ ہارون کے ساتھ دھینگا مشتی میں اس کی سوتی قمیص سامنے سے پھٹ گئی تھی اور دودھیا جسم جھانک رہا تھا۔ اس نے اس پھٹے ہوئے حصے کو گرہ لگائی۔ ہارون پر ایک نفرت آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

''مہرو! ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہوئیں گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس خبیث کے ساتھی بھی آس پاس موجود ہوں۔''

''یہ ہوش میں بھی آ سکتا ہے۔'' میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

سلطانہ نے جلدی جلدی ہارون کی کمر سے گولیوں والی بیلٹ کھولی۔ پھر اس کی چھوٹی نال والی رائفل اٹھائی اور اسے جھولے میں ڈال لیا لیکن یہ پہلے والا جھولا نہیں تھا۔ یہ دوسرا تھا۔ اس پر پہلے میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔ یہ کھوہ کی پچھلی دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔

''اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹ ابھری۔ ''نہیں... میرا خیال ہے کہ صرف ہاتھ باندھ دیتے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''تمہیں پتا ہے نا وہاں چھوٹے گاؤں میں سرتا کے پتی راجندر کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ راجو نے اس کے پاؤں بھی بندھوا دیے تھے، وہ تمہارے دوست مختار کی کوٹھڑی میں بھوکا پیاسا مر گیا تھا۔''

پتا نہیں وہ کن لوگوں کی باتیں کر رہی تھی اور مجھے کیوں ان میں شامل کرتی جا رہی تھی۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے وہ بالکل مخبوط الحواس دکھائی دیتی تھی۔ شاید اسے کوئی شدید صدمہ پہنچا تھا جس کے سبب اس نے ہوش و حواس کھو دیے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ اس صدمے کا تعلق اس کے مہروز نامی شوہر سے ہی ہو۔ اپنے دیوانے پن میں شوہر کو تلاش کرتی ہوئی وہ دور نکل آئی ہو اور ہارون وغیرہ اسے ڈھونڈ رہے ہوں۔ وہ اپنے خیالات میں اس قدر پختہ دکھائی دیتی تھی کہ اس موقع پر اس کی باتوں کی تردید کرنا یا اس سے بحث میں الجھنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔

اس نے میرے ساتھ مل کر ہارون کے ہاتھ پشت پر موڑے اور انہیں اچھی طرح ایک ازاربند سے باندھا۔ یہ ازاربند اس کے جھولے سے ہی نکلا تھا۔ اس کے بعد اس نے ہارون کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے کرتے کی بغلی جیب سے ایک رومال، ایک چھوٹا چینی چاقو اور تھوڑی سی کرنسی نکلی۔ کرنسی دیکھ کر میں پھر چونکا۔ مجھے لگا کہ ان نوٹوں میں کچھ اجنبی نوٹ بھی شامل تھے۔ غالباً وہ انڈین تھے۔ انڈین کرنسی اس شخص کی جیب میں؟ یہ خاصا اہم سوال تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے لگنے لگا کہ میں انڈین بارڈر کے آس پاس کہیں ہوں۔ سرحدی علاقوں میں اس قسم کے جنگلی رقبے بھی عام پائے جاتے ہیں۔ وہاں اسمگلنگ وغیرہ کا دھندا بھی ہوتا ہے۔ ہارون نامی اس شخص کی جیب سے غیر ملکی کرنسی کا نکلنا کئی امکانات کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ان میں اسمگلنگ کا امکان بھی شامل تھا۔ ان لمحوں میں ایک دم عمران کی شبیہ میری نگاہوں میں ابھری اور سینے میں درد کی ایک شدید ٹیس، بے کراں کرب بن کر پھیل گئی... وہ اس وقت یہاں میرے ساتھ ہوتا تو اس کی متجسس فطرت ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی۔ وہ خدائی فوجدار بن جاتا اور فوراً اس امر کی سراغ رسانی شروع کر دیتا کہ اس موچھیل دیہاتی کی جیب میں انڈین کرنسی کیسے آئی ہے۔ عمران کے خیال کے ساتھ ہی میرے سینے میں موجزن دکھ کا سمندر کچھ اور بھی بپھر گیا۔ آنسو، آنکھوں کے بند توڑ کر بہہ نکلنے کو بے تاب ہو گئے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم یہ تاریک کھوہ چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ بارش تھمی ہوئی تھی، بس کسی وقت باریک پھوار پڑنے لگتی تھی۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ اجالے کی آمیزش ہو رہی تھی۔ سلطانہ نے چھوٹا جھولا میری طرف بڑھایا اور بڑا خود اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔ وہ جلد از جلد یہ جگہ چھوڑنے کی خواہاں تھی۔

ہم کھوہ سے نکلے اور نم زمین پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے درختوں میں آگے بڑھنے لگے۔ ہوا چلتی تو شاخوں سے بہت سا پانی جھڑ کر ہمارے اوپر گرتا اور لگتا کہ بارش پھر شروع ہو گئی ہے۔ بھیگے ہوئے گھونسلوں میں پرندوں نے ہولے ہولے بولنا شروع کر دیا تھا۔ میں سلطانہ سے ایک قدم پیچھے چل رہا تھا۔ وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکس نظر آتی تھی۔ اس نے اپنے کپڑے کے جھولے میں کلہاڑی اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے فوراً باہر نکال سکتی تھی۔ میرے والے جھولے میں بھی کلہاڑی اسی انداز سے رکھی گئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد اجالا پھیل گیا۔ بادلوں کے اندر سے کہیں کہیں نیلا آسمان نظر آ رہا تھا۔ رات بھر کی بارش سے سب کچھ اجلا اور نکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ دیوانی لڑکی نہ جانے مجھے کہاں لے جا رہی تھی؟ ''وہ دیکھو مہرو! وہاں سے جلے ہوئے درخت شروع ہو جاتے ہیں۔'' اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

مجھے جلے ہوئے خشک درختوں کے آثار نظر آئے۔ سلطانہ نے ایک چھوٹے سے کچے ٹیلے پر کھڑے

www.pkdigest.com

ہو کر اطراف کا اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر ایک سمت کا تعین کر کے بااعتماد طریقے سے آگے بڑھنے لگی۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے کچھ کہنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوگا۔ اگر میں اس سے کچھ کہوں گا تو وہ الٹا مجھے مخبوط الحواس سمجھنے لگے گی اور عین ممکن ہے، یہ گمان کرنے لگے کہ سر پر چوٹ آنے کی وجہ سے میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے پاس جانا چاہ رہی ہے، ان تک پہنچ جائے۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ دوستانہ رویہ ظاہر کرتے اور میری مدد کو آمادہ ہو جاتے۔ ان کے ذریعے میں کسی معروف راستے یا پختہ سڑک تک پہنچ سکتا تھا۔ ایک بار میں اس ویرانے سے نکل جاتا پھر سوچا جا سکتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ پولیس تک پہنچنا ہے؟ کسی عزیز رشتے دار کی مدد حاصل کرنی ہے یا خاموشی سے فرح اور عاطف کا کھوج لگانا ہے؟

دوسری سوچ یہ بھی تھی کہ میں راستے میں ہی کسی مناسب جگہ پر اس لڑکی سے علیحدہ ہو جاؤں۔ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ اس کے ساتھ ”تل پانی“ نامی بستی میں جا کر میں کسی اور چکر میں پھنس جاتا۔ انہی سوچوں میں غلطاں میں مسلسل چلتا جا رہا تھا۔ اب ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ کچھ کھا لینا چاہیے۔ تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔“ لڑکی نے ایک سایہ دار درخت کے نیچے خشک جگہ دیکھ کر کہا۔

وہ بھوک کی بات کر رہی تھی اور میرے اندر صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے دو میتیں تھیں۔ ایک عمران کی دوسری والدہ کی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں شاید ہفتوں تک کوئی نوالہ گلے سے نیچے نہ اتار سکوں۔ سلطانہ نامی وہ لڑکی درخت کے ایک گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا جھولا کھولا۔ پلاسٹک کے ایک سبز برتن کے اندر گوشت کے تلے ہوئے ٹکڑے تھے۔ خشک چنے اور میٹھی چھلیاں وغیرہ بھی تھیں۔ دو بوتلوں میں صاف پانی تھا۔ جھولے کے سامان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جہاں سے بھی نکلی ہے، پوری تیاری سے نکلی ہے۔ اس کے بے حد اصرار پر میں نے تھوڑے سے چنے کھائے اور پانی پیا۔ پانی کا ذائقہ بھی کچھ عجیب لگا۔ سلطانہ بڑی جلدی میں نظر آتی تھی۔ وہ جلدی جلدی لقمے لے رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے اس کی نگاہ بے ساختہ اپنے عقب میں اٹھ جاتی تھی۔ اسے جیسے ڈر تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ سکتا ہے۔

دن کی روشنی میں، میں اسے زیادہ وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی رنگت تانبے جیسی تھی۔ رخسار چوڑے تھے اور ان کی ہڈیاں کچھ ابھری ہوئی تھیں۔ بالکل سفید دانت ذرا سے اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے اور اس کی سخت جانی کو ظاہر کرتے تھے۔

وہ جلدی جلدی لقمہ چباتے ہوئے بولی۔ ”پتا نہیں بالو کہاں ہوئیں گا۔ کیا کر رہا ہوئیں گا؟ اس نے کچھ کھایا بھی ہوئیں گا کہ نہیں...“

اس نے دوسری تیسری دفعہ کسی ”بالو“ کا ذکر کیا تھا۔ رات کو بھی جب ہم کھوہ میں تھے، زوردار بارش ہو رہی تھی اور بجلی کڑک رہی تھی تو اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ ”بڑی ٹھنڈ ہوگئی ہے۔ پتا نہیں بالو کہاں ہوئیں گا؟“

وہ جھولا سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میرے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا۔ مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ہم پھر چل دیے۔ وہ مجھے گفتگو میں شریک کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، ہاشم، بالو کو لے کر ڈیرے پر پہنچ گیا ہوئیں گا نا؟“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”ویسے وہ جگے دار تو بہت ہے۔ اسے پتا ہے کہ میرے بغیر بالو کو سنبھالنا مشکل ہو جائیں گا۔ وہ ایسے دم میں کو مصیبت میں ڈال دیں گا۔“

میں نے ایک بار پھر سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے کلہاڑی نکال لی تھی۔ جہاں کہیں جھاڑ جھنکاڑ زیادہ ہوتا، وہ اسے کاٹ کر آگے بڑھ جاتی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی ویرانے میں پلی بڑھ کر جوان ہوئی ہے اور اس جنگل کے نشیب و فراز اس کے لیے ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ہیں۔ اس کے انداز میں بلا کی چستی تھی۔ اسے چلتے پھرتے دیکھ کر میں نے ایک اور بات محسوس کی... نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ واقعی شادی شدہ ہے اور اس کا سڈول جسم ”دودھ پلانے والی ماؤں“ جیسا ہے۔ مجھے اس کی سوتی قمیص پر سامنے کی طرف گیلاہٹ نظر آئی۔ ایسی گیلاہٹ کبھی کبھی ان ماؤں کے کپڑوں پر نظر آتی ہے جن کے جسم میں قدرت نے بچے کی ”خوراک“ کی فراوانی رکھی ہوتی ہے۔ ہم جونہی ایک جھنڈ میں سے نکلے، سلطانہ کے چہرے پر خوشی کی چمک نظر آئی۔ اس نے ایک دم اپنی انگلی سے دور کہیں اشارہ کیا اور چہکی۔ ”وہ دیکھو مہرو! وہ ہے ڈیرا۔“

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ قریباً ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر قدرے نشیب میں، کسی گھر کی چھت نظر آ رہی تھی۔ اس کچے گھر کو چاروں طرف سے سبز درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک کھلا احاطہ بھی نظر آتا تھا۔ اس کے گرد مٹی کی ہی چار دیواری تھی۔

”میرا خیال ہے کہ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اکیلی اچ جاتی ہوں۔“ سلطانہ نے کہا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

”ٹھ... ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

اس نے اپنا جھولا اتار کر ایک درخت کی موٹی شاخ سے لٹکا دیا... اور تیزی سے درختوں میں اوجھل ہوگئی۔

میں اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے ذہن میں آیا کہ اکیلا ہی آگے بڑھ جاؤں۔ جس طرح اس ویران جنگل میں یہ چھوٹا سا ڈیرا نظر آیا تھا، عین ممکن تھا کہ آگے بھی کوئی گھر یا شخص نظر آ جاتا اور میں اس کی مدد حاصل کر سکتا۔ لیکن اس میں رسک بھی تھا۔ میں راستہ کھو کر بھٹک سکتا تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے سلطانہ کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی ہاشم نام کے بندے کی بات بھی کر رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اسے لینے ہی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ تو سلطانہ کی طرح ذہنی بیمار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے کچھ ٹھکانے کی باتیں بتا سکتا تھا اور یہ بھی بتا سکتا تھا کہ یہ لڑکی اصل میں کون ہے اور اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔

میں وہیں درخت کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنا جھولا کھول کر دیکھا۔ اس میں دو تین مردانہ جوڑے تھے۔ پانی سے بھری ہوئی ایک چھوٹی بوتل تھی۔ دو چار سیب، اچار کا ڈبا اور خشک چنے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک طرف کلہاڑی رکھی تھی۔ جو سب سے عجیب شے دکھائی دی، وہ ایک سرخ عروسی جوڑا تھا۔ گوٹے کناری والے اس جوڑے کو بڑی احتیاط سے تہ کر کے ایک دوسرے کپڑے میں رکھا گیا تھا... اس کے بعد میں اٹھا۔ اردگرد دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے سلطانہ کے شاخ سے لٹکے ہوئے جھولے میں تاکا جھانکی کی۔ زخمی ہارون کی تلاشی میں ملنے والے کرنسی نوٹ واقعی انڈین تھے۔ یہ کل ملا کر کوئی دو ڈھائی سو روپے بنتے تھے۔ ان میں پاکستانی نوٹ کوئی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ سلطانہ کے جھولے میں کچھ ایسا سامان بھی نظر آیا جو چھوٹے بچوں کے استعمال کے لیے ہوتا ہے۔ دو چار بالکل چھوٹے فراک... جانگیے اور بنیان وغیرہ۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کے ایک دو کھلونے بھی تھے۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ بار بار جس ”بالو“ کا ذکر کر رہی تھی، وہ اس کا شیر خوار بچہ ہی ہے۔

بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح یہ سوال بھی ذہن میں سر اٹھا رہا تھا کہ وہ بچہ سلطانہ کے ساتھ سفر کیوں نہیں کر رہا اور یہاں ڈیرے پر کیوں موجود ہے؟

میں وہیں بیٹھا خیالوں کے تانے بانے بنتا رہا۔ سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا، ہلکی تمازت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اپنے اردگرد سے چوکس تھا۔ کسی نامعلوم شخص یا اشخاص کے علاوہ مجھے کسی جنگلی جانور کی آمد سے بھی خطرہ تھا۔ یہ کوئی ”رکھ“ نہیں تھی، خالص جنگلی علاقہ تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے دور نشیب میں کچھ حرکت دکھائی دی۔ میں نے سلطانہ کا سرخی مائل لباس پہچان لیا۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ غالباً اس کے ساتھ کوئی اور شخص بھی تھا۔ دھیرے دھیرے وہ دونوں قریب آ گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ سلطانہ کے بازوؤں میں ایک بچہ بھی ہے۔

گھنی جھاڑیوں سے نکل کر سلطانہ جب میرے سامنے آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ رخسار بالکل سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے چٹاچٹ بچے کے کئی بوسے لیے اور اس کا چہرہ میری طرف کرتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو، تین چار روز میں ہی کیا حال ہو گیا ہے۔ ایک دم آدھا رہ گیا ہے۔ میں جب وہاں پہنچی، اس وقت بھی رو رو کر آسمان سر پہ اٹھائے ہوئے تھا۔“

بچے کی عمر مشکل سے پانچ چھ ماہ ہوگی۔ وہ خوش شکل تھا۔ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں چپچپی ہو رہی تھیں۔

میں نے ساتھ آنے والے شخص کو دیکھا۔ وہ بھی دیہاتی لباس میں تھا۔ اس کے سر پر بڑا سا پگڑ تھا۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چالیس سال ہوگی۔ اس نے ہاتھ کو ماتھے پر لے جا کر مجھے سلام کیا اور خاموش کھڑا رہا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر گول مٹول بچے کا منہ چوما، اسے سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر اسے میری بانہوں میں دیتے ہوئے بولی۔ ”چلو، اب جاؤ اپنے ابا کے پاس۔“

میں بھنا کر رہ گیا۔ ویسے مجھے اس سے کسی ایسی ہی حماقت کی توقع تھی۔

میں نے سلطانہ کے ساتھ آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل لاتعلق کھڑا تھا جیسے اس نے کچھ دیکھا سنا ہی نہ ہو۔ وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

سلطانہ نے بڑا جھولا خود اٹھا لیا اور چھوٹے جھولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”ہاشو! یہ تم اٹھا لو۔“ زبان سے یہ الفاظ کہنے کے ساتھ ساتھ سلطانہ نے ہاتھوں سے بھی اشارے کیے تھے اور تب مجھے پتا چلا کہ سلطانہ کے ہمراہ آنے والا یہ ہاشم نامی شخص گونگا بہرا ہے۔ اس نے فرماں برداری سے جھولا اٹھایا اور ہمارے ساتھ چل دیا۔

بچہ میری گود میں تھا اور ماں کی طرف دیکھ کر ہمک رہا

www.pkdigest.com

تھا۔ میں سٹپٹا گیا... زوراز وری کی بیوی کے ساتھ اب یہ زبردستی کا بچہ بھی گلے پڑ رہا تھا۔ میں نے سلطانہ کی نگاہ بچا کر سوالیہ نظروں سے ہاشم عرف ہاشو کو دیکھا اور اشارے سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیا شے ہے؟

وہ جیسے کچھ بھی نہیں سمجھ سکا اور بے ڈھنگے طریقے سے مسکرا کر رہ گیا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ہاشو کے آنے کے بعد اب ہاشو کی حیثیت راہبر کی ہو گئی تھی۔ میں اور سلطانہ اس کے عقب میں چل رہے تھے۔ میں اب جلد از جلد ''تل پانی'' نامی آبادی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ فرح، جاطف، والدہ، عمران اور ثروت کے چہرے مسلسل میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ سب میرے دل سے قریب ترین تھے۔ میرے اپنے تھے لیکن فی الوقت کوئی بھی میرے پاس نہیں تھا۔ کچھ مستقل طور پر بچھڑ گئے تھے، کچھ عارضی طور پر۔ جو عارضی طور پر بچھڑے ہوئے تھے، میں جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

بچہ میرے گلے سے لگا ہوا تھا۔ اس کی مستانی ماں میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ جھولے میں پڑی کلہاڑی کا رنگین دستہ اس کے ہاتھ سے بہت قریب تھا۔ اس کی تیز نگاہیں اردگرد کا جائزہ لیتی جا رہی تھیں۔ یقیناً کھوہ میں اس ہارون نامی شخص کی اچانک آمد اور وہاں ہونے والی سنگین مار کٹائی کے مناظر سلطانہ کے ذہن میں تازہ تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں پھر کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہو جائے۔

چلتے چلتے بچہ کسمسایا اور اس کا ہاتھ میری گردن کے پچھلے حصے پر لگا۔ مجھے لگا جیسے یہ جگہ سن ہے۔ مجھے یاد آیا کہ لاہور میں چنی والے چوک کے قریب گاڑی الٹنے کے بعد میں زخمی ہوا تھا اور میرے سر کے علاوہ گردن پر بھی زخم آئے تھے لیکن اب بچے کا ہاتھ لگنے کے باوجود مجھے گردن کے پچھلے حصے پر تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے گردن کو ٹٹول کر دیکھا۔ محسوس ہوا کہ زخم مندمل ہو چکا ہے یا پھر... اس پر کوئی... ایسی چیز لیپ کر دی گئی ہے جس نے درد کا احساس ختم کر دیا ہے۔ آٹھ دس روز میں زخم کا اس طرح ٹھیک ہونا تو ممکن نہیں تھا۔ غالباً اس پر کوئی ایسی چیز لگا دی گئی تھی جس نے جلد کی سی شکل اختیار کر کے درد کا احساس ختم کر دیا تھا۔

ایک دم سلطانہ خوشی سے چلا اٹھی۔ اس نے انگلی سے دور درختوں کی طرف اشارہ کیا۔ گھنے جنگل کے درمیان میں سے نیلے پانی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ ایک خوب صورت قدرتی جھیل کی طرح تھی۔ اس جھیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی بستی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ''ہم پہنچ گئے۔ آخر ہم پہنچ آج گئے۔'' وہ مسرور ہو کر بولی۔

ہم تیزی سے آگے بڑھتے رہے۔ آخر بستی اور جھیل کے خدوخال واضح ہونے لگے... نہایت گھنے جنگل کے درمیان یہ ایک قابل دید نظارہ تھا۔ جھیل کا ایک کنارہ پوری طرح آباد تھا اور یہ کوئی چھوٹی بستی نہیں تھی۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ اس قصبے میں کم از کم تین مندروں کے کلس اور دو مسجدوں کے مینار دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی حویلی ٹائپ عمارت تھی۔ اس سے ذرا کم بلند اور بھی کئی حویلیاں تھیں اور اس بستی کے درمیان بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ کل رات کی بارش نے ہر شے کو بڑی اچھی طرح نکھار دیا تھا۔ جھیل کے کنارے سبز ڈھلوانوں پر کہیں کہیں گائے بھینسیں اور بکریاں وغیرہ چرتی نظر آ رہی تھیں۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر بڑی بڑی پگڑیوں والے گھڑ سواروں کا ایک دستہ تیزی سے جاتا دکھائی دیا۔

میں اس بستی کے خدوخال دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ ہم کسی دیہاتی بستی یا چھوٹے سے دیہہ میں پہنچیں گے۔ یہاں کا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔

سلطانہ خوش تھی۔ وہ مجھے مخاطب کر کے بولی۔ ''کتنی پیاری جگہ ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ پہلے اسے 'نیلا پانی' کہتے تھے لیکن پھر یہ نام بدلتے بدلتے 'تل پانی' بن گیا۔ یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ شاید حکم جی کے پڑدادا کے وقت کی یا پھر اس سے بھی پہلے کی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ میں بس صورتِ حال کو جوں کا توں رکھ کر اس بستی میں پہنچنا چاہتا تھا اور... سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں آخر ہوں کس جگہ پر؟ کیا یہ واقعی اندرونِ سندھ کا کوئی علاقہ تھا؟ سانگھڑ، دادو وغیرہ... لیکن یہ شان دار جھیل؟

خوشی کے عالم میں سلطانہ نے بچہ میرے ہاتھوں سے لیا اور زیادہ تیزی سے قدم اٹھانے لگی۔ جلد ہی ہم درختوں سے نکل کر جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں مجھے کئی دیہاتی عورتیں اور مرد نظر آئے۔ عورتوں نے گھاگرے چولے پہن رکھے تھے۔ مردوں کا لباس دھوتی کرتے اور بڑے پگڑ پر مشتمل تھا۔ کچھ جوان عورتیں سروں پر مٹکے رکھے ایک قطار میں جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے دو بیل گاڑیوں کے بیل جھومتے اور گھنٹیاں بجاتے چلے جا رہے تھے۔ کسی نے ہماری طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں دی۔

اگر ہم خشکی کے راستے بستی تک پہنچنا چاہتے تو کافی چکر پڑتا۔ اس کام کے لیے جھیل میں چھوٹی چھوٹی تین چار

کشتیاں چل رہی تھیں۔ انہیں طویل بانسوں کے ذریعے دھکیلا جا رہا تھا۔ ہم بھی بچے سمیت ایک کشتی پر سوار ہو گئے۔ پندرہ سواریاں پوری ہو گئیں تو کشتی بان نے کشتی کھینی شروع کی۔ ساتھ ساتھ وہ سواریوں سے کرایہ بھی وصول کرتا جا رہا تھا۔ وہ نوجوان لڑکا تھا۔

''کتنے پیسے بھائی؟'' سلطانہ نے کشتی بان سے پوچھا۔

''کتنی سواریاں ہیں دیدی؟''

''تین...''

''تین روپے دے دو جی۔''

سلطانہ نے دوپٹے کی گرہ سے پیسے کھولے اور ایک نوٹ کشتی بان کو دیا۔ یہ پانچ کا نوٹ تھا... اور انڈین تھا۔ کشتی بان نے جو دو روپے بقایا دیے، وہ بھی انڈین تھے۔ کشتی میں تین چار عورتیں ایسی موجود تھیں جن کی مانگوں میں سیندور بھرا تھا۔ ایک دو لڑکیوں کے ماتھے پر بندیا نظر آ رہی تھی۔ مجھے یہ سارا ماحول ہی کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ اس ساری صورتِ حال میں کوئی خلا محسوس ہو رہا تھا... کوئی بہت بڑا خلا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کئی گنا بڑھی کہ باقی سواریوں نے بھی جو کرایہ دیا، وہ بھارتی کرنسی میں تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ یوں لگا کہ جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں... کیا ہو گیا تھا۔ اپنے ملک میں نہیں تھا میں، پاکستان میں نہیں تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ ''کیا ہوا مہرو! خیریت تو ہے؟'' سلطانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ہم... کہاں... ہیں؟'' میں نے ٹوٹی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''تل پانی میں مہرو! اور کہاں؟''

''یہ تل پانی کہاں ہے؟'' میری آواز لرز رہی تھی۔

''تل پانی کہاں ہوئیں گا۔ وہیں ہوئیں گا جہاں پر ہمیشہ سے ہے۔'' سلطانہ نے ایک بار پھر مجھے پُرتشویش نظروں سے دیکھا۔

میرا جی چاہا کہ اسے تھپڑ دے ماروں مگر میں یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنا سر پکڑے خاموش بیٹھا رہا۔

اسی دوران میں کشتی کے اندر بیٹھی سواریوں میں سے ایک بڑھیا کے ہاتھ سے اس کا مرغا چھوٹ گیا اور کشتی میں ادھر ادھر پھدکنے لگا۔ لوگ اسے پکڑنے کی کوشش میں دائیں بائیں ہوئے تو کشتی بری طرح ڈولنے لگی۔ چند سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ الٹ ہی جائے گی۔ پھر کشتی بان اور اس کے معاون کی ڈانٹ ڈپٹ سے لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور یہ خطرہ ٹلا۔

ہم دوسرے کنارے پر پہنچے۔ میرے دماغ میں مسلسل تندو تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ میرا دل گھبرا رہا تھا کہ میں جس مقام پر ہوں، یہ پاکستان میں نہیں ہے۔ ہرگز نہیں ہے۔ تو کیا میں انڈیا کے کسی سرحدی علاقے میں تھا؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر مجھے بارڈر کیسے کراس کرایا گیا تھا... اور بارڈر کراس کرانے والوں نے مجھے اس نامعلوم علاقے میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ مجھے یہ بھی لگ رہا تھا کہ میں اپنے اندازوں سے زیادہ دیر تک بے ہوش رہا ہوں۔ جلد ہی ہم ایک گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ سلطانہ نے اب اپنا چہرہ چھوٹے سے گھونگھٹ میں چھپا لیا تھا۔ وہ کچھ ہراساں بھی نظر آتی تھی۔ اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ چند سیکنڈ بعد ایک درمیانی عمر کے مقامی شخص نے دروازہ کھولا... وہ بھی دیہاتی لباس میں تھا۔ تاہم اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور ماتھے پر محراب کا نشان ظاہر کرتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس نے دروازہ کھولنے کے بعد سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ سلطانہ جلدی سے بولی۔ ''آپ چاچا غنی ہیں نا؟''

ادھیڑ عمر شخص نے اثبات میں سر ہلایا۔

سلطانہ نے کہا۔ ''میں سلطانہ ہوں جی۔ زرگاں سے...''

ادھیڑ عمر غنی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر ہم تینوں کا جائزہ لیا اور ہمیں اندر آنے کے لیے کہا۔

یہ ایک درمیانے سائز کا دیہاتی گھر تھا۔ چھت لکڑی کی تھی۔ دیواریں اور فرش کچا تھا۔ تاہم بڑی اچھی طرح لیپا پوتی کی گئی تھی اور نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ غنی نامی اس شخص نے سلطانہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں اکیلا ہی ہوں، بچے کل سے اپنے ماموں کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ ویسے میرا خیال تھا کہ تم لوگ ایک دو روز بعد آؤ گے۔ رمجان نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔''

''بس جلدی آنا پڑ گیا جی۔ حالات اچ کچھ ایسے ہو گئے تھے۔'' سلطانہ منمنائی۔ وہ اب بھی گھبرائی ہوئی لگتی تھی۔

''یہ ہے تمہارا شوہر؟'' ادھیڑ عمر غنی نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' وہ ذرا سا شرمائی۔

''یہ چوٹ کیسے لگی بیٹا؟'' غنی نے مجھ سے پوچھا۔

میرے بولنے سے پہلے ہی سلطانہ بولی۔ ''کل شام

www.pkdigest.com

کے وقت پیڑ سے گرے ہیں۔ کافی جیادہ چوٹ آئی ہے۔ میں نے پٹی تو کر دی ہے، پر ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی جرورت پڑ جائے۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "غنی صاحب! آپ میری ایک بات سنیے۔"

ادھیڑ عمر غنی ایک لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آیا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "خیریت تو ہے؟"

"ہاں جی، بس ذرا اکیلے میں آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

سلطانہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی مگر اس سے پہلے ہی ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ گونگا بہرا ہاشم دروازے کے پاس لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ ایک قریبی کمرے میں جا کر میں نے غنی صاحب سے کہا۔ "میں سخت پریشان ہوں جی۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ لڑکی کون ہے؟"

غنی صاحب حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگے۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟ یہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟"

"نہیں جی، یہ میری بیوی نہیں ہے اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ کل شام پہلی بار مجھ سے ملی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی دماغی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ کل سے مسلسل اول فول بک رہی ہے۔"

"اور یہ بچہ جو ساتھ ہے؟"

"وہ بھی میرا نہیں۔ ان دونوں کے پیچھے کچھ لوگ لگے ہوئے ہیں۔ کل رات تیز بارش میں ہم نے ایک جگہ پناہ لی تھی۔ وہاں بھی ایک بندوق والا آ پہنچا تھا۔ وہ اسے اور مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ پھر وہاں ہمارے درمیان لڑائی ہوئی اور وہ ہارون نام کا بندہ زخمی ہو کر گر گیا۔ اب وہ بندہ بھی وہیں جنگل میں بندھا پڑا ہے..."

ادھیڑ عمر عبدالغنی کے چہرے پر الجھن آمیز تشویش نظر آنے لگی۔ انہوں نے مجھے سرتاپا گھور کر کہا۔ "تو... تم کون ہو...؟"

"میں دراصل..." میں کہتے کہتے رک گیا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں کہاں بے ہوش ہوا تھا اور کہاں ہوش میں آیا ہوں... اور ممکن تھا کہ وہ میری بات پر یقین ہی نہ کرتے۔

میں گہری سانس لیتے ہوئے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا۔ "غنی صاحب! میں بڑے مشکل حالات سے دوچار ہوں۔ میں ان حالات کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ میں کہاں ہوں؟ میرا مطلب ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے؟"

غنی صاحب کی آنکھوں میں حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "بھئی، یہ تل پانی ہے۔ زرگاں کے بعد علاقے (علاقے) کی سب سے بڑی آبادی تو یہی ہے۔ اسے کون نہیں جانتا؟"

"اچھا... یہاں کا سب سے قریبی شہر کون سا ہے؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"بیٹا! تم کیسی باتاں کر رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی کچھ چکرائے ہوئے ہو۔"

"غنی صاحب! آپ بس میرے ایک دو سوالوں کے جواب دے دیں۔ پھر آپ جو پوچھیں گے، میں بتا دوں گا۔" میرے لہجے میں عاجزی تھی۔

"بھئی، یہاں کا سب سے قریبی شہر تو جھانسی ہے۔ وہاں تک جانے میں بھی چار دن لگ جاتے ہیں۔"

"جھانسی... جھانسی۔" میں نے اپنے ذہن میں دو تین بار دہرایا۔ یقیناً یہ کوئی انڈین نام تھا... میرے ذہن میں تاریخ کے حوالے سے "جھانسی کی رانی" کے الفاظ چمکنے لگے۔ مگر ضروری بھی نہیں تھا کہ یہ وہی جھانسی ہو۔ کہاں لاہور میں دفتش کا علاقہ اور کہاں یہ جھانسی... میں نے مزید وضاحت کے لیے پوچھا۔ "جھانسی کے بعد کون سی جگہ آتی ہے؟"

غنی صاحب کے چہرے پر الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے بیزار انداز میں کہا۔ "جھانسی کے بعد الہ آباد ہے پھر لکھنؤ ہے۔"

میرے ذہن میں جیسے کئی دھماکے ہوئے۔ میرا بدترین اندیشہ درست تھا۔ میں پاکستان میں نہیں انڈیا میں تھا... اور انڈیا کا بھی یہ کوئی سرحدی علاقہ نہیں تھا۔ یہ "ڈیپ" انڈیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سر تھام لیا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ میرا رنگ ہلدی ہو رہا ہے۔ "غنی صاحب! مجھے یہ بتائیں، یہ لڑکی کون ہے؟ آپ سے اس کا تعلق کیسے ہوا ہے؟"

میرے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے غنی صاحب شروع میں تو ہچکچائے پھر انہوں نے جواب دیا لیکن صرف اتنا بتایا کہ سلطانہ اس علاقے کی دوسری بڑی بستی زرگاں کی رہنے والی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ کچھ مسئلہ تھا جس کی وجہ سے یہ فوری طور پر زرگاں سے یہاں تل پانی میں آنا چاہتی تھی۔ زرگاں میں غنی صاحب کا کوئی دوست رمضان علی تھا۔ اس نے ایک پیغامبر کے ہاتھ غنی صاحب کو یہ پیغام پہنچایا تھا کہ وہ چند روز تک ایک لڑکی کو ان کے پاس بھیج رہا ہے۔ لڑکی کے ساتھ اس کا شوہر اور بچہ بھی ہیں۔ یہ لوگ صرف دو تین

دن ان کے پاس رہیں گے، پھر خود اپنے رہنے کا کوئی انتظام کر لیں گے۔ اس کے سوا عبدالغنی صاحب کو کچھ معلوم نہیں تھا... یا شاید وہ ابھی بتانا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے کہا۔ "غنی صاحب! آپ جن رمضان صاحب کا ذکر کر رہے ہیں، اگر وہ واقعی آپ کے دوست ہیں تو پھر انہیں بتانا چاہیے تھا کہ وہ جس لڑکی کو آپ کے پاس بھیج رہے ہیں، وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں خود اس بات پر حیران ہوں۔ اگر لڑکی کا کوئی ایسا مسئلہ ہوتا تو رمضان نے مجھے جرور بتانا تھا۔ پر اس نے تو کوئی بات نہیں کی۔"

"یہ جو اس کے ساتھ گونگا بندہ آیا ہے، یہ کون ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ یہ لڑکی سلطانہ کا کوئی رشتے دار ہے۔ رمضان نے مجھے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ لڑکی پہلے اچ زرگاں سے نکل پڑے، اس کا بچہ بعد میں کسی دوسرے کے ساتھ نکلے۔ اس طرح لڑکی کو زرگاں سے نکلنے میں آسانی ہوئیں گا۔ بعد میں کہیں راستے میں لڑکی اور بچہ آپس میں مل جائیں گے۔ میرے خیال میں ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ گونگا بچے کے ساتھ نکلا ہوئیں گا..."

"میں آپ کو پھر بتا رہا ہوں، یہ لڑکی اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ جو بندہ پیغام لے کر آیا تھا وہ کہاں ہے؟"

"وہ تو شاید واپس چلا گیا تھا۔ ویسے زرگاں کے ایک دو بندے ہور یہاں ہیں لیکن سب سے پہلے میں اس گونگے سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔"

غنی صاحب اٹھے اور اپنے چہرے پر الجھن لیے کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی انہیں بھی سلطانہ کی مخبوط الحواسی کا علم ہو جائے گا۔ میرے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پٹی بدلے جانے کی ضرورت تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا... اور یہ یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ میں اپنے ملک میں نہیں، غیر ملک میں ہوں۔ فرح، عاطف اور اپنی ماں کی قبر سے سیکڑوں میل دور۔ پتا نہیں کہ میری ماں کو باقاعدہ قبر بھی نصیب ہوئی تھی یا نہیں۔ ان کی موت کو چھپانا سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ اس چار دیواری میں پوری طرح حاوی ہو گئے تھے۔ انہوں نے گارڈ خادم حسین کو مار دیا تھا۔ عمران کا دوست آصف بھی غالباً ان کے ہاتھوں سے جان گنوا بیٹھا تھا۔ سیٹھ سراج وغیرہ کے لیے عین ممکن تھا کہ وہ ماں جی کی موت کو کوئی اور رنگ دے دیتے یا پھر ان کے جسد خاکی کو ویسے ہی کہیں غائب کر دیتے۔

میں جب ان سارے خونی منظر کے بارے میں سوچتا تو مجھے لگتا تھا کہ یہ کوئی سات آٹھ یا دس پندرہ روز پہلے کی باتیں نہیں ہیں بلکہ ان کو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ اچانک مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ غنی صاحب واپس آ گئے۔ ان کے چہرے پر پہلے سے زیادہ الجھن تھی۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ ہولے سے بند کیا اور مدھم آواز میں بولے۔ "بچے نے پوٹی کی ہے۔ لڑکی اس کی ٹانگیں وغیرہ دھو رہی ہے۔ میں نے گونگے سے علیحدہ میں بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ پتا نہیں کیا کیا اشارے کر رہا ہے۔ صحیح طرح سے میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ وہ لڑکی کی طرف کی بات اچ کر رہا ہے۔"

"آپ اسے یہاں لائیں، میرے پاس۔"

"نہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوئیں گا۔ میں چوہان کو لے کر آتا ہوں۔ وہ بھی زرگاں سے آیا ہے۔ رمضان کے محلے میں ہی رہتا تھا۔ پکی بات ہے کہ اس لڑکی کو بھی جانتا ہوئیں گا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، عبدالغنی صاحب تیزی سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے چند سیکنڈ بعد سلطانہ آ دھمکی۔ وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے میرے قریب بیٹھ کر [illegible] انداز میں میرا ہاتھ دبایا اور بولی۔ "مہرو! بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ اب کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گا۔ ہم کل اچ چھوٹے سرکار سے ملیں گے۔ وہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔ وہ ہم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔" اس نے بڑی محبت سے اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔

پھر جیسے اسے ایک دم یاد آیا۔ "ہائے میں مری... میں نے تمہاری چوٹ تو دیکھی اچ نہیں۔ اب کیا حال ہے درد کا؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ جلدی جلدی پٹی کھولنے لگی۔ وہ اپنے جھولے میں سے صاف روئی اور مرہم لے کر آئی۔ ہاشو سے اس نے نیم گرم پانی منگوایا اور بڑی توجہ سے میرے سر کے زخم کو صاف کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کی انگلیوں کے لمس میں انتہا درجے کی محبت آمیز ملائمت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خاص قسم کی جرأت بھی اس کے انداز میں موجود تھی جو سنگین چوٹوں کی مرہم پٹی کے لیے درکار ہوتی ہے۔ ایسی جرأت عام طور پر لڑکیوں میں نہیں پائی جاتی... یوں لگ رہا تھا کہ مہرو نام کا کوئی شخص واقعی موجود تھا اور وہ سلطانہ کا شوہر تھا۔ اب اس شخص کے ساتھ پتا نہیں کیا ہوا تھا کہ وہ یہاں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ موجود نہیں تھا۔ شاید کوئی المناک حادثہ... کوئی سنگین جرم... کوئی خونی واردات۔

www.pkdigest.com

عین ممکن تھا کہ جو کچھ پیش آیا، وہ زرگاں سے تل پانی تک کے راستے میں ہی پیش آیا ہو اور اس واقعے کے بعد سلطانہ نے ہوش و حواس کھو دیے ہوں۔ غالب امکان یہی تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے کیونکہ غنی صاحب کو سات آٹھ دن پہلے اپنے دوست رمضان کا پیغام ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ لڑکی اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ان کے پاس آ رہی ہے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟'' وہ میری پٹی کرتے کرتے ذرا شرمیلے انداز میں بولی۔

''کچھ نہیں۔''

''جب تم کہتے ہو کہ کچھ نہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ ہے۔'' وہ پٹی کو آخری گرہ لگا کر میرے بازو سے لگ گئی اور میری بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''داڑھی بنا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا؟''

''اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو؟ پہلے کبھی نہیں بنائی میں نے... شاید تم بھول گئے۔ شروع شروع میں تو میں تمہیں نہلا بھی دیا کرتی تھی۔'' وہ کہہ کر شرما گئی۔

یکایک گھر کے بیرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ سلطانہ جلدی سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ غنی صاحب واپس آ گئے ہیں۔ ان کے ساتھ بھاری آواز والا کوئی اور شخص بھی تھا۔ یہ وہی چوہان نام کا بندہ تھا جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے ذکر کیا تھا۔ سلطانہ جلدی سے ان دونوں کے پاس باہر چلی گئی۔ میں وہیں نیم تاریک کمرے میں بیٹھا رہا اور ادھ کھلے دروازے سے دوسرے کمرے کا منظر دیکھتا رہا۔ چوہان سفید رنگت اور مسکراتے چہرے والا ایک چوبیس پچیس سالہ نوجوان تھا۔ وہ بھی مقامی لباس میں تھا۔ اس نے سلطانہ کو پہچان لیا۔ سلطانہ نے اسے ''چوہان بھائی'' کہہ کر مخاطب کیا۔ چوہان نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور بچے کے گال گدگدائے۔

ان کو وہیں چھوڑ کر عبدالغنی صاحب میرے پاس کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ان کے چہرے پر اب پہلے سے زیادہ الجھنیں موجود تھیں۔ سفیدی مائل بالوں کی ایک لٹ ان کی شکن شکن پیشانی پر جھول رہی تھی۔ میں غنی صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو پہلی ملاقات میں ہی آپ سے اپنا احترام کرانے لگتے ہیں۔ اپنے چہرے مہرے سے وہ ایک دانا بینا اور ہمدرد انسان دکھائی دیتے تھے۔

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے دیکھنے کے انداز نے مجھے گڑبڑا دیا۔ ''کیا بات ہے غنی صاحب! آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور الجھے لہجے میں بولے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم... ایسا کیوں کر رہے ہو؟''

''کک... کیا مطلب... غنی صاحب؟''

''تمہیں غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''غلط بیانی... میں کون سی غلط بیانی کر رہا ہوں؟'' میں ششدر تھا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولے۔

''آپ کھل کر بات کریں۔''

''سلطانہ تمہاری بیوی ہے اور تم اس سے انکار کر رہے ہو۔ بالو بھی تمہارا اپنا بچہ ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔'' غنی صاحب کا لہجہ حتمی تھا۔

میں نے ایک بار پھر ماتھا پکڑ لیا۔ مجھے لگا جیسے میں دیوانوں کے کسی گروہ میں گھر گیا ہوں اور اپنی شناخت کھو بیٹھا ہوں۔

www.pkdigest.com

غنی صاحب نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''دیکھو برخوردار! اگر تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں ہر طرح تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس طرح...''

''خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' میں نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا اور اپنے آپ میں سمٹتا چلا گیا۔

''یہ دیکھو... یہ کیا ہے۔ کیا تم اس سے بھی انکار کرو گے؟'' غنی صاحب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں ایک تصویر تھی۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے تصویر دیکھی۔ یہ ایک گروپ فوٹو تھا۔ اس میں کئی مرد و زن تھے۔ دو چار بچے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ سب لوگ مقامی دیہاتی لباس میں تھے۔ ایک سات آٹھ سالہ بچہ دولہے کے لباس میں تھا۔ اس نے سہرے میں سے اپنا چہرہ نکالا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ میرے اردگرد کی ہر شے گھومنے لگی ہو۔ غنی صاحب کا چہرہ... ان کی کالی چھتری، رنگین نقش و نگار والی دیواریں، چٹائی کے پھول بوٹے... سب کچھ میری نظروں میں گھومنے لگا تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں غرق تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ اس گروپ فوٹو میں ایک طرف

میں خود بھی موجود تھا۔ میرے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ شاید چند ہفتے کا ہو گا۔ غالباً یہ بالو تھا۔ سلطانہ نے میرا بازو تھام رکھا تھا اور میرے کندھے سے چپکی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں نے تصویر پھینک دی۔ اپنا سر عقب سے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور اپنے چہرے کو اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں میں دھنساتا چلا گیا۔ یہ کیا ہو رہا تھا میرے ساتھ؟ میں کہاں پھنس گیا تھا؟ کیا میں ڈیفنس والی کوٹھی میں بارہ تیرہ زینوں کے اوپر سے پرواز کر کے پختہ فرش پر گرنے کے بعد ابھی تک بے ہوش تھا؟ اور یہ جو کچھ دیکھ رہا تھا، بے ہوشی کے عالم میں دیکھ رہا تھا؟ میں کیسے یقین کر سکتا تھا... میں ایسی باتوں پر کیسے یقین کر سکتا تھا؟ میں نے زندگی میں ٹھوس حقیقتوں کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں کیا تھا۔ یہ میری فطرت میں ہی نہیں تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میری گردن کے پچھلے حصے پر رکھے ہیں اور وہاں مطلق درد نہیں ہو رہا۔ لگتا تھا کہ وہ زخم بالکل مندمل ہو چکا ہے جو حق والے چوک میں گاڑی کے الٹنے سے میری گردن پر آیا تھا اور جس نے رشید اور تابندہ کے گھر میں بھی مجھے سخت تکلیف میں رکھا تھا۔ ایک بار پھر میرے جسم میں سرد جھرجھریاں سی دوڑ گئیں۔ کیا واقعی یہ زخم مندمل ہو چکا تھا؟ میں نے دیوانوں کی طرح اس زخم پر ہاتھ چلایا۔ کوئی تکلیف نہیں تھی، کوئی کھرنڈ نہیں تھا۔ بالکل ملائم جلد تھی۔ پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ اسی ایکسیڈنٹ میں میری داہنی کہنی بھی تو زخمی ہوئی تھی۔ گاڑی کی کوئی نکیلی شے لگنے سے دو تین انچ لمبا زخم بن گیا تھا۔ میں نے تڑپ کر اپنا بازو موڑا اور سر گھما کر کہنی کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے ہیں۔ کہنی پر زخم کا بس بالکل مدھم سا نشان موجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چوٹ عرصہ پہلے ٹھیک ہو چکی ہے۔

''اوہ خدا... اوہ خدایا۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

غنی صاحب نے ایک بار پھر ملائم لہجے میں کہا۔ ''سنو مہروج! اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ... لیکن اس طرح کی باتیں نہ کرو۔ ان سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں...''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرا کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے اپنا سر بدستور ہاتھوں میں دبائے رکھا۔ ''میرا دماغ درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ہو سکے تو مجھے ایک آدھ گھنٹے کے لیے اکیلا چھوڑ دیں۔''

''میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ چلو، میں دروازہ بند کر دیتا ہوں، تم کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔'' غنی صاحب نے کہا۔ ان کا متین چہرہ بدستور الجھنوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

وہ مجھے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے۔ شاید وہ اب میری ذہنی صحت پر شک کرنے لگے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ان کا دھیان میرے سر کی شدید چوٹ کی طرف جا رہا ہو اور وہ خیال کر رہے ہوں کہ اس چوٹ کی وجہ سے میرے حواس وقتی طور پر مختل ہو گئے ہیں۔ دروازہ بند ہوا تو کمرے میں نیم تاریکی چھا گئی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ میری نگاہ بار بار اپنی کہنی کی چوٹ پر پڑ رہی تھی۔ ہاں، یہی چوٹ تھی۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اور یہ چوٹ بالکل مندمل ہو چکی تھی۔ شاید ایک ڈیڑھ سال پہلے... یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

اچانک میری نظر کمرے میں لگے ایک چھوٹے سے گول آئینے پر پڑی۔ یہ آئینہ کھڑکی کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ میں نے روشنی کے لیے کھڑکی ذرا سی کھولی اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ یہ ایک اور ذہنی جھٹکا تھا جو مجھے برداشت کرنا پڑا۔ مجھے اپنی شکل اجنبی لگ رہی تھی۔ بے شک یہ میرا ہی چہرہ تھا تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اس چہرے کو مدتوں بعد دیکھ رہا ہوں... رنگ کچھ سنولایا ہوا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں قدرے ابھری ہوئی، آنکھوں کے نیچے ہلکے سے ابھار... کچھ ضرور ہوا تھا میرے ساتھ۔ کچھ انوکھا اور غیر معمولی۔ میرا دل و دماغ اب پوری طاقت سے گواہی دے رہا تھا کہ ڈیفنس لاہور میں پیش آنے والے خونی واقعات کو دو تین ہفتے نہیں گزرے، نہ ہی دو تین مہینے گزرے ہیں... انہیں ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ان واقعات میں اور یہاں اس جنگل میں پیش آنے والے واقعات کے درمیان ایک خلا ہے۔ ایک ایسا خلا جس کی طوالت اور گہرائی نامعلوم ہے۔ وہ خلا کیسے پیدا ہوا؟ اس خلا نے مجھے کیسے متاثر کیا؟ متاثر ہونے کے بعد میں کیا کرتا رہا، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

ایکا ایکی میرے دل پر ایک زوردار گھونسا لگا۔ اگر... واقعی... یہ خلا موجود تھا تو پھر میرے پیارے کہاں تھے؟ ان پر کیا بیتی تھی؟ فرح، عاطف اور... ثروت۔ ثروت کی شبیہ نگاہوں میں گھومی اور سینے میں دھماکے سے ایک بہت بڑا الاؤ دہک گیا۔ میں تو ثروت کے پاس جانا چاہ رہا تھا۔ اس کو حالات کی زنجیروں سے آزاد کرانا چاہ رہا تھا۔ مجھے... جرمنی جانا تھا۔ میرا پاسپورٹ بن چکا تھا۔ ویزا لگنے والا تھا۔ میں

دن نہیں، گھڑیاں گن رہا تھا، گھنٹے شمار کر رہا تھا۔

او خدایا... یہ کیا ہو گیا؟ کہیں میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا... ایک دم میرے اندر کی بے قراری انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے بے پناہ کرب کے ساتھ سوچا۔ ''کیا واقعی بہت تاخیر ہو چکی ہے؟ کیا واقعی میں اپنی ثروت کو ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں؟'' میں نے ایک بار پھر دیوانوں کی طرح اپنی کنپٹی پر زخم کے پرانے نشان کو ٹٹولا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کمرے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں مرنے والا ہوں۔ میری نگاہوں میں ثروت، فرح اور عاطف کی صورتیں گھومنے لگیں۔ میں نے کمرے کا عقبی دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ میں گلی میں کھڑا تھا... میں بھاگنے لگا۔ بھاگتا چلا گیا۔ لوگ مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جنہوں نے ساڑیوں کے علاوہ چولیاں گھاگرے پہن رکھے تھے اور سانولے رنگ کے مرد بھی... اور ننگ دھڑنگ بچے بھی۔

میں اس مسافر کی طرح بھاگ رہا تھا جو پلیٹ فارم پر اتر کر ذرا دیر کے لیے غافل ہوا ہو اور اس کی گاڑی اس کے سارے مال اسباب سمیت آگے نکل گئی ہو۔

میں یوں تو بے سمت جا رہا تھا مگر اپنے تئیں ثروت کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جیسے وہ ابھی تک کسی اور کی نہ ہوئی ہو... جیسے ابھی تک میری محبت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جانی باقی ہو... وہ سرخ عروسی جوڑا پہنے بیٹھی ہو۔ ابھی قبول و ایجاب کے مراحل طے ہونا باقی ہوں۔ مجھے لگتا تھا کہ میں بھاگتا ہوا اس تک پہنچ جاؤں گا۔ پکار کر کہوں گا... میں آ گیا ہوں ثروت... اب اپنے اقرار کو اپنے ہونٹوں کے اندر روک لو۔ یہ اقرار صرف میرے لیے ہے۔ لہٰذا یہ شادی انجام نہیں پا سکتی۔ یہ محفل برخاست کرنا ہو گی۔ ایک نئی محفل سجانا ہو گی... جہاں سچا اقرار ہو گا، جہاں سچی محبت کے سدابہار پھول کھلیں گے۔

میں بھاگ رہا تھا۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اردگرد کے مناظر میری نگاہ میں دھندلائے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں نے درجنوں سکون بخش گولیاں ایک ساتھ نگل لی ہیں اور اب میں دوڑنے کے بجائے ہوا کے سمندر میں تیر رہا ہوں۔

اب میرے اردگرد سرسبز ڈھلوان تھی۔ یہاں گھنے درخت تھے۔ ان درختوں میں کہیں کہیں بکریاں چرتی نظر آ رہی تھیں۔ میں ایک جگہ بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔

میں ضعیف العقیدہ نہیں تھا۔ مجھ میں بے شمار خامیاں تھیں مگر توہم پرستی اور فطرت سے انحراف کرنے جیسی کمزوریاں نہیں تھیں۔ میں نے ہمیشہ ٹھوس حقائق پر یقین رکھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب میرا دماغ شدید ترین تناؤ کے سبب پھٹ رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ان حالات کے ڈانڈے فوراً ماورا سے جوڑنے لگ جاتا۔ جادو ٹونا، سحر، جن، بھوت، آسیب، ہم زاد اور اس طرح کے نہ جانے کون کون سے تصورات اس کی سوچوں کو جکڑ لیتے۔ اور شاید اس وجہ سے وہ کسی حد تک ''ریلیکسڈ'' بھی ہو جاتا مگر میں وجہ تلاش کر رہا تھا۔ منطق ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے کوئی ''واہمہ'' مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی صورتِ حال کے لیے ٹھوس وضاحت چاہیے تھی۔

اچانک مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ بھاگتے قدموں کی چاپ تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سلطانہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے گال قندھاری انار کی طرح سرخ تھے اور سینہ پھول پچک رہا تھا۔ عیاں تھا کہ وہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آئی ہے۔ پھر مجھے اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر غنی صاحب اور وہ دوسرا شخص بھی دکھائی دیے جس کا نام چوہان بتایا گیا تھا۔ سلطانہ نے آتے ساتھ ہی میرے دونوں کندھے تھام کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ سسک کر بولی۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے مہرو! ایسا کیوں کر رہے ہو تم... کیا میری جان لینا چاہتے ہو؟ تمہیں پتا ہے، تمہاری تکلیف دیکھ کر مجھ پر کیا گزرتی ہے؟''

اسی دوران میں غنی صاحب اور چوہان بھی میرے پاس آ گئے۔ چوہان نے بھی بڑی ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے مہرو... ہوش کرو یار! نہیں تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

''مجھے اکیلا چھوڑ دو تم لوگ۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

سلطانہ نے ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ لگایا۔ میں نے اسے جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔ غنی صاحب اور چوہان آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں سے کچھ الفاظ میرے کانوں تک پہنچے۔ جیسے سر... چوٹ... پریشانی وغیرہ۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے سر پر لگنے والی چوٹ کے بارے میں بات کر رہے ہیں اور غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس چوٹ کی وجہ سے میرے حواس گڑبڑا گئے ہیں۔

اسی دوران میں تین گھڑ سوار نظر آئے۔ وہ گہری سبز وردیوں میں تھے۔ ان کے سروں پر بھی سبز دھاری دار پگڑیاں تھیں۔ کندھوں پر رائفلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان پر خاکی غلاف چڑھے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے بارعب لہجے میں پوچھا۔ ''کیا بات ہے... یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

سلطانہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ غنی صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''کوئی خاص بات نہیں جی۔ یہ گھر کا معاملہ ہے۔''

''گھر کا معاملہ ہے تو گھر میں بیٹھ کر نمٹاؤ... اور اس بندے کو چوٹ کیسے لگی ہے؟'' میری طرف اشارہ کر کے پوچھا گیا۔

''پیڑ سے گر گیا ہے جناب! کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہے۔'' غنی صاحب نے کہا۔

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں سے اٹھ جاؤ۔'' اور تینوں گھوڑے آگے بڑھ گئے۔

غنی صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر التجا آمیز لہجے میں بولے۔ ''چلو اٹھ جاؤ مہرو!''

''میرا نام مہرو نہیں ہے۔ میں تابش ہوں۔ میں پاکستانی ہوں۔'' میری آواز اتنی بلند تھی کہ آگے جاتے ہوئے گھڑ سواروں تک پہنچ سکتی تھی۔

غنی اور چوہان بُری طرح گھبرا گئے۔ سلطانہ نے مجھے خاموش رکھنے کے لیے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''خدا کے لیے مہرو! ہوش کرو۔'' وہ کراہی۔

گھڑ سواروں تک میری آواز نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ آگے نکل گئے تو غنی صاحب نے دوبارہ بھنچی آواز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم جو کہو گے ہم سنیں گے لیکن گھر جا کر۔ یہاں سے اٹھ جاؤ۔ اگر کوئی اور یہاں آ گیا تو ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہو جائے گا۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں دوبارہ غنی صاحب کے گھر میں تھا۔ سلطانہ سمیت کوئی بھی مجھ سے کسی طرح کی متنازع بات نہیں کر رہا تھا۔ کسی نے مجھے مہرو کہہ کر بھی نہیں پکارا تھا۔ بہرحال، وہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

میں اون کی چٹائی پر دراز ہو گیا اور کچی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ سامنے والی دیوار پر دو تین جانوروں کی کھالیں آویزاں تھیں۔ میں ان میں سے بس ایک کھال پہچان سکا۔ یہ کسی چھوٹے چیتے کی تھی۔ گھر سے باہر گلی سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ بچے شور مچا رہے تھے۔ کہیں قریب ہی شاید بھجن گایا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں دھند سی بھری ہوئی تھی۔ میں جیسے ہوش اور بے ہوشی کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ دل گواہی دے رہا تھا کہ میں تابش ولد اشفاق سکنہ لاہور، ایک انوکھی و حیران کن صورتِ حال کا شکار ہو چکا ہوں۔ میری زندگی کے تسلسل میں سے شب و روز کا ایک طویل ٹکڑا غائب ہو چکا ہے۔ یہ بڑی فلمی اور داستانی سی صورتِ حال تھی۔ بچپن سے فلموں، ڈراموں میں اس طرح کے مناظر دیکھے تھے۔ کوئی شخص کسی حادثے کا شکار ہو کر اپنی یادداشت کھو بیٹھا۔ پھر کسی اور حادثے کے سبب اس کی یادداشت بحال ہو گئی۔ کیا میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے؟ لاہور ڈیفنس کی کوٹھی میں حادثے کا شکار ہونے کے بعد میں ایک نامعلوم وقت تک کسی اور حیثیت سے زندہ رہا ہوں۔ اس نامعلوم عرصۂ حیات میں، میں نے کیا کیا ہے؟ کن لوگوں سے ملا ہوں؟ کن لوگوں سے بچھڑا ہوں؟ کیا ٹھوکریں کھائی ہیں؟ کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

یہ لوگ غالباً سمجھ رہے تھے کہ سر کی چوٹ کی وجہ سے میرے حواس مختل ہو گئے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔ چوٹ کی وجہ سے میرے حواس مختل نہیں، بحال ہوئے تھے۔ میرے زخم نے مجھے مخبوط الحواس نہیں بنایا تھا، صحیح الدماغ کیا تھا۔ مگر حافظے کی یہ واپسی میرے لیے ایک ایسا عذاب بنی تھی جس کی شدت کو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ دل و دماغ میں یہ احساس ایک نہایت کرب ناک لہر کی طرح موجزن تھا کہ... میں نے دیر کر دی ہے۔ میں نے جہاں اور بہت کچھ کھو دیا ہے، وہاں ثروت کے معاملے میں بھی بہت دیر کر دی ہے۔

اسی دوران میں گھر کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ کسی نے دروازہ کھولا۔ کچھ ملی جلی آوازیں آئیں۔ ان میں ایک بھاری اور پُرتحکم آواز سب سے نمایاں تھی... لگتا ہے بہ لگتا ہے غنی صاحب بھی احتجاجی انداز میں کچھ کہہ رہے تھے۔

میں نے گھر کے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اپنی اس کوشش میں، میں پوری طرح کامیاب تو نہیں ہو سکا تاہم چند افراد کی ٹانگیں نظر آئیں۔ یہ وہی باوردی افراد تھے جو اس سے پہلے بستی سے باہر درختوں میں دکھائی دیے تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہے ہیں۔ ان کا رویہ سخت تھا۔ بہرحال، وہ کسی طرح کی بدتمیزی نہیں کر رہے تھے۔ غنی صاحب کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''دیکھو جناب! ہم تو خود ابھی تھوڑی دیر میں آپ کے پاس حاضر ہونے والے تھے۔ اس لڑکی نے کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ تو خود سائل بن کر آئی ہے۔''

جواب میں بھاری آواز والے نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بزرگوار! ہم بھی کسی کو اپرادھی تو نہیں کہہ رہے۔ بس اوپر کے

www.pkdigest.com

حکم پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ جو کچھ بولنا چاہتی ہے، وہاں جا کر بول لے۔"

وردی والے ایک دوسرے شخص نے کہا۔"اور اس کا پتی کدھر ہے؟"

"وہ بیمار ہے جی۔ دوسرے کمرے میں لیٹا ہوا ہے۔" غنی صاحب کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد دو تین افراد میرے والے کمرے میں گھس آئے۔ ان میں سے بھاری آواز والا شخص وہی تھا جس سے کچھ دیر پہلے بستی سے باہر ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سر تا پا دیکھا اور بولا۔"تم ہی سلطانہ کے پتی ہو؟"

ایک دم ہی میرے اندر کی گھٹن اور بے قراری آواز بن گئی۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔"میں نہیں ہوں اس کا پتی۔ میرا اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"تو کون ہو تم؟" بھاری آواز والے نے کہا۔

"میرا نام تابش ہے۔ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے زبردستی روک رہے ہیں۔"

سلطانہ تیزی سے اندر آئی۔ بھاری آواز والے سے مخاطب ہو کر بولی۔"آپ کو بتایا ہے نا یہ بیمار ہیں۔ ان کو چوٹ لگی ہے سر میں... اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ الٹی سیدھی باتاں کر رہے ہیں..."

"یہ جھوٹ بول رہی ہے... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے نہیں پتا، یہ کیا چاہتی ہے... اس کے ساتھی کیا چاہتے ہیں؟" میں نے چلا کر کہا۔

"خدا کے لیے مہروج... ایسی باتاں نہ کرو۔" سلطانہ نے بے قرار ہو کر میرا بازو تھاما۔

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور ایک دم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ لگتا تھا میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ چکر بڑھتے جا رہے تھے۔ دم گھٹ رہا تھا۔ میں گہری سانسیں لینے لگا۔ ارد گرد کی آوازیں اب جیسے مجھے فاصلے سے سنائی دے رہی تھیں۔ بھاری آواز والا مقامی لب و لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ سلطانہ اور غنی صاحب بھی بول رہے تھے۔ آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔"مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پلیز! چلے جاؤ یہاں سے... میرا سر پھٹ رہا ہے۔"

میں اپنا سر گھٹنوں میں جھکاتا چلا جا رہا تھا۔

وہ لوگ باہر چلے گئے۔ اب ان کی گفتگو کی آواز دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا۔ باوردی افراد سلطانہ کو اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ سلطانہ نے بچہ گود میں اٹھا لیا تھا اور اوڑھنی سر پر لے لی تھی۔ وہ پریشان اور دکھی ضرور تھی مگر ہراساں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ سلطانہ کے ساتھ بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے۔ گونگا ہاشم بھی ان کے ساتھ ہی گیا تھا۔

تین چار منٹ بعد غنی صاحب اندر آئے۔ میں چٹائی پر لیٹا، گہرے سانس لے رہا تھا۔ غنی صاحب کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔"وہ لوگ سلطانہ کو لے گئے ہیں۔ اسے تمہاری مدد کی بہت جیادہ جرورت تھی مگر تم نے سب کچھ الٹ دیا ہے۔"

"میں نے کیا الٹا ہے... اور میں کسی کی مدد کیا کروں گا؟ مجھے خود مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے بتائیں، میرے ساتھ کیا ہوا ہے...؟"

"تمہارے ساتھ کچھ نہیں ہوا مہروج! تم بالکل ٹھیک ہو۔ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے جس کی وجہ سے تم وقتی طور پر باتوں کو بھول رہے ہو۔ بہت جلد سب اچھا ہو جائے گا۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ چوٹ لگنے سے میرا حافظہ چلا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل الٹ ہے... بالکل الٹ ہے۔ میں اپنے آپ کو پہچان رہا ہوں... اپنے حالات کو پہچان رہا ہوں۔ میرا نام تابش ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ وہاں کچھ لوگوں کے ساتھ میری دشمنی تھی۔ میرا ان سے جھگڑا ہوا۔ میں سیڑھیوں سے گرا... بس... مجھے یہاں تک یاد ہے۔ اس کے بعد کچھ یاد نہیں۔ سب کچھ کسی گہری دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ اس دھند میں کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا۔"

میں نے ایک بار پھر اپنا سر ہاتھوں میں جکڑ لیا اور کرب کی انتہا سے گزرنے لگا۔"میری مدد کریں غنی صاحب! مجھے بتائیں میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں کتنی دیر تک اپنے ہوش میں نہیں رہا ہوں... اور مجھے یہ بھی بتائیں کہ میں یہاں سے کیسے نکل سکتا ہوں۔ مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے کہیں جانا تھا۔ کسی سے ملنا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے میرا انتظار کیا ہوگا... وہ شاید آج بھی میری راہ تک رہی ہو۔ اوہ خدا! یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟"

میں بولتا جا رہا تھا اور غنی صاحب ہمدردانہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میری اس بات نے انہیں چونکایا تھا کہ میرا حافظہ گیا نہیں، واپس آیا ہے۔

میری بڑھتی ہوئی بے قراری دیکھ کر انہوں نے وہ

بات ادھوری چھوڑ دی جو وہ کرنا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے سلطانہ کا ذکر دوبارہ نہیں کیا۔ مجھے روغنی مٹی کے گلاس میں پینے کے لیے پانی دیا۔ پھر بولے۔"چلو، تم کچھ دیر کے لیے آرام کر لو۔ اتنے میں چوہان بھی آ جاتا ہے پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔"

میں واقعی چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں۔ شاید میرے دماغ پر چھائی ہوئی دھند کچھ چھٹ جائے۔ ممکن ہے کہ میں اپنے ماضی اور حال میں کوئی رابطہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

گلی میں سے کبھی کبھی کوئی گھوڑا گاڑی چالیں چلتا گزرتا تھا اور اس کی ٹاپوں کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ پھر کبھی بھینسوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز گونجتی تھی۔ بچے شور مچاتے تھے اور کوئی بھک منگا صدا لگاتا تھا۔ کہیں کسی قریب کے گھر میں کوئی شخص بانسری جیسا ساز پُردرد آواز میں بجا رہا تھا۔ ہوا بلند و بالا درختوں میں سے سائیں سائیں کرتی گزرتی تھی۔ میں یہ ساری آوازیں کمرے کے اندر سے سن رہا تھا اور اپنے ذہن میں ماحول کی ایک تصویر بنا رہا تھا۔

یہ بستی، یہاں کے لوگ، یہاں کا رہن سہن آہستہ آہستہ مجھ پر واضح ہو رہا تھا۔ پھر بھی بے شمار سوال جواب طلب تھے۔ غنی صاحب نے کہا تھا کہ اس علاقے کے قریبی شہر جھانسی اور الٰہ آباد وغیرہ ہیں۔ لیکن سلطانہ اور غنی صاحب جو بولی بول رہے تھے، اس میں دکنی رنگ تھا۔ ایسا لب و لہجہ میں نے حیدرآباد میں سنا تھا اور جہاں تک مجھے پتا تھا، الٰہ آباد اور حیدرآباد وغیرہ میں بہت فاصلہ تھا۔ کئی سوال مسلسل ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ باوردی افراد مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہیں؟ شاید میری حالت دیکھ کر انہوں نے مجھے ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

جلد ہی مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔ وہ مجھے چھوڑ ضرور گئے تھے مگر میری طرف سے مکمل غافل نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کھڑکی کی درز سے دیکھا تو باہر گلی میں ایک باوردی شخص ایک خوانچہ فروش کے پاس کھڑا نظر آیا۔ وہ خوانچے پر سے کوئی فالسے کی طرح کا پھل اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ اس کی رائفل غلاف میں لپٹی ہوئی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ یہ شخص یہاں میری نگرانی کے لیے موجود ہو۔

میں لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد میری غنودگی، نیند میں بدل گئی۔ جب ذہن بہت تھک جائے اور اعصاب نڈھال ہو جائیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب میں سویا تو میرے اندازے کے مطابق سہ پہر تین چار بجے کا وقت تھا۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے میں ایک بڑی لالٹین روشن تھی۔ میں چٹائی پر لیٹا تھا اور میرے سر کے نیچے غالباً غنی صاحب نے ہی ایک نرم سرہانہ رکھ دیا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا۔ منظر حیران کن تھا۔ جھیل کے خم کھاتے ہوئے کنارے کے ساتھ دور دور تک آبادی کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کا عکس جھیل کے ساکت پانی میں چمکتا تھا اور لگتا تھا کہ ہر طرف ستارے روشن ہیں۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید یہ منظر مجھے کشش کرتا مگر اس وقت تو دل و دماغ میں طوفان برپا تھا۔ جاگتے ساتھ ہی سارے کرب زیادہ شدت کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگے۔ ان میں سے سب سے جان لیوا کرب کا تعلق ثروت کے تصور سے تھا۔ یقینی بات تھی کہ میں اسے کھو چکا ہوں... وقت کا ایک طویل ٹکڑا جو میرے دل و دماغ سے اوجھل ہو گیا تھا، اسی ٹکڑے کے دورانیے میں ثروت کہیں گم ہو چکی تھی... میرا دل غم سے بھر گیا۔ میں کچھ دیر تو برداشت کرتا رہا پھر کھڑکی کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میرے یہ آنسو ثروت کے لیے تھے۔ یہ اس جدائی کا ماتم تھا جو میری زندگی کا سب سے بڑا داغ بننے والی تھی۔ میں روتا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔ میں نے کیا کیا سوچا تھا۔ اپنی اور ثروت کی جدائی کو ختم کرنے کے لیے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ وہ سارا عزم، سارا جوش و خروش، انہونی کو ہونی کرنے کے وہ سارے حوصلے کیا ہوئے تھے؟ کسی بھی جدوجہد کے بغیر میں کس طرح ہار گیا تھا؟ یہ کیسی شکست تھی جس میں لڑنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے ان آنسوؤں میں فرخ اور عاطف کے حصے کے آنسو بھی شامل ہونے لگے۔ میں ان سب کے لیے رویا اور بہت دیر تک رویا۔ ابھی مجھے اپنے حالات کا ٹھیک سے ادراک نہیں تھا مگر میرا دل اندر سے گواہی دے رہا تھا کہ مجھے کچھ کاموں کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔

کسی نے بہت ہولے سے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے جاگتے دیکھ کر اندر آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ غنی صاحب ہوں گے مگر وہ چوہان تھا۔ چوہان بے شک مقامی لباس میں ہی تھا مگر وہ اپنی بول چال سے پڑھا لکھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے خدوخال بھی ظاہر کرتے تھے کہ وہ کہیں باہر سے یہاں آیا ہے۔ وہ متناسب جسم کا مالک تھا۔ آنکھیں روشن اور ماتھا چوڑا

www.pkdigest.com

تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور ملائمت سے بولا۔ ''بھوک لگی ہے تو کچھ تھوڑا بہت کھالو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ''شاید تمہیں یہ جان کر حیرانی ہو کہ میں ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہوں۔ کچھ عرصہ الٰہ آباد میں پریکٹس بھی کر چکا ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''میں تم سے جو کچھ کہوں گا، اپنی جانکاری کے مطابق سچ کہوں گا کیونکہ اس میں میرا کوئی مفاد نہیں ہے اور نہ ہی کچھ لینا دینا ہے۔ میں آشا کرتا ہوں کہ تم بھی مجھے اپنا ہمدرد سمجھو گے۔''

''مجھے یہ بتاؤ، میں کس جگہ ہوں... کیسے پہنچا ہوں یہاں؟''

''کیسے پہنچے ہو، اس کے بارے میں تو میں زیادہ نہیں جانتا کیونکہ تم میرے یہاں اس اسٹیٹ میں آنے سے پہلے ہی موجود تھے لیکن...''

''اسٹیٹ؟ کیا یہ کوئی اسٹیٹ ہے؟'' میں نے حیرت سے اس کی بات کاٹی۔

''ہاں، یہ بھانڈیل اسٹیٹ ہے۔ اتر پردیش کی دور دراز اسٹیٹس میں سے ایک۔ قانونی طور پر تو اعلیٰ میں راجواڑے، ریاستیں اور جاگیریں ختم ہو چکی ہیں مگر دور افتادہ علاقوں میں کسی نہ کسی طور ان کی حیثیت برقرار ہے۔''

''تم... کب... یہاں پہنچے تھے؟''

''آج سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے۔ بس میری کوئی مجبوری تھی جس کے سبب مجھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آنا پڑا۔''

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ یہ چوہان نامی شخص ڈیڑھ سال پہلے یہاں پہنچا تھا اور تب بھی میں یہاں اس جگہ موجود تھا؟

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ میں یہاں کن حالات میں آیا؟''

''تم آئے نہیں لائے گئے تھے اور جہاں تک میری جانکاری ہے، تم کو بڑے پنڈت مہاراج جی کی تحویل میں دیا گیا تھا۔ تم سے کوئی جرم سرزد ہوا تھا جس کی سزا تمہیں یہاں بدھ مندر میں بھگتنا تھی اور مقامی لوگوں کے عقیدے کے مطابق خود کو پوتر کرنا تھا۔''

''بڑا جرم؟ میں نے کیا کیا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا۔''

''میرے خیال میں یہ کوئی چوری کا معاملہ تھا۔ بدھا کی ایک خاص مورتی کی چوری کا... تمہارے علاوہ بھی یہاں دو لوگوں کو سزا بھگتنا تھی۔ ان میں سے ایک عورت تھی۔ اس عورت کا نام کورتی ہے۔ مقامی زبان میں کورتی، بانجھ عورت کو کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں تم کورتی سے مل بھی چکے ہو۔ تم اسے جانتے ہو۔''

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا۔ ''جب تم لوگ ایسی باتیں کرتے ہو تو میرے سر کی نسیں پھٹنے لگتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط کہہ رہے ہو مگر مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔''

چوہان نے بڑی نرمی سے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اسے ہولے ہولے سہلانے لگا۔ اس کے لمس میں ایک ہمدرد دوست کا خلوص تھا۔ ''تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری اس کیفیت کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو۔ میں تمہیں کئی ماہ تک وہاں زرگاں میں دیکھتا رہا ہوں۔ تمہارے مزاج کے اتار چڑھاؤ میری نگاہ میں رہے ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ... پلیز...''

''اچھا... تم میری طرف دیکھو... خوب غور سے۔''

چوہان نے اپنے ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''میں ڈاکٹر چوہان ہوں... جب بدھ مندر میں آگ لگی تو وہ بھکشو کا بھیس بدلے ہوئے تھے، تم بھی ان کے ساتھ تھے۔ پھر میں اور سلطانہ اندر گئے تھے۔ ہم نے تمہیں آگ سے نکالا تھا۔ یہ دیکھو، اس وقت میرا بازو تھوڑا سا جل گیا تھا۔'' چوہان نے قمیص کی آستین اٹھا کر کلائی سے اوپر جلنے کا نشان دکھایا۔

میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بولا۔ ''اس بات پر وشواس کرو کہ یہ سب سچ ہے۔ اب یاد کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ادھوری آدھی بات تمہیں یاد آجائے۔''

میں نے چوہان کے کہنے پر کوشش کی مگر ایک سفید دھند کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ محسوس ہوا کہ دم گھٹ رہا ہے۔ میری کیفیت دیکھ کر چوہان نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں ذرا نارمل ہوا تو وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔ ''تم سمجھدار اور روشن خیال ہو۔ اپنی تکلیف کو کوئی آسیبی رنگ نہیں دے رہے۔ اسے معروضی طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ جب بندہ اپنی تکلیف کو سمجھ لیتا ہے تو پھر اس پر غلبہ پانے میں آسانی رہتی ہے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو... میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

وہ اپنے گھونگریالے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولا۔ ''جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، ڈیڑھ دو سال پہلے تم کہیں سے بری طرح گرے ہو۔ کورتی بھی یہی بتاتی ہے کہ تم گرے ہو۔ تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ اس چوٹ کے بعد ''اے پیس آف ٹائم''... یعنی وقت کا ایک ٹکڑا تمہاری یادداشت سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ایسا اکثر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اسے ہم میڈیکل کی زبان میں RETROGRADE AMNESIA کہتے ہیں۔ یہ AMNESIA کی وہ قسم ہے جس میں کسی حادثے کی وجہ سے حادثے سے پہلے کے واقعات ذہن سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ بیماری جزوی بھی ہوتی ہے اور کلی بھی۔ جزوی بیماری میں کچھ باتیں یاد رہ جاتی ہیں، کچھ بھول جاتی ہیں۔ تمہارا معاملہ جزوی نہیں ہے۔ تمہاری یادداشت مکمل طور پر گئی تھی اور اب واپس آگئی ہے۔ تاہم یہ سو فیصد واپسی نہیں ہے۔ تم غور کرو گے تو اب بھی ماضی کی کچھ باتیں تمہارے ذہن سے محو ہوں گی۔ بہرحال، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا... بلکہ مجھے وشواس ہے کہ اب اس نئی صورت حال میں تم جو پچھلے ڈیڑھ دو سال کی باتیں بھول رہے ہو، وہ بھی جلد ہی تمہارے ذہن میں تازہ ہونے لگیں گی۔''

اس نے چند لمحے توقف کر کے میری آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں۔ میرے سر کی چوٹوں کا بغور معائنہ کیا پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''کورپس کلوزم...''

غالباً وہ میری تکلیف کا طبی نام لے رہا تھا۔

اس نے میرا کندھا تھپکا اور حوصلہ افزا انداز میں بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں ہے۔ برا وقت گزر چکا ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے مہروز۔''

میں جھنجلا گیا۔ ''تم بار بار مجھے اس نام سے کیوں پکار رہے ہو؟ یہ میرا نام نہیں ہے۔''

''سوری... سوری... مجھ سے غلطی ہوئی۔ تم نے اپنا نام تابش بتایا ہے۔ میں آئندہ تمہیں اسی نام سے مخاطب کروں گا۔ ویری سوری!''

''اوکے!'' میں نے کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر بات جاری رکھی۔ ''یہاں صورتِ حال یہ ہے مہروز... میرا مطلب ہے تابش کہ سلطانہ کو تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے۔ اگر تم نے اس کی مدد نہ کی تو وہ بری طرح پھنس جائے گی۔ اس کی عزت اور جان دونوں شدید خطرے میں پڑ جائیں گی۔''

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''سب سے پہلے تو تمہیں اپنا بیان تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے چھوٹے سرکار کے اہلکاروں کے سامنے جو کچھ کہا ہے، وہ بہت خطرناک ہے۔ تم نے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کیا ہے اور یہی وہ انکار ہے جو جارج اور حکم جی وغیرہ کو ایک دم ''اپر ہینڈ'' دے دے گا۔ وہ اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ حکم جی اور جارج کا تو پہلے ہی یہ کہنا ہے کہ سلطانہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ اس نے بس ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ یہ حکم جی... چھوٹے سرکار... یہ سب لوگ کون ہیں... ان سے میرا کیا تعلق ہے؟''

ایک دم چوہان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ مجھے سلجھانے کے بجائے مزید الجھا رہا تھا۔ اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ مجھے چاہیے کہ تمہیں آغاز سے بتاؤں... ہو سکتا ہے کہ اس سے کچھ باتیں تمہارے ذہن میں بھی تازہ ہو جائیں۔''

میں سوالیہ نظروں سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ''جو کچھ میرے علم میں ہے، میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ میری کسی بات پر شک کرو گے تو اپنی الجھنوں میں اضافہ کرو گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ کہنے لگا۔ ''یہ بھانڈیل اسٹیٹ دو بھائیوں کی ہے۔ دونوں کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ یہاں ہندو زیادہ ہیں لیکن مسلمانوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ بڑے بھائی کا نام راجے دشوا ناتھ ہے لیکن انہیں یہاں ''حکم جی'' کہا جاتا ہے۔ ان کے حصے میں زرگاں کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں چھ سات بڑے گاؤں ہیں جو اس جنگل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آباد ہیں۔ چھوٹے بھائی کا نام اجیت راجے ہے اور وہ ''چھوٹے سرکار'' کہلاتے ہیں۔ وہ یہاں تل پانی کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ تل پانی دراصل ''ٹیلے پانی'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہ ایک ہی بڑی بستی ہے جو تم اس جھیل کے کنارے آباد دیکھ رہے ہو۔ اس کے علاوہ جنگل میں کہیں کہیں کسانوں اور خانہ بدوشوں کے چھوٹے چھوٹے ڈیرے ہیں جو ایسے قابلِ ذکر نہیں۔ میں جب اس بھانڈیل اسٹیٹ میں پہنچا تھا تو زرگاں میں اترا تھا۔ مجھے پناہ کی ضرورت تھی اور زرگاں کے حکم جی نے مجھے پناہ دی تھی۔ وہاں پتا ہے میں نے سب سے پہلے تمہیں کہاں دیکھا تھا؟''

''کہاں؟''

www.pkdigest.com

''ایک بار پھر کہوں گا کہ وشواس کرو۔ میں تمہیں حقیقت بتانے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہا۔ میں نے تمہیں سب سے پہلے زرگاں کے بودھ مندر میں دیکھا تھا۔ یہاں اسے بگوڈا بھی کہتے ہیں۔ تم نے گیروا رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ تمہارا سر منڈا ہوا تھا اور تم مندر کے صحن میں جھاڑو دے رہے تھے۔ کورتی بھی وہیں تھی۔ وہ بھی اسی حال میں تھی۔ تمہارا ایک تیسرا ساتھی بھی تھا مگر میں نے اسے نہیں دیکھا۔

''پھر ایک روز میں نے تمہیں بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ تم دوپہر کے وقت ایک پیالا لیے گھروں کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ تمہارے گلے میں زرد رنگ کی مالا تھی اور پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں۔ مجھے لگا کہ تم وہ نہیں جو نظر آتے ہو۔ شاید تمہیں ایسا بنایا گیا ہے، تمہیں ایک نیا روپ دیا گیا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں اپنے دوست رمضان سے پوچھا تھا۔ رمضان زرگاں کا مقامی ہے۔ اس نے بتایا کہ تم بڑے پنڈت مہاراج کے اپرادھی ہو اور یہاں اس بودھ مندر میں جیون قید کاٹ رہے ہو۔ رمضان نے مجھے وہی چوری والی بات بتائی اور کہا کہ تم نے کوئی مقدس مورتی چوری کی تھی۔ تمہارے ساتھ جو دو اور افراد شریک تھے، وہ بھی اسی بودھ مندر میں سزا بھگت رہے تھے۔ تم سارا دن بے تکان کام کرتے تھے۔ تمہیں بچا ایک وقت کا بھوجن ملتا تھا... اور روزانہ شام کو مخصوص تعداد میں بید مارے جاتے تھے تاکہ تم مرنے سے پہلے پوتر ہو جاؤ۔ اگر تم دیکھنا چاہو تو ان بیدوں کے نشان شاید تمہاری کمر پر اب بھی موجود ہیں۔''

چوہان اٹھا اور اس نے میری قمیص ہولے سے اوپر اٹھائی۔ پہلے خود میری پشت پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر میری پشت پر پھیرا۔ مجھے ہلکے ہلکے کئی ابھار محسوس ہوئے۔ بہرحال، ان میں کسی طرح کا درد نہیں تھا اور یہ پرانی بات لگتی تھی۔

''ایک روز میں نے تمہیں اور بھی بُری حالت میں دیکھا۔ میں اس کی تفصیل بیان کر کے خواہ مخواہ تمہارا من خراب کرنا نہیں چاہتا۔ سمجھو کہ تمہیں مارا پیٹا جا رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکم جی کی ایک بیوی اور اس کی سہیلیوں نے تمہارے ساتھ کوئی شرارت کی تھی۔ تم پر چھیڑ چھاڑ کرنے کا الزام لگایا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا نام روتا تھا۔ تم ذہن پر زور دو، شاید تمہیں کچھ یاد آئے۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ ہی تم بار بار مجھ سے یاد کرنے کو کہو۔ مجھے بس بتاتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے سخت مضطرب لہجے میں کہا۔

''انہی دنوں میں زرگاں سے ہجرت کر کے یہاں تل پانی میں آ گیا۔ مجھے وہاں زرگاں کے حالات کی زیادہ جانکاری نہیں رہی۔ پھر ایک روز اچانک مجھے پتا چلا کہ راجپوت مسلم گھرانے کی لڑکی سلطانہ نے تم سے شادی کر لی ہے اور اب تم اس کے گھر میں اس کے بوڑھے والد کے ساتھ ہی رہتے ہو۔ اس خبر نے جہاں اور لوگوں کو حیران کیا ہوگا، وہاں میں بھی ششدر رہ گیا۔ تم تو پنڈت مہاراج کے قیدی اور معتوب تھے پھر تمہاری شادی سلطانہ سے کیسے ہو گئی؟ اس کی ٹھیک جانکاری مجھے آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ ہاں، یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ یہ شادی آناً فاناً ہوئی۔ شاید تم سلطانہ کو پسند آ گئے تھے یا پھر کوئی اور بات تھی۔ ہو سکتا ہے کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا ہو... بہرحال، سلطانہ ایک دلیر لڑکی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کسی سے دبتی نہیں۔ حتیٰ کہ جارج جیسے شخص کو بھی وہ خاطر میں نہیں لائی۔ میرا خیال ہے کہ آگے بتانے سے پہلے... میں تمہیں حکم جی، اس کے خاص دوست سر جارج اور سلطانہ کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتا دوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

چوہان بولا۔ ''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے، حکم جی اس اسٹیٹ کے ایک بڑے علاقے زرگاں کا مالک و مختار ہے۔ حکم جی اور چھوٹے سرکار دونوں بھائی ہیں لیکن دونوں کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ حکم جی شروع سے رنگین طبیعت کا مالک ہے۔ اس کی محل سرا میں جسے عرفِ عام میں دیوان کہا جاتا ہے، دنیا کی بیشتر خرافات موجود ہیں۔ حکم جی کی پانچ باقاعدہ پتنیاں ہیں جن میں روتا بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی لونڈیاں، رکھیلیں وغیرہ بھی حکم جی اور ان کے دوستوں کی تفریحِ طبع کے لیے دیوان میں موجود رہتی ہیں۔ جارج جس کو یہاں سر جارج بھی کہا جاتا ہے، حکم جی کا سب سے قریبی دوست ہے۔ دونوں کی مشترک دلچسپیوں میں شراب، شکار اور شباب سرِفہرست ہیں۔ جارج درحقیقت آج سے دس بارہ سال پہلے انڈیا آیا تھا اور کوگر شیروں پر ریسرچ کرنے کے لیے ہی ان دشوار گزار جنگلات میں داخل ہوا تھا۔ اس نے یہاں بہت سی دستاویزی فلمیں بنائیں اور ڈیٹا وغیرہ اکٹھا کیا۔ پھر اس کا من ان جنگلوں میں ایسا لگا کہ وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ ان دنوں حکم جی اور چھوٹے سرکار کے پتاجی رائے پرتاب بہادر بھی زندہ تھے۔ وہ بھی کوگر نسل کے شیروں میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے کوگرز پال رکھے تھے۔ انہی کوگرز کی وجہ سے ہی کچھ عرصے بعد ان کی موت بھی ہوئی۔ بہرحال، رائے پرتاب بہادر کے جیون میں ہی حکم جی اور جارج میں گہری دوستی ہو چکی تھی۔ دونوں کی طبیعت ملتی تھی اور دونوں کے لیے اس دور دراز اسٹیٹ میں ہر طرح کا ''شکار'' بھی موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد جارج کا دل کہیں اور نہیں لگ سکا۔ وہ ایک دو بار چند مہینوں کے لیے انگلینڈ گیا بھی لیکن پھر واپس آ گیا۔ اب وہ یہیں پر ہے۔ اس کے دو تین انگریز دوست بھی یہیں کے ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک برمنگھم کا سرجن ہے... اب میں تمہیں سلطانہ کے بارے میں کچھ بتا دوں؟''

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

پتا نہیں کیوں مجھے کسی وقت لگنے لگتا تھا کہ میں نے اس کہانی کے کچھ حصے کہیں سنے ہوئے ہیں۔ کہاں سنے ہیں؟ کس نے سنائے ہیں؟ واقعات کے یہ ٹکڑے کچھ شناسا سے کیوں لگتے ہیں؟ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس کے گرد ایک ناقابلِ عبور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

چوہان نے حسبِ عادت اپنے گھونگریالے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''سلطانہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ زرگاں میں اس کے والد مختار احمد کی تھوڑی سی زمین ہے۔ اس زمین سے ان کی گزر بسر ہوتی ہے۔ سلطانہ کا صرف ایک بھائی ہے۔ وہ کمر میں چوٹ لگنے سے معذور ہو گیا ہے اور کئی سال سے بستر پر ہی ہے۔ سلطانہ کی والدہ بڑی دلیر عورت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تلوار چلانا جانتی تھی اور باقاعدہ مردوں سے مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس کی موت بھی ایک بہادر راجپوت کی طرح ہوئی۔ یہ کوئی پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت سلطانہ... بمشکل آٹھ نو سال کی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھی۔ اچانک ماں بیٹی کو درختوں میں ہلچل محسوس ہوئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو دل ہلا دینے والا منظر نظر آیا۔ حکم جی جو اس وقت نوجوان تھا، زمین پر گرا ہوا تھا اور تین بھیڑیے اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ حکم جی کا خاص محافظ ایک طرف پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ سلطانہ کی والدہ اپنی بچی کو لے کر وہاں سے بھاگ جاتی یا شور مچا کر کسی کو مدد کے لیے بلانے کی کوشش کرتی، وہ ایک موٹی لکڑی کے ساتھ خود بھیڑیوں پر حملہ آور ہو گئی۔ اس نے انہیں زوردار چوٹیں لگائیں۔ پھر اس کی نظر محافظ کی رائفل پر پڑ گئی۔ اس نے رائفل کھینچی اور یکے بعد دیگرے کئی فائر کر کے تینوں بھیڑیوں کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ تاہم اس شدید کشمکش میں وہ خود بھی زخمی ہو گئی اور قریباً ایک ماہ بعد ان زخموں کی وجہ سے ہی چل بسی۔ سلطانہ کی والدہ نے بھانڈیل اسٹیٹ کے ولی عہد کا جیون بچایا تھا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا... سورگ باشی رائے پرتاب بہادر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے صلے میں سلطانہ کے والد مختار احمد کو کچھ زمین دینا چاہی جس میں ایک بڑا باغ بھی تھا مگر وہ بھی بہت خوددار تھے۔ انہوں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت رائے پرتاب بہادر نے انہیں اپنی خاص مہر دی تھی اور کہا تھا کہ یہ مہر دکھا کر وہ جب چاہے ان سے یا ان کی اولاد سے کچھ مانگ سکتے ہیں۔ اب پتا نہیں اس میں کتنی حقیقت ہے لیکن بات ایسے ہی بیان کی جاتی ہے۔''

چوہان نے چند لمحے توقف کیا اور بولا۔ ''اب میں دوبارہ سر جارج کی طرف آتا ہوں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، جارج مقامی عورتوں کا رسیا ہے۔ چونکہ وہ حکم جی کا گہرا دوست ہے اس لیے حکم جی کسی نہ کسی طریقے سے اس کے لیے تفریحِ طبع کا سامان فراہم کرتا ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق، سر جارج کچھ عرصے سے سلطانہ کے چکر میں ہے۔ سلطانہ کوئی ایسی خوب صورت لڑکی نہیں ہے لیکن تمہیں پتا ہی ہوگا، جارج کی فطرت کے لوگ اس شے کو حاصل کر کے زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں جسے حاصل کرنا زیادہ مشکل ہو۔ ممکن ہے کہ ماضی قریب میں کسی وقت جارج نے سلطانہ کی طرف پیش قدمی کی ہو مگر اسے ناکامی ہوئی ہو اور اس کے بعد اس نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہو۔ بہرحال، اس طرح کی کوئی بھی صورت ہو سکتی ہے۔ حالانکہ سلطانہ کا بیاہ ہو چکا ہے مگر جارج پھر بھی اس کے پیچھے ہے کیونکہ حکم جی پر جارج کا ہولڈ ہے، اس لیے میرے اندازے کے مطابق سلطانہ کے لیے کوئی نہ کوئی مشکل کھڑی ہوتی رہتی ہے۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جارج کے اثر کی وجہ سے حکم جی اور پنڈت مہاراج، سلطانہ کی شادی کو شادی ہی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ صرف نام کی شادی ہے۔ وہ تم کو ایک نکما شخص سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ سلطانہ نے تمہیں صرف دکھاوے کا پتی بنایا ہوا ہے۔ اصل میں اس کے بچے کا باپ کوئی اور ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''کیا... تم بھی... یہی کہہ رہے ہو کہ... میں سلطانہ کا شوہر ہوں؟'' میری آواز خوف آمیز حیرت کی شدت سے لرز

www.pkdigest.com

رہی تھی۔

”کم از کم اس میں تو کوئی شک نہیں ہے مہر وز... مم... میرا مطلب ہے تابش! میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں ایک شوہر کی حیثیت سے سلطانہ کے گھر میں رہتے دیکھا ہے۔“

”لیکن تم تو کہتے ہو کہ تم سلطانہ کی شادی سے پہلے ہی یہاں ٹل پانی میں آ گئے تھے؟“

”میں کچھ دن کے لیے عارضی طور پر وہاں گیا تھا۔ حکم جی کی ایک بچی بیمار تھی۔ وہ اس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرح سے یہ بھی حکم جی کی منافقت ہی کہلائے گی۔ وہ عام لوگوں کو تو جڑی بوٹیوں اور جھاڑ پھونک سے علاج کی تلقین کرتا ہے مگر جب اپنے گھر کا کوئی فرد بیمار ہوتا ہے تو پھر اسے انگریزی طریقہ علاج کی ضرورت پڑتی ہے۔ بہر طور یہ حکم جی کی مجبوری تھی جس کی وجہ سے میں دوبارہ زرگاں جا سکا۔ یہ گروپ فوٹو جو ابھی چاچے غنی نے تمہیں دکھائی ہے، یہ میری موجودگی میں ہی اتری تھی۔ ٹھاکر برادری کے ایک لڑکے کی شادی تھی۔ میں اور میری منہ بولی بہن بھی اس تصویر میں موجود ہیں۔ یہ دیکھو... یہ اس طرف دُلہے کے پیچھے ہم دونوں کھڑے ہیں۔“

چوہان نے ایک بار پھر مجھے تصویر دکھائی۔ وہ واقعی تصویر میں نظر آ رہا تھا۔ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار تھا۔ چوہان نے کہا۔ ”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے تابش! ورنہ میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ ایک بیوی کی حیثیت سے سلطانہ نے تمہاری خاطر کیا کیا مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی ایک باہمت لڑکی ہے تابش! تمہاری شریکِ حیات بننے کے بعد اس نے واقعی شریکِ حیات بن کر دکھایا ہے لیکن اب اس کی مصیبتوں میں ایک دم اضافہ ہو گیا ہے اور یہ اضافہ... میری بات کا بُرا نہ ماننا... یہ اضافہ تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اہل کاروں کے سامنے تم نے جو کچھ اپنے اور سلطانہ کے بارے میں کہا ہے، وہ اس بے چاری کو سخت آفت میں ڈال دے گا۔ میری طرح وہ بھی یہاں چھوٹے سرکار کی پناہ میں آنے کے لیے آئی تھی مگر مجھے نہیں لگتا کہ اب اسے پناہ مل سکے گی۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ...“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ ایک دو دن میں ہی ہو جائے۔ حکم جی کے لوگ تمہیں اور سلطانہ کو یہاں سے گھسیٹ کر واپس لے جائیں گے۔ اس کے بعد وہاں جو کچھ سلطانہ کے ساتھ ہو سکتا ہے، اس کا تصور کرنا بھی سخت تکلیف دہ ہے۔ تمہیں کچھ کرنا پڑے گا مہر وز... میرا مطلب ہے تابش! ورنہ تمہاری بیوی، تمہارا بچہ بلکہ پورا گھر سخت مشکل میں پڑ جائے گا۔“

میرا دم پھر گھٹنے لگا۔ میں نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔ ”تم اگر میرے دوست ہو تو پھر سمجھ لو کہ مجھے ان لوگوں سے کچھ بھی لینا دینا نہیں۔ میں صرف یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے لوگوں میں جانا چاہتا ہوں۔“

چوہان کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ”کیا تم اس لڑکی کو بے یار و مددگار چھوڑ دو گے جو تمہاری خاطر زخم پر زخم کھاتی رہی ہے اور جو اب صرف تمہارے کارن ایک بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے؟“

”میں نے کسی کو مصیبت میں نہیں پھنسایا۔ میں خود مصیبت میں ہوں۔ مجھے یہاں سے جانا ہے۔“

”تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے تابش! تمہیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ تمہارے لیے جانا ممکن ہی نہیں ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں تمہیں تفصیل نہیں بتا سکتا۔ اور میرا خیال ہے کہ میں بتاؤں گا بھی تو تم وشواس نہیں کرو گے۔ یہ جگہ تمہارے لیے ایک... جزیرے کی طرح ہے۔ تم اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ کیا ہم کسی جزیرے میں ہیں؟“

”نہیں، میں صرف ایک مثال دے رہا ہوں۔ میں نے کہا ہے نا کہ تمہیں میری بہت سی باتوں پر وشواس نہیں ہو گا۔ جہاں تک میری جانکاری ہے، تم اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ یہاں سے نکلنے کی کوشش کر چکے ہو لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔“

”میں کوشش کر چکا ہوں؟“

”ہاں، تم... ایک مرتبہ کا تو میں گواہ بھی ہوں۔ جب تمہیں تیواری لال اور ڈیوڈ وغیرہ پکڑ کر لائے تھے۔ تمہیں گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا...“

تیواری لال؟ ڈیوڈ؟ وہ پتا نہیں کن لوگوں کے نام لے رہا تھا اور کن واقعات کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی ایسی باتوں سے میری کنپٹیاں پھٹنے لگی تھیں... اچانک جنگل کی طرف سے آنے والی ایک ہولناک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔

> خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

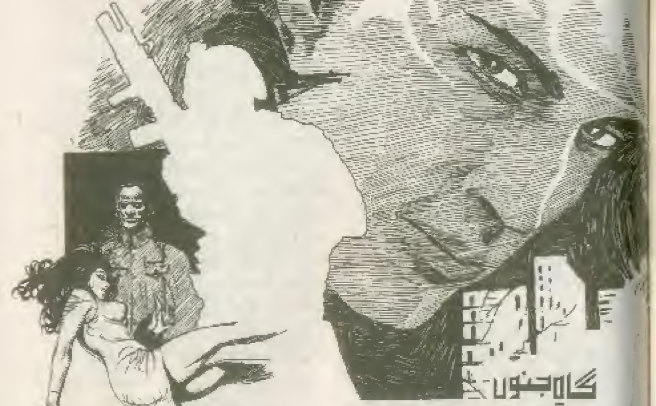

گاہِ جنوں

ثمر عباس

جب جرم لذت دینے لگے تو اس جنون کے آگے انسانیت صرف بین ہی کر سکتی ہے۔ قانون کے ساتھ دینے والے شخص کی دہری زندگی کے نقیب و فراز جس کے جنون پر اس کی لذت کے نتیجے پیدا کر دیے تھے

ایک قاتل کی سفاک سرگرمیوں کا شاخسانہ

بوڑھی عورت نے عینک کے اوپر سے اسے دیکھا۔ ”نام؟“

”رون... رون بریک۔“ جوان آدمی نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا جیسے اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نام یہی ہے۔ عورت کے لیے اس کا رویہ اجنبی نہیں تھا۔ اس کے پاس جو لوگ آتے تھے، ان کا رویہ عام طور سے ایسا ہی ہوتا تھا۔ عورت سابقہ فوجیوں کی بحالی کے محکمے میں کام کرتی تھی اور اس کا کام مدد کے لیے آنے والے فوجیوں کے لیے کام کرنا تھا۔ یہ عورت گزشتہ تیس برس سے اس محکمے کے لیے کام کر رہی تھی۔

”فوج سے کب ریٹائر ہوئے؟“

”دو مہینے پہلے۔“ رون نے وضاحت کی۔ ”اصل میں مجھے ایک سال پہلے بھیج دیا گیا تھا لیکن میں چھ مہینے اسپتال میں رہا۔“

رون نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس اسپتال میں رہا تھا۔ عورت نے بھی نہیں پوچھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ کس اسپتال کی بات کر رہا ہے۔ یہاں آنے والے اکثر سابق فوجی اسی اسپتال سے فارغ ہو کر آتے تھے۔ بظاہر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ اگر اسے کہیں زخم آئے بھی تھے تو وہ کب کے بھر چکے تھے۔ لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کی روح پر آنے والے زخم ابھی تک نہیں بھرے۔ عورت کا تجربہ تھا کہ اس قسم کے زخم بہت ہی مشکل سے بھرتے ہیں۔ اکثر تو ہرے ہی رہ جاتے ہیں۔

”تم کوئی ہنر جانتے ہو؟“ عورت نے سوال کیا۔ یہ سوال صرف خانہ پُری کے لیے تھا کیونکہ سب طے ہو گیا تھا۔

”نہیں لیکن میں گاڑیوں کا کام جانتا ہوں۔ جنگ پر جانے سے پہلے میں ایک گیراج میں کام کرتا تھا۔“

عورت نے کہا۔ ”اسی لیے میں نے تمہارے لیے ایک گیراج کا انتخاب کیا ہے۔“

”مجھے کہاں جانا ہو گا؟“

”مغربی نیو یارک۔“ عورت نے کہا۔ ”اچھی جگہ ہے، وہاں تمہاری رہائش پیلس ٹاور میں ہو گی۔ ذرا پرانی عمارت ہے لیکن اس میں اچھے فلیٹس ہیں۔ تمہارا بچپن بھی ویسٹ ان میں گزرا ہے۔“

رون نے سر ہلایا۔ "ہاں، فوج میں جانے تک میں وہیں رہا کرتا تھا۔"

رون سات سال پہلے افغانستان پر حملے کے فوراً بعد فوج میں بھرتی کرلیا گیا تھا۔ انکار کا سوال ہی نہیں تھا۔ اسے لازمی فوجی خدمات کے تحت بھرتی کیا گیا تھا۔ اس وقت رون صرف اکیس سال کا تھا۔ اس نے ہائی اسکول کے بعد تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اسے گاڑیوں کی مرمت کا شوق تھا اسی لیے وہ ایک گیراج میں کام کرنے لگا۔ پھر اسے جبری بھرتی کرکے افغانستان بھیج دیا گیا جہاں وہ پانچ سال تک دشمن اور اپنے اعصاب سے لڑتا رہا۔ آخر وہ ہار گیا اور اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ اسے امریکا واپس بھیج دیا گیا جہاں وہ چھ مہینے نفسیاتی اسپتال میں داخل رہا تھا اور پھر اسے صحت یاب قرار دے کر ڈسچارج کردیا گیا۔ عورت نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "اس میں سب کچھ ہے اور تمہاری ضرورت کے لیے کچھ رقم بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

رون نے سر ہلایا۔ "تمہارا شکریہ۔"

عورت کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی جیسے وہ سوچ رہی ہو کہ اسے بتائے یا نہ بتائے۔ پھر اس نے فیصلہ کرلیا۔ "تم جس فلیٹ میں جارہے ہو، اس میں اس کی مالکن مُردہ پائی گئی تھی۔ اس کا بیٹا عراق کی جنگ میں مارا گیا تھا اور اس نے اپنا سارا اثاثہ سابق فوجیوں کی بحالی کے محکمے کے نام کردیا تھا۔"

"بتانے کا شکریہ۔" رون نے کسی جذبے کے بغیر کہا۔

"میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں۔ ویسے تو کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن تمہیں کسی اور سے پتا چلتا..."

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" رون نے اسی لہجے میں کہا اور دفتر سے نکل آیا۔ اس کے سامان کا بیگ اس کے پاس تھا۔ اس نے سب سے پہلے اے ٹی ایم سے اپنا اکاؤنٹ چیک کیا۔ اس کی پانچ سال کی تنخواہ مع واجبات اس کے اکاؤنٹ میں تھی۔ یعنی اسے معاشی لحاظ سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ چاہتا تو اپنے طور پر بھی کہیں رہائش اختیار کرسکتا تھا لیکن فی الحال اس نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا۔ ایک ٹیکسی نے اسے بیٹس ٹاور کے سامنے اتارا۔ یہ کوئی دس منزلہ اور خاصی پرانی سی عمارت تھی۔ اس کا بیرونی پلاستر جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا۔ اس علاقے میں اب بیشتر عمارتیں نئی بن گئی تھیں جن کے نیچے بہت اچھی قسم کی دکانیں اور ریستوران بنے ہوئے تھے۔ بس یہی عمارت کچھ خستہ حال تھی۔

رون سڑک عبور کرکے عمارت میں داخل ہوا اور اس نے منیجر کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک بھاری جسم والے ادھیڑ عمر آدمی نے جھانکا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "رون بریک...!" اس نے تعارف کرایا اور وہ کاغذ منیجر کو تھما دیا جو اسے عورت نے دیا تھا۔ منیجر نے سر ہلایا۔

"مجھے گریگ بلوز کہتے ہیں... ایک منٹ رکنا۔" وہ اندر گیا اور فوراً آگیا۔ اس نے ایک چابی رون کے ہاتھ پر رکھی۔ "سامنے سیڑھیوں پر چلے جاؤ۔ دوسرے فلور پر بائیں طرف مڑ کر سب سے آخر میں تمہارا فلیٹ ہے۔"

رون نے چابی لے لی اور جانے لگا تو اسے خیال آیا۔ اس نے منیجر کی طرف دیکھا۔ "اس فلیٹ کی مالکن اپنے فلیٹ میں مردہ پائی گئی تھی؟"

"ہاں۔" منیجر نے خشک لہجے میں کہا اور اندر جاکر دروازہ بند کرلیا۔ رون شانے اچکا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ عمارت کی حالت اندر سے بھی خستہ تھی۔ اگرچہ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے لیکن اسے صفائی سے زیادہ مرمت کی ضرورت تھی۔ رون کا فلیٹ بائیں طرف کی گیلری میں سب سے آخر میں تھا۔ اس گیلری میں دائیں بائیں درجن سے زیادہ فلیٹ تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے فلیٹ کے دروازے کے پاس ایک چھوٹی سی لڑکی چاک سے کھلونے بنا رہی ہے۔ رون نے اس کے پاس رک کر اسے ہیلو کہا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی اور بدستور اپنے کام میں مگن رہی۔ رون شانے اچکا کر آگے آیا اور فلیٹ کا دروازہ کھول کر اس نے لائٹ کا بٹن دبایا۔ لائٹ جل اٹھی۔ اندر جاکر دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تو اسے جھٹکا لگا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی۔ وہ پوری راہداری میں کہیں نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی نزدیکی فلیٹ میں رہتی تھی۔

رون نے لڑکی کو ذہن سے جھٹک کر فلیٹ کا جائزہ لیا۔ ایک لیونگ روم کے ساتھ ایک بیڈ روم تھا اور ایک کھانے کا کمرا تھا۔ یہ کل تین کمروں پر مشتمل فلیٹ تھا اور اس کی ضرورت کے لحاظ سے کافی تھا کیونکہ وہ اکیلا آدمی تھا۔ پھر فلیٹ فرنش بھی تھا۔ لیونگ روم میں ایک پرانا پیانو بھی رکھا تھا۔ وہ بیڈ روم میں آیا اور بستر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ تکیے پر خون کا داغ تھا۔ چادر بھی بے ترتیب تھی۔ پورے فلیٹ میں بے ترتیبی اور گرد تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی مالکن کے مرنے کے بعد کسی نے اس کی صفائی کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ رون نے تکیہ اٹھا کر اس کا خون کے دھبے والا غلاف اتار دیا۔

اس کا پورا ایک دن فلیٹ کی صفائی میں لگا۔ اس دوران میں اسے بہ مشکل کھانا کھانے کا وقت ملا لیکن جب اگلے روز وہ سونے کے لیے لیٹا تو اس نے فلیٹ کو بالکل صاف کردیا تھا۔ اگلے روز اس کا ارادہ اپنے میلے کپڑے دھونے اور کچھ خریداری کرنے کے ساتھ اس گیراج جانے کا بھی تھا جہاں اس کی نوکری کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہ سونے کی کوشش کررہا تھا تو اسے یوں لگا جیسے لیونگ روم میں کوئی بول رہا ہے۔ آواز دبی دبی لیکن لہجہ غصیلا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے آکر لیونگ روم کی لائٹ جلائی۔ وہاں کوئی نہیں تھا اور اب آوازیں بھی آنا بند ہوگئی تھیں۔ اس رات کئی بار ایسا ہوا کہ اسے لیونگ روم سے آوازیں آتی محسوس ہوئیں لیکن جب وہ وہاں جاتا تھا تو آواز آنا بند ہو جاتی۔ تنگ آکر اس نے اسے اپنا وہم قرار دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی اور اس کا سر بھی بھاری ہو رہا تھا۔ گرم پانی سے غسل کرکے وہ خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ ..... کپڑے دھونے سے پہلے اس نے مناسب سمجھا کہ ناشتا کرکے باہر سے کچھ سامان خرید لائے۔ وہ باہر نکلا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ لڑکی کا آخر تھا اور پھولدان بھی خزاں زدہ پارک میں ڈیرے جمالیے۔ اس نے گھر کے لیے ضروری سامان خریدا اور واپس آکر عمارت کے تہ خانے میں موجود واشنگ مشین میں کپڑے دھوئے۔ یہاں کئی مشینیں تھیں جو سکہ ڈالنے سے کام کرتی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے دوپہر کا کھانا بنایا اور جب وہ میز پر کھانا لگا رہا تھا تو اسے کسی عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ آواز بہت ہلکی لیکن واضح تھی۔ وہ بے اختیار لیونگ روم میں آیا۔ یہاں پر آواز واضح تھی۔ وہ اس کا مخرج تلاش کرنے لگا۔ جلد اسے پتا چل گیا کہ آواز اصل میں وہاں رکھے پیانو کے پیچھے سے آرہی ہے۔ اس نے پیانو اور دیوار کے عقب میں موجود خلا میں جھانک کر دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ دیوار میں کوئی سوراخ ہے۔ اس نے کوشش کرکے ہاتھ اندر کیا تو اس کی انگلیوں نے دیوار میں دراڑ اور سوراخ کو محسوس کرلیا۔ اس نے زور لگا کر پیانو کو آگے کھسکایا تو دیوار کا یہ حصہ..... نمایاں ہوگیا۔ یہاں سے دیوار یوں ٹوٹی تھی جیسے کسی نے اس پر پوری قوت سے کدال ماری ہو۔ دیوار میں واضح سوراخ تھا۔ رون نے سوراخ میں جھانکا تو دوسری طرف تاریکی نظر آئی۔ اس نے چیک کرنے کے لیے سوراخ میں انگلی ڈالی تو اچانک اسے یوں لگا جیسے کسی چیز نے اس کی انگلی پر کاٹ لیا ہو۔ اس نے تڑپ کر ہاتھ پیچھے کرلیا۔ اس کی انگلی پر خون نمودار ہوا۔ شاید سوراخ میں کوئی کیل تھی جو اس کی انگلی میں چبھ گئی تھی۔

وہ باتھ روم کی طرف لپکا اور واش بیسن کا نل کھول کر انگلی اس کے نیچے کردی پھر اس نے اوپر دواؤں والا خانہ کھولا۔ سامنے ہی چند دواؤں کی شیشیاں رکھی تھیں۔ وہ چونک اٹھا کیونکہ یہ سب ذہنی سکون اور اعصاب کو سن کرنے والی دوائیں تھیں۔ وہ ان کا معائنہ کرنے لگا۔ کیا یہ ساری دوائیں یہاں رہنے والی بوڑھی عورت استعمال کرتی تھی؟ وہ اس سوچ میں اتنا ڈوب گیا کہ اپنی چوٹ بھی بھول گیا۔

کھانا کھا کر وہ باہر نکلا تو اس کے اعصاب پُرسکون ہو چکے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ گیراج والے سے بات کرنے کے بعد اس روز گھومے گا اور پرانی جگہوں پر جائے گا۔ گیراج خاصا بڑا تھا اور اس کے مالک میکس نے گرم جوشی سے رون کا استقبال کیا۔ "مجھے تمہارے بارے میں اطلاع مل گئی تھی اور میں تمہارا منتظر تھا۔"

"میں پرسوں آیا ہوں۔ ابھی تک گھر سیٹ کررہا ہوں۔ ممکن ہے مجھے کام پر آتے آتے ایک دو دن اور لگ جائیں۔"

"کوئی بات نہیں... تم جس دن سے چاہے جوائن کرلو۔" میکس نے فراخ دلی سے کہا۔

رون شام تک گھومتا رہا۔ پھر اسے بھوک لگی تو ایک چھوٹے سے ریستوران میں داخل ہوگیا۔ اندر بہت رش تھا اور بے شمار لوگ کھا پی رہے تھے۔ رون اکیلا تھا، اس لیے کاؤنٹر پر آگیا۔ اس نے اردگرد کسی ویٹر کے لیے دیکھا تو اس کی نظر ایک جانے پہچانے چہرے پر پڑ گئی۔ لڑکی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول پاکر بھی کہ اسے مینیو چاہیے۔ وہ اس کے پاس مینیو کارڈ لے آئی اور ایک اور آدمی کی طرف بڑھی جو اسے آرڈر دینا چاہتا تھا لیکن رون نے اسے روک لیا۔

"معاف کرنا... میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ رکی اور حیرانی سے مسکرائی۔ "کہو۔"

رون نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "تم میگی ہو نا... میکارتھی جونز؟"

"ہاں، میں میگی ہوں۔"

رون پُراعتماد ہوگیا۔ "میں رون بریک ہوں۔ تمہارے گھر کے پاس ہمارا گھر تھا۔"

"رون..." وہ بولی۔ "تم آرمی میں چلے گئے تھے پھر تمہاری ماں بھی گھر چھوڑ کر چلی گئی... اب وہ کہاں ہیں؟"

"ان کا انتقال ہوگیا۔" رون کا لہجہ دھیما ہوگیا۔ "اس وقت میں افغانستان میں تھا۔"

www.pkdigest.com

"اوہ... ویری سیڈ۔" میکی بولی۔ "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم آف ٹائم میں مجھ سے ملو؟"

"اوہ کیوں نہیں۔" روان نے اسے کھانے کا آرڈر نوٹ کرایا۔ بل کی ادائیگی کے ساتھ روان نے ایک چٹ پر اسے اپنا فون نمبر بھی لکھ کر دے دیا تھا۔ وہ واپس آیا تو خوش تھا۔ میکی سے مل کر اسے اپنے ماضی کا خیال آیا۔ اسے احساس تھا کہ اس علاقے میں سات برسوں میں بہت کچھ تبدیلی ہوگیا ہے۔ اس کے دوست اور جاننے والے بدل چکے تھے یا یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور جا چکے تھے۔ ان دو دنوں میں میکی پہلی شناسا تھی جو اسے نظر آئی تھی۔ وہ فلیٹ میں واپس آیا تو پھر وہی ٹینشن والی کیفیت لوٹ آئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ایسا کیوں ہے... لیکن اس جگہ سے اب اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

وہ رات کو سونے کے لیے بستر پر آیا۔ اس نے اپنا تکیہ اٹھا کر سینے پر رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے کان لیونگ روم کی طرف لگے ہوئے تھے لیکن اس رات اسے کوئی آواز نہیں آئی۔ پھر صبح سویرے اس کی آنکھ شور سے کھلی۔ کچھ دیر تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شور کس کا ہے۔ وہ اٹھا... کوئی دروازہ بجا رہا تھا اور ساتھ میں کسی عورت کی منت سماجت کرنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ روان دروازے تک آیا۔ اس نے کی ہول سے باہر جھانکا تو اسے ایک جوان عورت نظر آئی جس نے پھول دار فراک پہن رکھی تھی اور اس کے بازو اور چہرے پر زخم کے نشان تھے... جیسے کسی نے اس پر تشدد کیا ہو۔ وہ دروازہ بجاتے ہوئے بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ ابھی روان دروازہ کھولنے جا رہا تھا کہ وہ چیخی اور دائیں طرف کے پہلے فلیٹ کے دروازے میں گھس گئی۔ اس کے بعد اس کی آوازیں بھی معدوم ہوگئیں۔ روان نے سر جھٹکا۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے؟' اس نے سوچا اور واپس آکر گھڑی دیکھی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے اور ابھی سورج نکلنے میں بھی کچھ وقت تھا۔ وہ پھر بستر پر دراز ہوا اور سو گیا۔

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر وہ نیچے آیا۔ وہ منیجر سے برابر والے فلیٹ کی عورت کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن منیجر اپنے فلیٹ میں نہیں تھا۔ روان کو کچھ کپڑوں کی ضرورت تھی۔ وہ کپڑے لینے چلا گیا۔ واپسی میں ایک بار پھر منیجر غائب تھا۔ جب وہ لفٹ کی طرف آیا تو اس نے وہاں ایک طویل قامت پولیس افسر کو پہلے ہی موجود پایا۔ وہ اسے گھور رہا تھا پھر لفٹ میں بھی روان کو اس کی نگاہیں مستقل چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ روان جب لفٹ سے نکل کر اپنے فلیٹ کی طرف بڑھا تو وہ اس کے پیچھے تھا۔ روان کو بے چینی ہونے لگی کہ وہ یوں مستقل اس کے پیچھے کیوں آرہا ہے؟ وہ چند قدم کے فاصلے سے اس کے پیچھے تھا۔ روان چلتا ہوا اپنے فلیٹ کے دروازے تک آگیا، تب بھی وہ اس کے پیچھے ہی تھا۔ عین اس وقت جب روان پلٹ کر اس سے اس طرح تعاقب کرنے کی وجہ پوچھنا چاہ رہا تھا، پولیس والے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابی نکال کر برابر والے فلیٹ کے دروازے میں لگاتے ہوئے اندر چلا گیا۔ روان حیران رہ گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا پڑوسی ایک پولیس مین ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ اسے اس طرح کیوں گھور رہا تھا جیسے وہ کوئی مجرم ہو؟

روان اندر آیا۔ اس نے کپڑوں کا تھیلا رکھا۔ اب تک اس کے سارے کپڑے بیگ میں تھے اور اس نے الماری استعمال نہیں کی تھی۔ سابقہ مالکن کا بیشتر سامان وہ کوڑے کی نذر کر چکا تھا لیکن ابھی اس نے کپڑوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پہلی بار اس نے الماری کھولی تو اندر سے بدبو کا ایسا شدید جھونکا آیا کہ اسے ابکائی آتے آتے رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی جانور مر کر سڑ گیا ہو۔ اس نے جلدی سے روم فریشنر لا کر الماری میں اسپرے کیا۔ اس کے بعد بدبو کچھ کم ہوئی۔ پھر اس نے سامنے ٹنگے ہوئے کپڑے ہٹائے تو اسے عقب کی طرف بنے خانوں میں بہت سارے ٹن بند کھانوں کے استعمال شدہ ڈبے نظر آئے۔ ان میں بچا ہوا کھانا سڑ رہا تھا اور اصل میں یہ اسی کی بدبو تھی۔ عورت کے کپڑوں کے ساتھ وہاں عام سی چیزیں پڑی تھیں جو آدمی الماری میں رکھتا ہے۔

روان نے سب سے پہلے کھانوں کے کھلے ٹن ایک شاپر میں جمع کیے اور ان کو لے جا کر گاربیج شوٹ میں ڈالا۔ اس سے بدبو کچھ کم ہوئی۔ اس کے بعد اس نے عورت کے کپڑے ہینگر سے اتار کر ایک خالی کارٹن میں ڈالے۔ اس کا ارادہ اسے کسی خیراتی ادارے کو دینے کا تھا۔ اندر خانوں میں کتابیں اور مختلف استعمال کی اشیا تھیں۔ اس نے کتابیں چھوڑ کر باقی چیزیں بھی کارٹن میں ڈال دیں اور کتابیں اٹھا کر لیونگ روم میں کتابوں والے ریک میں رکھ دیں۔ اس کے بعد اس نے صفائی شروع کی۔ الماری کے فرش پر کچرے کا ڈھیر تھا۔ وہ اسے سمیٹ رہا تھا کہ اس کے نیچے سے ایک چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈر نکلا... روان نے اسے اٹھا کر دیکھا اور باہر آیا۔ اس نے اسے چلایا تو وہ آن ہوگیا۔ اس کے سیل ابھی کام کر رہے تھے۔ پہلے تو ایک بوڑھی عورت ہلکی آواز میں کچھ

گاتے ہوئے پیانو بجا رہی تھی۔ پھر اس نے دہشت زدہ سی چیخ ماری اور اس کے بعد ایسا لگا کہ وہ بھاگ دوڑ کر رہی ہو... اور آخر میں اس نے خود کو کسی جگہ بند کر لیا اور ڈرے ہوئے انداز میں بولنے لگی۔

"وہ آرہا ہے... وہ بہت ظالم ہے... وہ مجھے مار دے گا... پلیز نہیں... نہیں۔" اس کے بعد وہ عورت یوں چلانے لگی جیسے کوئی اس پر بے پناہ تشدد کر رہا ہو۔ اس کے بعد ٹیپ اچانک خاموش ہوگیا۔ روان نے اسے فارورڈ کر کے دیکھا لیکن آگے کچھ نہیں تھا۔ یہ یقیناً اس فلیٹ کی مرحوم مالکن کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ کچھ برا ہوا تھا۔ کسی نے اسے حملہ کر کے قتل کر دیا تھا۔ یہ ایک شہادت تھی جو شاید پولیس کی نظر میں نہیں آسکی تھی۔ روان نے ٹیپ سنبھال کر الماری میں رکھ دیا اور خود صفائی میں لگ گیا۔ الماری اندر سے اتنی گندی تھی کہ اسے مکمل طور پر صاف کرنے میں پورا دن لگ گیا۔ جب کام مکمل کر کے روان نے اس کا پٹ بند کرنا چاہا تو وہ کہیں اٹک گیا۔ روان نے معائنہ کیا تو اسے اندر کی طرف ایک چھوٹی سے کنڈی نظر آئی جس کا بولٹ فرش میں چلا جاتا تھا۔ روان حیران ہوا۔ الماری کے اندر ایسی کنڈی کون لگاتا ہے؟ اس نے گرا ہوا بولٹ اوپر کیا تو پٹ بند ہوگیا۔ پھر [illegible] ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس فلیٹ میں کوئی پُراسرار واقعہ ہوا ہے اور اسے اس بارے میں جاننا چاہیے۔

لیکن وہ کسی اور سے بات کرنے سے پہلے خود اس بارے میں تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رات کا کھانا ریسٹوران میں کھایا جہاں میکی کام کرتی تھی اور اس سے ہیلو ہائے کر کے ایک نزدیکی انٹرنیٹ کیفے میں آگیا۔ اس نے نیٹ پر مقامی خبریں نکالیں۔ فلیٹ کی مالکن کی موت کی خبر تین مہینے پہلے کے اخبارات میں تھی۔ مسز رچمنڈ بیوہ تھی اور اس کا اکلوتا بیٹا بھی جنگ میں مارا گیا تھا، تب سے وہ الگ تھلگ زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا اور اتفاق سے اس کے فلیٹ کے پاس کے تمام فلیٹ بھی خالی تھے اس لیے کسی کو پتا نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ جب وہ تین دن اپنے فلیٹ سے نہیں نکلی تو بلڈنگ منیجر نے اس کی اطلاع پولیس کو دی۔ پولیس نے آکر منیجر سے دروازہ کھلوایا۔ اندر مسز رچمنڈ کی لاش اس کی الماری میں پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس پر تشدد کیا ہو۔ اس کی انگلیوں پر زخم کے نشانات تھے۔ لیکن یہ اس کے مرنے سے کئی دن پہلے کے تھے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق موت دل رکنے سے ہوئی تھی جس کا سبب فاقہ کشی تھی۔ شاید وہ کئی دن تک بھوکی پیاسی اس الماری میں بیٹھی رہی تھی... چونکہ قتل کا کوئی ثبوت نہیں تھا اس لیے پولیس نے ایک ہفتے کی تفتیش کے بعد کیس ختم کر دیا۔

روان نے سوچا، اس کا مطلب ہے کہ پولیس کو اس بارے میں کوئی ثبوت نہیں ملا کہ مسز رچمنڈ کو تشدد کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ اگر وہ یہ کیسٹ ریکارڈر پولیس کو دے دیتا تو ممکن ہے اسے اس سے کوئی مدد ملتی۔ اسے تعجب ہوا کہ ڈاکٹر بھی نہیں جان سکے کہ مسز رچمنڈ کی موت کی اصل وجہ کیا تھی۔ لیکن گھر آتے آتے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ جب پولیس کو معلوم ہوتا کہ وہ چھ مہینے نفسیاتی اسپتال میں زیر علاج رہ کر آیا ہے تو وہ اس کی بات کو سرے سے سنجیدگی سے نہیں لیتی۔ ویسے بھی پولیس اپنے طور پر اس کیس کو بند کر چکی تھی۔

روان اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں پہنچا۔ جیسے ہی وہ راہداری میں مڑا اس نے ایک عورت کو اپنے فلیٹ کا دروازہ بجاتے دیکھا۔ روان نے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی۔ اس نے وہی پھول دار فراک پہن رکھی تھی۔ وہ کسی قدر مشرقی نقوش والی خوب صورت عورت تھی لیکن اس وقت خوف نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ وہ خوف زدہ انداز میں پیچھے بھی دیکھ رہی تھی... پھر وہ مایوس ہو کر پلٹی اور برابر والے دروازے میں گھس گئی۔ اس کے جانے کے بعد روان اپنے فلیٹ میں آگیا۔

'مجھے کسی کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔' اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔ 'ویسے بھی میں اس جگہ نیا ہوں اور اگر کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے تو اسے دیکھنا صرف میرا فرض نہیں ہے۔'

پولیس والا یقیناً مسز رچمنڈ کے مرنے کے بعد یہاں آیا تھا کیونکہ اخباری اطلاعات کے مطابق اس کے آس پاس کے فلیٹ خالی تھے۔ اگر یہ پولیس والا اپنی فیملی سمیت اس وقت ہوتا تو یقیناً اس کا ذکر اخبارات میں ہوتا۔ روان نے سونے سے پہلے الماری میں اپنے کپڑے سیٹ کیے۔ وہ سونے کے لیے لیٹا تو اسے پھر لیونگ روم سے شور کی آواز آنے لگی۔ شور میں ایک مردانہ آواز نمایاں تھی اور ساتھ میں کوئی عورت دبے دبے انداز میں چلا رہی تھی۔ روان کو یقین تھا کہ برابر والا پولیس مین اپنی بیوی پر تشدد کر رہا ہے اور یہ شور اسی کا ہے۔ اس نے دیوار میں موجود سوراخ سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن آواز اتنی ہی آرہی تھی۔ الفاظ غیر نمایاں تھے اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ پولیس والا کیا کہہ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد آواز آنا بند ہوگئی۔ روان واپس بیڈروم میں آگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ براہ راست دخل اندازی مناسب نہیں ہے

www.pkdigest.com

لیکن اسے بلڈنگ منیجر سے اس بات کی شکایت کرنی چاہیے کیونکہ اس شور و غل سے وہ پریشان ہو رہا تھا۔

صبح وہ جلدی اٹھ گیا۔ اس کا ارادہ آج گیراج جانے کا تھا۔ ابھی وہ ناشتا بنا رہا تھا کہ کسی نے زور سے دروازہ بجایا۔ رون نے پہلے کیٹ آئی سے جھانکا۔ اسے سامنے وہی مشرقی نقوش والی عورت نظر آئی۔ اس وقت بھی اس نے پھول دار فراک پہن رکھی تھی۔ وہ بے تابی سے اس کا دروازہ بجا رہی تھی اور ساتھ ہی خوف زدہ انداز میں مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ رون دروازہ کھولنے والا تھا کہ اس نے برابر والے فلیٹ سے پولیس والے کو نکلتے دیکھا۔ اس نے جھپٹ کر عورت کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر لے جانے لگا۔ عورت مظلومانہ انداز میں انکار کر رہی تھی۔ وہ ذرا دور ہوئی تو رون کو اس کے ہاتھوں، پیروں پر تشدد کے نشانات نظر آئے۔

رون کو غصہ آنے لگا۔ یہ شخص اس عورت کے ساتھ کیا کر رہا تھا؟ اگر وہ اس کی بیوی بھی تھی، تب بھی اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے۔ رون کو یاد آیا کہ جب سے وہ یہاں آیا تھا، اس نے ایک بار بھی اس عورت کو باہر نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب باہر نکلی تھی تو اس انداز میں جیسے یہاں سے فرار ہونا چاہتی ہو۔ شاید اس کے شوہر نے اسے قید کر رکھا تھا۔ اس کی بچی بھی ظلم کا شکار نظر آتی تھی۔

کچھ دیر بعد فلیٹ سے عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں اور رون کو لگا کہ اگر اس نے مداخلت نہیں کی تو شاید وہ وحشی اس عورت کو قتل کر دے۔ وہ کچھ دیر تو برداشت کرتا رہا پھر اس کا صبر جواب دے گیا اور وہ دروازے کی طرف لپکا لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ رک گیا... کیونکہ سامنے وہی آرگن بجانے والی بچی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آرگن تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ گئی۔ اس کے بازو پر نیل کے نشان تھے جیسے کسی نے اسے مارا ہو۔ رون نے اس کا ہاتھ دیکھنے کی کوشش کی تو وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔

''اوکے!'' رون نے کہا۔ ''کیا وہ عورت تمہاری ماں ہے؟''

بچی نے سر ہلایا۔ رون نے دوسرا سوال کیا۔ ''کیا پولیس والا تمہارا باپ ہے؟''

اس بار بچی ساکت رہی۔ اس نے اپنے آرگن پر کچھ کیز دبائیں۔ رون نے کیز پر غور کیا اور پھر پیانو کا کور کھولا تو اسے کچھ کیز پر خون آلود انگلیوں کے نشان نظر آئے۔ وہ حیران ہوا کیونکہ اس نے پیانو پہلی بار کھولا تھا اس لیے اسے نہیں معلوم تھا کہ اس پر انگلیوں کے نشانات کہاں سے آ گئے۔ اسے یاد آیا کہ بوڑھی عورت کی انگلیاں بھی زخمی تھیں اور اس نے ان زخمی انگلیوں سے ہی پیانو بجایا تھا۔ اس نے بچی کی طرف دیکھا تو اس نے پھر آرگن بجایا۔ رون نے خون آلود نشانات والی کیز کو دبایا تو ویسی ہی آواز نکلی۔ اسی لمحے برابر والے اپارٹمنٹ سے شور کی آواز شدت سے آنے لگی۔ عورت بری طرح چلا رہی تھی۔ رون نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور جلدی سے موبائل پر پولیس کا نمبر ملایا۔

''ہیلو'' اس نے آپریٹر سے کہا۔ ''یہاں ایک شخص اپنی بیوی پر بری طرح تشدد کر رہا ہے اور وہ خود پولیس والا ہے۔''

''تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟'' رون نے اپنا نام اور پتا بتایا۔ ''اوکے! ہم چیک کرتے ہیں۔''

رون نے موبائل رکھا تو اسے باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ لیونگ روم میں آیا تو بچی غائب تھی۔ اس نے باہر جھانکا وہاں بھی بچی نہیں تھی۔ وہ راہداری میں نکل آیا۔ اب اپارٹمنٹ سے آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے فلیٹ کا دروازہ بجایا اور بلند آواز سے بولا۔ ''مسٹر پولیس مین... میں نے اس واقعے کی اطلاع پولیس کو کر دی ہے اور تمہیں اپنی بیوی اور بچی پر تشدد کا جواب دینا ہوگا۔''

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ایسی خاموشی تھی جیسے فلیٹ بالکل خالی ہو۔ رون نے کئی بار دروازہ بجایا مگر خاموشی رہی۔ دس منٹ بعد راہداری کے کونے پر دو پولیس والے نمودار ہوئے۔ رون ان کی طرف لپکا۔ ''میرا نام رون بریک ہے، میں نے ہی کال کی تھی... یہاں یہ... اس فلیٹ میں۔'' وہ دروازے کے سامنے رکا۔

آنے والے دو پولیس افسران نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اسے وہاں سے دور ہونے کو کہا۔ ایک پولیس افسر نے دروازہ بجایا اور بولا۔ ''نیو یارک پولیس... اندر کسی کو مدد کی ضرورت ہے؟''

دوسری بار اس نے وارننگ دی اور پھر دروازے کا ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ اس نے حیرت سے رون کی طرف دیکھا اور پھر ٹارچ سے اندر روشنی ڈالی۔ دروازہ کھلتے ہی پتا چل گیا کہ فلیٹ خالی ہے۔ وہ اندر آ گئے۔ دروازہ کھولنے والے افسر نے رون کو گھورا۔ ''کیا یہ مذاق ہے؟''

رون بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ عورت، اس کی بچی اور طویل قامت پولیس والا اسی گھر میں رہتے ہیں۔ میں نے ان کو کئی بار آتے جاتے دیکھا ہے۔ اس مظلوم عورت نے کئی بار مجھ سے مدد...''

''بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟'' پولیس افسر غرایا۔ فلیٹ میں سوائے معمولی سے ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کے اور کچھ نہیں تھا۔ ہر جگہ گرد تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ مکان مہینوں سے خالی پڑا ہوا ہے۔ رون کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ جب پولیس افسر نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی تو اسے ہوش آیا۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں اسے حوالات سے نکال کر باہر لایا گیا۔ ہال میں میکی اس کی منتظر تھی۔ اسے نکالنے والے افسر نے میکی سے کہا۔ ''ہم اسے تمہاری ضمانت پر چھوڑ رہے ہیں... لیکن یہ نفسیاتی مریض رہا ہے اور تمہیں اس کی ذمے داری سوچ سمجھ کر اٹھانی چاہیے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں۔'' میکی نے آہستہ سے کہا۔

پولیس والے اسے گزشتہ روز گرفتار کر کے لائے تھے اور انہوں نے اس کے بارے میں مکمل تفتیش کر لی تھی۔ انہیں پتا چل گیا تھا کہ وہ چھ مہینے نفسیاتی اسپتال میں داخل رہا ہے اس لیے انہوں نے اس کے خلاف چارج تو نہیں لگایا لیکن وہ اسے ضمانت کے بغیر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ رون کا یہاں سوائے میکی کے کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ اس نے بتا دیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میکی اس کی ضمانت کرانے آئے گی۔

''میں معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں زحمت دی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میکی مسکرائی۔ ''آدمی مشکل میں ہی دوسرے کے کام آتا ہے۔''

وہ باہر آئے۔ میکی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ پولیس والے اسے سب بتا چکے تھے۔ وہ ایک کافی شاپ میں آئے۔ رون نے کافی منگوائی اور میکی کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم بھی سمجھ رہی ہو کہ میں نے جھوٹ بولا ہے؟''

میکی نے نظریں چرائیں۔ ''نہیں لیکن پولیس غلط نہیں کہہ رہی۔''

''واقعی وہ فلیٹ بالکل ویران تھا لیکن میں نے خود طویل قامت پولیس والے کو اس میں آتے جاتے دیکھا ہے اور پھر وہ مظلوم عورت اور اس کی بچی بھی وہیں سے آتے تھے۔''

''لیکن وہ فلیٹ تو خالی ہے۔''

''ہاں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

میکی کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''رون! کیا تم وہاں رہنے پر مجبور ہو؟''

''نہیں لیکن یہ فلیٹ مجھے آرمی ویلفیئر والوں نے دیا ہے۔''

''بہتر ہے کہ تم کہیں اور منتقل ہو جاؤ۔''

رون نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں کہیں اور منتقل ہو جاتا ہوں۔''

میکی خوش ہو گئی۔ ''کیا میں تمہارے لیے کوئی جگہ تلاش کروں؟''

رون نے سر ہلایا۔ ''ضرور۔'' پھر اس نے ہچکچا کر پوچھا۔ ''کیا تم نے میری بات کا یقین کیا ہے؟''

میکی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''رون! میرے لیے سب سے زیادہ اہمیت تمہاری بات کی ہے۔''

رون کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ میکی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''شکریہ میکی۔''

وہ مسکرائی۔ ''لیکن تمہیں جلد از جلد اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے۔''

''میں نے ایک گیراج میں جاب کر لی ہے اور جیسے ہی کوئی اچھی جگہ ملی، میں اس فلیٹ کو چھوڑ کر وہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔''

کافی ختم کر کے میکی اٹھ گئی۔ ''میں ریستوران سے چھٹی لے کر آئی ہوں اور مجھے پھر جانا ہے۔''

رون ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ''کیا تم میرے گھر آؤ گی؟''

میکی نے سر ہلایا۔ ''ہاں ضرور لیکن یہ نہیں کہہ سکتی کہ کب آؤں گی۔''

''میں انتظار کروں گا۔'' رون نے کہا۔

اپنے فلیٹ میں واپس آتے ہوئے وہ ایک لمحے کو برابر والے دروازے پر رکا۔ اب اسے شبہ ہو رہا تھا کہ اس نے جو دیکھا تھا وہ سچ تھا یا اس کا وہم تھا؟ مگر وہ اس کا وہم نہیں تھا۔ اس نے پولیس والے کو اور عورت کو دیکھا تھا، ان کی بچی کو بھی دیکھا تھا۔ ابھی اسے فلیٹ میں آئے چند منٹ ہوئے تھے کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے دروازے تک آیا اور باہر جھانکا تو اسے منیجر نظر آیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظروں سے منیجر کی طرف دیکھا۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں نے آرمی ویلفیئر والوں کو مطلع کر دیا ہے۔ تم اب اس فلیٹ میں نہیں رہ سکتے۔''

''لیکن کیوں؟''

''پولیس تمہیں کیوں لے گئی تھی؟''

www.pkdigest.com

"وہ ایک غلط فہمی تھی جو دور ہو گئی اور پولیس نے مجھے رہا کر دیا ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا... تمہارے پاس دو دن کی مہلت ہے، تم کہیں اور اپنا بندوبست کر لو۔"

"جب مجھے کہیں اور جگہ ملے گی تو میں یہ منحوس فلیٹ خالی کر دوں گا۔" رون نے بھی خشک لہجہ اختیار کیا۔ "ویسے ایک بات بتا سکتے ہو؟"

"پوچھو..." اس نے بادل ناخواستہ کہا۔

"یہ برابر والا فلیٹ کب سے غیر آباد ہے؟"

منیجر نے فلیٹ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "گزشتہ دو سال سے۔"

"اس سے پہلے اس میں کون رہتا تھا؟"

"ایک پولیس والا اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ رہتا تھا۔" منیجر نے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، اس کے موبائل کی بیل بجی اور وہ کال ریسیو کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ رون اس کی بات سن کر اچھل پڑا... یعنی اس فلیٹ میں سچ مچ کوئی پولیس والا اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ رہ کر گیا تھا۔ اسے بھی تو یہی تین لوگ دکھائی دیے تھے۔ یہ کیا اسرار تھا؟ اس نے فلیٹ کے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر آگے آ کر اس کا ہینڈل تھمایا لیکن دروازہ لاک تھا۔ جب پولیس والے نے اسے کھولا تھا تو وہ آسانی سے کھل گیا تھا۔ رون کو لگا کہ اس کا دماغ جواب دے جائے گا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے اندر آ گیا۔

اگلے دن اس نے سب سے پہلے اخبارات دیکھے اور اس میں کچھ خالی فلیٹس کے اشتہارات پر نشان لگائے۔ پھر وہ گیراج گیا تاکہ اس کے مالک سے چند دن کی مزید مہلت لے سکے۔ جب رون نے اسے بتایا کہ وہ شاید مزید تین چار دن نوکری پر نہ آ سکے تو اس کا منہ بن گیا۔ اس نے کہا۔ "میں زیادہ دن انتظار نہیں کر سکتا... مجھے آدمی کی ضرورت ہے اور تبھی میں نے تمہیں جاب دی تھی۔ اگر تم نہیں کر سکتے تو..."

"نہیں... بس چار دن اور۔" رون نے اسے یقین دلایا۔

"ٹھیک ہے، اگر تم پانچویں دن کام پر نہیں آئے تو پھر آنے کی زحمت مت کرنا۔"

"میں اس سے زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔"

رون نے دن کا باقی حصہ کرائے کا مکان یا فلیٹ دیکھنے میں گزارا لیکن اس کا کام نہیں بنا۔ کہیں جگہ اسے پسند نہیں آئی اور کہیں کرایہ زیادہ تھا۔ ایک عمارت میں لفٹ نہیں تھی اور ساتویں فلور تک اسے سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا۔ وہ تھک کر واپس آ گیا۔ رات کے کھانے کے لیے اس نے باہر جانے کا سوچا لیکن پھر گھر میں بنانے کو ترجیح دی۔ ابھی وہ فریج کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کیا بنائے، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ منیجر اسے پھر یاد کرانے آیا ہوگا۔ لیکن اس نے دروازہ کھولا تو سامنے میکی کو دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ "تم آؤ اندر آؤ۔"

میکی نے ایک کاغذ کا شاپر اٹھا رکھا تھا۔ "تم کھانا بنا رہے تھے؟" اس نے کچن کی طرف دیکھا۔ "لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں فش فرائی اور گارلک بریڈ لائی ہوں۔"

"شکریہ۔" رون نے کہا۔ وہ لیونگ روم میں آ گئے۔ میکی نے پیانو کے ساتھ ٹوٹی دیوار دیکھی۔

"یہ کیا ہوا ہے؟"

"پتا نہیں، میں نے جب پیانو ہٹایا تو یہ اسی طرح تھی۔"

"پیانو کیوں ہٹایا تھا؟"

رون جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ "وہ... مجھے اس کے عقب سے آوازیں آئی ہیں۔ اس لیے میں نے ہٹا کر دیکھا۔"

میکی نے ردعمل ظاہر نہیں کیا اور بولی۔ "پھر اسے واپس اپنی جگہ پر نہیں کیا؟"

"نہیں، بس میں نے اسے ایسے ہی رہنے دیا۔ ویسے بھی میں ایک دو دن میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔"

میکی نے سر ہلایا۔ "یہ سب سے اچھی بات ہے۔"

انہوں نے ڈنر کیا۔ رون نے ایک ریڈ وائن کی بوتل کھولی۔ کھانے کے بعد اس نے کافی بنائی اور پھر میکی کو وہ سب بتا دیا جو اس نے اس فلیٹ میں آنے کے بعد دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ "میں نہیں جانتا کہ یہ سب سچ ہے یا میرے محسوسات ہیں لیکن کل ہی مجھے منیجر نے بتایا ہے کہ اس فلیٹ میں دو سال پہلے ایک پولیس والا اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ رہتا تھا۔"

"تم نے اس کے بارے میں پوچھا؟"

"نہیں، منیجر کی کال آ گئی تھی اور وہ چلا گیا۔"

"اس فلور پر کوئی اور نہیں رہتا؟"

"مجھے زیادہ افراد کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ شاید ایک دو فلیٹ اور بھی آباد ہوں گے۔ پھر ویسے بھی اب مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔"

میکی خاموش ہو گئی۔ کافی کے بعد اس نے جانے کی اجازت چاہی۔ رون اسے نیچے تک چھوڑنے آیا۔ وہ واپس اوپر پہنچا تو اس نے راہداری میں خالی فلیٹ کے سامنے اسی لمبے پولیس والے کو دیکھا۔ وہ ساکت کھڑا تھا پھر وہ اندر چلا گیا

اور عقب میں دروازہ بند ہو گیا۔ رون اس کی طرف لپکا لیکن جب وہ دروازے کے پاس پہنچا تو وہ بند ہو چکا تھا اور لاک بھی تھا۔ اس نے ہینڈل پکڑ کر جھنجوڑا اور چلایا۔ "دروازہ کھولو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اندر ہو... دروازہ کھولو... لعنتی شخص۔"

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ دیوانوں کی طرح دروازے سے لڑ رہا ہے ___ ایک طرف کھڑا موٹا سا شخص اسے خوف اور حیرت سے دیکھ رہا تھا پھر جیسے ہی رون نے اس کی طرف دیکھا، وہ جلدی سے راہداری کے وسط میں اپنے فلیٹ میں گھس گیا۔ رون اس کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد موٹے آدمی نے باہر جھانکا اور بولا۔ "کیا بات ہے؟"

"مسٹر! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" رون نے نرمی سے کہا۔

"لیکن میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"پلیز!" رون نے لجاجت سے کہا۔ "میں تم سے صرف کچھ معلومات چاہتا ہوں۔ تم یہاں کے پرانے رہائشی ہو؟"

"نہیں، میں سات مہینے پہلے آیا ہوں۔"

"پھر بھی تمہیں زیادہ معلوم ہوگا۔"

"کس بارے میں؟"

"اس فلیٹ کے سابق رہائشیوں کے بارے میں۔" رون نے خالی فلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" موٹے شخص نے انکار کیا۔

"یہ تو جانتے ہو گے کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں جانتا کہ اس فلیٹ میں رہنے والی ایک عورت اور اس کی بچی کا قتل ہوا تھا۔"

"عورت اور بچی..." رون کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ "انہیں کس نے قتل کیا تھا؟"

"مجھے اس بارے میں نہیں معلوم... مجھے منیجر نے بس اتنا ہی بتایا تھا۔" موٹے آدمی نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔

رون واپس اپنے فلیٹ کی طرف آیا۔ اس نے برابر والے فلیٹ کی طرف دیکھا۔ یعنی وہ عورت اور بچی اصل میں زندہ نہیں ہیں۔ اس نے سوچا۔ تو کیا وہ ان کی روحیں ہیں جو اب تک بھٹک رہی ہیں... یا کوئی اور عورت اور اس کی بچی ہے؟ پولیس والا موجود تھا اور ممکن ہے اس نے اس فلیٹ کی ڈپلی کیٹ چابی بنا رکھی ہو اور اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہو۔ اپنے فلیٹ میں آ کر اس نے دیوار والے سوراخ سے دیکھا لیکن دوسری طرف سوائے تاریکی کے اور کچھ نہیں تھا۔ رون ایک ہتھوڑی اور اسکرو ڈرائیور لایا اور اس نے اسکرو ڈرائیور سوراخ پر رکھ کر ہتھوڑی سے ضرب لگائی۔ دوسری طرف سے کوئی چیز ٹوٹ کر گری۔ رون کو اب دوسری طرف نظر آنے لگا۔ کمرے میں روشنی تھی اور وہ خالی نظر آ رہا تھا۔ اچانک ہی دوسری طرف سے کسی شخص کی آنکھ دکھائی دی۔ رون ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہمت کر کے دوسری طرف دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے پیانو کھسکا کر دیوار کے سامنے کر دیا اور خود وہاں سے ہٹ گیا۔ اگر فلیٹ خالی تھا تو دوسری طرف سے کس نے جھانکا تھا؟ رون نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ آنکھ کسی مرد کی تھی۔ تو کیا پولیس والا اندر موجود تھا؟ اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جا کر باہر دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ پلٹ کر آنے لگا تو دستک دوبارہ ہوئی اور اس بار اس نے دیکھے بغیر دروازہ کھول دیا۔ رون سن رہ گیا۔ سامنے طویل قامت پولیس والا کھڑا تھا اور اس نے پتلون کے ساتھ گرے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا قد رون سے کم سے کم [illegible] زیادہ تھا۔ وہ ذرا آگے جھکا اور رون کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"بہتر ہوگا کہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔"

"تت... تم کون ہو؟"

پولیس والا جواب دینے کے بجائے کچھ دیر اسے سخت نظروں سے گھورتا رہا پھر پلٹ کے اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ اس فلیٹ میں جو خالی تھا۔ رون نے ایک بار پھر پولیس کو فون کرنے کا سوچا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پولیس کبھی اس کی بات کا اعتبار نہیں کرے گی۔ اس لیے پولیس سے بات کرنا بے کار تھا۔ اسے جو کرنا تھا، خود ہی کرنا تھا۔ رون بیڈروم میں آ گیا اور سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے اور فلیٹ سے نکل آیا۔ عمارت سے باہر آ کر اس نے اردگرد دیکھا۔ یہ مین سڑک تھی اس لیے یہاں ٹیکسیاں موجود تھیں۔ اس نے سڑک عبور کی اور دوسری طرف ایک دکان کے شیڈ تلے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظر عمارت کے داخلی دروازے پر مرکوز تھی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد اسے طویل قامت پولیس والا وہاں سے نکلتا دکھائی دیا۔ اس نے اب یونیفارم پہن رکھی

www.pkdigest.com

تھی۔ وہ بس اسٹینڈ کی طرف گیا اور وہاں کسی بس کا انتظار کرنے لگا۔ رون نے اشارے سے ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی رکو... جب میں کہوں تب چلنا۔“

”یس سر۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

کچھ دیر بعد ایک بس آئی اور پولیس والا اس میں سوار ہو گیا۔ رون نے ڈرائیور سے کہا۔ ”اس بس کے پیچھے چلو۔“

ڈرائیور نے اسے سر گھما کر دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ جب بس چلی تو وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ نصف گھنٹے بعد پولیس والا پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے اتر گیا اور اندر چلا گیا۔ رون نے ٹیکسی رکوا کر اسے کرایہ دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر ہیڈ کوارٹر کے اندر آ گیا۔ یہاں سیکڑوں پولیس والے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ طویل قامت پولیس مین کو کس طرح تلاش کرے۔ وہ اندر اس طرح آزادی سے نہیں گھوم سکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی روک کر اس سے نہ پوچھ لے۔ وہ باہر آ گیا۔ ویسے یہ کسی کا ڈیوٹی پر آنے کا وقت نہیں تھا۔ شاید طویل قامت پولیس والا کسی کام سے آیا تھا۔ رون باہر آ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد ہی باہر آ گیا۔ اس بار اس نے پارکنگ میں کھڑی ایک پولیس کار نکالی اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رون نے ایک ٹیکسی روک لی اور اس کا تعاقب کرنے لگا۔ پولیس کار ہاربر کے علاقے میں جا کر رکی اور طویل قامت شخص گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ رون نے ٹیکسی والے کو رکنے کو کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ اس نے بیس ڈالرز کا ایک نوٹ اگلی نشست پر پھینکا اور طویل قامت شخص کے پیچھے لپکا۔

طویل قامت شخص نجی گوداموں والے علاقے میں تھا۔ چند منٹ بعد وہ بڑے سے گودام کے گیٹ کے چھوٹے ذیلی دروازے سے اندر چلا گیا۔ گلی بالکل سیدھی تھی اور یہاں اسٹریٹ لائٹس کی تیز روشنی تھی۔ اگر طویل قامت شخص اچانک واپس آ جاتا تو وہ کہیں چھپ نہیں سکتا تھا۔ رون نے خطرہ مول لینے کے بجائے اس کا انتظار کر لینا مناسب سمجھا۔ نہ جانے وہ پولیس کار میں یہاں کیوں نہیں آیا تھا حالانکہ پولیس کار آرام سے یہاں تک آ سکتی تھی۔ اس نے کار خاصی پیچھے چھوڑ دی تھی۔ رون گلی کے کونے پر انتظار کرتا رہا۔ پولیس والا ابھی اندر ہی تھا۔ اچانک رون کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ یہ تو طے تھا کہ یہ کوئی ماورائی چکر نہیں ہے۔ پولیس والا سو فیصد انسان تھا اور لازمی بات تھی کہ وہ عورت اور لڑکی بھی اصل تھے۔ اگر

ایسا ہی تھا تو وہ یقیناً اس فلیٹ میں موجود تھے۔ یہ خیال آتے ہی رون واپس آیا اور اس نے ٹیکسی والے کو وہاں چلنے کو کہا۔

عمارت کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر وہ اندر کی طرف لپکا... وہ پُرجوش ہو رہا تھا لیکن اندر داخل ہوتے وقت اس نے خود کو معمول کے مطابق کر لیا۔ اسے خدشہ تھا کہ کسی سے اس کا سامنا نہ ہو جائے۔ لیکن اتفاق سے اوپر آنے تک کسی سے اس کا سامنا نہیں ہوا۔ فلیٹ میں داخل ہو کر اس نے بیڈ روم کا رخ کیا جس کی کھڑکی کے پاس سے ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والے زینے گزر رہے تھے۔ اس نے کھڑکی کا پٹ اوپر کیا اور سیڑھیوں پر آ گیا۔ ہر فلیٹ کے لیے الگ الگ سیڑھیاں تھیں۔ وہ پہلے سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آیا اور وہاں سے برابر والے فلیٹ کی سیڑھیوں پر اتر آیا۔ وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے لیکن تاریکی میں اس کا امکان کم ہی تھا۔ بالآخر وہ فلیٹ کے سامنے والی سیڑھی تک پہنچا اور اس نے کوشش کر کے کھڑکی کا پٹ اوپر کر دیا۔ اس کا خدشہ غلط نکلا کہ کھڑکی اندر سے بند ہو گی۔ اس کی کوشش تھی کہ کوئی آواز نہ ہو۔ پٹ اوپر کر کے وہ دبے قدموں اندر آیا۔ اندر تاریکی تھی، صرف کھڑکی سے کسی قدر روشنی آ رہی تھی۔

رون بنا آہٹ کے دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ اس فلیٹ کے لاؤنج میں نکلا تھا، بیڈ روم عقب کی طرف تھا۔ اچانک اسے کسی کی سسکی کی آواز آئی۔ وہ رک گیا۔ ایک لمحے کو اسے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے لیکن پھر وہ حوصلہ کر کے آگے بڑھا۔ جیسے ہی وہ بیڈ روم کے سامنے پہنچا اندر کھلبلی سی مچ گئی۔ بچی نے رون کے برابر سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن رون نے اسے پکڑ لیا۔

”آرام سے... آرام سے... یہ میں ہوں۔“

بچی نے بھی آواز سے اسے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی عورت بھی اندر سے نکل آئی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔ رون نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”ڈرو مت۔ یہ میں ہوں... پلیز ڈرو مت۔“

مدھم روشنی میں عورت نے ذرا دیر سے اسے پہچانا۔ وہ پھر خوف زدہ نظر آنے لگی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہا۔ ”تم یہاں سے... چلے جاؤ... وہ آ گیا تو تمہیں مار دے گا۔“

”تم پولیس والے کی بات کر رہی ہو؟“ رون نے پوچھا۔

عورت نے سر ہلایا۔ ”وہ بہت ظالم ہے۔“

”اس نے تمہیں یہاں کیوں رکھا ہے اور اس کا تم سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں ہے... ہم اس کی قید میں ہیں۔“

”قید میں کیسے؟“ رون حیران ہوا۔ ”کیا تم احتجاج نہیں کرتے؟“

”یہاں کوئی... ہماری نہیں سنتا۔“ عورت بولی۔ ”سب اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں... تم باہر سے آئے ہو اس لیے تم سے مدد مانگی۔“

”اس دن جب تم مدد مانگنے آئی تھیں اور وہ تمہیں پکڑ کر لے گیا تھا، تب میں نے تمہاری بچی کے آنے پر پولیس کو کال کی تھی اور جب پولیس آئی تو یہ فلیٹ خالی تھا۔ تم لوگ کہاں چلے گئے تھے؟“

”ہم اندر تھے لیکن جب پولیس آئی تو وہ ہمیں لے کر پچھلی سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔“

رون کو اندازہ ہو گیا کہ عورت اور بچی کا تعلق امریکا سے نہیں ہے۔ وہ ممکنہ طور پر مشرق بعید کے کسی ملک سے تعلق رکھتی تھیں۔ رون نے پوچھا۔ ”تمہارا تعلق کہاں سے ہے اور تم امریکا کیسے آئیں؟“

عورت نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”میرا تعلق فلپائن سے ہے اور مجھے میرے خاندان سمیت اسمگل کر کے یہاں لایا گیا ہے۔ ہمیں ایک بحری جہاز میں قید کر کے لایا گیا تھا پھر یہاں اتارا گیا۔ ایک بہت بڑی سی جگہ ہمیں لوہے کے ڈبوں میں قید رکھا گیا تھا۔“

رون کے ذہن میں اس گودام کا خیال آیا جہاں طویل قامت شخص گیا تھا۔ شاید اسمگل کر کے لائے جانے والوں کو وہیں رکھا جاتا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ عورت اور اس کی بچی کو یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ رون نے عورت سے سوال کیا تو وہ کانپنے لگی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم... لیکن وہ درندہ ہے۔ جب تک یہاں ہوتا ہے، مجھ پر اور میری بچی پر تشدد کرتا ہے۔ اسے ہم پر ذرا رحم نہیں آتا... کئی بار اس نے میری بچی کے سامنے مجھے...“ عورت کہتے کہتے رک گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رون اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ اس کے سامنے بڑی خوفناک صورت حال واضح ہوئی تھی۔ طویل قامت شخص یقیناً اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ پورا گینگ تھا جو لوگوں کو اسمگل کر کے امریکا لا رہا تھا اور شاید یہ بردہ فروشی کا نیا طریقہ تھا۔ ان لوگوں کو حکام کا تعاون بھی حاصل تھا، جبھی تو وہ

اتنے کھلے عام یہ کام کر رہے تھے۔ طویل قامت شخص اپنی وحشت کی تسکین کے لیے اس عورت اور اس کی بچی کو یہاں لایا تھا اور شاید دو سال پہلے قتل ہونے والی عورت اور اس کی بچی کا قاتل بھی وہی تھا۔

رون کے خیال میں پولیس کو اطلاع کرنا ضروری تھا مگر وہ ہچکچا رہا تھا۔ اس نمبر سے پہلے بھی اس نے پولیس کو کال کی تھی اور اب وہ دوبارہ اسی نمبر سے کال کرتا تو ممکن ہے پولیس اسے سنجیدگی سے نہیں لیتی۔ مگر اسے کال تو کرنا تھی۔ اس نے موبائل نکالا تھا کہ فلیٹ کے باہر دروازے میں چابی لگنے کی آواز آئی۔ جب تک وہ لیونگ روم میں جانے کے بارے میں سوچتا، دروازہ کھل جاتا۔ اب وقت نہیں تھا۔ وہ عورت اور بچی کو دھکیلتا ہوا بیڈ روم میں آ گیا۔ پھر اس نے تیزی سے موبائل کی کیز دبائیں۔ اس دوران میں باہر سے آنے والا بیڈ روم تک آ گیا تھا۔ اس نے اندر آ کر لائٹ آن کی اور رون کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ طویل قامت پولیس والا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر رون اس کی طرف جھپٹا۔ وہ تربیت یافتہ فوجی تھا اور جسمانی لڑائی کے طریقوں سے واقف تھا لیکن طویل قامت شخص اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے تیزی سے ایک طرف ہٹتے ہوئے اپنی بیلٹ میں لگا ڈنڈا نکالا اور گھما کر رون کے سر پر رسید کیا۔ ضرب شدید تھی۔ رون فرش پر جا گرا۔ چکراتے ذہن سے اس نے عورت اور اس کی بچی کو دیکھا جو دیوار کے کونے میں دبکی ہوئی تھیں اور پھر پولیس والے کو دیکھا۔ اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

رون کو ہوش آیا تو کچھ دیر تک اسے یاد نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ ایک صاف ستھرے سفید بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اچانک اسے سب یاد آ گیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ زندہ کیسے ہے؟ پولیس والے کو اسے قتل کر دینا چاہیے تھا کیونکہ وہ بچ جاتا تو اس کے بارے میں پولیس کو بتا دیتا۔ اسی لمحے ایک نرس نے اندر جھانکا اور اسے ہوش میں دیکھ کر اندر آ گئی۔

”اب تم کیسے ہو؟“ اس نے رون کی کلائی تھامی۔

”ٹھیک ہوں لیکن میں یہاں کیسے آیا؟“

”اس کا جواب تمہیں باہر بیٹھا پولیس افسر دے گا لیکن پہلے ڈاکٹر تمہیں چیک کرے گا۔“ نرس نے بتایا اور باہر چلی گئی۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے رون کا معائنہ کیا اور اس سے چند سوالات کیے۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ رون کی

www.pkdigest.com

وہاغی حالت درست ہے اور اس ضرب سے اس کے دماغ کو نقصان نہیں ہوا ہے تو اس نے پولیس افسر کو اس سے ملنے کی اجازت دے دی۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور اس پر ٹانکے آئے تھے۔ پولیس افسر اندر آیا۔

"میرا نام آندرے ولی ہے۔" پولیس افسر نے اپنا تعارف کرایا۔

"وہ سب پکڑے گئے؟" رون نے بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ پکڑے گئے ہیں اور باقی بھی جلد پکڑ لیے جائیں گے۔ لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے۔ اور تم اس میں کس طرح شامل ہوئے؟"

رون نے گہری سانس لی اور پولیس افسر کو بیان دینے لگا۔ وہ اپنی نوٹ بک پر نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی درمیان میں سوال بھی کر لیتا۔ کوئی ایک گھنٹے کے انٹرویو کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"آج شام تک میں یہ بیان ٹائپ کروا کے لاؤں گا۔ تم اس پر سائن کر دینا۔"

"ٹھیک ہے لیکن مجھے ان لوگوں کے بارے میں تو بتاؤ... بلکہ پہلے تو یہ بتاؤ کہ میں بچا کیسے اور پولیس کیسے آئی؟ مجھے تو لگ رہا تھا کہ وہ مجھے قتل کر دے گا۔"

"تمہارے موبائل فون کی مدد سے۔" پولیس افسر نے کہا۔ "تم نے چالاکی سے کام لے کر اس وقت پولیس کا نمبر ملا دیا تھا جب ڈیک نے تمہیں بے ہوش کر دیا۔"

"ایک منٹ... یہ اس لمبے پولیس افسر کا نام ہے؟"

"ہاں، بدقسمتی سے وہ پولیس افسر ہی ہے۔ تمہاری خوش قسمتی کہ وہ تمہیں چھوڑ کر اس عورت پر ٹوٹ پڑا اور اسے بُری طرح تشدد کا نشانہ بنانے لگا۔ پولیس آپریٹر ساری آوازیں سن رہی تھی۔ اس نے پہلے معلوم کرایا کہ کال کہاں سے ہو رہی ہے پھر موبائل سگنل کی مدد سے پولیس ٹریس کرتی ہوئی وہاں تک آ گئی۔ اس دوران میں ڈیک نے عورت کو بھی بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔ وہ بھی اسی اسپتال میں ہے اور اس کی جان بھی بچ گئی ہے۔ اس کے بیان کی روشنی میں پولیس مزید کارروائی کر رہی ہے۔"

"یہ لوگ انسانوں کو اسمگل کرتے ہیں؟"

"ہاں... نہ صرف اسمگل کرتے ہیں بلکہ بردہ فروشی بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ غریب ملکوں سے لوگوں کو لالچ دے کر یہاں لاتے ہیں اور ان کو دولت مند جرائم پیشہ افراد اور زمینداروں کو فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ عورت اور اس کی بچی بھی اسی طرح لائے گئے ہیں۔"

"وہ بتا رہی تھی کہ اس کا شوہر بھی ہے؟"

"ہاں، پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔ ہم نے ہاربر میں گودام سے مزید ایسے سو افراد کو برآمد کیا ہے۔"

"ڈیک پہلے بھی یہاں ایک عورت اور بچی کو لایا تھا جو قتل کر دی گئی تھیں۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔"

"ہاں لیکن اس وقت اس کیس میں ڈیک کا نام نہیں آیا تھا۔ اصل میں عمارت کا منیجر اس کے ساتھ ملا ہوا تھا اور اسی نے ڈیک کو یہ فلیٹ دیا ہوا تھا لیکن ویسے اسے خالی ظاہر کرتا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے اس راہداری کے سارے فلیٹ خالی رکھتا... اور اسی وجہ سے ان کی مرمت کرانے سے گریز کرتا تھا۔ تمہیں کیونکہ آرمی ویلفیئر والوں نے بھیجا تھا، اس لیے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔"

"میرے خدا! منیجر ملا ہوا تھا... تب ہی تو میں حیران تھا کہ ڈیک اتنی آسانی سے اس فلیٹ کو کس طرح استعمال کر رہا ہے۔"

"ڈیک جنونی شخص اور تشدد کا شوقین ہے۔ وہ خاص طور سے ایسی عورت پر تشدد کرتا تھا جس کی کوئی بچی ہو۔ وہ اسمگل کیے لوگوں میں سے ایسی عورت کو چن کر لے آتا تھا اور [illegible] کرتا تھا۔ جو عورت [illegible] وہ بھی اسی کا [illegible] تھا لیکن منیجر کی [illegible] سے وہ بچ نکلا کیونکہ منیجر نے اس کا نام پتا غلط لکھا تھا۔ لیکن اس بار وہ ایسا پھنسا ہے کہ جیتے جی جیل سے باہر نہیں آ سکتا۔"

رون کو خیال آیا۔ "میں جس فلیٹ میں رہ رہا ہوں اس کی مالکن بھی پراسرار موت کا شکار ہوئی تھی۔ صفائی کے دوران میں مجھے ایک ایسا ٹیپ ریکارڈر ملا تھا جس میں اس کے آخری لمحات کی آوازیں ریکارڈ ہیں۔ ممکن ہے پولیس کو اس سے کچھ مدد ملے۔"

"وہ ٹیپ ریکارڈر کہاں ہے؟"

"میرے فلیٹ میں ہے۔" رون نے بتایا۔

"او کے! ہم دیکھ لیں گے۔" پولیس افسر اٹھتے ہوئے بولا۔ "باہر ایک پیاری سی لڑکی بیٹھی ہے... کیا میں اسے اندر بھیج دوں؟"

"میگی۔" رون نے بے تابی سے کہا۔ "ہاں، اسے بھیج دو۔"

چند لمحے بعد میگی آئی تو رون کو لگا جیسے کمرا جگمگا اٹھا ہو۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں محبت کی چمک صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"اوہ! تو یہ ہے وہ حسین جنت جہاں تم ویک اینڈ گزارتے ہو؟"

میری نے پُرشوق نگاہوں سے اس خوب صورت کاٹیج کو دیکھتے ہوئے کہا جس کی چھت کسی گرجا گھر کی طرح اونچی اور فرش قیمتی لکڑی کے تختوں سے مزین تھا اور بڑے کمرے کی وسیع و عریض کھڑکی سے کرین بیری جھیل کا نیلگوں پانی انتہائی دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ ڈیوی اس کی پشت پر کھڑا میری کی محویت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ جس سیکنڈری اسکول میں بیالوجی پڑھاتا تھا، میری وہاں سیکریٹری تھی۔ بلاشبہ اس کی خوب صورتی میں کوئی کلام نہ تھا۔ دلکش نقش و نگار کے ساتھ جو خوبی اسے دوسری لڑکیوں سے ممتاز کرتی، وہ اس کے لمبے سیاہ بال اور زیتون جیسی چکنی جلد تھی۔ اس روز بھی وہ آسمانی رنگ کے سویٹر اور سیاہ ٹراؤزر میں غضب ڈھا رہی تھی۔ تینتیس سال کی عمر میں وہ ایک شادی کر چکی تھی اور دوسری شادی ڈیوی سے کرنا چاہتی تھی لیکن وہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔

اس سہ پہر ڈیوی کی بیوی میری اور دونوں چھوٹی بیٹیاں وی لائن سنگ کا میوزیکل شو دیکھنے ٹورنٹو گئی ہوئی تھیں لہٰذا ڈیوی کو موقع مل گیا کہ وہ میری کے ساتھ اس کاٹیج میں کچھ وقت گزار سکے۔ میری کو موٹل جانا پسند نہیں تھا جبکہ یہاں آ کر اسے یوں لگا جیسے ڈیوی نے اسے دعوت پر بلایا ہو۔ وہ ایک ایک چیز کو تعریفی انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اس دوران ڈیوی نے ہیٹنگ سسٹم آن کر دیا۔ یہ اکتوبر کا پہلا ہفتہ تھا اور کاٹیج گزشتہ اتوار

کی بندھی ازدواجی زندگی بتانے والے شوہر کو پیش آنے والی صورت حال کا احوال

حیات کی رہ گزر پر ساتھ چلتے اجنبیوں میں اکثر شناسائی ہو جاتی ہے اور اس شناسائی کے نتیجے میں کبھی اتفاقات رونما ہوتے ہیں ... اور کبھی حادثات ...... ایسے ہی دو اجنبیوں کا قصہ جو اتفاق سے ملے اور ایک حادثے نے ان کے تعلق کو نیا موڑ دے دیا۔

عہد گرفتہ

سیریناراض

سے بند پڑا ہوا تھا۔ اس لیے ڈیوی کو باہر کے مقابلے میں یہاں کچھ زیادہ ہی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا میں تمہارا گھر دیکھ سکتی ہوں؟" تیری نے آتش دان کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔" ڈیوی نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تو وہ کچن کی جانب چل پڑی۔ وہاں کا سامان دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ ڈیوی کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہوئے بولی۔ "واؤ! تمہارے کچن میں تو اتنا سامان ہے جو میرے پورے اپارٹمنٹ میں بھی نہیں ہوگا۔ اسٹوو، فریج، واشر، ڈرائر، ڈش واشر، مائیکرو ویو... یہاں رہنے والوں کی زندگی کتنی آسان ہوگی۔"

ڈیوی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "یہ سب چیزیں میری ساس نے خریدی تھیں کیونکہ وہ سہولت سے زندگی گزارنے کی عادی تھی۔ وہ اس وقت تک یہاں نہیں آئی جب تک اسے یقین نہ ہو گیا کہ اس کاٹیج میں سہولت کی ہر شے موجود ہے۔ میری بیوی نے یہاں کا انتظام سنبھالنے کے بعد صرف مائیکرو ویو کا اضافہ کیا ہے۔"

"گویا یہ کاٹیج تمہاری بیوی کا ہے؟"

ڈیوی یہ سن کر تھوڑا سا شپٹایا لیکن جھوٹ بولنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس لیے بات بناتے ہوئے بولا۔

"یہ ہمارا فیملی کاٹیج ہے لیکن اس کی ملکیت اسی کے نام ہے۔"

تیری نے ایک آہ بھری اور بولی۔ "دولت مند ہونا بھی ایک نعمت ہے۔ تم خوش قسمت ہو ڈیوی کہ تمہیں ایک امیر بیوی ملی۔"

ڈیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے یہ سوچ کر ہی ندامت ہوتی تھی کہ میری کے پاس دولت تھی اور وہ اس کے مقابلے میں کم حیثیت رکھتا تھا، حالانکہ وہ اشاروں کنایوں میں کئی بار اس خواہش کا اظہار کر چکا تھا کہ اس کاٹیج کی ملکیت مشترکہ ہونی چاہیے لیکن میری نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے رہنے کے لیے آتا ہے۔

تیری کی نظریں کھڑکی سے باہر جھیل پر جمی ہوئی تھیں جس کا نیلگوں پانی چمکتی دھوپ میں لشکارے مار رہا تھا۔ وہ مسحور کن انداز میں بولی۔ "جھیل کا چمکتا پانی اور زرد پتوں کی بہار... کیا خوب نظارہ ہے۔"

ڈیوی اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ "خزاں کا موسم مجھے ہمیشہ سے ہی پسند ہے اور میں یہ لمحات تمہارے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ دیکھو۔" تیری استعجابیہ انداز میں بولی۔ "اس کشتی میں ایک مرد اور ایک عورت نظر آ رہے ہیں۔"

ڈیوی نے اس جانب دیکھا اور کشتی پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "ہاں، دیکھ رہا ہوں۔ وہ لائف جیکٹ کے بغیر ہی کشتی میں گھوم رہے ہیں۔"

سرخ رنگ کی کشتی میں بیٹھا شخص مضبوط قامت تھا۔ عورت نے اپنے سنہری بال پونی ٹیل کی شکل میں باندھ رکھے تھے۔ اس نے نیلی جیکٹ اور سیاہ پینٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

"میں اس شخص کو جانتا ہوں۔" ڈیوی بولا۔ "اس کا نام ایلون ٹالٹیر ہے اور اس کا کاٹیج یہاں سے کچھ فاصلے پر چڑھائی کی جانب ہے، البتہ اس لڑکی کو میں نہیں جانتا۔ لگتا یہی ہے کہ وہ بھی ایلون کے ساتھ وقت گزارنے یہاں آئی ہے۔"

"چلو، میں تمہارا کاٹیج پوری طرح دیکھ لوں۔" تیری نے ڈیوی کا بازو پکڑا اور کوریڈور کی جانب بڑھ گئی۔ پہلے... بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈیوی نے بتایا کہ یہ اس کی چار سالہ بیٹی کیٹ کا کمرا ہے جبکہ دوسرا بیڈ روم آٹھ سالہ سلی کا تھا جس کی دیواروں پر کتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جبکہ شیلف میں بھی زیادہ تر کتابیں کتوں سے ہی متعلق تھیں۔

"لگتا ہے کہ سلی کو کتے بہت پسند ہیں؟" تیری نے انداز سے کہا۔

"ہاں، پاگل پن کی حد تک۔"

"کیا اس نے کوئی کتا پال رکھا ہے؟" تیری نے پوچھا۔

"نہیں۔ میری کو گھر میں جانور رکھنا پسند نہیں۔ وہ مجھے ہی بڑی مشکل سے برداشت کر رہی ہے۔"

وہ شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہارے اندر کا جانور مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

ڈیوی نے پیار سے اس کا کان مروڑا تو وہ کسمساتے ہوئے بولی۔ "چھوڑو مجھے... تکلیف ہو رہی ہے۔"

پھر وہ دونوں ماسٹر بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔ ڈیوی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہاں کی آرائش دیکھ کر تیری کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرے کے پورے فرش پر گہرے نیلے رنگ کا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا جبکہ باہر کی جانب کھلنے والی واحد کھڑکی پر بھی بیش قیمت پردے موجود تھے۔ وسط میں جہازی سائز بیڈ پر آرام دہ تکیے دیکھ کر بے اختیار اس پر لیٹنے کو دل چاہنے لگتا۔

"واؤ!" تیری نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے تعریفی انداز میں کہا۔ "یہ کمرا تو میرے اپارٹمنٹ سے بھی بڑا ہے۔"

وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے لے جاتے ہوئے مسکرائی۔ "کیوں نہ کچھ دیر آرام کیا جائے۔"

اس کی مسکراہٹ میں دعوت تھی۔ ڈیوی آگے بڑھا لیکن پھر اچانک ہی رک گیا۔ "نہیں... یہاں نہیں۔"

"کیوں؟"

"میری اور میں..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ان تنہائی کے لمحات میں وہ اپنی گرل فرینڈ کو کس طرح بتاتا کہ اس کے دل میں اپنی بیوی کے لیے کتنی محبت اور احترام ہے۔

"کیا تم کسی بات سے خوف زدہ ہو؟" تیری کچھ الجھتے ہوئے بولی۔

ڈیوی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ تیری کو اپنی بات سمجھانے سے قاصر ہے۔ اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی کے علاوہ اس بستر پر..."

"ٹھیک ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "لیکن تم اپنی خواہشات شیئر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔"

ڈیوی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "یہ کاٹیج میری بیوی کا ہو سکتا ہے لیکن خواہشات تو میری اپنی ہیں۔"

تیری بھی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ "آل رائٹ! ہم کون سا بیڈ روم استعمال کر سکتے ہیں... میرا مطلب ہے کہ تم اپنے مہمانوں کو کہاں ٹھہراتے ہو؟"

وہ اسے لے کر ایک دوسرے کمرے میں آ گیا جو کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ اس نے تیری سے کہا کہ وہ کچھ دیر آرام کرے تب تک وہ آتش دان میں آگ جلاتا ہے۔ وہ یہ کام پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا لیکن اس روز نہ جانے کیا ہوا کہ کئی مرتبہ کوشش کرنے کے باوجود لکڑیاں آگ نہ پکڑ سکیں۔ اس نے شرمندگی سے تیری کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میں ایک کوشش اور کرتا ہوں۔ شاید لکڑیاں گیلی ہیں۔"

"رہنے دو۔ کچھ ایسی زیادہ سردی بھی نہیں ہے۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب آ گئی۔ اس نے اپنا سوئیٹر اتار دیا اور ڈیوی پر جھکتے ہوئے بولی۔ "یہ کمرا تو خاصا گرم ہے۔"

اس خود سپردگی کے باوجود ڈیوی نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ تیری مسلسل پیش قدمی پر آمادہ تھی لیکن وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ تیری جھنجلاتے ہوئے بولی۔ "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ تم سوئیٹر پہن لو۔ ہم کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔"

اسے اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ تیری کو یہاں لے کر کیوں آیا۔ ویسے بھی میری اور تیری کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ پھر اس نے ایک ایسی عورت کے ساتھ تعلق کیوں قائم کیا جو دولت اور مرتبے کے لحاظ سے اس کی بیوی کے مقابلے میں آدھی بھی نہیں تھی۔ اگر میری کو اس معاملے کی ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی تو وہ اسے لات مار کر اس گھر سے نکال دیتی اور اسے بیوی کے ساتھ ساتھ بچوں اور اس پُرآسائش زندگی سے بھی محروم ہونا پڑتا۔

تیری اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم جب سے یہاں آئے ہو، کچھ خوف زدہ اور پریشان لگ رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ محض تمہارا وہم ہے۔"

"اچھا۔ میں باتھ روم جا رہی ہوں۔ ذرا بالوں میں برش کر لوں۔"

"خیال رکھنا کوئی بال فرش پر نہ گرنے پائے ورنہ میری پریشان ہو جائے گی۔"

"تم مجھے اتنا حقیر سمجھتے ہو؟" تیری ناراضی سے بولی اور پیر پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ اب اس کی نظریں کھڑکی سے باہر جھیل کا نظارہ کر رہی تھیں۔

شک پرست

ولیم کی ممی شاپنگ سے واپس آئیں تو ولیم کوشش کے باوجود انہیں یہ بتانے کی جرأت نہ کر سکا کہ ان کا چہیتا کتا پیڈی کار کے نیچے آ کر ہلاک ہو گیا ہے۔ کچھ دیر گھر کی صفائی ستھرائی کرنے کے بعد ممی نے اچانک پوچھا۔ "پیڈی کہاں ہے؟"

ولیم نے بڑی ہمت سے کام لیا اور آہستہ سے بولا۔ "پیڈی کو آج ایک کار نے کچل دیا ہے۔"

ممی نے رنج و غم کا اظہار کرنے کے بجائے کھانا لگایا۔ ماں بیٹے نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ممی پڑوس میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو انہیں پھر کتا یاد آیا۔ "پیڈی کہاں ہے؟"

"میں نے تو آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ پیڈی کو ایک کار نے کچل دیا ہے۔"

ممی یہ سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ہچکیوں میں قدرے کمی آئی تو ولیم نے کہا۔ "تعجب ہے کہ دوپہر کو جب میں نے پیڈی کی موت کے بارے میں بتایا تھا تو آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا؟"

"نہیں۔" ممی نے ہچکی لے کر کہا۔ "میں سمجھی تھی کہ تم نے ڈیڈی کہا ہے۔"

"وہ دیکھو۔ تمہارا دوست کشتی میں واپس آرہا ہے... لیکن یہ کیا؟ وہ اکیلا کیوں ہے... لڑکی کہاں گئی؟"

ڈیوی بھی اس کے برابر میں آکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ وہ دونوں کشتی میں جھیل کی سیر کے لیے گئے ہیں لیکن لگتا ہے کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ شاید وہ لڑکی اس کی کوئی مہمان تھی جسے وہ جھیل کے دوسرے کنارے پر چھوڑنے گیا ہوگا جہاں سے اسے بس مل جائے۔ میں نے اس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ تعلقات رکھتا ہوگا۔" پھر وہ دروازے کی جانب مڑ کر کہنے لگا۔ "ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔"

"کیوں نہ پہلے ایک کپ چائے پی لیں؟" میری بولی۔

"سوری۔ یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں ایسا کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا جس سے میری کو یہ شبہ ہو کہ میں کسی عورت کو یہاں لے کر آیا تھا۔"

میری کچھ نہیں بولی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔

اگلے ہفتے ڈیوی اپنی بیوی اور بچیوں کے ساتھ ویک اینڈ گزارنے کاٹیج آیا۔ اتوار والے دن میری نے رات کے کھانے پر ایلون اور اس کی بیوی لیزا کو بھی مدعو کیا۔ گوکہ دونوں جوڑے تقریباً ہم عمر تھے لیکن ایلون اور لیزا کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ کھانے کے بعد ڈیوی کی بیٹیاں کیٹ اور سیلی اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں جبکہ وہ لوگ بڑے آتش دان کے پاس بیٹھ کر برانڈی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ باتوں باتوں میں میری نے لیزا سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ موسم گرما کے اختتام کے بعد تم لوگ پہلی بار اپنے کاٹیج میں آئے ہو؟"

"ہاں... تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ایلون گزشتہ ہفتے اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں آیا تھا اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جاتے وقت ان لوگوں نے کاٹیج کو بہترین حالت میں چھوڑا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک ہفتہ قبل یہاں آٹھ آدمی مچھلیاں پکڑنے کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے۔"

ڈیوی نے ترچھی نگاہ سے ایلون کی جانب دیکھا جو زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ کیا ہوا اگر وہ بیوی سے چھپ کر اپنی گرل فرینڈ کو یہاں لے آیا؟ ایلون بھی وہی کچھ کر رہا تھا اور بیوی سے دوستوں کا بہانہ کر کے کاٹیج میں کسی لڑکی کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ لیزا بہت اچھی عورت تھی لیکن اپنے شوہر کے ساتھ کسی دوسری لڑکی کو برداشت نہیں کرتی۔ اس کا بے خبر رہنا ہی اچھا تھا۔

دس نومبر کو کرین بیری جھیل کے مغربی کنارے سے ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی۔ اس کے بال بھورے تھے اور اس نے نیلے رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ لاش کی حالت بگڑ چکی تھی اور ابتدائی اطلاعات کے مطابق وہ ایک ماہ تک پانی میں پڑی رہی تھی۔ گوکہ اس کی موت پانی میں ڈوبنے سے ہوئی تھی لیکن اس کے سر پر چوٹ کا نشان بھی تھا جو غالباً کشتی کے چپو سے ضرب لگنے کا تھا۔ شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ کسی نے لڑکی کے سر پر چپو سے وار کیا اور اسے جھیل میں پھینک دیا۔ اس عورت کے شوہر رابرٹ لووٹ نے لاش کو شناخت کیا۔ عورت کا نام اپریل لووٹ تھا اور وہ اوٹاوا کی رہنے والی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے یہ کہہ کر گئی تھی کہ وہ بہن سے ملنے سارنیا جا رہی ہے لیکن جب مقررہ وقت پر واپس گھر نہیں پہنچی تو رابرٹ نے اپنی سالی کو فون کر کے اس کے بارے میں پوچھا جس نے بتایا کہ وہ اس کے پاس نہیں آئی اور نہ ہی ان کے ملنے کا کوئی پروگرام تھا۔ مسٹر لووٹ نے اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں درج نہیں کروائی۔ اسے شبہ تھا کہ اپریل کسی دوسرے مرد کی خاطر اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے اور وہ اس موہوم سی امید کے سہارے اس کا انتظار کر رہا تھا... کہ اپنی غلطی کا احساس ہونے پر شاید وہ خود ہی واپس آ جائے۔

لاش برآمد ہونے کے بعد ڈیوی بری طرح خوف اور اندیشوں کا شکار ہو گیا۔ اسے بار بار یہی خیال ستا رہا تھا کہ اگر میری نے لاش کا تعلق اس عورت سے جوڑ لیا جسے ان دونوں نے ایلون کی کشتی میں دیکھا تھا اور پولیس کو اس بارے میں مطلع کر دیا تو اس کی زندگی عذاب ہو جائے گی کیونکہ اس طرح ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ اس روز وہ میری کے ساتھ کاٹیج میں موجود تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے سامنے میری کی موجودگی کے بارے میں کیا جواز پیش کرے گا؟ دوستوں اور رشتے داروں میں اس کی کیا ساکھ رہ جائے گی؟ یہی سب کچھ سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوا جا رہا تھا۔

اس سہ پہر کے بعد ڈیوی اور میری کی دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔ گوکہ ان کے بیچ کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا لیکن ڈیوی ذہنی طور پر اس تعلق کو ختم کرنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا اور اس کا خیال تھا کہ وہ جلد از جلد میری سے مل کر اس صورت حال سے نمٹنے کا کوئی راستہ تلاش کرے گا۔ فی الحال وہ اسے مکمل طور پر نظرانداز کر رہا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے اسکول پہنچتا اور اپنی ڈاک چیک کرنے کے بعد پہلی کلاس لینے کے لیے سائنس روم میں چلا جاتا۔ اس عورت کی لاش دریافت ہونے کے

روحانی معالج صدر کراچی

ایس-آر-رائے

ہر کام بذریعہ کلامِ الٰہی کیا جاتا ہے ہر مقصد میں کامیابی چند یوم میں حاصل کریں مثلاً

من پسند جگہ شادی | گھریلو پریشانی | کاروبار میں بندش

رشتوں میں بندش | انعامی چانس | سوتن سے نجات

شوہر کو راہِ راست پر لانا | بیرون ملک سفر

ہر کام بذریعہ نقش و کلام کیا جاتا ہے

ہم دعویٰ نہیں کام کرتے ہیں

خود بیٹھ کر کام حل کروائیں اور پرسکون زندگی بسر کریں

اپنا لکی نمبر، برج، ستارہ، پتھر، مبارک دن اور اصلی پتھر

مناسب ہدیہ پر وی پی پارسل حاصل کریں صرف ایک فون کال پر

رابطہ 24 گھنٹے

0332-2502301 , 021-32783885

0322-3231669 , 0333-3136430

Email : aamilsr_roy@yahoo.com

بعد وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اسے اپنی بیوی اور بچیوں سے بہت زیادہ محبت تھی۔ وہ اس کالج، بی ایم ڈبلیو اور ان تمام آسائشوں سے بھی بہت پیار کرتا تھا جو ایک ٹیچر کی تنخواہ سے مہیا نہیں ہو سکتی تھیں۔ اسے ٹیری سے محبت نہیں تھی اور اگر یہ معاملہ کوئی خطرناک صورت اختیار کر جاتا تو وہ ہر قیمت پر اپنے آپ کو اس صورتِ حال سے الگ کر لیتا۔

وہ ٹیری کو بتا دینا چاہتا تھا کہ اب ان دونوں کو خوش اسلوبی سے اپنے راستے جدا کر لینے چاہئیں لیکن اس صورتِ حال میں وہ اس کی ناراضی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ بھڑک جاتی تو پھر اسے پولیس کے پاس جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ ایسی صورت میں ڈیوی کا مستقبل تباہ ہو جاتا۔ وہ میری کو کیا بتاتا کہ ٹیری اس کے ساتھ کالج میں کیا کر رہی تھی... جہاں سے اس نے ایلون کو نیلے رنگ کی جیکٹ میں ملبوس ایک لڑکی کے ساتھ کشتی میں جاتے اور پھر واپس تنہا آتے دیکھا تھا۔ ڈیوی بُری طرح خوف زدہ ہو گیا تھا لہٰذا اس نے اپنے آپ کو ممکنہ خطرات سے بچانے کے لیے ٹیری کے ساتھ مزید کچھ عرصہ تعلق برقرار رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس شام اس نے ایک پبلک بوتھ سے ٹیری کو فون کیا۔ اس کی آواز سنتے ہی وہ چہکنے لگی۔ ڈیوی نے فوراً ہی مطلب کی بات چھیڑ دی اور بولا۔ ”سویٹ ہارٹ! اس روز ہم دونوں نے جو کچھ دیکھا، میں اس بارے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا اشارہ اس عورت کی جانب ہے جو تمہارے پڑوسی کے ساتھ کشتی کی سیر کر رہی تھی؟“

”ہاں ہاں، وہی۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی کو بھی یہ بات معلوم نہ ہو کہ ہم دونوں اس وقت کالج میں موجود تھے۔ ویسے بھی میں ایلون کو برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ بے چارہ تو ایک مکھی بھی نہیں مار سکتا۔“

”ہم کسی مکھی کی بات نہیں کر رہے، وہ ایک جیتی جاگتی عورت تھی۔“

”ممکن ہے کہ یہ وہ عورت نہ ہو۔“ ڈیوی نے کمزور سی دلیل پیش کی۔

”واقعات اور شواہد تو بتا رہے ہیں کہ یہ وہی عورت ہے۔ اس نے بھی نیلے رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ تفتیشی افسر کا کہنا ہے کہ اس کی موت سر پر چوٹ لگنے سے واقع ہوئی اور پھر یہ کہ واپسی میں تمہارا پڑوسی اکیلا ہی آیا تھا۔“

”یقیناً... کچھ بھی ممکن ہے۔“ ڈیوی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تمہیں اس بارے میں کسی سے اور بالخصوص پولیس سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلاوجہ اپنے لیے غیر ضروری مشکلات پیدا کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر میری کو معلوم ہو گیا کہ میں اور تم اس کالج میں آئے تھے تو وہ مجھے دھکے دے کر اپنے گھر بلکہ اپنی زندگی سے بھی نکال دے گی۔ میری اور تمہاری ملازمت بھی ختم ہو جائے گی اور اس طرح مستقبل میں ہمارے اکٹھے ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔“

آخری جملہ سن کر ٹیری موم کی طرح پگھل گئی اور محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ”ڈیوی ڈارلنگ! تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

ڈیوی نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”ہمارے پاس خاموش رہنے اور ایک دوسرے کے بارے میں اچھا سوچنا ہی بہتر ہے۔“

”میں سمجھی کہ تم مجھے نظر انداز کر رہے ہو۔“ ٹیری نے شکوہ کیا۔ ”تم نے فون بھی نہیں کیا اور اسکول میں بھی ایسے بن گئے جیسے تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔“

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ کل شام میں ٹھیک رہے گا؟ میں میری سے میٹنگ کا بہانہ کر دوں گا۔“

”ضرور... ضرور... ڈیوی! میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

ٹیری کا اپارٹمنٹ پہلی منزل پر تھا جس کے نیچے ہیئر ڈریسر کی دکان تھی۔ ڈیوی نے [illegible] پارک کی اور انتظار [illegible] ڈیوی کسی کی نظروں میں آئے بغیر ٹیری کے دروازے تک پہنچ جائے۔ چھ ماہ پہلے جب ان کا افیئر شروع ہوا تو ٹیری نے اسے دروازے کی اضافی چابی دے دی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دروازہ کھول کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا جہاں ٹیری اس کی منتظر تھی۔

ٹیری کا اپارٹمنٹ ایک بیڈ روم، لاؤنج، کچن اور باتھ روم پر مشتمل تھا۔ ڈیوی کو یہاں آنا کبھی اچھا نہیں لگا۔ اس کے بجائے وہ ٹیری سے ملنے کے لیے موٹیل کو ترجیح دیتا تھا لیکن اپارٹمنٹ اس لحاظ سے محفوظ تھا کہ اس بلڈنگ میں رات کے وقت کسی باہر کے شخص کی آمد متوقع نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ وائن کی بوتل بھی لے آیا تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے ٹیری کو چاندی کا بریسلیٹ دیا جسے دیکھ کر وہ نہال ہو گئی۔ اپنی محبت کا یقین دلانے اور اس کا منہ بند رکھنے کے لیے دو سو ڈالرز ایک معمولی رقم تھی۔ ممکن ہے کہ آنے والے ستمبر تک اس کا تبادلہ کسی دوسرے اسکول میں ہو جاتا۔ اس طرح ٹیری سے اس کی جان خود بہ خود ہی چھوٹ جاتی۔

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔

کئی ہفتے گزر گئے لیکن پولیس اس قتل کے بارے میں کچھ معلوم نہ کر سکی۔ کرسمس کی آمد آمد تھی۔ ہفتے کے روز وہ گھر

پر ہی موجود تھا۔ میری چاکلیٹ کیک بنا رہی تھی کہ اچانک ہی ڈیوی کا دھیان خبروں کی جانب چلا گیا۔ اس نے ٹی وی آن کیا تو پہلی خبر سنتے ہی اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ پولیس نے اس عورت کے قتل کے الزام میں ایک بیس سالہ نوجوان جیسن کو گرفتار کیا تھا جس نے اپنی سترہ سالہ گرل فرینڈ کے ساتھ مقتولہ کے کریڈٹ کارڈ سے کچھ شاپنگ کی تھی۔ اس نوجوان نے تردید کی کہ اس نے اپریل لووٹ کو قتل کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے مقتولہ کی لاش ساحل کے نزدیک پانی میں دیکھی تھی۔ اس نے مقتولہ کی پچھلی جیب سے بٹوا نکالا اور لاش کو دوبارہ پانی میں دھکیل دیا۔ کریڈٹ کارڈ بھی بٹوے میں تھا جسے اس نے بعد میں ضائع کر دیا۔ جیسن اور اس کی گرل فرینڈ ٹریلر پارک میں رہتے تھے اور جیسن... چوری چکاری کی وجہ سے پولیس کے ریکارڈ میں تھا۔

سوموار کی صبح اسے میری کا دو لفظی پیغام ملا۔ ''کال می!''

وہ اس پیغام کا مطلب سمجھ گیا۔ میری پولیس کے پاس جانے سے پہلے اسے بتانا چاہ رہی تھی تاکہ وہ ذہنی طور پر اس صورتِ حال کے لیے تیار ہو سکے۔ یہ پیغام گویا اس کے لیے ایک وارننگ تھا لیکن اسے ہر حال میں میری کو روکنا تھا۔ وہ پورا دن اس نے کسی روبوٹ کی طرح گزارا۔ اس کی ساری سوچ ایک ہی نکتے پر مرکوز ہو گئی تھی کہ میری کو کس طرح اس کے ارادے سے باز رکھا جائے؟

میری بچیوں کو سلانے میں مصروف تھی۔ ڈیوی چپکے سے کچن میں گیا اور فریج میں رکھا سارا دودھ سنک میں بہا دیا پھر اس نے اپنا اوور کوٹ، دستانے اور ہیٹ وغیرہ پہنا کہ میری وہاں آ گئی اور اسے تیار ہوتا دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم اتنے خراب موسم میں باہر جا رہے ہو؟ باہر دیکھا نہیں کتنی سردی ہے۔''

''قریبی اسٹور تک جا رہا ہوں۔ صبح کے ناشتے کے لیے دودھ نہیں ہے۔''

میری بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ باہر شدید برف باری ہو رہی تھی۔ ڈیوی بڑی مشکل سے گاڑی چلاتا ہوا میری کے اپارٹمنٹ تک پہنچا۔ دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ کوئی اسے وہاں دیکھ لے گا۔ میری اسے دیکھ کر حیران ہو گئی اور بولی۔ ''تم نے فون کیوں نہیں کیا؟ اس موسم میں تمہیں باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔''

''تم جانتی ہو کہ میں گھر سے فون نہیں کر سکتا اور سیل فون کال بھی ٹریس ہو جاتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا ہیٹ، دستانے اور اوور کوٹ اتار دیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب مجھے پولیس کو وہ سب کچھ بتا دینا چاہیے جو کہ اس روز میں نے دیکھا تھا۔''

''خدا کے واسطے ایسا مت کرنا ورنہ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔'' ڈیوی گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

''مجھے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ جیسن نے اس عورت کو قتل نہیں کیا، وہ بے گناہ ہے۔''

''وہ اتنا معصوم بھی نہیں۔ تم جانتی ہو کہ پولیس کے پاس اس کا ریکارڈ ہے۔ آگے چل کر وہ خطرناک مجرم بن سکتا ہے۔ اس کا جیل میں رہنا ہی بہتر ہے۔''

''تم اتنے خود غرض نہیں ہو سکتے۔'' میری اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''کیا تم میری زندگی تباہ کرنا چاہتی ہو؟''

''تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ممکن ہے میری تمہیں معاف کر دے۔ تم نے تو قتل نہیں کیا پھر کیوں ڈر رہے ہو؟ لیکن میری خاموشی سے ایک بے گناہ کی زندگی ضرور تباہ ہو جائے گی۔''

ڈیوی یہ سنتے ہی غصے سے بے قابو ہو گیا۔ وہ تیزی سے اس پر جھپٹا۔ میری نے اس کے حملے سے بچنے کے لیے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور جیسے ہی اس نے میری کی گردن دبوچی، اس نے اپنے ناخن اس کے ہاتھوں میں گاڑ دیے لیکن ڈیوی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شاید وہ اپنے حواس میں نہیں رہا تھا۔ میری کی گردن پر اس کی گرفت سخت ہوتی گئی۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئی تھیں پھر ایک جھٹکے کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ میری کا بے حس و حرکت جسم فرش پر پڑا ہوا تھا اور اس کے لمبے سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اچانک ہی ڈیوی پر کمزوری طاری ہونے لگی اور وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گرتے ہوئے بولا۔ ''تم نے مجھے ایسا کرنے پر کیوں مجبور کیا؟''

اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنی حالت پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکا پھر اس نے اپنا ہیٹ، کوٹ اور دستانے اٹھائے اور انہیں پہن کر وہاں سے چل دیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اسے سیڑھیاں اترتے وقت ریلنگ کا سہارا لینا پڑا۔ سڑک ویران اور سنسان پڑی تھی۔ وہ سر جھکائے تیزی سے اپنی گاڑی تک پہنچا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

میری اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''اتنی دیر کہاں لگا دی؟ میں تو پریشان ہو گئی تھی۔''

''اسٹور بند تھا اس لیے مجھے کافی آگے تک جانا پڑا۔''

''دودھ ملا یا نہیں؟'' میری نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ لگتا تھا جیسے اس کے پاس بولنے کے لیے لفظ ہی نہ رہے ہوں۔ میری نے اس کا کوٹ اتارا اور اسے لے کر کمرے میں آ گئی۔ اسے صوفے پر بٹھا کر خود بھی اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ ''یہ تمہارے ہاتھوں پر خراشیں کیسے آئیں؟''

ڈیوی نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان زخموں کو دیکھ سکے جن سے خون رس رہا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ رونے لگا۔ میری اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی اور بولی۔ ''ڈیوی! مجھے بتاؤ کہ تم کیا کر کے آئے ہو؟''

''میں نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے۔''

میری دہشت زدہ ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس سے دور ہوتے ہوئے بولی۔ ''وہ تمہارے اسکول میں سیکریٹری تھی نا؟''

''کیا... تم اسے کیسے جانتی ہو؟''

''صرف میں ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کو اس بارے میں معلوم ہے۔ اس کا نام میری ہے نا؟'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور تھوڑے سے وقفے کے بعد بولی۔ ''لیکن تم نے اسے کیوں مار ڈالا؟''

''وہ دن یاد کرو جب تم بچیوں کے ساتھ ڈھونڈتی ہوئی [illegible]۔ میں نے [illegible] میری کو کاٹیج [illegible] ہم نے ایڈن کو ایک [illegible] کے ساتھ [illegible] کی سیر کرتے ہوئے دیکھا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ میری کے چہرے کے تاثرات سے اس کا ردِعمل جاننا چاہ رہا تھا۔

''بولتے رہو... میں سن رہی ہوں۔''

ڈیوی نے اس کے بعد پیش آنے والے تمام واقعات بیان کر دیے تو میری بولی۔ ''تمہیں ڈر تھا کہ اگر اس نے زبان کھول دی تو تم بہت کچھ کھو دو گے۔ بچیاں، میری دولت، یہ پُرآسائش زندگی... ان سب سے محروم ہو جاؤ گے۔''

''نہیں۔'' وہ زور سے بولا۔ ''مجھے تمہاری دولت سے کوئی سروکار نہیں۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' وہ اونچی آواز میں بولی۔ ''تم پہلے ہی بہت جھوٹ بول چکے ہو۔ تم فلرٹ ہو جو اپنی سیکریٹریوں، دفتر میں کام کرنے والی لڑکیوں اور جونیئر ٹیچرز سے تعلق قائم کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔''

''تم یہ سب جانتی تھیں، اس کے باوجود تم نے میرے ساتھ رہنا گوارا کر لیا؟'' ڈیوی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں... اس لیے کہ کیٹ اور سیلی تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ تم پیار کرنے والے باپ ہو۔ ان بچیوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں اپنی زندگی سے نکالنے کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اپنی بچیوں کو باپ کی شفقت سے محروم کر دیتی۔ اسی لیے تمہاری حرکتیں برداشت کرتی رہی۔ ویسے بھی مجھے تم پر ترس آتا تھا کیونکہ تم مالی لحاظ سے کمتر ہو اور ہمیں تمہاری تنخواہ کی ضرورت نہیں... جب کسی مرد کو یہ احساس ہونے لگے کہ وہ مالی لحاظ سے اپنی فیملی کے لیے اہم نہیں تو اسے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے تم دوسری عورتوں کی طرف راغب ہوتے تھے جو معمولی قیمت کے تحائف سے ہی خوش ہو جاتی ہیں۔ اس طرح تمہاری انا کو تسکین ملتی ہوگی۔''

''گویا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے اور تم صرف مجھے برداشت کر رہی ہو؟''

''اب اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' میری اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم سے ایک سنگین جرم سرزد ہو گیا ہے۔ تمہیں پولیس کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔''

''نہیں۔'' وہ اپنا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں جیل چلا گیا تو کیٹ اور سیلی کا کیا ہوگا؟ لہٰذا ہمیں خاموش ہی رہنا چاہیے... اپنے بچوں کی خاطر۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ میں پورے وقت تمہارے ساتھ ہی تھا۔''

میری نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھو۔ جب وہ تمہیں نوچ رہی تھی تو تمہاری کھال کے ریشے اس کے ناخنوں میں پھنس گئے ہوں گے۔ اس لیے جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں تمہارے لیے بہترین وکیل کروں گی اور مقدمے کا فیصلہ ہونے تک تمہارا ساتھ دوں گی۔''

''اس کے بعد کیا کرو گی؟''

''شاید مجھے یہ ملک چھوڑنا پڑے۔ کسی دوسری جگہ جا کر اپنی شناخت کے ساتھ زندگی گزاروں گی۔''

یہ کہہ کر وہ ہال نما کمرے میں گئی اور کارڈلیس فون لے کر آ گئی۔ ڈیوی کو فون دیتے وقت اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ ''نائن ون ون کو فون کر کے پولیس کو بلا لو۔''

اس نے خشک آنکھوں اور بے تاثر چہرے سے ڈیوی کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے افسوس ہے ڈیوی... تم ایک اچھے آدمی بھی بن سکتے تھے۔''

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ڈیوی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کارڈلیس پر نگاہ ڈالی اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

www.pkdigest.com

تیرہویں قسط

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں
میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر
سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی
بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون
کے بھی کتنی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل
تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں
تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں
بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور
مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو
روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا
انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت
اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی
بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں...... کبھی بازی
پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس
وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری
اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

www.pkdigest.com

وہ ایک کھلی جیپ تھی جس نے اس کی گاڑی کے عین سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا تھا اور اب اس سے ہتھیاروں سے لیس نقاب پوش اچھل اچھل کر باہر نکل رہے تھے۔ وہ کون لوگ تھے؟ فوری طور پر اس کے لیے فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ جو بھی ہیں، دوست ہرگز نہیں ہو سکتے۔ وہ اچانک سامنے آجانے والے ان دشمنوں کے لیے تر نوالہ بننے کو تیار نہیں تھا اس لیے بے حد پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا لاک کھولا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکلا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ سیدھا کھڑا نہ ہو اور جسم کو ایسے زاویے پر رکھے کہ گاڑی کے دروازے کی آڑ میں چھپ سکے۔ ورنہ دوسری صورت میں اگر حملہ آوروں کی طرف سے فائرنگ کی جاتی تو وہ نشانہ بن سکتا تھا۔ اگلے ہی پل سنائی دینے والی فائر کی آواز نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اسے باہر نکلتے دیکھ کر ان میں سے کسی نے فائر کر دیا تھا۔ فائر کی آواز کے فوراً بعد جو دوسری آواز اس کی سماعتوں تک پہنچی، وہ اس کی گاڑی کے ڈرائیور کی بھیانک چیخ تھی۔ وہ بے چارہ اس صورت حال پر بری طرح بوکھلا گیا تھا اور اچانک راستہ روکے جانے پر ایمرجنسی بریکس لگانے کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اس کی چیخ سن کر شہر یار کو اندازہ ہوا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہلاک یا شدید زخمی ہو چکا ہے۔ ڈرائیور کے ساتھ جو بھی حادثہ پیش آیا تھا اسے اس پر دلی افسوس تھا لیکن اس وقت وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال تو اسے اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی اور وہ بھی بنا ہتھیار... فی الوقت وہ قطعی نہتا تھا۔ ایک عام سے معمول کے دورے پر آتے ہوئے اسے خیال ہی نہیں گزرا تھا کہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار لے کر چلتا۔ اس نے ڈرائیور کے پاس موجود ریوالور کو ہی کافی جانا تھا لیکن قسمت کی خرابی سے ڈرائیور اس کے تحفظ کے لیے کوئی قدم اٹھاتا، اس سے قبل خود ہی نشانہ بن گیا تھا۔ اس کی طرف سے کسی مدد کی قطعی امید نہ رکھتے ہوئے شہر یار گاڑی کے عقب میں رینگ گیا۔ جیپ سے اترنے والے نقاب پوش ابھی تک اس کی گاڑی کے قریب نہیں آئے تھے اور دور سے ہی جائزہ لے رہے تھے۔

"بے کار کی محنت نہ کریں اے سی صاحب! ہم تعداد میں بھی زیادہ ہیں اور ہمارے پاس اسلحہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ اگر ہم چاہتے تو آپ گاڑی سے اتر بھی نہیں سکتے تھے۔ اپنے ڈرائیور کو لگنے والی گولی کو ہماری کوئی خطا نہ سمجھیے گا۔ نشانہ ہم سب کا بالکل اے ون ہے۔ آپ ہمیں گلیوں میں کنچے کھیلنے والے لونڈے تصور کرنے کی غلطی نہ کریں اور آرام سے بغیر کسی مزاحمت کے ہاتھ اٹھا کر سامنے آجائیں۔"

وہ گاڑی کے عقب میں پہنچا ہی تھا کہ ان نقاب پوشوں میں سے ایک کی قدرے بلند لیکن ہموار آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کو سن کر تذبذب میں پڑ گیا۔ بولنے والے کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک پڑھا لکھا اور پُراعتماد آدمی ہے۔ پھر اس نے جو بات کہی تھی، وہ تو بالکل روشن حقیقت کی طرح عیاں تھی۔ حملہ آور تعداد میں زیادہ بھی تھے اور مکمل طور پر ہتھیار بند بھی۔ وہ اگر ان کے خلاف مزاحمت کرتا بھی تو ان کے آگے اس کی کتنی دیر پیش چلتی۔ آخرکار اسے ہار ماننی ہی پڑتی لیکن اس طرح بغیر کسی مزاحمت کے ہار مان لینا بھی اس کے لیے خلافِ فطرت تھا۔ وہ فطرتاً مہم جو تھا اور ایسے کسی موقع پر اپنی حیثیت و مقام سب بھول کر میدانِ عمل میں اترنے کے لیے پر تولنے لگتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے عضلات پوری طرح تنے ہوئے تھے اور اس کی فطرت اسے مقابلے پر اکسا رہی تھی۔

"دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر کھڑے ہو جائیں اے سی صاحب! کوئی بھی غیر ضروری حرکت آپ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔" اس سے قبل کہ وہ آخر خود کوئی فیصلہ کرتا، اس کی پشت پر سے آواز ابھری اور کوئی ٹھنڈی سی شے اس کی گردن سے ٹکرائی۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ گردن پر موجود ٹھنڈک کو پہچاننا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔ لوہے کی یہ ٹھنڈک یقینی طور پر کسی ہتھیار کی نشان دہی کر رہی تھی۔ اس کا راستہ روکنے والوں میں سے کوئی بہت آہستگی سے چل کر اس کی پشت پر پہنچ گیا تھا اور اسے بے بس کر دیا تھا۔ اس بے بسی پر شدید جھنجلاہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ اپنی پشت پر موجود شخص کے حکم کے مطابق سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس پر سامنے کا منظر زیادہ واضح تھا۔ اسے روکنے والی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈھاٹا پوش بالکل تیار بیٹھا تھا۔ اس نے جیپ کا انجن بند نہیں کیا تھا تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو فرار ہونے میں مشکل پیش نہ آئے۔ ڈرائیور کے علاوہ دو ڈھاٹا پوش اس کی گاڑی کے بالکل قریب کھڑے ہوئے تھے جبکہ ان کا چوتھا ساتھی تو اس کی پشت پر موجود ہی تھا۔

"آگے بڑھو۔" وہ اس جائزے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کی پشت پر موجود شخص نے اسے ہلکا سا ٹھوکا دیتے ہوئے حکم دیا۔ شہر یار نے اس کی آواز کو شناخت کر لیا۔ اسے گھیرنے والوں میں سے اب تک صرف یہی شخص اس سے ہم کلام ہوا تھا۔

"میرا ڈرائیور زخمی ہے۔ یہ اگر اسی طرح یہاں پڑا رہا تو مر جائے گا۔" عقب میں موجود شخص کے حکم کی تعمیل میں اس نے دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ زخمی ڈرائیور پر نظر پڑنے پر ٹھٹک کر رک گیا۔ اردگرد چھائے اندھیرے کے باوجود گاڑی کی اندرونی بتی روشن ہونے کی وجہ سے وہ اندر موجود ڈرائیور کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس کے سینے پر گولی لگی تھی اور زخم سے نکلنے والے خون نے اس کے سفید یونیفارم کی قمیص کو بے تحاشا رنگ ڈالا تھا۔ خون کے اس بے تحاشا بہاؤ کے باوجود شہر یار نے نوٹ کر لیا تھا کہ ابھی اس کی جان نہیں نکلی ہے اور وہ آنکھیں بند کیے اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا ہے۔

"اس کی فکر کرنا بے کار ہے۔ یہ چند منٹ سے زیادہ مزید زندہ نہیں رہ سکے گا۔" بے حد سرد لہجے میں اسے جواب دے کر ایک ٹھوکا اور دیا گیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہے۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے شہر یار نے اپنے قدم آگے بڑھائے لیکن خود کو سوال کرنے سے نہیں روک سکا۔

"آخر تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح گھیرنے کا کیا مقصد ہے؟"

"ہم کون ہیں یہ تو نہیں بتا سکتے، البتہ مقصد شاید آپ کو آگے چل کر معلوم ہو جائے۔ ہم تو بس اپنے دوستوں کا ساتھ دینے کے لیے اس کام میں شامل ہوئے ہیں۔" بڑے بے نیاز اور پُراعتماد انداز میں اس کی بات کا جواب دیا گیا۔ اس جواب کو سن کر شہر یار چونک گیا۔ قطعی مختلف لب و لہجے میں بات کرنے والا یہ آدمی جس کے بارے میں وہ پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ شخص مقامی نہیں ہے، اس کے کسی دشمن کے ایما پر اسے اغوا کرنے جا رہا تھا اور اس علاقے میں اس کی چودھری افتخار کے علاوہ بھلا اور کس سے دشمنی تھی؟

اس سوچ کے حصار میں گھرا وہ جیپ تک پہنچ گیا۔ پشت پر موجود شخص کے علاوہ اب باقی دو افراد کی رائفلیں بھی اس پر اٹھی ہوئی تھیں اور اس کے لیے کسی قسم کی حرکت کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ اسے جیپ کی پچھلی نشست پر بٹھانے کے بعد دونوں ڈھاٹا پوش اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے جبکہ عقب پر موجود ڈھاٹا پوش نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ اس کے جیپ میں سوار ہوتے ہی ڈرائیور نے جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ رات کے سناٹے میں جیپ کے ٹائروں کی چرچراہٹ دور تک گونجی لیکن آبادی سے دور جنگل کے اس قریبی حصے میں کوئی گولی چلنے کی آواز سننے والا نہیں تھا تو ٹائروں کی چرچراہٹ کسے متوجہ کرتی؟ طاقتور انجن والی جیپ زناٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

"تم لوگ جس بھی مقصد کے تحت مجھے..." یہ سمجھتے ہوئے کہ اگلی سیٹ پر بیٹھا ڈھاٹا پوش ہی اسے اغوا کرنے والوں کا اس کارروائی کے دوران لیڈر ہے، شہر یار نے اس سے گفتگو کی کوشش کی لیکن اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے افراد میں سے کسی ایک نے کلوروفام میں بھیگا ہوا رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ وہ چونکہ اپنی توجہ مکمل طور پر اگلی سیٹ پر موجود شخص پر مرتکز کیے ہوئے تھا اس لیے بروقت اس کارروائی سے آگاہ نہ ہو سکا اور بے خبری میں ہی بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈوبنے پر مجبور ہو گیا۔

☆☆☆

رات بے حد تاریک تھی اور اس مقام پر تو تاریکی کے ساتھ ساتھ بھیانک بھی لگ رہی تھی۔ دنیا کی رونقوں کا سبب، اس کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے والے جسموں کی آخری پناہ گاہ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ جیسے ہی روح جسم کو چھوڑ کر پرواز کرتی ہے، مٹی کا ڈھیر خالی وجود کو یہاں لا کر گاڑ دیا جاتا ہے۔ وہ جو کبھی کاروبارِ حیات چلایا کرتے تھے، اس شہرِ خموشاں میں منوں مٹی تلے دبے ڈی کمپوزرز کی کارروائی سے آہستہ آہستہ خود بھی مٹی ہوتے اس مٹی میں ملتے جاتے ہیں۔ ہنگامۂ حیات کو جاری رکھنے والے انسانوں کی آخری پناہ گاہ کی خاموشی میں جانے ایسی کیا بات ہوتی ہے کہ جیتا جاگتا انسان اس طرف کا رخ کرے تو ایک دہشت سی محسوس کرتا ہے۔ خصوصاً رات کے وقت قبرستان میں داخل ہونے کو بڑے دل گردے کا کام سمجھا جاتا ہے۔ اکثر لوگ یوں محسوس کرتے ہیں کہ جیسے قبروں کے اندر لیٹے مردے مٹی کے ڈھیر کو چیر کر اپنے ہاتھ باہر نکالیں گے اور انہیں بھی اندر گھسیٹ لیں گے۔

لیکن وہ چاروں اس خوف سے قطعی بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک قبرستان کا گورکن تھا جس کے شب و روز گزرتے ہی اس شہرِ خموشاں میں تھے۔ وہ انہی قبروں کے درمیان مُردوں کی ہڈیوں سے کھیلتا ہوا بڑا ہوا تھا اور اب عمر کی آخری منزل پر تھا۔ عمر کے ان سالوں میں اس نے بے شمار مُردوں کو مٹی تلے اترتے اور پھر ہڈیوں کا پنجر بنتے دیکھا تھا۔ مرنے والے مر جاتے تو چند دنوں تک ان کے عزیز و اقارب

www.pkdigest.com

Suno Sunao
Call: 8020

نئے نئے دوست

سنو سناؤ 8020 سروس دلچسپ لوگوں اور اچھی آوازوں کی ایک رنگا رنگ اور منفرد دنیا ہے۔ سنو سناؤ سروس میں آپ ملیں گے ایسے کالرز جو پاکستان کے مختلف علاقوں سے کال کرتے ہیں۔ ہر کسی کی اپنی دنیا ہے اور اپنی کہانی۔

یہ سب کالرز 8020 سروس میں شامل ہو کر اپنے خیالات اور تجربات کی باتیں دوسرے کالرز کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔ 8020 سروس کے ذریعے آپ پاکستان کے مختلف علاقوں اور لوگوں کے بارے میں مفید باتیں جان سکتے ہیں۔ دوسرے شہروں میں کیا ہو رہا ہے، وہاں کے لوگ کیا سوچ رکھتے ہیں اور اپنا دن کیسے گزارتے ہیں۔ آپ یہ سب باتیں بہت آسانی سے جان سکتے ہیں۔ آپ بھی اس گفتگو میں شامل ہو کر نئے نئے دوست اب بہت آسانی سے بنا سکتے ہیں۔

ہمارے وہ کالرز جو کہ ریڈیو Announcer اور RJ بننا چاہتے ہیں، وہ سنو سناؤ میں دوسروں سے بات کر کے اپنی صلاحیت کو اجاگر کر سکتے ہیں۔

دوست بنانے اور معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ آپ سنو سناؤ کی ڈرا کے ذریعے فری بیلنس اور دوسرے انعامات بھی جیت سکتے ہیں۔ اگر آپ کو اچھی باتوں اور اچھے لوگوں میں دلچسپی ہے تو یہ سروس آپ کے لیے perfect رہے گی۔

تو آج ہی اپنے ہم خیال لوگوں کی اس حیرت انگیز کمیونٹی سے connect ہو جائیے۔ 8020 سروس کے ذریعے کچھ سنیں اور کچھ سنائیں، کچھ سیکھیں اور کچھ سکھائیں۔

اپنے موبائل سے 8020 ڈائل کریں

باقاعدگی سے قبر پر آتے رہتے، تازہ قبر پر پانی کا چھڑکاؤ ہوتا اور پھولوں کی پتیاں بکھیری جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہوتا جاتا اور ایک وقت ایسا آتا کہ عید، شب برأت پر حاضری کا سلسلہ بھی موقوف ہو جاتا۔ گورکن کی بوڑھی آنکھیں برسوں سے یہ سارے تماشے دیکھ رہی تھیں۔

مگر آج کی رات بوڑھے گورکن کے تجربوں میں ایک اور تجربے کا اضافہ کرنے کے لیے آئی تھی۔ رات کے آخری پہر قبرستان میں آنے والے وہ تینوں نفوس کسی مرنے والے کے لواحقین تھے، نہ ہی پناہ کے متلاشی تشنہ باز و پریم دیوانے۔ وہ کفن چور بھی نہیں تھے لیکن آئے بہرحال کچھ لے جانے ہی تھے۔ انہوں نے گورکن سے کفن سمیت قبر میں دفن ایک مُردے کا مطالبہ کیا تھا۔ گورکن اس مطالبے پر ہکا بکا رہ گیا لیکن مطالبہ کرنے والوں کی شناخت اور حیثیت نے اسے انکار کی جرأت نہیں کرنے دی۔ وہ سرکاری اہلکار تھے اور کچھ عرصے قبل ہی یہاں دفن ہونے والے ایک سرکاری افسر کی ڈیڈ باڈی لے جانے آئے تھے۔ ان کے پاس اس کام کے لیے مختار نامہ موجود تھا اور وہ چاہتے تو دن دہاڑے بھی یہ کام کر سکتے تھے... لیکن انہوں نے اس کام کے لیے رات کے آخری پہر کا انتخاب کیا تھا۔ گورکن کے لیے حکم تھا کہ کام نہایت صفائی اور خاموشی سے کیا جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی جائے۔ غریب گورکن کے پاس اس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ پھاوڑا اور کدال سنبھالے اپنی دھوتی کو گھٹنوں سے اوپر باندھ کر میدانِ عمل میں اتر آیا اور مشاقی سے کھدائی کا کام کرنے لگا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ قبر ابھی پکی نہیں کی گئی تھی اور اسے صرف چاروں طرف ابھری اینٹوں کی چار دیواری چن کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچی قبر کی کھدائی کرتے کرتے بالآخر گورکن اس مقام پر پہنچ گیا جہاں قبر میں دفن لاش ظاہر ہوگئی۔

لاش ظاہر ہونے سے پہلے وہاں موجود افراد کا اس بدبو سے سابقہ پڑا جو مُردہ گلتے سڑتے جسموں سے اٹھتی ہے۔ یہ کوئی معمولی بو نہیں تھی۔ اگر کسی عام آدمی کے نتھنوں سے ٹکراتی تو وہ ابکائی لے کر پیٹ میں موجود خوراک اگلنے پر مجبور ہو جاتا لیکن گورکن تو اس شہرِ خموشاں کا ہی باسی تھا۔ یہاں بسنے والے سیکڑوں باسیوں میں سے واحد زندہ باسی۔ اس کے لیے یہ بو انجان نہیں تھی اور اس نے پہلے ہی حفظِ ماتقدم کے تحت اپنے منہ پر کپڑا لپیٹ لیا تھا۔ اس کے ساتھ موجود سرکاری اہلکاروں نے بھی اپنے منہ اور ناک ہلکے سبز رنگ کے ماسکس سے ڈھانپ رکھے تھے۔ وہ لوگ گورکن کے کھدائی کرنے کے دوران مٹی کو ہٹا کر ایک جانب کرنے میں اس کی مدد کرتے رہے تھے۔ قبر کشائی کے بعد لاش ظاہر ہوئی تو اسے قبر سے نکال کر مخصوص پولی تھین بیگ میں منتقل کرنے کے کام میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ لاش بہت زیادہ پرانی نہ ہونے کے باوجود اچھی خاصی خراب ہوگئی تھی۔ گورکن کے تجربے کے مطابق لاش کو دفن ہوئے جتنی مدت گزری تھی، وہ اس سے دُہری مدت کے برابر پرانی لگ رہی تھی۔ اس طرح کی گلی سڑی، بدبودار لاش کو قبر سے برآمد کر کے پولی تھین بیگ میں منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ان لوگوں نے کر لیا۔ ظاہر ہے، وہ اس کام کے ماہر تھے تب ہی تو یہاں بھیجے گئے تھے۔

"قبر کو دوبارہ مٹی ڈال کر پہلے والی حالت میں کر دو۔ کام اتنی صفائی سے کرنا کہ کسی کو قبر کھولے جانے کا شبہ نہ ہو سکے۔" لاش کو جراثیم کش ادویات اور بو دبانے والی خوشبوؤں کے چھڑکاؤ کے بعد اپنے ساتھ لائے ہوئے ایک تابوت میں منتقل کر کے... ان میں سے ایک نے گورکن کو حکم دیا اور پھر اسے ایک نیلا کڑکڑاتا ہوا نوٹ تھما کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ تابوت سمیت وہاں سے رخصت ہوگیا۔ سرکاری اہلکار کا حکم، اس پر سے نیلے کڑکڑاتے نوٹ کی خوشبو... گورکن ان کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی پوری تن دہی سے قبر کا گڑھا بھرنے لگا۔ اس قبر کا گڑھا جو ان کے رخصت ہونے پر کسی ماں کی کوکھ کی طرح خالی ہوگئی تھی۔

☆☆☆

شہریار کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک نیم روشن کمرے میں فرش پر بچھے گدے پر لیٹا ہوا پایا۔ کمرا بے حد مختصر تھا جس میں اس کے بستر کے بعد بس چند فٹ کی جگہ بچی تھی۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھا اور مدھم روشنی میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ ایک چوکور کمرا تھا جس میں اس کے بستر کے علاوہ جو دوسری شے موجود تھی، وہ دیوار کے ساتھ رکھی پانی کی ایک صراحی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ موجود نہیں تھا۔ اس نے بستر پر بیٹھے بیٹھے ہی اپنا باقی جائزہ بھی مکمل کیا۔ کمرا اینٹوں کی مدد سے بنایا گیا تھا اور دیواریں پلاستر اور رنگ و روغن سے قطعی عاری تھیں۔ دائیں دیوار میں لکڑی کا ایک پٹ والا دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کی چوڑائی بہت کم تھی اور وہ دیوار میں کچھ اس طرح سے فکس تھا کہ کوئی درز نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ باہر سے روشنی آنے کے لیے بھی جگہ موجود نہیں تھی۔ کمرے کی تاریکی کو نیم روشن کرنے کے لیے دیوار پر ایک کیل کے ساتھ لالٹین ٹنگی ہوئی تھی۔ اس مختصر قید

خانے کا جائزہ لینے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو لمحہ بھر کے لیے سر چکرا کر رہ گیا۔ یہ یقیناً اسے بے ہوش کرنے والے کلوروفام کا اثر تھا جو اب بھی باقی تھا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو اس کے اثر سے آزاد کرنے کی کوشش کی اور صراحی کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس پر رکھے اسٹیل کے گلاس میں پانی انڈیلا۔ پانی بالکل شفاف تھا اس لیے اسے پانی پینے میں کوئی عار محسوس نہ ہوا۔ پانی پی کر اس کی طبیعت بشاش ہوگئی۔

وہ اٹھ کر دروازے تک گیا اور اسے ہلانے جلانے کی کوشش کی لیکن دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا اور کچھ اس طرح سے دیوار میں فٹ کیا گیا تھا کہ اسے ہلانے جلانے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی تاکہ اس کو یہاں تک لانے والے اگر باہر موجود ہوں تو انہیں اس کے ہوش میں آنے کا علم ہو جائے اور وہ اس سے بات چیت کر کے اسے اغوا کر کے یہاں لائے جانے کا سبب بتا سکیں... مگر اس کی مسلسل دستک بے کار گئی اور باہر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ خاموشی سے بیٹھ کر ان لوگوں کے متوجہ ہونے کا انتظار کرے۔ اس نے یہی کیا لیکن اس خالی خولی انتظار کے دوران بھی اس کے حواس جاگ رہے تھے۔ ذرا سے ارتکاز کے بعد وہ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ اسے جس چار دیواری کے اندر قید رکھا گیا ہے، وہ عام آبادی میں موجود نہیں ہے۔ اس کی سماعت چار دیواری سے باہر موجود آوازوں کو محسوس کر رہی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ، ہوا کی سرسراہٹ اور کچھ غیر معمولی سی آہٹیں بھی جو اردگرد بکھری ہوئی تھیں۔ سماعت کے بعد اس نے اپنی قوتِ شامہ پر زور دیا تو فضا میں جنگلی بوٹیوں کی مہک اور نمی سی محسوس ہوئی۔ اس کا ذہن فوراً حساب کتاب کرنے لگا۔ قوتِ سماعت و شامہ کی حاصل کردہ معلومات کے تجزیے نے اس کے سامنے ایک ہی جواب پیش کیا۔ وہ اس وقت جنگل کے کسی حصے میں موجود تھا اور اس خیال کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی تھی کہ اسے جنگل کے قریب سے ہی اغوا کیا گیا تھا۔ یعنی اغوا کرنے والوں نے اسے جنگل ہی میں موجود اپنے کسی خفیہ ٹھکانے میں رکھا تھا۔ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟ وہ جب بھی خود سے یہ سوال کرتا، اس کے سامنے ایک ہی جواب آتا۔

چودھری افتخار عالم شاہ... یہاں اس کا دشمن بھی وہی تھا اور اختیارات بھی اسی کے اتنے وسیع تھے کہ وہ اس جنگل سمیت پورے علاقے میں جہاں چاہتا اسے قید کروا سکتا تھا۔

چودھری کے پاس اسے اغوا کروانے کے لیے کئی مضبوط جواز بھی موجود تھے۔ وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ تھا اور لوگ اپنی ہر ضرورت کے لیے نہ صرف اس کی طرف دیکھتے تھے بلکہ اس کا ہر ظلم بھی خاموشی سے برداشت کر لیتے تھے... لیکن اب اسکول واسپتال کے باقاعدہ آغاز نے چودھری کی اس حیثیت کو زک پہنچائی تھی۔ دوسری طرف لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کے لیے کی جانے والی سختی نے اسے مالی اعتبار سے نقصان پہنچایا تھا۔ پھر ماہ بانو کا شہریار کی مدد سے اس کے ہاتھوں سے نکل جانا بھی اس کے غصے کو بھڑکانے کا سبب بنا تھا۔ اس نے ڈاکٹر ماریا کو چارے کے طور پر استعمال کر کے شہریار کو ٹریپ کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن خوش قسمتی سے شہریار اس کی اس گھناؤنی چال سے بچ گیا تھا۔ اب یقیناً وہ ایک نیا حربہ لے کر آیا تھا اور اس حربے کے استعمال سے پہلے خود امریکا روانہ ہو گیا تھا تاکہ خود کو شک سے بری رکھنے کے لیے عدم موجودگی کا جواز دے سکے۔

شہریار جوں جوں اس صورتِ حال پر غور کر رہا تھا، اس کا یقین مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے چودھری کا ہی ہاتھ ہے۔ اپنے یقین پر پختہ ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے پر دستک دی۔ اب اس دستک کا بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا لیکن اسے یقین تھا کہ باہر کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے اتنی جدوجہد سے اغوا کر کے لانے کے بعد بغیر کسی نگراں کے تنہا چھوڑ دیا جاتا۔

"میں جانتا ہوں کہ باہر میری آواز سنی جا رہی ہے۔ بے شک تم لوگ مجھے رسپانس نہ دو لیکن میرا یہ پیغام چودھری تک پہنچا دو کہ وہ تھرڈ کلاس مجرموں کی طرح اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے بجائے مجھ سے فیس ٹو فیس بات کرے۔" اپنے یقین ہی کی بنیاد پر اس نے بلند لیکن باوقار لہجے میں یہ بات کہی اور واپس بستر پر آ بیٹھا۔

"آپ بے کار اندازے لگانے میں اپنی توانائیاں ضائع نہ کریں اے سی صاحب! یہاں جس کو اور جب بھی آپ سے مذاکرات کرنے ہوں گے وہ خود سامنے آ جائے گا۔" ذرا سے توقف کے بعد دروازے کی دوسری جانب قدموں کی آہٹ سنائی دی اور نہایت ٹھنڈے لہجے میں شہریار کو جواب دیا گیا۔ جواب دینے والے کی آواز شناخت کرنے میں اس بار اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ وہی تھا جو اغوا کے دوران بھی اس سے گفتگو کرتا رہا تھا۔ اس شخص کے لہجے کا ٹھہراؤ اور زبان کی روانی اس کو ہر بار ٹھٹکا دیتی تھی۔ وہ بولتا تو

صاف احساس ہوتا تھا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا شہری ماحول کا بندہ ہے جو شاید کسی مجبوری کے سبب ان مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں میں شامل ہو گیا ہے۔ فی زمانہ بڑھتی ہوئی... بے روزگاری اور کرپشن نے یہ ایک نیا ٹرینڈ جنم دیا تھا۔ بہ حیثیت ایک انسان کے شہریار کے لیے یہ ایک بڑا لمحۂ فکریہ تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنی قید و بند کی پریشانی کو بھول کر اس نوجوان کی ذات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر شہریار عادل زندہ سلامت چاہیے ایس پی صاحب... آپ یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لیں۔ اگر آپ اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے تو یاد رکھیے گا کہ پھر پولیس کی نوکری میں آپ کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ ناکامی آپ کے اگلے پچھلے سارے کھاتے کھول دے گی۔ شہریار عادل کوئی معمولی شخص نہیں ہے جو اسے اس طرح اغوا کر لیا جائے اور کہیں کوئی طوفان نہ اٹھے۔ مجھے ہر حال میں وہ چوبیس گھنٹے سے پہلے واپس چاہیے۔"

ریسیور کان سے لگائے یہ سب سنتے معظم تارڑ کو دوسری طرف موجود آئی جی مختار مراد کی کیفیت کا خوب اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ غصے سے باقاعدہ چنگھاڑ رہا تھا۔ یقیناً سجاد رانا کی ہلاکت کے بعد ہونے والا شہریار کا اغوا اس کے اعصاب کے لیے بڑی آزمائش ثابت ہوا تھا اور اس کا اپنا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح گھڑی کی چوتھائی میں شہریار کو بازیافت کروا ڈالے۔

"ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں سر! پولیس فورس کے جوانوں نے اس سارے علاقے کو گھیر لیا ہے جہاں سے شہریار صاحب کی گاڑی اور ان کے ڈرائیور کی لاش ملی ہے۔ میرے جوان کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح کوئی کلیو مل جائے جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ اے سی صاحب کو اغوا کر کے کہاں لے جایا گیا ہوگا۔ ویسے مجھے شک ہے کہ انہیں جنگل کی طرف لے جایا گیا ہے اور اگر ایسا ہے تو پولیس فورس کو کارروائی کرنے میں بہت مشکل پیش آئے گی۔ ہمارے پاس نہ تو اتنی نفری ہے اور نہ ہی اتنی سہولیات کہ گھنے جنگل میں گھس کر کارروائی کر سکیں۔" اس نے مختار مراد کے سامنے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ذہن میں موجود خدشات اور درپیش مسائل بھی بیان کر دیے۔ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ شہریار کا اغوا اتنی معمولی بات نہیں تھی کہ آرام سے دب جاتی۔ ابھی مختار مراد کا فون آیا تھا بعد میں اور بھی نہ جانے کون کون اس سے رابطہ کر کے شہریار کی بازیابی کے سلسلے میں اس پر دباؤ ڈالتا۔

"آپ کو شہریار کی تلاش میں جنگل چھاننا پڑے یا کسی کا محل... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بس مجھے چوبیس گھنٹے میں اس کے ملنے کی اطلاع چاہیے۔ باقی آپ کو جتنی فورس اور سہولیات درکار ہیں، وہ نوٹ کروا دیں۔ آپ کو چند گھنٹوں کے اندر سب کچھ پرووائڈ کر دیا جائے گا۔" مختار مراد نے طنز اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں اس کی بات کا جواب دے کر ریسیور پٹخ دیا۔ ریسیور پٹخے جانے کی آواز سن کر معظم تارڑ نے بھی ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کان سے لگا ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا کہ مختار مراد کا اشارہ نہیں سمجھتا۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کو شہریار کی تلاش میں جنگل چھاننا پڑے یا کسی کا محل... مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ اس بات کا مطلب تھا کہ وہ چودھری افتخار پر شبہ کر رہا تھا کیونکہ اس علاقے میں محل جیسی حویلی تو بس اسی کی تھی۔ خود معظم تارڑ بھی سمجھ رہا تھا کہ یہ کارروائی چودھری کی طرف سے ہی کی گئی ہے۔ چودھری اس سلسلے میں پہلے ایک بار اپنا ارادہ ظاہر کر چکا تھا، بعد میں اس نے اچانک نیویارک جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اب اس کی غیر موجودگی میں یہ واردات ہوئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ چودھری یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کا اس کارروائی سے کوئی تعلق نہیں... لیکن دوسرے لوگ بھی کوئی گھاس نہیں کھائے ہوئے تھے جو حقیقت کو نہ سمجھ پاتے۔ تارڑ نے بھی حقیقت سمجھ لی تھی اور واردات کی اطلاع ملنے کے بعد سے مسلسل چودھری سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ پاکستان اور نیویارک کے درمیان جو طویل فاصلہ تھا، اس نے وقت کا بھی بہت بڑا بُعد پیدا کر دیا تھا۔ ایس پی تارڑ کو معلوم تھا کہ اس پہر جبکہ یہاں دن نکلا ہوا ہے، نیویارک میں رات ہوگی۔ اب جانے رات کی یہ گھڑیاں چودھری خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتے ہوئے گزار رہا تھا یا کسی گوری رنگت والی حسینہ کی سنہری زلفوں کی چھاؤں میں۔ وجہ بہرحال جو بھی رہی ہو... مسلسل کوشش کے باوجود وہ چودھری سے رابطے میں ناکام تھا۔

مختار مراد سے احکامات ملنے کے بعد اس نے ایک بار پھر چودھری سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہاں ہنوز وہی صورتِ حال تھی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر اس نے حویلی فون کیا اور منشی اللہ رکھا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ فوراً ہی منشی لائن پر آ گیا۔

"حکم ایس پی صاحب! آپ نے خادم کو کیسے یاد فرمایا؟" اس کا وہی سدا کا خوشامدانہ انداز اور لب و لہجہ تھا۔

www.pkdigest.com

"یار تو اصل میں مجھے تمہارے سرکار کی آ رہی ہے لیکن کئی بار کوشش کرنے کے بعد بھی ان سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ سوچا تم سے معلوم کرلوں۔ تمہیں تو یقیناً ان کے بارے میں علم ہوگا۔" نارڈ نے منشی کی خوشامد کو نظرانداز کرتے ہوئے سیدھے اپنے مطلب کی بات کی۔

"سرکار سے تو خود ہمارا رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ انہوں نے اپنا فون بند کر رکھا ہے۔ ادھر چھوٹے چودھری مراد شاہ کے گھر کے نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی تھی، پر ادھر سے بہو جی نے بتایا کہ چودھری صاحب کسی گل توں ناراض ہو کے گھر سے چلے گئے ہیں۔ چھوٹے چودھری صاحب نے وہ ہوٹل تو تلاش کرلیا ہے جدھر چودھری صاحب رکے ہیں، پر آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ ابھی ادھر رات ہو رہی ہے اور چودھری صاحب ہوٹل والوں سے کہہ کر سوئے ہیں کہ انہیں صبح سے پہلے کوئی نہ جگائے... تو آپ سمجھ لیں کہ جب ادھر صبح ہوگی، تب ہی آپ سرکار سے گل کرسکدے ہو۔" منشی نے اسے چند جملوں میں پوری کتھا سنا دی۔

"ٹھیک ہے... میں چودھری صاحب سے بعد میں بات کرلوں گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ بالا کہاں ہے؟" یہ جان لینے کے بعد کہ ابھی کم از کم تین چار گھنٹوں تک اس کا چودھری سے رابطہ نہیں ہو سکے گا، ایس پی نے دوسرے رخ سے تفتیش کی کوشش کی۔

"ادھر حویلی میں ہی ہے سر جی! کل سے وچارے کو تاپ چڑھا ہوا ہے اس لیے منجی پکڑ کر لیٹا ہوا ہے۔ آپ دسو، آپ کو اس نال کوئی کام شام ہے کیا؟ میں کسی ہور کام کے بندے کو تہاڈے نال بھیج دوں گا۔" چرب زبان منشی کی باتیں سن کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کے فون کرنے کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا ہے لیکن کسی نہ کسی طرح اسے بہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔

"تم میرے اور چودھری صاحب کے درمیان تعلقات کی نوعیت اچھی طرح جانتے ہو منشی... ہم ایک دوسرے کے رازدار ہیں۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو اور سیدھی طرح سے وہ بتاؤ جو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔" ایس پی، منشی کا انداز سمجھ کر یک دم ہی براہ راست گفتگو پر آگیا۔

"مینوں کیا خبر حضور کہ آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے کھل کر پوچھیں۔ مینوں اگر کسی گل کی خبر ہوئی تو آپ کو ضرور دسوں گا۔" منشی کی منافقت تو تھی ہی بے مثال، اسی فدویانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

"رات تمہارے علاقے میں اے سی شہریار کو اغوا اور اس کے ڈرائیور کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ بات تو تمہیں معلوم ہی ہو گی۔ اب میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اے سی کہاں ہے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ تمہارے علاقے میں اتنی بڑی واردات ہو اور تمہیں کچھ خبر ہی نہ ہو۔" منشی کی اداکاری کی پروا نہ کرتے ہوئے ایس پی نے اس سے سوال کیا۔

"یہ آپ کیسی گل کر رہے ہیں ایس پی صاحب! بے شک اے سی صاحب کا اغوا ادھر سے ہی ہوا ہے لیکن گاؤں سے بہت دور جنگل کے علاقے میں... ہور آپ تو جانتے ہیں کہ آج کل ادھر ہمارے بندے کام نہیں کر رہے ہیں۔ ادھر حویلی میں بھی صبح ہی واقعے کی خبر پہنچی ہے۔ میں یہی خبر سنانے کے لیے تو سرکار کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا، پر ان سے گل نہ ہو سکی... پر آپ کی گل سن کر تو ایسا لگ رہا ہے کہ آپ ہم پر ہی شک کر رہے ہیں۔ یہ تو وڈی غلط گل ہے۔ آدمی کو اپنے دوستوں پر تو بھروسا کرنا چاہیے۔" منشی فوراً معصوم بن کر اس کی تردید کرنے لگا۔

"بات شک کی نہیں ہے۔ پیر آباد اور اس کے قرب و جوار کے سارے علاقے میں تم لوگوں کا ہولڈ ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ براہ راست اگر اس واقعے میں تم ملوث نہیں بھی ہو تو بھی تمہیں کچھ نہ کچھ معلوم ضرور ہوگا۔ یہ تو میں یقین کر ہی نہیں سکتا کہ وہاں اتنا بڑا واقعہ ہوا اور تم لوگوں کو اس کی بھنک تک نہ ملی ہو۔" ایس پی نے طنز اور غصے سے بھرپور لہجے میں منشی کو باور کروایا کہ وہ اس کے انجان ہونے پر قطعی یقین نہیں رکھتا۔

"اب ایسی بھی گل نہیں ہے ایس پی صاحب! اب وہ پہلے والی گل رہی ہی کدھر ہے؟ آپ کو تو خود یاد ہوگا کہ ابھی تھوڑے دن پہلے ادھر ڈیرے پر کوئی گھس آیا تھا اور ہمارے بندوں کو بے ہوش کر کے تہ خانے میں آگ لگا گیا تھا۔ آپ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ساتھ یہ کارروائی کرنے والے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے... تو فیر اے سی صاحب کے معاملے کی ہمیں کیا خبر؟ آپ کے محکمے کے بندے صبح سے ادھر پہنچے ہوئے ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ وہ کھوج لگائیں اے سی صاحب کا۔ اساں نوں کچھ معلوم ہوا تو آپ کو بتا دیں گے۔" منشی کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ قطعاً تعاون پر آمادہ نہیں ہے۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر ایس پی نے کال منقطع کردی اور صورت حال پر غور کرنے لگا۔

شہریار کا اغوا اس کے لیے اتنی تشویشناک بات نہیں تھی جتنے چودھری کے بدلے ہوئے تیور اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ اس نے چودھری کا باجوہ سے

بدلا ہوا رویہ بھی دیکھا تھا اور اس کے بعد باجوہ کی اچانک موت بھی۔ بظاہر باجوہ دل کے دورے سے جاں بحق ہوا تھا لیکن ایس پی کو یقین نہیں آیا تھا کہ یہ سچ ہے... اور وہ سچ کے سامنے آنے کا منتظر تھا۔ سچ کو جاننے کے لیے ہی اس نے ایک بار پھر ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک خاص نمبر ڈائل کیا۔

"اچھا ہوا آپ نے خود کال کرلی نارڈ صاحب! میں آپ سے رابطہ کرنے ہی والا تھا۔ رات جو ڈیڈ باڈی آپ نے بھجوائی تھی، آپ کے حکم پر میں نے اس کا ایمرجنسی میں پوسٹ مارٹم کر ڈالا ہے اور پوسٹ مارٹم کے نتیجے میں بہت ہی حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے۔ مرنے والے کی موت آپ کے مطابق ہارٹ اٹیک سے ہوئی تھی لیکن پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا ہے کہ اس شخص کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ایک ایسا زہر دے کر جس کے ظاہری اثرات دیکھ کر ڈاکٹرز یہی اندازہ لگا پاتے ہیں کہ مریض کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور اسی حساب سے ٹریٹمنٹ بھی دیتے ہیں۔ نتیجتاً مریض کی موت واقع ہو جاتی ہے۔" دوسری طرف موجود سرجن جو انکشافات کر رہا تھا، انہیں سن کر نارڈ زلزلے کی زد میں آگیا تھا اور اس کے ذہن میں بجتی خطرے کی گھنٹی کسی دیوہیکل گھنٹے کی سی قوت سے بجنے لگی تھی۔

☆☆☆

"ابا جی! ناراضگی جانے دیں نا... دیکھیں میں خود آپ کو منانے کے لیے آیا ہوں۔" مراد شاہ، چودھری کے مقابل بیٹھا اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنی بیوی شاہدہ کی زبانی چودھری کی ناراضگی کا سبب بننے والے سارے قصے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں شاہدہ کا کوئی قصور نہیں۔ اس بے چاری نے تو چودھری سے وہی کچھ کہا تھا جو مبنی بر حقیقت تھا۔ نیو پارک میں قیام کے دوران مراد میں واقعی ایسی کئی تبدیلیاں آ گئی تھیں جو حویلی کے طرز زندگی سے میل نہ کھاتی تھیں۔ ان تبدیلیوں میں سے ہی ایک تبدیلی کھانے پینے کے معاملے میں نسبتاً سادگی اختیار کرنا بھی تھی جس کا اظہار شاہدہ نے... جو کہ ایک اچھی مشرقی بیوی کی طرح شوہر کی پسند ناپسند میں ڈھل گئی تھی، چودھری کے سامنے کر دیا تھا اور چودھری کی نازک مزاجی اسے برداشت نہیں کر سکی تھی۔ مراد کو آفس سے واپس آنے کے بعد سارے واقعے کا علم ہوا تو اس نے چودھری کو منانے کے لیے اس کی تلاش شروع کر دی۔ وہ اپنے باپ کے مزاج سے آشنا تھے اس لیے اتنا اندازہ تو کر سکتا تھا کہ وہ کسی بڑے ہوٹل کا ہی رخ کرے

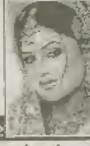

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

جولائی 2010 دلہن نمبر کی رعنائیاں

انجم انصار اور عالیہ بخاری کے سلسلے وار ناول

مادی دنیا کی ضرورتوں سے قطع نظر ایک آواز ہماری صداقت و سچائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے
کچھ اسی تناظر میں قیصرہ حیات کا ناول

رشتے ناتے کچے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں۔ ٹوٹ جائیں تو انہیں جوڑا نہیں جا سکتا...... گرہ ضرور لگ سکتی ہے۔
رشتوں کی ڈور میں الجھا یاسمین نشاط کا ناولٹ

ماضی کے آئینے میں جھلملاتے عکس کو وقت کی دبیز تہیں بھی منعکس ہونے سے روک نہیں سکتیں ......
اسی انداز میں عطیہ عمر کی تحریر

زندگی جن باتوں سے عبارت ہے، ان میں ایک جذبہ محبت ہے۔ محبت بھی زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کراتی ہے۔ محبت کے جذبے سے گندھی نگہت سیما کی پراثر تحریر

شریک حیات بننا ایک منفرد اور انوکھا تجربہ ہوتا ہے......
دلہن نمبر کے لیے شائستہ زرین اور عظمیٰ آفاق سعید کے خصوصی مضامین

افسانے

اقبال بانو، شمیم فضل خالق، فریدہ فرح لاکھانی، شیریں حیدر، ثریا انجم اور نگہت اعظمی کی خاص تحریریں

آپ کی آرا و فرمائشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

گا۔ اس نے اپنی تلاش کا آغاز قریبی ہوٹلوں سے کیا اور بالآخر ایک ہوٹل کے ریسپشن سے اسے علم ہو گیا کہ چودھری افتخار عالم شاہ نامی شخص وہیں ایک سوئٹ میں قیام پذیر ہے۔ لیکن اس وقت اس کی چودھری سے ملاقات ممکن نہیں ہو سکی۔ وہ ہوٹل انتظامیہ کو پہلے ہی ہدایت کر چکا تھا کہ بے حد تھکن کے باعث وہ رات کے وقت کسی سے ملاقات نہیں کر سکے گا، چنانچہ کسی ملاقاتی کی آمد یا ٹیلی فون کال کی صورت میں اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ ناچار مراد کو مایوس لوٹنا پڑا اور دوسرے دن وہ صبح ہی صبح دوبارہ ہوٹل پہنچ گیا۔ اس بار اسے باپ کی طرف سے اذنِ باریابی مل گیا اور اب وہ اس کے سامنے بیٹھا اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چودھری سے بہت سے نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ چودھری اس کا باپ تھا اور وہ اس رشتے کو ہرگز بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

''تو نہ آتا منانے۔ میں نے کیا تجھے پیغام بھیجا تھا کہ آ کر مجھے منا؟'' چودھری اتنی آسانی سے رام ہو جانے والا بندہ ہوتا تو ذرا سی بات پر ناراض ہی کیوں ہوتا؟ مراد کی خوشامد کا تیکھے لہجے میں جواب دے کر وہ بے نیازی سے اپنی مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

''کیسے نہ آتا اباجی! آپ میرے گھر سے ناراض ہو کر نکل گئے، یہ کوئی معمولی بات ہے کیا؟ میں کل سے اتنا بے چین ہوں۔ رات بھر نیند بھی ٹھیک طرح نہ آ سکی۔ شاہدہ بھی بڑی شرمندہ ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ ایک بار کسی طرح ماموں کو منا کر لے آئیں پھر میں انہیں دوبارہ شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔'' اپنی کیفیت بتانے کے ساتھ مراد شاہ نے لگے ہاتھوں بیوی کا پیغام بھی پہنچا دیا۔

''نا تو وہ کیوں شرمندہ ہے؟ اس نے تو مجھے وہی کچھ بتایا تھا جو تو نے اسے سکھایا ہے۔ انقلابی بن گیا ہے نا تو۔ وڈی وڈی گلاں کرنے لگا ہے۔ اب ہمیں تجھ سے سیکھنا پڑے گا کہ کیسے رہیں؟ کیا کھائیں، کیا پہنیں؟ ہماری پرکھوں سے چلی آئی ریت رسموں کو تیرے جیسا کل کا منڈا غلط کہے گا اور ہم مان لیں گے؟'' چودھری کو موقع ملا تھا، وہ کیوں نہ جی بھر کر بیٹے کے لتے لیتا۔

''میں آپ سے یہ ساری بحث کرنے نہیں آیا ہوں اباجی! میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانے آیا ہوں اور اس وعدے پر کہ جب تک آپ یہاں رہیں گے، گھر میں وہی کچھ ہوگا جو آپ چاہیں گے اور جیسی آپ کی مرضی ہوگی۔'' وہ جانتا تھا کہ نظریاتی اعتبار سے اس کے اور اس کے باپ کے درمیان مفاہمت ممکن نہیں اس لیے ایک بیٹے کی حیثیت سے ہتھیار ڈال دینا ہی مناسب سمجھا۔

''اچھا، میں سوچتا ہوں۔ ابھی تو چل، چل کر ذرا ناشتا کرتے ہیں۔'' چودھری نے اگرچہ اپنا لہجہ سخت ہی رکھا تھا لیکن پھر بھی مراد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ نرم پڑ گیا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے کمرے سے باہر نکلے اور لفٹ کے ذریعے نیچے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئے۔ ان کے وہاں پہنچ کر میز منتخب کرتے ہی ایک ویٹرس خدمت میں حاضر ہو گئی۔ وہ ہوٹل جتنا خوب صورت اور لشکارے مارتا ہوا تھا، وہاں خدمت پر مامور عملہ بھی ویسا ہی تھا۔ ان سے ناشتے کا آرڈر لینے آنے والی ویٹرس بھی ہوٹل کے ماحول سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھی۔ وہ نہ صرف خوب صورت تھی بلکہ اس خوب صورتی کے ساتھ ساتھ اپنی ملازمت کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ یقینی طور پر اتنے بڑے ہوٹل کی ملازمت کے لیے اسے خصوصی تربیت دی گئی ہوگی۔ پھر اس کا لباس بھی ایسا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ چودھری نے بھی اس کے حسن بے باک سے خوب آنکھیں سینکتے ہوئے اپنا آرڈر نوٹ کروایا پھر مراد کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم بھی اپنی پسند کے ناشتے کا آرڈر نوٹ کروا دو۔''

''میں صرف ایک کپ ... اور سینڈوچ لوں گا۔'' باپ کے لیے جو لمبے آرڈر ... اس نے اپنی پسند بتائی۔

''یہ تو حال ہے تیرے کھانے پینے کا... تب ہی تو صحت نہیں رہی ہے۔ ادھر ویسے بھی کھانے کو کیا ملتا ہے، سوکھا سوکھا تو ہوتا ہے سب۔ کھانے پینے کا مزہ تو ادھر اپنے ملک میں آتا ہے۔ ناشتے میں سری، پائے، نہاری، آملیٹ شاملیٹ، پراٹھوں کے ساتھ کھاتے ہیں تو سواد آ جاتا ہے۔ ادھر یہ جو سینڈوچ اور جوس شوس ہوتے ہیں، وہ تو ہم اپنے ہاں کھانے کے بعد چکھنے ٹھونگنے کے لیے رکھتے ہیں۔ تو بھی شاہدہ سے کہہ کر گھر پر ذرا تگڑا ناشتا بنوایا کرتا کہ کچھ باڈی شاڈی بنے۔'' چودھری نے بیٹے کی پسند پر تنقید کرتے ہوئے اسے نصیحت کی۔ مراد جو اچھا خاصا سرخ و سفید اور اسمارٹ نوجوان تھا، باپ کی نصیحت سن کر محض مسکرا کر رہ گیا۔ اب وہ اسے یہ کہہ کر کہ ... نہیں کر سکتا تھا کہ بے ڈول جسم صحت مندی کی علامت نہیں ہوتا بلکہ ایسا شخص کئی عوارض کا شکار ہو جاتا ہے، ناراض کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ باپ کو منانے آیا تھا اس لیے حتی الامکان بحث سے گریز کا رویہ اپنائے ہوئے تھا۔

''اگر آپ کو سری پائے اور نہاری یاد آ رہے ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے اباجی! آپ میرے ساتھ گھر چلیں، میں دوپہر کے کھانے پر ان چیزوں کا انتظام کروا دوں گا۔''

''باپ کو بچوں کی طرح لالچ دے کر بہلانے کی کوشش کر رہا ہے؟'' مراد کی بات سن کر چودھری نے کہا اور کھل کر ہنس پڑا۔ سب سے بڑی اولاد، وہ بھی نرینہ ہونے کی وجہ سے مراد شروع ہی سے اسے بہت عزیز رہا تھا اور وہ اسے دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ ہی بہت زیادہ رعایت دیتا تھا۔ اس بار بھی وہ زیادہ دیر اپنی ناراضگی برقرار نہیں رکھ سکا اور ہنس دیا تو مراد کو اطمینان ہو گیا۔ اس ہنسی نے طے کر دیا تھا کہ وہ اپنے تخریبے باپ کو منانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

''آپ نے اپنا موبائل بھی آف کر رکھا ہے۔ میں اور شاہدہ کل سے کتنی بار آپ کا نمبر ملا کر دیکھ چکے ہیں لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ گاؤں سے منشی اللہ رکھا کا بھی فون آیا تھا میرے پاس۔ وہ بھی پریشان ہو رہا تھا کہ چودھری صاحب کا فون کیوں بند ہے؟ میرے خیال میں اس کو آپ سے کوئی ضروری کام ہوگا۔'' مطلع صاف ہوا تو مراد نے اس سے دوسری گفتگو چھیڑ دی۔

''موبائل میں نے جان کر آف کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ تو سب سے پہلے مجھے فون کرنے کی ہی کوشش کرے گا، پر میں اتنی آسانی سے تیرے ہاتھ تھوڑی آنے والا تھا۔'' چودھری نے ... اپنا کارنامہ ...

''ڈھونڈ تو میں نے آپ کو پھر بھی لیا۔ کل رات ہی میں یہاں پہنچ گیا تھا لیکن آپ آرڈر دے کر سوئے تھے کہ کسی کو آپ کے کمرے تک نہ آنے دیا جائے، نہ ہی فون پر بات کروائی جائے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں رات ہی آپ کو واپس لے جاتا۔'' مراد نے جواباً اپنا کارنامہ بیان کیا۔

''مینوں معلوم تھا کہ تو مجھے ڈھونڈ نکالے گا۔ آخر میرا پتر ہے۔ تیری ذہانت میں مجھے کوئی شبہ تھوڑی ہے اسی لیے پہلے ہی سے سارا بندوبست کر کے سویا تھا۔'' چودھری شرارت سے مسکرایا۔ وقت کے اس لمحے میں وہ ایک بالکل مختلف آدمی لگ رہا تھا جس کی ساری سخت گیری اور سفاکی کہیں گم ہو گئی تھی اور وہ صرف اور صرف ایک جوان بیٹے کا محبت کرنے والا باپ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر قدرت کے اس اصول پر یقین آتا تھا کہ اللہ نے ہر انسان کے اندر خیر و شر دونوں جذبوں کو رکھا ہے۔ محبت و نفرت، سختی و نرمی، سفاکی و رحم دلی ہر دو متضاد پہلو انسان کے اندر ہوتے ہیں، بس یہ انسان پر ہوتا ہے کہ وہ کس جذبے کو ابھار کر سامنے لائے اور کس کو دبا

اعداد و شمار کے ماہر جناب جی ایم نوشاہی نے ایک مرتبہ اپنے دوستوں کو بتایا کہ اوسط درجے کا مرد آدمی روزانہ پچیس ہزار الفاظ بولتا ہے جبکہ اوسط درجے کی عورت روزانہ تیس ہزار الفاظ بولتی ہے۔

پھر آہ بھر کر انہوں نے کہا۔ ''بدقسمتی سے شام کو جب میں دفتر سے اپنے گھر پہنچتا ہوں تو اپنے پچیس ہزار الفاظ استعمال کر چکا ہوتا ہوں جبکہ میری بیوی اپنے تیس ہزار الفاظ بولنے کا آغاز کرتی ہے۔''

☆☆☆

گندو میاں بیمار پڑے۔ ڈاکٹر آیا۔ اس نے اسٹیتھ اسکوپ لگا کر سینے کا معائنہ کیا۔

''ڈاکٹر صاحب۔'' گندو میاں نے پوچھا۔ ''کیا آپ میرے جراثیم کو فون کر رہے ہیں؟''

☆☆☆☆

امریکہ کے مشہور ماہر معاشیات برن اسٹائن کا کہنا ہے۔ ''دنیا کی موجودہ رفتار کو دیکھ کر پیش گوئی کرنے کو دل چاہتا ہے کہ جلد ہی عرب کے لوگ ایک سے ایک بڑھ کر کیڈیلاک پر دندناتے پھر رہے ہوں گے اور ہم امریکی اونٹوں کی سواری سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔''

☆☆☆

استانی نے کلاس میں پوچھا۔ ''کسی ایسے جانور کا نام بتاؤ جو بہت تیزی سے بڑھتا ہے؟''

ایک بچے نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''مچھلی مس!''

''شاباش۔'' استانی نے کہا۔ ''کیا تم اس کے بڑھنے کی رفتار بتا سکتے ہو؟''

''جی ہاں مس۔'' بچہ بولا۔ ''پچھلے ہفتے ابو جان نے جو مچھلی پکڑی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ روزانہ دو تین انچ کا اضافہ کر دیتے ہیں اور ابھی تک اسی رفتار سے اضافہ جاری ہے۔''

☆☆☆

مچھلی کے شکار پر جاتے ہوئے تم اپنی بیوی کو گھر کیوں چھوڑ جاتے ہو؟''

''اس کی ایک بہت اہم وجہ ہے۔''

''وہ وجہ مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''وجہ یہ ہے کہ مچھلیوں پر میری بیوی کی موجودگی کا اچھا اثر نہیں پڑے گا۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ وہ دیکھ کر میرے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں ہوں گی کہ میں خود کتنی بری طرح اس عورت کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔''

www.pkdigest.com

دے۔ چودھری نے بھی اپنے اندر موجود ہر مثبت جذبے کو دبا کر منفی خوبیوں کو اتنی شدت سے پروان چڑھایا تھا کہ اب مشکل سے ہی کبھی کسی مثبت جذبے کی جھلک نظر آتی تھی۔

"اب تو آپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہے نا... اب آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔" باپ کا اچھا موڈ دیکھ کر مراد شاہ نے بھی ذرا لاڈ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مطلب کی بات کی۔

"تو اتنی ضد کر رہا ہے تو چلتا ہوں۔" آخر کار چودھری نے بھی ہامی بھر ہی لی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ ڈائننگ ہال سے باہر نکلے۔ ان کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ مراد اوپر کمرے میں جا کر چودھری کا سامان لے آئے گا اور چودھری اس دوران لاؤنج میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرے گا۔ پروگرام کے مطابق مراد نے جیسے ہی اوپر کمرے میں جانے کے لیے لفٹ میں قدم رکھا، چودھری کی نظر حشر سامان لنڈا پر پڑی۔ وہ کل ہی کی طرح منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اسکرٹ کی بے حد مختصر لمبائی اور اونچی ایڑی کی سینڈل نے اس کی سڈول ٹانگوں کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ کل کی طرح آج بھی چودھری اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

"اچھا ہوا کہ آپ مجھے یہیں مل گئے چودھری صاحب! میں آپ ہی سے ملنے آئی تھی لیکن آپ کا روم نمبر میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔" چودھری کو دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے اپنی سریلی آواز میں کہا۔

"یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ تم مجھ سے ملنے یہاں تک آئی ہو، ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ تم سے دوبارہ ملاقات کے لیے ڈیوڈ سے رابطہ کرنا پڑے گا۔" چودھری نے بھی جوابی خوشی کا اظہار کیا۔

"میں صرف آپ سے ملنے نہیں آئی ہوں۔ آج کا سارا دن میں آپ کے ساتھ گزاروں گی اور آپ کو نیویارک دکھاؤں گی۔ آئی ہوپ کہ آپ میری کمپنی کو ضرور انجوائے کریں گے۔"

"وہ تو لازم ہے۔ کون ایسا ناشکرا ہو گا جو تم جیسی حسینہ کی کمپنی انجوائے نہ کرے۔" چودھری کی باچھیں لنڈا کا پروگرام سن کر کانوں تک چر گئیں۔ لنڈا کو سامنے پا کر وہ یہ تک فراموش کر چکا تھا کہ مراد بھی اسی ہوٹل میں موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ جانے کا وعدہ کر چکا ہے۔

"تو پھر چلیں... ابھی نکل پڑتے ہیں۔ ہم سب سے پہلے لبرٹی آئی لینڈ چلیں گے اور وہاں اسٹیچو آف لبرٹی کے سامنے ڈھیر سارے فوٹو گرافس بنوائیں گے۔ میں ساری تیاری کے ساتھ آئی ہوں۔ آپ کا اس بار کا نیویارک کا ٹرپ یادگار نہ بنا دیا تو میرا نام بھی لنڈا نہیں۔" پرجوش لہجے میں کہتے ہوئے اس نے چودھری کا بازو تھام لیا۔

"اس کا تو مجھے بھی یقین ہے کہ تمہارے ساتھ نیویارک گھومنے کا مزہ ہی الگ ہو گا۔ بس یہ ڈر ہے کہ اسٹیچو آف لبرٹی تمہارے سامنے پھیکا نہ پڑ جائے۔" چودھری نے وارفتگی کا مظاہرہ کیا۔

"اوہ... چودھری صاحب! آپ تو مجھے بنانے لگے۔" لنڈا اس کی بات سن کر کھلکھلا کر ہنسی اور خالص امریکن اسٹائل میں اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مراد شاہ ایک سروس بوائے سے چودھری کا سامان اٹھوائے وہاں پہنچا۔ دونوں باپ بیٹے کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں تو مراد نے فوراً ہی رخ موڑ لیا۔

"ایکسکیوز می لنڈا! میں ابھی آتا ہوں۔" چودھری لنڈا کو خود سے دور کر کے فوراً مراد کی طرف بڑھا۔

"تو میرا سامان اپنے ساتھ لے کر اپنے اپارٹمنٹ چلا جا پتر! میں فارغ ہو کر آپ وہاں پہنچ جاؤں گا۔" وہ شرمندہ تو خیر نہیں تھا لیکن بیٹے کے چہرے پر موجود ناپسندیدگی کے تاثرات دیکھ کر ذرا دھیمی آواز میں اس سے بولا۔

"ٹھیک ہے اباجی! میں چلتا ہوں۔" مراد نے آہستگی سے جواب دے کر اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے باپ کو کتنی حسین مصروفیت میسر آ گئی ہے اس لیے اس کے جلد فارغ ہونے کے امکان کو قطعی ناممکن تصور کرتا ہوا وہاں سے فوری طور پر رخصت ہو گیا۔

"بیٹا تھا میرا... مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔" مراد کے رخصت ہونے کے بعد چودھری پلٹ کر لنڈا کی طرف آیا تو اسے بتانے لگا۔

"بڑا ہینڈسم مین ہے۔ لگتا ہے آپ پر گیا ہے۔" لنڈا نے فوراً ریمارکس پاس کیے تو چودھری فخر سے مسکرانے لگا۔ ہنستے مسکراتے وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوٹل سے باہر نکلے۔ پارکنگ میں لنڈا کی گاڑی موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر چند لمحوں بعد وہ نیویارک کے بے پناہ ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہو گئے۔

"اطلاع ملی ہے کہ اسسٹنٹ کمشنر شہریار عادل کو... کڈنیپ کر لیا گیا ہے۔ کل رات وہ فاریسٹ آفیسر عابد انصاری سے ملاقات کر کے واپس آ رہا تھا، اس وقت یہ واقعہ پیش آیا۔ کڈنیپنگ کو کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود پولیس ابھی تک کچھ

نہیں کر سکی ہے۔ خیال ہے کہ اسے کڈنیپ کرکے گھنے جنگل میں کہیں کسی خفیہ ٹھکانے پر رکھا گیا ہے۔ آئی جی مختار مرزا اس صورت حال پر سخت چراغ پا ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ کسی طرح جنگل میں سرچ آپریشن شروع کروا دیا جائے۔" وہ تھوڑا سا ہی آگے بڑھے تھے کہ لنڈا نے مہارت سے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے اطلاع دی۔

"اوہ شٹ! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ میرے بندے مجھے اس بات کی اطلاع دینے کے لیے فون کر رہے ہوں گے لیکن میں نے اپنا موبائل بند کیا ہوا ہے اس لیے ابھی تک مجھ تک یہ خبر نہیں پہنچی۔" لنڈا کی فراہم کردہ معلومات پر چودھری نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا موبائل جیب سے نکالا اور اسے آن کیا۔ اپنی اس مصروفیت میں اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ لنڈا اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہی ہے۔

"یہ کام آپ کے حکم پر ہوا ہے نا چودھری صاحب؟" اس نے سوال کیا تو چودھری چونکا۔ "ہم جانتے ہیں کہ یہ کارروائی آپ ہی کے بندوں نے کی ہے۔ آپ شہریار سے بری طرح خار کھائے ہوئے ہیں اور پہلے بھی ایک بار اسے ڈاکٹر ماریا کے ذریعے ٹریپ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی چال سے بچ گیا تھا، چنانچہ اب آپ اسے اغوا کرکے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں... لیکن میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ آپ کا یہ عمل ہمارے مفاد میں نہیں ہے۔ اس حرکت سے ہمارے پروجیکٹ کو سخت نقصان پہنچ سکتا ہے۔" چودھری ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ لنڈا کے سوال کا جواب ہاں میں دے یا نہ میں کہ اس نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ اس کے لہجے کا یقین اتنا گہرا تھا کہ چودھری چاہنے کے باوجود کسی بات سے انکار نہیں کر سکا۔

"جنگل میں سرچ آپریشن شروع ہونے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟ ایک بار اگر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے قدم ان راستوں پر اٹھ گئے تو پھر انہیں ہمیشہ کے لیے راہ مل جائے گی اور ہمارا وہاں پوست کاشت کرنے کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ ہم اس پروجیکٹ پر اچھا خاصا کام کر چکے ہیں اور رقم بھی ٹھیک ٹھاک لگ گئی ہے۔ اس سے پیچھے ہٹنے کا مطلب ہوگا، ویسٹ آف ٹائم اینڈ منی اور یہ قابل برداشت نہیں۔ ویسے بھی آپ کو اب اس اے سی کو اغوا کروانے کی کیا ضرورت رہ گئی تھی۔ وہ لڑکی ماہ بانو ہم نے آپ کو فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اور لکڑی و کھالوں کے بزنس کا بھی بہتر متبادل آپ کے سامنے ہے۔ اس صورت حال میں اسے ہی شہریار کو چھیڑنا سوائے حماقت کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" سرد سی آواز میں بات کرنے والی لنڈا کے لہجے میں اس وقت خاصی تلخی تھی اور چہرے کے تاثرات میں بھی سختی کا عنصر نمایاں تھا۔

"آئی ایم سوسوری ہنی! یہ سب ایک ذرا سی غفلت کی وجہ سے ہو گیا ورنہ میں نے خود بھی یہ بات سمجھ لی تھی کہ اب شہریار کے اغوا کی کوئی ضرورت نہیں رہی ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں ابھی اپنے بندوں کو فون کرکے شہریار کی رہائی کا حکم دے دیتا ہوں۔ ابھی اتنا زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔ پاکستان میں اس وقت لگ بھگ شام کے چھ ساڑھے چھ بجے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں شہریار کو واپس بھیج دیا جائے تو کہیں کچھ نہیں ہوگا۔ سرچ آپریشن کی طرف سے بھی زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے سویٹی۔ ہمارے ہاں ایسے کام اتنی آسانی سے شروع نہیں ہوتے۔ شہریار واپس پہنچ گیا تو یہ معاملہ بالکل دب جائے گا۔" یہ یقیناً لنڈا کا رعب حسن تھا جو چودھری جیسا بندہ زندگی میں پہلی بار کسی سے معافی طلب کر رہا تھا۔ لنڈا نے اس کی ساری وضاحت بے تاثر چہرے کے ساتھ سنی اور خاموشی سے اسے موبائل پر کوئی نمبر ڈائل کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"ہاں منشی... کل سن، بالا کو غصہ ہے، ہمیں سے بول کر شہریار کو فوراً آزاد کر دے۔" رابطہ قائم ہوتے ہی وہ انگریزی ترک کرکے اپنے مخصوص لب ولہجے میں بات کرنے لگا۔

"میں کہہ دوں گا سرکار، پر آپ بتائیں کہ آپ کدھر ہیں؟ کل سے میں آپ سے کل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ادھر ایس پی نے بھی آپ کا پوچھ پوچھ کے میری جان کھائی ہوئی ہے۔ وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح مجھ سے اگلوا لے، اے سی کا اغوا ہمارے ہی بندوں نے کیا ہے لیکن میں نے بھی پچھے پر ہتھ نہیں رکھنے دیا اسے۔" چودھری کو اطلاع فراہم کرتے ہوئے منشی نے اپنا کارنامہ بھی فخر سے بیان کیا۔

"ایس پی کو رہن دے اس سے تو بعد میں، میں آپ نمٹ لوں گا... تو بس کسی طرح اپنی زبان نہ کھولنا۔ اور ہاں، بالے کو بولنا کہ آزاد کرنے سے پہلے اے سی کی چنگی طرح چھینٹی شیٹی ضرور لگا دے۔ وہ ہمارا مہمان رہے اور بغیر خاطر مدارت کے واپس چلا جائے یہ تو کوئی چنگی گل نہیں ہے نا۔"

"جی چودھری صاحب! اوڈی چنگی طرح اس کی خاطر مدارت ہو جائے گی۔ کوئی اور خدمت ہو تو وہ بھی آپ مینوں دس دیں۔" منشی نے اپنے ازلی خوشامدانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ میرا موبائل اب کھلا رہے گا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو مینوں فون کر دینا۔" چودھری نے منشی کو حکم دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور مسکراتا ہوا لنڈا کی طرف متوجہ ہوا۔

"لو ہنی! تمہاری پرابلم سولو ہو گئی۔ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں خبر مل جائے گی کہ شہریار واپس اپنے بنگلے پر پہنچ گیا ہے۔"

"یہی ہم سب کے حق میں بہتر رہے گا۔" لنڈا نے ہنوز سنجیدہ رہتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔ چودھری کی ٹیلی فونک گفتگو کے دوران وہ نہایت خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی رہی تھی۔

"اوہ کم آن ہنی! اب تو اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ اگر تم اسی طرح موڈ آف رکھو گی تو ہم کیا خاک انجوائے کر سکیں گے؟" چودھری نے اس کے شانوں پر اپنا بازو پھیلاتے ہوئے اسے منانے کی سعی کی۔ حیرت انگیز طور پر لنڈا نے اپنا موڈ فوراً ہی بحال کر لیا اور کھل کر مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ چودھری کے لیے اس نظارے سے بڑھ کر خوب صورت تھی جو لبرٹی آئی لینڈ کی طرف فیری میں سفر کرتے ہوئے سمندر کے پانی میں نیویارک شہر کی روشنیاں پڑنے سے ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چودھری قدرت کی شناسائی میں سے صرف ایک شے کو سراہنے کا قائل تھا اور وہ شے تھی عورت... مجھے سراہنے کے لیے وہ اسے پرکھنا ضروری سمجھتا تھا اور لنڈا تو بجائے خود ایسی زوردار عورت جسے ایک بار برتنے کے بعد چودھری کے اندر اس کے قرب کی طلب مزید بھڑک گئی تھی۔

☆☆☆

شہریار کو اس قید میں کئی گھنٹے گزر گئے تھے۔ بیرونی دنیا سے رابطہ تقریباً منقطع ہونے کے باوجود وہ سماعتی مشاہدے کی بنیاد پر دن کے مختلف پہروں کے بارے میں اندازہ قائم کر رہا تھا۔ جس وقت وہ بے ہوشی سے جاگا تھا، اس وقت پرندوں کی چہچہاہٹ نے اسے وقت صبح کے بارے میں مطلع کیا تھا۔ دن آہستہ آہستہ گزر کر شام کے سایوں کی آغوش میں آیا تو بھی اس کی قوت سماعت نے اسے مطلع کر دیا۔ کمرے کی دیواروں اور دروازے کے درمیان کوئی درز نہ ہونے کے باعث بصری رابطہ تو تھا ہی منقطع... بات چیت پر بھی باہر موجود فرد یا افراد میں سے کوئی آمادہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اتنا طویل وقت گزر جانے کے باوجود کسی نے اس سے کھانے کے بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا۔ حوائج ضروریہ کا بھی یہی عالم تھا۔ اس سلسلے میں اسے خود پر کڑا ضبط کرنا پڑ رہا تھا۔ ورنہ دوسری صورت یہی تھی کہ وہ اس مختصر کمرے کے ہی کسی کونے کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتا۔ اس کی نفاست پسند طبیعت کو یہ بات گوارا نہیں تھی اس لیے اب تک ضبط سے ہی کام لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ پیاس محسوس ہونے پر بھی اس نے کونے میں رکھی صراحی سے دو بار چند قطرے ہی حلق کو تر کرنے کے لیے اپنے منہ میں ٹپکائے تھے لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کسی بھی لمحے اس فطری ضرورت کے آگے ہار ماننی پڑے گی۔ ہار ماننے سے قبل اس نے مناسب سمجھا کہ ایک کوشش اور کر دیکھے۔ شاید باہر موجود افراد اس کی درخواست پر کان دھر لیں۔ اسی خیال کے تحت وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"کوئی ہے؟ پلیز! دروازہ کھولو۔ میں حاجت محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر زوردار دستک دی اور بلند آواز میں بولا۔ یوں محسوس ہوا کہ وہاں اس کی بات سننے والا کوئی موجود ہی نہ ہو لیکن پھر پل بھر کے توقف کے بعد دروازے کے قریب آہٹیں ابھریں۔ ان آہٹوں کو سن کر اس کے دل میں امید کی لہر جاگی اور باہر موجود افراد پر مزید زور ڈالنے کے لیے اس نے ایک بار پھر دروازے کو بجایا۔ ردعمل میں دروازہ اتنی تیزی سے کھولا گیا کہ اس کو پیچھے ہٹنے کا موقع بھی نہیں ملا اور دروازے کا پٹ پوری قوت سے اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ وہ اچانک لگنے والے اس جھٹکے کو سہار نہیں سکا اور لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا۔ اس اثنا میں دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے تھے اور انہوں نے اپنے چہرے نقاب کے پیچھے چھپائے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے بیک وقت اپنے ہاتھوں میں موجود ڈنڈوں سے شہریار پر حملہ کر دیا۔ وہ چوٹ کھانے کے بعد سنبھل نہیں سکا تھا، اس اچانک حملے سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکا اور دونوں ڈنڈے پوری قوت سے اس کے جسم پر پڑے۔ ڈنڈوں سے لگنے والی چوٹوں نے اسے بلبلا کر رکھ دیا اور وہ تڑپ کر اپنے بچاؤ کے لیے سیدھا ہوا۔ اس دوران حملہ آور دوسرا وار کر چکے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کے ڈنڈے کو اپنے دائیں ہاتھ پر روکا اور دوسرے کو روکنے کے لیے بایاں ہاتھ پھیلایا لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور دوسرے حملہ آور کا ڈنڈا پوری قوت سے اس کے بائیں بازو پر آ کر لگا۔ اس چوٹ نے اسے مزید جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا اور بنا کچھ سوچے سمجھے اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اس شخص کو دے ماریں۔ اس کے حملے کے زور سے وہ شخص پیچھے کی طرف الٹا اور مختصر کمرے میں رکھی صراحی سے جا کر ٹکرایا۔ صراحی فرش سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ صراحی میں موجود پانی کمرے

www.pkdigest.com

کے بَل چہرے فرش پر پھیل گیا۔

اس سارے عمل کے دوران پہلے ڈنڈا بردار نے اپنے حواس قائم رکھے تھے، چنانچہ اس نے بلاتوقف ہاتھ چلایا اور ڈنڈے کی زوردار ضرب شہریار کی ٹانگوں پر لگائی۔ ضرب کھا کر شہریار نے خود کو سنبھال کر اس شخص کو اس چوٹ کا جواب دینے کی کوشش کی لیکن کمرے کی محدود چار دیواری اس کے تیزی سے حرکت کرنے میں مانع تھی۔ وہ جب تک سنبھل کر سیدھا کھڑا ہوا، حملہ آور اس پر دوسرا وار کر چکا تھا۔ اس بار اس نے شہریار کی کمر کو نشانہ بنایا تھا۔ کمر پر یہ چوٹ کھانے کے بعد شہریار نے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور اس شخص کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کیا لیکن اس دوران اس کا صراحی پر گرنے والا ساتھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنے ڈنڈے سے شہریار پر حملہ کر دیا اور اس کے سر پر ضرب لگائی۔ سر پر لگنے والی یہ ضرب ایسی تھی کہ وہ چکرا اٹھا اور پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ دونوں پے درپے اسے ضربیں لگاتے چلے گئے۔

اس کا جسم جو فطری تقاضے پورے نہ ہو سکنے کی وجہ سے پہلے ہی کچھ نڈھال سا ہو رہا تھا، زیادہ دیر مزاحمت نہیں کر سکا اور اگلے چھ سات منٹ میں ہی اس کے حواسوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تکلیف دیتے جسم کی ٹیسوں کے ذریعے اپنے ذہن میں پورے واقعے کو دُہراتے ہوئے اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کمرا مختصر لیکن صاف ستھرا تھا اور اپنے ساز و سامان سے کسی اسپتال کا حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اس کمرے کے لیے اپنے ذہن میں آشنائی محسوس کی۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی یادداشت پر زور دیتا، کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کے مخصوص گیٹ اپ میں ایک شخص اندر داخل ہوا۔ شہریار نے اس شخص کو فوراً شناخت کر لیا۔ وہ پیرآباد کے مرکز صحت میں ڈیوٹی دینے والا مسلی ڈاکٹر داور تھا۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں سر؟" شہریار کو ہوش میں دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا جس کے جواب میں شہریار اپنے سر کو محض ایک اثباتی جنبش ہی دے سکا۔

"پولیس کے جوان بے ہوشی کی حالت میں آپ کو اٹھا کر یہاں لائے تھے۔ روڑے کے جنگل سے اپنی بکریاں چرا کر واپس آ رہے تھے تو انہوں نے آپ کو راستے میں بے ہوش پڑا ہوا دیکھا۔ اتفاق سے ان لڑکوں کی ایک بکری کھو گئی تھی جس کی تلاش میں انہیں واپس لوٹنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ انہوں نے آپ کو بے ہوش پڑا ہوا پایا اور پہچان گئے کہ آپ اے سی شہریار عادل ہیں۔ گاؤں میں آپ کی مستقل آمدورفت کی وجہ سے یہاں کے کافی لوگ آپ کو پہچانتے ہیں۔ پھر آپ کے اغوا اور پولیس کی تلاش میں متحرک ہونے سے بھی لوگ واقف ہو گئے تھے اس لیے ان لڑکوں کو آپ کو شناخت کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ انہوں نے فوراً ہی پولیس والوں کو اطلاع دی اور وہ لوگ آپ کو اپنی گاڑی میں یہاں لے آئے تاکہ ابتدائی طبی امداد دی جا سکے۔ آپ کا سر پھٹ گیا تھا اور جسم کے چند اور مقامات پر بھی ایسی چوٹیں لگی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ آپ کا خون آلود چہرہ اور لباس دیکھ کر ہم لوگ تشویش میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں سیریس معاملہ نہ ہو... لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اور ڈاکٹر ماریا نے مل کر آپ کو ٹریٹمنٹ دیا تو فوری طور پر آپ کی حالت سنبھل گئی۔ اب بھی میں نے ڈرپ میں پین کلر شامل کر دیا ہے، امید ہے کہ آپ اپنی چوٹوں میں بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کریں گے۔" اس کے سوال کرنے سے قبل ڈاکٹر داور نے ازخود اسے تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔

"آپ لوگوں نے میرے آفس فون کر کے میرے ملنے کی خبر دے دی ہے یا نہیں؟" دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے اس سے دریافت کیا۔

"یس سر، وہاں اطلاع پہنچ چکی ہے۔ آپ کے پی اے عبدالمنان صاحب نے کہا ہے کہ وہ خود یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ایس پی معظم حارث نے بھی اپنے آنے کی اطلاع دی ہے۔ یہاں موجود پولیس فورس کو لیڈ کرنے والے آفیسر نے اصرار کیا تھا کہ آپ کو نورکوٹ کے اسپتال میں شفٹ کر دیا جائے لیکن میں نے اور ڈاکٹر ماریا نے اسے یقین دہانی کروائی کہ آپ کی حالت بہتر ہے اور کوئی تشویش ناک بات نہیں۔" ڈاکٹر داور شاید زیادہ گفتگو کرنے کا عادی شخص تھا جو ہر بات کو نہایت تفصیل سے بیان کر رہا تھا۔

"تھینک یو ڈاکٹر! اب آپ ایسا کریں کہ اس پولیس آفیسر کو میرے پاس بھیج دیں۔" بیڈ کی پشت سے سر لگا کر اس نے قدرے نیم دراز ہوتے ہوئے ڈاکٹر کو ہدایت دی۔ اس ذرا سی حرکت کو کرنے میں ہی اس کے جسم کے جوڑ جوڑ نے جس طرح احتجاج کیا تھا، اس سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مارنے والوں نے خوب دل کھول کر پٹائی لگائی ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی بھی چوٹ خطرناک ثابت نہ ہو۔ شاید وہ لوگ اسے محض وارننگ دینا چاہتے تھے کہ بچو، سدھر جاؤ ورنہ نتیجہ اس سے بھی زیادہ بُرا نکل سکتا ہے۔

"پولیس آفیسر کو بعد میں کال کیجیے گا، پہلے یہ سوپ پی لیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے گرم گرم بنا کر لائی ہوں۔ پولیس آفیسر کو اندر بلا لیا تو اسے بیان ریکارڈ کرانے میں یہ سوپ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" ڈاکٹر داور کے اس کی ہدایت پر عمل کرنے سے پہلے ڈاکٹر ماریا ایک ٹرے میں بھاپ اڑاتا ہوا سوپ کا پیالہ رکھے اندر داخل ہوئی اور اس سے بولی۔ اسے سوپ کے ساتھ اندر داخل ہوتے دیکھ کر شہریار کو سمجھ آ گیا کہ وہ کیوں یہاں سے غائب تھی، ورنہ اس کی جیسی نیچر تھی اس سے تو یہی امید کی جا سکتی تھی کہ وہ شہریار کے ہوش میں آنے تک اس کے پاس ہی موجود رہتی۔

"تھینک یو ڈاکٹر! میں واقعی اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔" شہریار نے خوش دلی سے اس کی بات کا جواب دے کر ایک طرح سے اس کی تائید کر دی۔ ویسے سوپ کی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے پیٹ کے چوہوں کو پوری طرح جگا دیا تھا اور اسے یاد آنے لگا تھا کہ اسے پیٹ میں کچھ ڈالے ہوئے چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ کا وقت گزر چکا ہے۔

"ویل سر! آپ سوپ پئیں۔ میں پندرہ منٹ بعد پولیس آفیسر کو آپ کے پاس بھیج دوں گا۔" ڈاکٹر داور کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر ماریا نے اس کے سینے پر نیپکن پھیلایا اور خود بیڈ پر اس کے بائیں جانب بیٹھ گئی۔

"چلیں، اب اچھے بچوں کی طرح منہ کھولیں اور یہ سوپ پی لیں۔" باؤل میں سے چمچ میں سوپ بھر کر اس نے شہریار کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ ایک ڈاکٹر کا یہ خالصتاً گھریلو عورت والا انداز اسے اچھا لگا تھا۔

"اتنی چوٹیں کھا کر بھی آپ مسکراتے ہیں... بڑے بہادر ہیں۔" ڈاکٹر ماریا نے اسے سراہا۔

"آپ جیسا تیماردار میسر آ جائے تو بیمار کے چہرے پر تو خود بخود ہی رونق و مسکراہٹ آ جاتی ہے... لیکن آپ یہ نہ

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-
اندھیری رات کے مسافر 325/-
ثقافت کی تلاش 150/-
قیصر و کسریٰ 380/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-
گمشدہ قافلے 350/-
داستان مجاہد 200/-
پردیسی درخت 325/-
یوسف بن تاشفین 325/-
معظم علی 325/-
خاک اور خون 350/-
کلیسا اور آگ 300/-
قافلہ حجاز 350/-
محمد بن قاسم 300/-
پورس کے ہاتھی 180/-
انسان اور دیوتا 280/-
پاکستان سے دیارِ حرم تک 160/-
آخری چٹان 325/-
سو سال بعد 150/-
سفید جزیرہ 225/-
شاہین 325/-

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781 051-35539609 042-37220879
022-2780128 021-2765086 041-2627568

سمجھے گا کہ بیمار کا حال اچھا ہے۔'' اس نے مرزا غالب کے شعر کو نثری پیرائے میں استعمال کرتے ہوئے ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا اور اس کے بڑھائے ہوئے چمچے سے سوپ پی لیا۔ دائیں ہاتھ میں جسم کو گلوکوز فراہم کرنے والی سوئی چبھے ہونے کی وجہ سے وہ خود سے سوپ پینے کے لائق تھا بھی نہیں۔

''ڈاکٹر سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ بیمار کا حال کیسا ہے؟ ہم آپ کے ہوش میں آنے کا ٹھیک ٹھاک حساب لگا سکتے ہیں تو یہ کیسے نہیں جانیں گے کہ ابھی آپ کا حال اتنا خراب ہے کہ اگلے کئی دن تک بیڈ ریسٹ کریں گے، تب ہی کہیں جا کر بہتر ہوں گے۔ مارنے والوں نے آپ کو بڑی احتیاط سے مگر دل کھول کر مارا ہے۔ ویسے بائی داوے آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ کون لوگ تھے؟'' اسے سوپ پلانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے شوخ لہجے میں بات کرتے کرتے اچانک سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''معلوم تو نہیں بس اندازہ ہی لگا سکتا ہوں کہ اس واقعے کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے... لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ اس نے اتنا لمبا ڈراما رچانے کے بعد اتنی آسانی سے مجھے چھوڑ کیسے دیا؟ ورنہ میں نے تو اغوا ہونے کے بعد بھی سوچا تھا کہ اب وہ مجھ سے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کرے گا۔'' اس نے مبہم اور پُرسوچ انداز میں ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا۔

''آپ کا اشارہ چودھری افتخار عالم کی طرف ہے نا؟'' ڈاکٹر ماریا نے اس سے پوچھا۔ جواباً وہ خاموش رہا لیکن یہ خاموشی خود اعلان کر رہی تھی کہ ڈاکٹر ماریا کا اندازہ درست ہے۔ اسے خاموش دیکھ کر ماریا نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور چپ چاپ اسے باؤل میں موجود سوپ پلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تھینکس فار دِس ڈیلیشیس سوپ ڈاکٹر!'' شہریار نے اس سے کہا۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

''یس کم اِن۔'' شہریار نے دستک کا جواب دیا۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور عبدالمنان کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایس پی معظم تارڑ بھی موجود تھا۔

''آر یو او کے سر؟'' عبدالمنان نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی بے تابی سے پوچھا۔ اس کے چہرے کی تھکن اور آنکھوں کی سرخی سے ظاہر تھا کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے بالکل بھی آرام نہیں کر سکا ہے۔

''یس، آئی ایم پرفیکٹلی او کے۔ یو ڈونٹ وری۔'' اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے شہریار نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

''آئی جی صاحب آپ کے لیے بہت زیادہ پریشان تھے۔ انہیں آپ کی واپسی کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ جب ہوش میں آجائیں تو ان کی آپ سے بات کروا دی جائے۔ انہوں نے آپ کو علاج کے لیے لاہور شفٹ کرنے پر بھی زور دیا تھا۔'' عبدالمنان نے اسے مختار مراد کی بابت آگاہ کیا۔

''ان سے میں بات کر لوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میری گاڑی کے ڈرائیور کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟'' کمرے میں ایس پی کی موجودگی کو نظر انداز کیے وہ مسلسل عبدالمنان سے مصروفِ گفتگو تھا۔

''ڈرائیور بے چارہ تو ختم ہو گیا۔ آپ کی گاڑی فوری طور پر دریافت نہیں کی جا سکی تھی، چنانچہ زخمی ڈرائیور کو کسی قسم کی طبی امداد نہیں مل سکی۔ وہ کسی مدد کے پہنچنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔'' عبدالمنان نے افسردگی سے بتایا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اغوا کاروں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ڈرائیور کے زندہ بچ جانے کا کوئی امکان نہیں پھر بھی وہ دل سے خواہاں تھا کہ کسی طرح اس غریب کی زندگی بچ جائے لیکن اس کی خواہش نے طے شدہ فیصلے کو نہیں ٹالا تھا۔

''آپ جس وقت کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے ہیں، اچانک ہی سب کچھ ہوا اور کیسے ہوا، کسی کو بھی نہیں پتا۔ آپ کی گاڑی اور ڈرائیور کی لاش کو ویرانے میں پا کر ہم صرف یہ اندازہ لگا سکے تھے کہ آپ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ پولیس فورس کے جوان آپ کو تلاش کرتے رہے۔ آئی جی صاحب نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ اگر چوبیس گھنٹوں کے اندر آپ کو تلاش نہیں کیا جا سکا تو وہ جنگل میں سرچ آپریشن شروع کروا دیں گے لیکن اس سے قبل ہی آپ ہمیں مل گئے۔ آپ کا اغوا ہمارے لیے جتنی حیرت کی بات تھی، اس طرح واپسی اس سے بھی زیادہ حیرت ناک ہے۔ ورنہ میرا تو آئیڈیا تھا کہ اغوا کار آپ کے بدلے میں کسی قسم کے مطالبات کر کے ہم سے سودے بازی کی کوشش کریں گے۔'' افسردگی بھرے ان لمحات میں اس کی اور عبدالمنان کی گفتگو میں ذرا تعطل آیا تو ایس پی نے ازخود اس سے گفتگو چھیڑ دی۔

''میں تھوڑی دیر بعد آپ کے آدمی کو اپنا بیان ریکارڈ کروا دوں گا۔ فی الحال تو میرے سر میں شدید درد ہے اس لیے میں زیادہ بول نہیں سکتا۔'' اس نے قدرے روکھے لہجے میں ایس پی کی بات کا جواب دیا۔ ڈرائیور کی موت نے اس کے دل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ غریب صرف اس وجہ سے مارا

گیا تھا کہ اسے ہی شہریار عادل کی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی کسی سے دشمنی تھی، نہ ہی وہ کسی قسم کے لینے دینے میں تھا۔ وہ تو بس اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا لیکن اپنی غرض اور انا میں مبتلا افراد کو کیا مطلب تھا کہ ان کی سفاکی نے کسی غریب خاندان سے اس کا سہارا چھین لیا ہے۔ ایس پی کو چودھری کے گروپ کے بندے کی حیثیت سے وہ اس جرم میں برابر کا شریک سمجھتا تھا، چنانچہ اس سے اس وقت صحیح لہجے میں بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''ایز یو وِش سر! ابھی آپ آرام کریں اور جب فیل کریں کہ بیان دینے کے قابل ہیں تو اطلاع کر دیجیے گا۔'' ایس پی بنا کسی حیل و حجت کے اس سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

''مجھے اپنا موبائل دے دو عبدالمنان۔'' ایس پی کے باہر جانے کے بعد اس نے عبدالمنان سے فرمائش کی۔ خود اس کا اپنا موبائل اور دیگر اشیا تو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ اغوا ہونے کے بعد جب اسے ہوش آیا تھا تو اس نے اپنے جسم پر موجود لباس کے سوا ہر شے کو غیر موجود پایا تھا۔ اب مرکزِ صحت کے اس کمرے میں وہ اپنے جسم پر موجود لباس کو بھی تبدیل شدہ پا رہا تھا۔ یقیناً اس کا پہلے والا لباس خراب ہو گیا تھا، تب ہی اسے بدل کر یہ ڈھیلا ڈھالا شلوار قمیص پہنا دیا گیا تھا۔

''یس سر۔'' عبدالمنان نے موبائل اس کے حوالے کر دیا اور بولا۔ ''آپ اطمینان سے بات کریں، میں اس دوران آپ کو یہاں سے شفٹ کرنے کے انتظامات دیکھتا ہوں۔'' شہریار نے سر کی جنبش سے اسے اجازت دے دی۔ ویسے وہ جانتا تھا کہ انتظامات تو وہ پہلے ہی کر چکا ہوگا اس وقت صرف اسے پرائیویسی فراہم کرنے کے لیے بہانہ بنا کر نکلا ہے۔ عبدالمنان کی یہ سمجھداری اور معاملہ فہمی اس کے دل میں اس کی قدر مزید بڑھا دیتی تھی۔ وہ جس سیٹ پر کام کر رہا تھا، واقعی اس کا مکمل طور پر اہل تھا۔

اس کے باہر جاتے ہی اس نے مختار مراد کا نمبر ملایا۔ کال ان کے پی اے نے ریسیو کی اور یہ جاننے کے بعد کہ شہریار عادل بات کرنا چاہتا ہے، فوراً فون مختار مراد کو تھما دیا۔ یقیناً وہ اس سلسلے میں پہلے ہی ہدایت کر چکے تھے اس لیے پی اے نے اس کا نام جاننے کے بعد مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''آئی ایم سو ہیپی شہریار! یقین کرو تمہاری زندہ سلامت واپسی نے مجھے اتنی خوشی دی ہے کہ مجھے لگ رہا ہے، میرا اپنا سگا بیٹا ایک بڑی مصیبت سے بچ کر واپس آگیا ہو۔'' فون ہاتھ میں آتے ہی وہ جذباتی لہجے میں شہریار سے بولے۔

''تھینک یو سو مچ انکل! مجھے آپ کی اپنے لیے تشویش کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے اور میں آپ کی اس محبت کے لیے دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔'' اس نے ممنونیت سے مختار مراد کی محبت کا جواب دیا۔

''شکریے کی ضرورت نہیں بیٹا... میں تو خود اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے تمہیں جیتا جاگتا واپس پہنچا دیا، ورنہ میں تو پریشان تھا کہ رانا صاحب کو اس واقعے کی اطلاع کیسے دوں؟ انہوں نے جو پے در پے صدمے اٹھائے ہیں،

مسلمان حکمراں

جب یہ سوال زیرِ غور تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا وظیفہ کیا ہونا چاہیے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دریافت فرمایا کہ مدینے میں ایک مزدور کی کم از کم روزانہ اجرت کیا ہے؟ وہی اجرت آپؓ نے اپنے لیے بطور وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقاء میں سے کسی نے آپؓ سے کہا: ''اتنے کم روزینے میں آپ کا گزارہ کیسے ہوگا؟'' تو آپؓ نے فرمایا: ''اس میں میرا گزارہ اس طرح ہوگا جس طرح ایک مزدور کا گزارہ ہوتا ہے، اگر گزارہ نہ ہوا تو میں اس مزدور کی اجرت بڑھا دوں گا۔''

ایک دن کھانے کے بعد، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا: ''کیا کوئی میٹھی چیز نہیں ہے؟''

انہوں نے فرمایا: ''بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔'' چند دنوں کے بعد آپؓ نے دیکھا کہ کھانے میں حلوہ بھی ہے۔ آپؓ نے بیوی سے کہا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ ہمارے راشن میں میٹھی چیز نہیں آتی، آج یہ حلوہ کیسے پک گیا؟'' انہوںؓ نے جواب دیا۔ ''میں نے جو اس دن محسوس کیا کہ آپؓ کو میٹھی چیز کی خواہش ہے تو میں نے یوں کیا کہ راشن میں جتنا آٹا روزانہ آتا تھا، اس میں سے مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی تھی۔ آج اتنا آٹا جمع ہو گیا کہ اس کے بدلے میں نے بازار سے کھجور کا شیرہ منگوایا اور اس طرح یہ حلوہ پک گیا۔'' آپؓ نے اسے تناول فرمایا اور بیوی کا شکریہ ادا کیا۔

کھانے کے بعد آپؓ سیدھے بیت المال کے مہتمم کے پاس پہنچے اور فرمایا: ''ہمارے ہاں راشن میں جس قدر آٹا جاتا ہے آج سے اس میں سے ایک مٹھی بھر کم کر دینا کیونکہ ہفتہ بھر کے تجربے نے بتایا ہے کہ ہمارا گزارہ مٹھی بھر کم آٹے میں بھی ہو جاتا ہے۔''

www.pkdigest.com

ابھی تو ان سے پوری طرح نہیں سنبھل سکے۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ان کے لیے تو بہت مشکل ہو جاتی۔ صرف ان کی اور بھابی صاحبہ کی وجہ سے ہی میں نے تمہارے اغوا کی خبر نشر نہیں ہونے دی۔ میڈیا والوں کا تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہر بات کو کتنا اچھالتے ہیں۔ انہیں خبر نشر کرنے کی اجازت مل جاتی تو سیکڑوں من گھڑت کہانیاں وہ خود بنا لیتے۔ الحمدللہ اب تم واپس آگئے ہو تو خود اس معاملے کو ہینڈل کرنا کیونکہ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ ہماری طرف سے پابندی پر وہ لوگ وقتی طور پر تو خبر نشر کرنے سے رک گئے تھے لیکن اب چپ نہیں بیٹھیں گے۔“

”میں بھی انہیں کیا بتا سکوں گا؟ وہ لوگ مجھ سے اس اغوا کا سبب جاننا چاہیں گے لیکن سبب تو مجھے خود نہیں معلوم۔ دوسرا سوال ان کا یہ ہوگا کہ مجھے اس سلسلے میں کس پر شک ہے تو ظاہر ہے میں شک ہونے کے باوجود کسی کا نام نہیں لے سکوں گا۔ ان حالات میں میڈیا والوں سے گفتگو بے کار ہی ثابت ہوگی۔“ اس نے مختار مراد کی بات کا جواب دیا۔

”جتنا بھی اور جو بھی تمہیں مناسب لگے، میڈیا والوں کو بتا دینا۔ تم سے زبردستی تو بہرحال وہ لوگ نہیں کر سکتے... بلکہ ایسا کرو کہ تم مجھے سارا واقعہ تفصیل سے سنا دو۔ میں تمہیں گائیڈ کر دوں گا کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں؟“

مختار مراد نے اس سے کہا تو وہ اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ مختار مراد خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ آخرکار وہ چپ ہوا تو وہ بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو کہ نہ تو تم کسی کو اغوا کا سبب بتانے کے قابل ہو اور نہ ہی اپنے کسی شک کا اظہار کر سکتے ہو۔ ان حالات میں یہی بہتر ہے کہ جو جو اور جس طرح پیش آیا ہے، وہ بتا دو۔ بس میڈیا والوں کے سامنے اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کرنے سے مکمل گریز کرنا ورنہ وہ لوگ بڑ کا کوا بنانے میں ماہر ہوتے ہیں، خوامخواہ کہانیاں گھڑتے پھریں گے۔“

”ڈونٹ وری انکل! میں خیال رکھوں گا۔“ اس نے مختار مراد کو تسلی دی۔

”اوکے! تم اب آرام کرو۔ میں نے تمہارے پی اے کو ہدایت دے دی تھی کہ تمہیں پیرآباد سے سیدھا لاہور پہنچا دیا جائے۔ چوٹیں وغیرہ تو سنا ہے کہ تمہیں زیادہ مہلک نہیں آئی ہیں لیکن پھر بھی مناسب ہے کہ تم یہاں کسی اچھے اسپتال سے اپنا علاج کروالو۔ پھر یہاں آنے میں یہ بھی فائدہ رہے گا کہ تمہارے ماموں ممانی آسانی سے تمہاری مزاج پرسی کر سکیں گے۔ تمہارے وہیں رکے رہنے کی صورت میں انہیں پریشانی ہوگی۔ نہ تو وہ لوگ اتنا لمبا سفر آسانی سے کر سکتے ہیں اور نہ ہی مریم کو تنہا چھوڑ کر گھر سے نکل سکتے ہیں۔ ابھی وہ عدت میں ہے نا۔“ آخری جملہ بولتے ہوئے اس کی آواز جس طرح کانپی تھی، اس نے شہریار کے دل کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ ”مریم عدت میں ہے نا۔“ یہ فقط ایک جملہ نہیں تھا۔ یہ وہ عظیم دکھ تھا جو ان سب نے سجاد رانا کی اچانک موت کی صورت میں بہ یک وقت اٹھایا تھا۔

”ٹھیک ہے انکل! میں لاہور آجاتا ہوں۔“ بجھے ہوئے لہجے میں اسے جواب دے کر اس نے فون بند کر دیا اور تکیے پر سر رکھ کر سیدھا لیٹ گیا۔ ہوش میں آنے کے بعد سے وہ سر میں درد کی جو ہلکی ہلکی سی ٹیسیں اٹھتی محسوس کر رہا تھا، وہ اب بے حد شدت اختیار کر گئی تھیں اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سر میں زوردار دھماکے ہو رہے ہوں۔

☆☆☆

وہ بالکل گم صم سی بیٹھی خلاؤں میں تک رہی تھی۔ اس کے سامنے دھرا کھانا ابھی جوں کا توں رکھا تھا۔ نقاہت کے باوجود دل کسی طرح کھانے کی طرف راغب ہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل وہ نہایت سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے صرف خود کو توانا رکھنے کے لیے ہی اس قید خانے میں ملنے والا کھانا پابندی سے زہر مار کر لیا کرتی تھی لیکن جب سے اس نے پروجیکٹر پر چلنے والا وہ کریہہ منظر دیکھا تھا، حلق سے نوالے اتارنا مشکل ہو گئے تھے۔ جب بھی کھانا سامنے آتا اور وہ نوالہ منہ میں رکھتی، خون میں لت پت لاش سامنے آجاتی۔ جانے وہ کون تھا جسے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ وہ ان کی گفتگو سے بس اتنا اندازہ کر سکی تھی کہ وہ عمران کا کوئی دشمن تھا جسے اس کی تسلی کے لیے اس انجام تک پہنچایا گیا تھا۔ شکل سے معصوم اور شریف نظر آنے والا عمران اندر سے اتنا سفاک نکلے گا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی... لیکن اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لینے اور کانوں سے سن لینے کے بعد کسی شک و شبہے کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ اب تو وہ یہی کہہ سکتی تھی کہ اس نے عمران کی اچھی صورت سے دھوکا کھا کر اس کے بارے میں اچھا گمان کرنے کی غلطی کی تھی۔ وہ بھلا اچھا کیونکر ہو سکتا تھا۔ آخر وہ بھی تو انہی لوگوں میں سے ایک تھا جن کی قید میں وہ رہ رہی تھی۔ وہ شکل سے وحشی دکھائی دیتے لوگ جو جانے اس برف زار میں کن مذموم مقاصد کے حصول کے لیے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ جنہوں نے شہروں کی رونق اور گھریلو زندگی کی خوشیاں چھوڑ کر اس سخت ماحول میں ڈیرا ڈال رکھا تھا اور ہتھیاروں سے دل بہلاتے اپنی وحشتوں کو اور بھی گمبھیر

کرتے رہتے تھے۔ وہ کون لوگ تھے؟ اس بارے میں وہ ابھی تک حتمی اندازہ نہیں لگا سکی تھی مگر اسے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں تھا کہ وہ سب کے سب ابنارمل تھے۔ ان ابنارمل لوگوں کے درمیان رہنا اب اس کے لیے مشکل ترین ہوتا جا رہا تھا۔ اس قید خانے میں ایک کریہہ منظر اور سفاکی دیکھنے کو ملی تو اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ جو پورے حوصلے سے حالات کے ان طوفانوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھی، یک دم ہی کچھ ڈھے سی گئی۔ شاید یہ مایوسی کی ہی کیفیت تھی جو اس کے اندر سے حالات کا مقابلہ کرنے کی امنگ مٹنے لگی تھی۔

مایوس آدمی زندگی کی بقا کی طرف سے بے پروا ہو جاتا ہے اور پھر زندگی کو جاری و ساری رکھنے والے عناصر میں دلچسپی نہیں رہتی۔ وہ بھی اسی مایوسی کی وجہ سے کھانے کی طرف سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کو قیدی بنا کر رکھنے والے اب بھی تمام اوقات کا کھانا پابندی سے اس تک معمول کے مطابق پہنچا رہے تھے۔ کسی وقت وہ اس کھانے میں سے چند لقمے نگل لیتی اور کبھی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ آج بھی اس نے یہی کیا تھا۔ کھانا سامنے رکھ دیے جانے کے باوجود وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ جو شخص ایک مخصوص وقت کے بعد کھانے کے برتن واپس لے جانے آیا تھا، وہ برتنوں میں کھانے کو جوں کا توں رکھا دیکھ کر برتن اٹھائے بغیر خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا کہ شاید بعد میں بھوک محسوس کرنے پر کچھ کھا لے... لیکن وہ کافی دیر گزر جانے کے باوجود اس طرف متوجہ نہیں ہوئی اور نہ جانے کتنی دیر تک یونہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

بیٹھے بیٹھے جب تھکن اور نقاہت کے باعث جسم جواب دینے لگا تو وہ اسی جگہ گٹھری سی بن کر لیٹ گئی۔ خالی پیٹ انسان کو نیند نہیں آیا کرتی اور پیٹ میں دوڑتے چوہے احتجاج کرنے لگتے ہیں لیکن وہ چونکہ کئی وقتوں سے ڈھنگ سے کھانا نہیں کھا رہی تھی، اس لیے کم خوراکی سے طاری ہونے والی نقاہت اسے غنودگی میں لے گئی۔ غنودگی کی اس کیفیت میں کتنے لمحے بیتے اسے ہوش نہیں تھا لیکن وہ اس وقت بُری طرح چونکی جب اس نے اپنا آپ ایک بھاری بوجھ کے نیچے دبا ہوا محسوس کیا۔ ساتھ ہی کسی کی گرم گرم سانسیں اس کی گردن سے ٹکرائیں۔ اس نے بُری طرح کسمسا کر خود کو اس بوجھ سے آزاد کروانا چاہا لیکن اس کے نازک بدن کی طاقت اس پہاڑ جیسے بوجھ کو دھکیلنے کے لیے ناکافی تھی۔ کچھ دیر قبل وہ زندگی سے کتنی ہی مایوس سہی لیکن تھی تو بہرحال ایک دوشیزہ ہی... جسے آخری دم تک اپنی عزت کی حفاظت کا خیال رہتا ہے۔ چنانچہ اپنی دوشیزگی چھن جانے کا خطرہ محسوس کر کے بُری طرح مچلنے لگی۔ اس کی کوشش تھی کہ کچھ اور نہ کر سکے تو کم از کم چیخ ہی مار دے لیکن اس ظالم نے اس کے وجود کو اپنے بوجھ تلے پیس ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کے منہ کو بھی ایک ہاتھ سے پوری قوت سے بند کر رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اس کے کپڑے تن سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود پر سوار اس وحشی سے نجات کے لیے... جس کے جسم پر موجود بے تحاشا بالوں کی چبھن اور مساموں سے اٹھتی گندی بدبو قطعی ناقابل برداشت تھی، اس نے بدن کی پوری قوت صرف کر کے اپنا داہنا ہاتھ اس کے جسم کے نیچے سے نکالا اور اپنے منہ پر جمے اس کے ہاتھ پر ناخن گاڑتے ہوئے جھٹکے سے اس کا ہاتھ منہ سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ کا جھٹکا تو شاید اس وحشت زدہ درندے کا ہاتھ منہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو پاتا لیکن ناخنوں کی چبھن نے کافی مدد کی اور اس کا ہاتھ ماہ بانو کے منہ سے ہٹ گیا۔

ماہ بانو نے فوراً ہی ایک زوردار چیخ ماری لیکن بس اسے ایک ہی چیخ مارنے کا موقع مل سکا اور اس درندے کا ہاتھ دوبارہ اس کے منہ پر آجما۔ اب اس کے انداز میں مزید وحشت در آئی تھی اور وہ اور بھی زیادہ شدت سے اسے کچلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وحشت کی ہی وجہ سے اسے اس طرف دوڑ کر آتے قدموں کی آواز سنائی نہ دے سکی۔ آنے والے نے بس ایک نظر یہ منظر دیکھا اور پوری قوت سے اسے ماہ بانو پر سے دھکیل کر غار کی دیوار پر دے مارا۔ نفس کے وحشی جانور کے زیراثر وہ شخص چوٹ کھا کر کسی بیل کی طرح بُری طرح ڈکرایا اور غراتا ہوا اپنی راہ کی رکاوٹ بننے والے پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح ہوشیار تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے آپ کو حملے سے بچایا بلکہ اس وحشی کا سر دونوں ہاتھوں سے جکڑ کر ایک بار پھر اسے دیوار پر دے مارا۔ سر غار کی پتھریلی دیوار سے ٹکرانے پر ایک زوردار آواز ابھری اور اگلے ہی پل ماہ بانو نے اس شخص کے سر سے خون کا فوارہ سا نکلتا دیکھا۔ اس دوران وہ کسی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی اور وہی نیلے پھولوں والی سیاہ چادر جو اس وحشی نے اس کے جسم پر سے نوچ پھینکی تھی، ایک بار پھر اپنے گرد لپیٹ لی تھی۔

رات کا وقت ہونے کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن اس مدھم روشنی میں بھی وہ وہاں موجود ان دونوں افراد کو شناخت کر سکتی تھی۔ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے والا شخص وہی گل شیر نامی آدمی تھا جس کی آنکھوں کی ہوس نے

www.pkdigest.com

پہلے بھی اسی کے اندر خطرے کی گھنٹی بجائی تھی جبکہ ان نازک لمحات میں اس کے لیے رحمت بن کر آنے والا معصوم صورت عمران تھا۔ وہی عمران جس سے پہلے بھی وہ اچھی امید باندھ چکی تھی لیکن پھر اس کی وحشت کی داستان سامنے آنے پر مایوسی کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل دینے والا وہ شخص اس وقت اس کا محافظ بن گیا تھا اور اس کی عزت پر حملہ کرنے والے کو بری طرح پیٹ رہا تھا۔ ماہ بانو نے محسوس کیا کہ گل شیر کو پیٹتے ہوئے عمران کے انداز میں وحشت اتر آئی ہے اور وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ پہلے ہی زخمی ہو چکا ہے، مسلسل اس کا سر دیوار سے مارتا رہا۔ چند لمحوں میں ہی اس نے گل شیر کو بالکل ادھ موا کر دیا۔ وہ جو کچھ دیر قبل ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح ماہ بانو پر حملہ آور ہوا تھا، اب عمران کے ہاتھوں میں بالکل بے جان شے کی طرح جھول رہا تھا۔ خونم خون گل شیر اور وحشت زدہ عمران کو دیکھ کر ماہ بانو کا اتنا برا حال ہوا کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ اس پر چند لمحے قبل جو گزری تھی، وہ ہی کیا کم تھی جو وہ اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر بھی اپنے حواس قائم رکھ پاتی۔ وہ تو شور کی آوازیں سن کر دوسرے لوگ خود ہی اس طرف متوجہ ہو گئے اور دوڑ کر ادھر آ گئے۔ آنے والوں میں سے تین نے بڑی مشکل سے عمران کو قابو کر کے اس کی گرفت سے گل شیر کو آزاد کروایا۔

"چھوڑ دو مجھے۔ میں اس شیطان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس جیسے بھیڑیے جو معصوم لڑکیوں کی عزت سے کھیلتے ہیں، زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔" خود کو قابو میں کرنے والوں کی گرفت میں مچلتا ہوا وہ وحشت زدہ انداز میں چلایا۔

"ہوش کرو عمران! وہ مر چکا ہے۔" ان میں سے ایک نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ لگاتے ہوئے اسے احساس دلایا تو وہ عالم وحشت سے باہر نکلا اور سامنے پڑی گل شیر کی لاش کو دیکھنے لگا۔ اس کی وحشیانہ ضربوں کے نتیجے میں اس کا سر پاش پاش ہو چکا تھا اور بھیجا باہر نکل آیا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر بھی اس کے چہرے سے کسی قسم کا افسوس ظاہر نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک نفرت بھری نظر گل شیر کی لاش پر ڈال کر حقارت سے اس پر تھوک دیا اور بولا۔

"اچھا ہوا مر گیا سالا! بچ جاتا تو میں اس کا ریشہ ریشہ الگ کر دیتا۔"

"اسے یہاں سے لے کر جاؤ اور گل شیر کی لاش اٹھوا کر جگہ صاف کرواؤ۔" ان میں سے ایک نے جو شاید دوسروں سے ممتاز مقام رکھتا تھا، حکم دیا۔ فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل ہونے لگی۔ عمران کو بازوؤں میں جکڑے کھڑے آدمی اسے گھسیٹ کر وہاں سے لے جانے لگے۔ اس نے بھی زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ یقیناً گل شیر کی لاش دیکھنے کے بعد اس کے جنونی غصے کا ابال کم ہو گیا تھا۔

ماہ بانو چادر میں سمٹی ہوئی دہشت زدہ نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ عمران کو وہاں سے لے جانے کے بعد گل شیر کی لاش بھی اٹھا لی گئی تھی اور اب ایک آدمی وہاں زمین اور دیواروں پر لگے خون کو صاف کر رہا تھا۔ خون کے ساتھ ساتھ گل شیر کے سر سے اس کے بھیجے کا بھی کچھ حصہ باہر نکل آیا تھا۔ صفائی کرنے والے آدمی نے بڑے اطمینان سے اسے بھی صاف کر دیا۔ ماہ بانو نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے ساتھی کی موت پر افسردہ یا غمگین نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے لیے گویا یہ ایک معمول کی بات تھی جس کے پیش آ جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ شاید وہ اس طرح کے مناظر اتنی بار دیکھ چکے تھے کہ اب ان کے لیے ان کی حیثیت بالکل ایسی ہو گئی تھی جیسے روزانہ اپنے گھر سے دفتر جانے والے شخص کے لیے راستے کے مختلف مناظر کی ہوتی ہے۔ ایسا شخص غیر ارادی طور پر سب کچھ دیکھتا تو ضرور ہے لیکن منظر میں کوئی نیا پن محسوس نہ ہونے کے باعث اس کے دل و دماغ میں تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ ان تمام لوگوں نے بھی گل شیر کی لاش دیکھی تھی مگر اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

"میں سمجھتا ہوں انکل کہ جنگل میں آپریشن بہت ضروری ہو گیا ہے۔ وہاں ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں ہیں۔ یہ بات ہم پہلے ہی جانتے ہیں بلکہ میں اس سلسلے میں پہلے بھی آپ سے درخواست کر چکا ہوں کہ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے کچھ کیجیے۔" اسپتال کے آرام دہ کمرے میں صاف ستھرے بستر پر نیم دراز وہ اپنی عیادت کے لیے آئے ہوئے آئی جی مختار مراد سے مخاطب تھا۔ بہترین نگہداشت اور علاج نے اسے تیزی سے روبہ صحت ہونے میں کافی مدد دی تھی ورنہ جس حالت میں وہ اغوا کاروں کے چنگل سے نکل کر آیا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ اب اسے دوبارہ سے زندگی کے معمولات میں شامل ہونے میں کافی وقت لگے گا۔ بہرحال، اب بھی وہ سو فیصد تو صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ سر پر لگنے والا زخم گہرا ہونے کی وجہ سے اس پر ڈاکٹر داور نے ٹانکے لگائے تھے اور ابھی یہ ٹانکے کھولے نہیں گئے تھے۔ جسم کے باقی حصوں پر لگنے والے زخم بھی ابھی پوری

طرح مندمل نہیں ہوئے تھے۔ پھر ڈنڈوں کی ضرب سے لگنے والی اندرونی چوٹیں جو حرکت کرنے میں اسے خاصی تکلیف دیتی تھیں۔ پیر آباد کے مرکز صحت میں ملنے والی ابتدائی طبی امداد نے اگر اس کی زندگی خطرے میں جانے سے بچائی تھی تو لاہور کے اس جدید اسپتال کے ڈاکٹرز بھی اسے تیزی سے روبہ صحت کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ فرق دونوں میں صرف اتنا تھا کہ ایک جگہ غریب لوگوں کو سہولیات فراہم کرنے کے لیے رفاہی بنیادوں پر کام ہو رہا تھا جبکہ دوسری جگہ پر خدمت کے عوض لمبے لمبے بل وصول کیے جاتے تھے۔ کہتے ہیں، درخت اگانے والا اگلی نسل کے لیے درخت اگاتا ہے اور خود اسے اس درخت کا پھل کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ شہریار کے ساتھ معاملہ ذرا مختلف ہوا تھا۔ اس نے دوسروں کے بھلے کے خیال سے اپنے ضلع میں دیہی مراکز صحت کا قیام عمل میں لانے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور اس کی یہ نیکی و خدمت خود اس کے لیے خوش نصیبی بن گئی، ورنہ ممکن تھا کہ وہ فوری طبی امداد نہ ملنے پر محض خون کے زیادہ اخراج کے باعث ہی جان سے چلا جاتا۔ پس ماندہ دیہاتوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی ہے کہ قابل علاج امراض و مسائل بھی فوری طبی امداد نہ ملنے کے باعث پیچیدہ صورت اختیار کر کے بیچارے مریض کی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم نے مجھ سے آپریشن کے لیے بات کی تھی۔ اس وقت تم ایک دیہاتی لڑکی کے اغوا اور پھر اس کی لاش ملنے کے باعث یہ فرمائش کر رہے تھے جس کے بارے میں شک ظاہر کیا گیا تھا کہ اسے ڈاکوؤں نے اٹھایا ہے لیکن مقامی پولیس آفیسر کا کہنا تھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے خود اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔" آئی جی مختار مراد نے اپنے مضبوط حافظے کا ثبوت دیتے ہوئے مختصراً اس واقعے کا حوالہ دیا۔

"صرف وہی ایک کیس نہیں تھا۔ اس واقعے کے بعد ڈاکوؤں نے ایک گاؤں پر حملہ کر کے وہاں لوٹ مار بھی کی تھی۔" شہریار نے تڑپ کر یاد دلایا۔

"ہاں، وہ واقعہ بھی مجھے یاد ہے لیکن بیٹا... مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ دونوں ہی واقعات اتنے قابل ذکر نہیں تھے کہ میں ان کی بنیاد پر حکومت کو اتنے بڑے آپریشن کے لیے راضی کر پاتا۔ تمہیں اس جنگل کی لوکیشن کا شاید اچھی طرح اندازہ نہیں ہے۔ وہاں گھنے درختوں اور پہاڑیوں کی موجودگی کے باعث چھپنے کی جگہیں بھی بہت ہیں اور آس پاس دیہاتوں کی موجودگی کے سبب ڈاکوؤں کے لیے راہ فرار اختیار کرنا بھی زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ اگر ہم وہاں آپریشن کرنا چاہیں گے تو ہمیں بہت بڑے پیمانے پر یہ آپریشن کرنا ہوگا اور اس کے لیے جتنا بجٹ درکار ہے، اس کی منظوری کے لیے کوئی بہت ہی خاص ریزن سامنے ہونا ضروری ہے۔" مختار مراد نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

"آپ کے خیال میں ایک معصوم لڑکی کا اس کی شادی سے ایک دن قبل اغوا ہو جانا اور پھر اس کی کٹی پھٹی لاش ملنا کوئی معمولی واقعہ تھا؟ اس واقعے کے اثرات کتنے خطرناک نکلے تھے، یہ بھی آپ کو یاد ہوگا۔ میں تو کبھی اس جذباتی سے لڑکے عبدالمتین کو نہیں بھول سکتا جو اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی سے اتنی بری طرح متاثر ہوا کہ شاہنواز جیسے دہشت گرد کے ہاتھ چڑھ گیا۔ صرف اس ظلم کی وجہ سے وہ لڑکا اپنے جسم سے بم باندھ کر بھرے مجمع میں آ گھسا تھا۔ وہ مجھے، وزیروں، پولیس والوں اور ایسے تمام افراد کو مار دینا چاہتا تھا جن کے ذمے قانون نافذ کرنا اور لوگوں کو انصاف فراہم کرنا ہے... لیکن اتفاق سے وہ اسٹیج تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور نتیجتاً ہم سارے وی آئی پیز کے صدقے میں بے گناہ عوام مارے گئے۔" شہریار نے نہایت تلخی سے سنگین واقعے کا ذکر کیا۔

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں شہریار لیکن پھر وہی کہنے پر مجبور ہوں کہ اس واقعے کی بنیاد پر میں آپریشن ڈکلیئر نہیں کر سکتا۔ ہاں، تمہارا معاملہ الگ تھا۔ اگر تم واپس نہ لوٹتے تو میں، رانا صاحب اور فیملی کے دوسرے بارسوخ افراد مل کر زور لگاتے کہ تمہیں بازیافت کرنے کے لیے آپریشن کیا جائے اور اس وقت ہم یہ بات منوا بھی لیتے لیکن اب جبکہ تم واپس آ گئے ہو تو کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے پاس اب کوئی ٹھوس وجہ نہیں رہی ہے۔ خود تمہیں بھی یقین نہیں کہ تمہیں اغوا کرنے والے ڈاکو ہی تھے۔ تمہیں تو چودھری اور اس کے بندوں پر شک ہے کہ انہوں نے تمہیں اپنی راہ کی رکاوٹ سمجھتے ہوئے یہ اغوا کیا تھا۔"

"تو یہ بات بھی تو ظاہر ہے کہ چودھری کا ڈاکوؤں سے ربط ضبط ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے ہی مجھے ڈاکوؤں کے ذریعے اغوا کروا کر ان کے کسی ٹھکانے پر رکھا ہو، ورنہ خود ڈاکوؤں کو مجھ سے کیا غرض ہو سکتی تھی؟" اس نے دلیل دیتے ہوئے مختار مراد کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"یہ صرف ایک قیاس ہے۔ تم یا میں اس کا ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہیں بلکہ تم کسی مخالف کی تنقیدی نظر سے

www.pkdigest.com

دیکھو تو تمہارے اغوا کا معاملہ ہی کافی مشکوک صورت اختیار کر لے گا۔ تمہارے پاس بتانے کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہیں کس نے، کیوں اور کس لیے اغوا کیا تھا... اور بغیر کوئی مطالبہ کیے اتنی آسانی سے آزاد کیسے کر دیا؟ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ تم نے چودھری پر الزام لگانے کے لیے خود ہی اپنے اغوا کا ڈراما رچایا تھا اور اب فضول واویلا کر رہے ہو۔ اسی لیے میں نے تمہیں میڈیا والوں کے سامنے کسی پر شک ظاہر کرنے سے منع کیا تھا۔ سچ کیا ہے، وہ تم جانتے ہو اور میں بھی اسے مانتا ہوں لیکن ہم اس سچ کو سب سے نہیں منوا سکتے۔''

آئی جی مختار مراد نے بغیر لگی لپٹی رکھے اس پر ہر بات واضح کر دی تو اس کا جوش بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ واقعی موجودہ حالات میں تو خود اس کی اپنی پوزیشن مشکوک ہو گئی تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل! واقعی میں اپنے اغوا والے معاملے پر شور مچاؤں گا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو گا کہ میڈیا والوں کو چٹپٹی خبریں بنانے کے لیے ایک ایشو ہاتھ آ جائے گا۔'' آخرکار اس نے آئی جی مختار مراد سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی شکست تسلیم کر لی۔

''مایوس مت ہو ینگ مین! ابھی تمہارے کیریئر کا اسٹارٹ ہے۔ آگے جا کر تمہیں بہت کچھ کرنے کا موقع بھی ملے گا اور کئی رکاوٹیں بھی سامنے آئیں گی۔ ہم سب جس سسٹم کا حصہ ہیں، وہ اسی طرح چلتا ہے۔ اکثر اوقات ہم جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے لیکن اس سچ کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ کئی بار ہمیں ناانصافی دیکھنے کے باوجود خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ چودھری افتخار اور تمہارا کیس کوئی انوکھا نہیں ہے۔ ان چودھریوں اور وڈیروں کے مقابل جب بھی کوئی ایمان دار افسر آتا ہے، یہ اسی طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ابھی تک چودھری کھل کر تمہارے مقابل نہیں آیا اور صرف پیچھے سے وار کرنے پر اکتفا کر رہا ہے، ورنہ تمہاری جگہ کوئی عام فرد ہوتا تو چودھری اب تک اسے اپنے علاقے سے اٹھا کر پھینک دیتا۔ ان بااختیار چودھریوں کی زد میں آنے والوں کا کیریئر کس طرح تباہ ہو جاتا ہے، تمہیں اندازہ نہیں ہے... اور وہ صرف اس وجہ سے کہ تم ایک طاقتور خاندان کے فرد ہو۔ یوں سمجھ لو کہ جس سسٹم کی خامیوں کی وجہ سے چودھری جیسے افراد احتساب سے بچے ہوئے ہیں، اسی سسٹم کے سہارے تم بھی اپنی سیٹ پر ٹکے ہوئے ہو۔'' مختار مراد ایک تجربے کار شخص تھا اور اس وقت اس کے لفظوں میں تجربہ بول رہا تھا۔ غصے اور جوش سے بھرے ہوئے شہریار کو اس کی بات سمجھ آئی تو وہ ذرا پسپا پڑ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

''مجھے آپ کے کہے ایک ایک لفظ سے اتفاق ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرے اور چودھری کے درمیان سب سے بڑا فرق حق و باطل کا ہے... اور میں حق کے غالب آنے تک یا کم از کم اس وقت تک جب تک میرے جسم میں جان ہے، چودھری سے اپنی جنگ جاری رکھوں گا۔''

''وش یو بیسٹ آف لک ینگ مین... مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس جنگ میں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا۔ تمہاری عمر کے لوگ عموماً اپنے جوش کی وجہ سے ہی ان کہنہ مشق جاگیرداروں سے شکست کھا جاتے ہیں اور وہ نہیں کر پاتے جس کی انہیں اللہ نے صلاحیت دی ہوتی ہے۔ سجاد کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ اس نے اپنا پورا کیریئر اتنی احتیاط سے گزارا۔ وہ اگر ڈی آئی جی کی پوسٹ تک پہنچا تھا تو اس کے لیے اس نے خود کو اہل بھی ثابت کیا تھا۔ میری ریٹائرمنٹ کے بعد وہ آئی جی بھی ضرور بنتا لیکن کیا ہوا؟ شینا کی موت نے اس پر ایسا جنون سوار کیا کہ وہ احتیاط کے سارے تقاضے فراموش کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شینا کے قاتل بھی انجام تک نہیں پہنچے اور وہ خود بھی اپنی جان سے گیا۔''

سجاد راٹھور کا حوالہ دیتے ہوئے مختار مراد کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی در آئی تھی۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی کا شوہر تھا اور اس نے ہمیشہ اس بات پر فخر محسوس کیا تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک بہت ہی اچھا شخص منتخب کیا ہے لیکن قسمت نے عجیب ہی چال چلی تھی۔ وقت کی آندھی نے نہ صرف اس کی بیٹی کی گود اجاڑ دی تھی بلکہ اس کا سہاگ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ ایک باپ کی حیثیت سے بیٹی کے اس غم پر اندر ہی اندر کڑھتا اور گھلتا رہتا تھا لیکن بظاہر اس نے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ دیکھنے والوں کے لیے اس کے چہرے سے اس کی اصل قلبی کیفیت کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ یہ ضبط اور برداشت یقیناً پولیس کی برسوں کی ملازمت کا نتیجہ تھا۔

''سجاد بھائی اور شینا کے قاتلوں کا کچھ معلوم ہوا انکل؟'' ذکر چھڑا تو وہ اس سے یہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''نہیں۔'' مختار مراد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کر سکے کہ ان قاتلوں کے ڈانڈے انڈین خفیہ تنظیم را سے جا کر ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے پیچھے ہم جہاں جہاں تک پہنچے، وہ وہاں سے پہلے ہی فرار ہو چکے تھے اور وہ بھی اس طرح کہ پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے آرڈر دے رکھا ہے کہ خوبیہ سراؤں اور جسم فروش عورتوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے اور جہاں کوئی مشکوک بات ہو، میرے نوٹس میں لائی جائے۔ مجھے یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ کام ہو رہا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ سچ مچ کچھ ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہم جیسے بڑے افسروں کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے ماتحتوں کے محتاج ہوتے ہیں اور ان میں سے کون اصل میں آپ کا ماتحت اور وفادار ہے، اس بات کا مشکل سے ہی اندازہ ہو پاتا ہے۔ سجاد کی جگہ جو نیا ڈی آئی جی آیا ہے، وہ بظاہر ٹھیک آدمی ہے۔ میرے پاس اس کے خلاف کوئی بڑی شکایت بھی نہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ میرے لیے سجاد کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال، ابھی تو انویسٹی گیشن چل رہی ہے... کچھ سامنے آیا تو میں تمہیں ضرور انفارم کروں گا۔ اب مجھے اجازت دو۔ بہت ٹائم گزر گیا ہے، مجھے کچھ دوسرے معاملات بھی دیکھنے ہیں۔'' وہ گھڑی پر نظر پڑنے پر بات کرتے کرتے اچانک ہی اپنی گفتگو سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تھینک یو سو مچ انکل کہ آپ اپنا قیمتی وقت نکال کر میری عیادت کے لیے آئے۔'' شہریار نے مختار مراد سے پُرجوش مصافحہ کرتے ہوئے حقیقی شکرگزاری کے احساس کے ساتھ کہا۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں ینگ مین! مجھے خود تم سے مل کر اچھا لگتا ہے کیونکہ تم جیسا نوجوان ایسے جذبوں کی بدولت تمہارے بہت اوپر تک جانے کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ میری دعا ہے کہ تم اپنے نیک مقاصد میں ضرور کامیاب ہو اور وہ کر کے دکھاؤ جو ہم نہیں کر پائے۔'' مختار مراد نے محبت سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''اگر کرم فرماؤں نے اگلی بار بالکل ہی اوپر نہ پہنچا دیا تو یقیناً آپ کی دعا قبول ہو گی۔'' شہریار اس کی بات سن کر شوخی سے ہنستے ہوئے بولا۔

''ایسی باتیں مت کرو ینگ مین! اب تم ہی ہو جو راٹھور صاحب اور اپنی ممانی کو سنبھال سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں لمبی عمر دے اور تمہارے طفیل وہ لوگ وہ خوشیاں دیکھ سکیں جو وقت نے ان سے چھین لی ہیں۔'' مختار مراد نے اسے فوراً ہی ٹوکتے ہوئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور ایک بار پھر اس کا شانہ تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد شہریار بھی تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گیا۔ مختار مراد سے ملاقات کر کے اس کے ذہن پر سے بہت سے جالے صاف ہو گئے تھے۔ خاص طور پر اس کا اسے ''ینگ مین'' کہہ کر پکارنے کا انداز اتنا مخلصانہ اور محبت سے بھرپور تھا کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ مختار مراد کے اور اس کے درمیان کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ وہ اس کے کزن کا سسر ہی تو تھا جو اگر اس سے تعلق نہ بھی رکھنا چاہتا تو وہ شکایت نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اپنے بے حد مصروف شیڈول میں سے بھی خاص طور پر اس کے لیے وقت نکال کر اس سے ملنے آیا تھا تو یہ بڑی بات تھی۔

''آپ کی میڈیسن کا وقت ہونے والا ہے سر! پہلے آپ کچھ کھا لیں تاکہ میں تھوڑی دیر بعد آپ کو میڈیسن دے سکوں۔'' مختار مراد کو گئے پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ سفید لباس میں ملبوس ایک نازک سی نرس دستک دے کر اندر چلی آئی اور اس سے بولی۔

''او کے! آپ میرا لنچ لے آئیں۔'' شہریار نے اسے اجازت دی۔ اس کی ممانی آفرین راٹھور نے تو خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خود اس کے لیے ہر ٹائم کا کھانا اسپتال پہنچایا کریں گی لیکن اس نے ان کی تکلیف کے خیال سے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ ویسے بھی یہ اسپتال بہت باسہولت تھا اور ہر شے آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی نرس نے اس کی اجازت پا کر ڈاکٹر کے تجویز کردہ فوڈ چارٹ کے مطابق اسے اپنی نگرانی میں ہلکا پھلکا لنچ کروایا اور پھر پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اسے دوائیں کھلا کر باہر نکل گئی۔ کمرے میں مستقل نرس کی موجودگی کو خود اس نے ناپسند کیا تھا اس لیے نرس ضرورت کے علاوہ وہاں نہیں رکتی تھی۔ اگر اسے کوئی کام ہوتا تو وہ بیڈ کے ساتھ لگا گھنٹی کا بٹن دبا کر اسے کال کر سکتا تھا۔

اس وقت نرس اسے دوائیں کھلا کر گئی تو تھوڑی دیر میں ہی اسے غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ یقیناً پین کلرز کا اثر تھا۔ اس نے ریموٹ کا بٹن دبا کر بیڈ کے عین سامنے لگا ٹی وی بند کر دیا۔ لنچ کرواتے ہوئے نرس نے اس کی فرمائش پر دھیمی آواز میں ٹی وی آن کیا تھا تاکہ وہ حسب خواہش نیوز دیکھ سکے۔ اب غنودگی محسوس ہوئی تو اس نے ٹی وی آف کر کے سو جانا ہی مناسب سمجھا۔ یوں بھی اسے عیادت کے لیے آنے والے ملاقاتیوں اور فون کالز کی وجہ سے آرام کا زیادہ موقع نہیں مل رہا تھا۔ آج صبح سے تو اس نے ڈاکٹر کی تجویز پر اپنا موبائل ہی آف کر دیا تھا تاکہ کم از کم ایک طرف سے تو سکون ہو۔ اس وقت وہ اس سکون اور تنہائی کا فائدہ اٹھا کر سونے ہی لگا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور باہر ڈیوٹی دینے والا پولیس اہلکار اجازت لے کر اندر آیا۔

''سر! ایس پی معظم تارڑ آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔'' اس نے شہریار کو اطلاع فراہم کی جس پر اس

www.pkdigest.com

نے بہ یک وقت حیرت اور کوفت محسوس کی۔ معظم تارڑ اس سے ملنے کے لیے یہاں تک آجائے گا، اسے قطعی امید نہیں تھی اور اب وہ آگیا تھا تو اس کا اس سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''اوکے! انہیں اندر بھیج دو۔'' قلبی کیفیت کے برخلاف اسے ایس پی کو باہر سے ہی لوٹانا اچھا نہیں لگا اس لیے جواب کے لیے منتظر کھڑے اہلکار سے بادلِ ناخواستہ کہا۔ وہ اس کا جواب سن کر فوراً ہی پلٹ گیا۔ اگلے لمحے معظم تارڑ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

''گڈ آفٹر نون سر! آئی ہوپ کہ اب آپ پہلے سے بہت بہتر ہوں گے۔'' اس نے مہکتا ہوا فلاور بکے بیڈ کے قریب رکھی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں حالانکہ دشمنوں کی کوشش تو یہی تھی کہ میں بہت عرصے تک بستر سے اٹھ ہی نہ سکوں... لیکن اللہ کا کرم ہے کہ میں بہتر ہوں اور بہت جلد اپنی جگہ پر واپس پہنچ کر کام شروع کر دوں گا۔'' معظم تارڑ کو جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ خود بہ خود ہی قدرے طنزیہ ہو گیا تھا جسے وہ کمال صفائی سے نظرانداز کر گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''وائے ناٹ سر! ہم لوگ تو منتظر ہیں کہ آپ آئیں اور اپنی ذمے داریاں سنبھالیں۔''

''انشاء اللہ... وہ تو میں جلد سنبھال لوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ لاہور کسی کام کے سلسلے میں آنا ہوا تھا یا بہ طورِ خاص میری عیادت کے لیے تشریف لائے ہیں؟'' اس نے ذہن میں پنپتا سوال آخرکار کر ہی ڈالا۔

''دونوں ہی باتیں سمجھ لیں۔ اصل میں مجھے وزیرِاعلیٰ صاحب سے ایک کام تھا۔ کام تو خیر میں ان سے فون پر بھی کہتا تو وہ کروا دیتے لیکن میں نے سوچا کہ ان سے ملاقات کے بہانے یہاں آؤں گا تو آپ کی مزاج پرسی بھی کر لوں گا۔'' معظم تارڑ نے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ تارڑ کی وزیرِاعلیٰ سے رشتے داری ہے اور اس رشتے داری کے بل بوتے پر وہ ان سے اپنے مطلب کا کام کروا سکتا ہے۔ کام کی نوعیت پوچھنے سے البتہ اس نے تجسس کے باوجود گریز کیا۔

''میرے علم میں آیا تھا کہ محکمہ پولیس کے کچھ افسران کو ایک تربیتی کورس پر دو سال کے لیے بیرونِ ملک بھیجا جا رہا ہے۔ میں نے ان افراد میں اپنا نام بھی شامل کرنے کی درخواست کی ہے۔ میں کچھ عرصے کے لیے اس سیٹ اپ سے نکلنا چاہتا ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اگر مجھے بیرونِ ملک کوئی اچھا چانس مل گیا تو میں وہیں سیٹل ہو جاؤں۔ یہاں رہنا اب مجھے اپنے لیے مناسب محسوس نہیں ہو رہا ہے۔'' اس کے سوال نہ کرنے کے باوجود تارڑ نے خود ہی اپنی وزیرِاعلیٰ سے ملاقات کا سبب بتا دیا۔ اس کی باتیں سن کر شہریار چونک گیا اور غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب اور الجھا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی خلافِ معمول صورتِ حال سے دوچار ہے۔

''کیا بات ہے تارڑ صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟'' آخرکار اس نے تارڑ سے پوچھ ہی لیا۔

''میں اپنے آپ کو یہاں ان سیف محسوس کرنے لگا ہوں۔ آپ دیکھیں نا کہ حالات کس رخ پر جا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخص محفوظ نہیں۔ آپ اپنے اغوا کی ہی مثال لے لیں۔ وہ تو آپ کی قسمت اچھی تھی کہ نہ جانے کس وجہ سے اغواکاروں نے آپ کو آزاد کر دیا ورنہ یہاں تو بندہ غائب ہو جائے تو اس کا کوئی نام و نشان ہی نہیں ملتا۔'' اس نے اپنی پریشانی کا سبب بتایا لیکن شہریار یہ جواب سن کر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ اسے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اور بھی بات ہے جسے تارڑ بتانا چاہتا ہے لیکن جھجک کا شکار ہے۔

''آپ پولیس والے ہو کر خود ڈر رہے ہیں تارڑ صاحب... یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔'' تارڑ کو ٹٹولنے کے لیے وہ اسے چھیڑنے کے انداز میں بولا۔

''پولیس والے بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ پشت پر سے ہونے والا حملہ وہ بھی نہیں روک سکتے۔ آپ سجاد رانا صاحب ہی کی مثال لے لیں۔ وہ تو مجھ سے بہت اوپر کے افسر تھے لیکن ان کے ساتھ کیا ہوا؟ ان کی وردی ان کی حفاظت تو نہیں کر سکی نا۔'' اس نے گویا دلیل کے ساتھ شہریار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''خیر، سجاد بھائی کا تو کیس ہی الگ ہے۔ وہ جن خطرناک مجرموں کے خلاف کام کر رہے تھے، ان کے اختیارات اور وسائل بہت زیادہ تھے لیکن آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ آپ تو ایک چھوٹے سے ضلع کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں اور وہاں بھی آپ کی اچھی پی آر ہے۔'' اس نے نہایت نرمی سے ایک بار پھر تارڑ کو طنز کی لپیٹ میں لیا۔

''پی آر دی آر کیا ہوتی ہے سر! طاقتور لوگ ہمیشہ اپنے سے نیچے والوں کو استعمال کرتے ہیں اور جب انہیں لگے کہ یہ بندہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا، اسے اپنے راستے سے ہٹانے میں دیر نہیں لگاتے۔'' تارڑ کا یہ جملہ بے حد چونکا دینے والا تھا۔ شہریار نے اس کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ تارڑ کو استعمال کرنے والا طاقتور شخص صرف ایک ہی تھا۔ چودھری افتخار عالم شاہ... اور تارڑ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے چودھری کی طرف سے کوئی خطرہ درپیش ہے۔

''آپ مجھ سے کھل کر بات کریں تارڑ صاحب! آخر آپ کس قسم کے خدشات کا شکار ہیں؟'' اس نے تارڑ سے اصل بات اگلوانے کی کوشش کی۔

''نہیں سر! مجھے خدشات لاحق تھے لیکن اب میں مطمئن ہوں۔ کچھ دنوں میں، میں ملک سے باہر نکل جاؤں گا اور جب یہاں ہوں گا ہی نہیں تو پھر خطرے کی بھی کوئی بات نہیں رہے گی۔''

''اوکے! آپ نہیں بتانا چاہتے تو آپ کی مرضی۔'' تارڑ کا گریز دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

''مجھے اجازت دیں سر! آپ کا کافی وقت لے لیا۔'' وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ شہریار نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ آج پہلی بار اسے تارڑ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کے دباؤ میں دوستانہ گرم جوشی محسوس ہوئی تھی۔

''اپنا خیال رکھیے گا سر اور ساتھ ہی محتاط بھی رہیے گا۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اور اسے ایڈونچرز کی نذر نہیں کیا جا سکتا۔'' مصافحہ کرتے ہوئے اس نے شہریار کو نصیحت کی۔

''مشورے کا شکریہ لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ میں اپنی زندگی کسی ایڈونچر کی نذر کرنے کے بجائے اسے مشن کے تحت بسر کرنے والا آدمی ہوں... اور مشن کی تکمیل کے لیے جان پر کھیل جانا بہادروں کا کام ہوتا ہے۔'' شہریار نے اسے دوبدو جواب دیا۔

''شاید آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں... مرنا تو بہرحال آدمی کو ہوتا ہی ہے۔ اقبال باجوہ کے بارے میں یاد ہے آپ کو کہ بے چارہ اچانک ہی مر گیا تھا۔'' اس نے سابقہ فاریسٹ آفیسر کا حوالہ دیا۔ اقبال باجوہ وہ شخص تھا جس کے تعاون سے ہی چودھری نے جنگل سے لکڑی اور کھالوں کی غیر قانونی اسمگلنگ کا کاروبار شروع کر رکھا تھا۔ ایس پی تارڑ خود بھی اس کام میں شامل تھا لیکن اب جانے کیا ہوا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔

''باجوہ کی موت طبعی نہیں تھی سر! اسے ایک ایسا زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا جو بظاہر ہارٹ اٹیک کی علامات دکھاتا ہے... لیکن حال ہی میں ہونے والے باجوہ کی لاش کے پوسٹ مارٹم نے اصل حقیقت ظاہر کر دی ہے۔'' وہ ابھی تارڑ کے رویے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ وہ اچانک اس پر یہ انکشاف کر کے تیز تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔

اس کا یہ انکشاف شہریار کے لیے خاصا دھماکا خیز تھا۔ پیرآباد مرکزِ صحت پر ڈاکٹر ماریا اور ڈاکٹر داور دونوں نے متفق طور پر یہ فیصلہ سنایا تھا کہ باجوہ کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے۔ ڈاکٹروں کی اس تشخیص کے بعد باجوہ کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا تھا۔ صورتِ حال میں شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی اس لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی تھی لیکن اب تارڑ اس پر انکشاف کر کے گیا تھا کہ باجوہ کی موت درحقیقت مہلک زہر سے ہوئی تھی اور یہ بات پوسٹ مارٹم کے ذریعے معلوم ہوئی تھی۔ موت کے اتنے دنوں بعد قبر سے لاش نکلوا کر اس کا پوسٹ مارٹم کروانے کی ضرورت کسے اور کیوں محسوس ہوئی، ان سوالات کے جواب یقیناً تارڑ ہی دے سکتا تھا... لیکن وہ تو اسے الجھن میں گرفتار کر کے خود وہاں سے جا چکا تھا۔

☆☆☆

کشور کو عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ آج کل اس کی طبیعت کا یہی عالم تھا۔ کبھی دم گھٹتا، کبھی متلی ہونے لگتی اور کبھی دل گھبراتا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری کیفیات وہ ہیں جن سے تخلیق کے مرحلے سے گزرنے والی ہر عورت کو گزرنا پڑتا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ ایک ایسی صورتِ حال میں اس اہم مرحلے سے گزر رہی تھی جس میں اسے ہر حال میں اپنا یہ راز چھپانا تھا... ورنہ نہ صرف اس کی اور آنے والے بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی بلکہ حویلی والے اس کھوج میں بھی لگ جاتے کہ اسے اس حال تک پہنچانے کا ذمے دار کون ہے؟ وہ آفتاب کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی اس لیے بہت محتاط تھی۔ احتیاط کے باعث ہی وہ اپنے کمرے سے بھی کم ہی باہر نکلتی تھی کہ نہ کسی کا سامنا ہو اور نہ ہی کوئی اس کا بھید پا سکے۔

حویلی میں اس کی اس روش کو بہت زیادہ تشویش سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ پہلے بھی تنہائی پسند تھی اور اس کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں کتابوں کے درمیان ہی گزرتا تھا۔ چنانچہ کمرے میں رہنے کے اوقات مزید طویل ہوئے تو کسی نے بہت زیادہ دھیان نہیں دیا۔ الٹیوں وغیرہ کے سلسلے میں ڈاکٹر ماریا کے اس بیان کے بعد کہ وہ ڈائریا کا شکار ہوئی ہے، وڈی چودھرائن کا شک بھی ختم ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ماریا نے اسے جو دوائیں دی تھیں، وہ الٹیوں اور متلی کو روکنے میں بہت مددگار ثابت ہوئی تھیں اور دوبارہ کسی کے سامنے اس کی طبیعت اس طرح نہیں بگڑی تھی کہ اسے جواب دہ ہونا پڑتا۔

لیکن بہر حال وہ اپنی زندگی کے ایک نہایت نازک تجربے سے گزر رہی تھی جس میں طبیعت کا بالکل معمول پر رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ عمومی حالات میں اس مرحلے سے گزرنے والی عورتوں کو یہ سہولت حاصل رہتی ہے کہ ارد گرد والے ان کا خیال رکھتے ہیں اور تجربہ کار لوگوں کے مشورے مشکل کو آسان بنا دیتے ہیں لیکن وہ تو کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ ابھی تو اسے یہ موقع بھی نہیں ملا تھا کہ آفتاب کو بھی یہ خوش خبری سنا دیتی۔ رانی کی حویلی سے غیر موجودگی نے اسے بالکل بے دست و پا کر کے رکھ دیا تھا اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کس طرح آفتاب سے رابطے کی راہ نکالے۔ موبائل فون لاہور والی کوٹھی میں اس کے ہاتھ سے اس وقت نکل گیا تھا جب آفتاب کے دوست افضل کی بیوی مہتاب اس سے ملنے وہاں آئی تھی اور اسی وقت اچانک ہی اس کی ماں چودھرائن ناہید بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ماں سے مہتاب کا تعارف اتفاقاً بن جانے والی ایک دوست کے طور پر کروایا تھا جس پر اس نے واضح ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اسی وقت اس کی نظروں میں کشور کا موبائل بھی آ گیا تھا۔ کسی مشکل میں پڑنے سے بچنے کے لیے کشور نے موبائل کو مہتاب کی ملکیت قرار دیتے ہوئے اس کے حوالے کر دیا، یوں وہ خود موبائل سے محروم ہو کر آفتاب سے رابطے کی صورت کھو بیٹھی۔ ان حالات میں اس پر اپنی طبیعت کے سلسلے میں ہونے والا انکشاف بڑا سخت ثابت ہوا۔ ایک طرف اگر وہ اپنی محبت کی اس نشانی کے پھوٹنے پر خوش تھی تو دوسری طرف یہ خوف بھی لاحق تھا کہ کسی پر کچھ ظاہر نہ ہو جائے۔

خوف اور خوشی سے بھرے یہ دن وہ بالکل تنہا گزارنے پر مجبور تھی اور یہ تنہائی کبھی کبھی اس کی گھبراہٹ میں بے پناہ اضافہ کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گھٹن اور گھبراہٹ کا شکار ہو کر کمرے سے نکلی تھی۔ ارادہ تھا کہ کچھ دیر پائیں باغ میں جا کر کھلی فضا میں ٹہلے گی تاکہ طبیعت کچھ فریش ہو جائے لیکن اپنے کمرے سے نکل کر برآمدہ طے کرنے کے بعد جب وہ حویلی کے اس حصے میں پہنچی جہاں سے باہر کی طرف جانے کا راستہ گزرتا تھا تو وہاں ڈاکٹر ماریا کو دیکھ کر چونک گئی۔ ڈاکٹر ماریا اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ کھڑی تھی اور قریب ہی وڈی چودھرائن بھی موجود تھی۔

"ہماری چھوٹی بہو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ملازمہ کا کہنا ہے کہ اسے وڈی الٹیاں ہو رہی ہیں اسی لیے میں نے تمہیں بلایا ہے کہ اسے دیکھ لو۔ آج کل شاید اس مرض کی وبا پھیل گئی ہے۔ پہلے کشور بیمار ہوئی، اب بہو بیگم کا مسئلہ ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اگر کہیں مصیبت ماری مر مرا گئی تو وڈے چودھری صاحب کو کیا جواب دوں گی۔ ایسا کرو، تم اوپر جا کر اسے دیکھ لو اور کوئی دوا شوا دے دو تاکہ یہ سیاپا تو مٹے۔"

وڈی چودھرائن اپنے مخصوص تحکمانہ لہجے میں ڈاکٹر ماریا سے مخاطب تھی۔ ڈاکٹر ماریا نے اس کے لہجے کو یقیناً پسند نہیں کیا ہوگا تاہم وہ زبان سے کوئی اظہار کیے بغیر چپ چاپ بالائی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ کشور جو ایک آڑ میں کھڑی یہ ساری باتیں سن رہی تھی، اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اپنے حالیہ تجربے کے بعد اسے فریدہ کی حالت کے بارے میں سن کر تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ فریدہ جو کہ نور پور کے زمیندار کی بہن تھی اور جسے چودھری جبراً اپنے ذہنی معذور بیٹے بہزاد شاہ کی منکوحہ بنا کر حویلی لے آیا تھا، درحقیقت چودھری کی ہوس مٹانے کا سامان بنی ہوئی ہے... اس راز سے صرف کشور واقف تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے کھوج میں پڑ جانے والی وڈی چودھرائن فریدہ کی طبیعت کے بارے میں سن کر اس لیے نہیں چونکی تھی کہ اس کے نزدیک فریدہ ذہنی معذور بہزاد شاہ کی بیوی تھی اور بہزاد شاہ اس لائق نہیں تھا کہ بیوی کے حقوق ادا کر سکتا لیکن اصل حالات سے واقف کشور کا ٹھٹک جانا تو لازمی تھا۔

وہ پائیں باغ میں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وڈی چودھرائن کے منظر سے ہٹ جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت چودھرائن کی چچیاں بھی اور شادو بھی اس کی جاسوسی کے لیے اس کے قریب موجود نہیں تھیں۔ یہ مغرب سے کچھ دیر قبل کا وقت تھا اور اس وقت حویلی کے باورچی خانے میں رات کے کھانے کی تیاری کے سلسلے میں زیادہ تر ملازمائیں وہیں مصروف ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر ماریا کے اوپر جانے کے دو چار منٹ بعد وڈی چودھرائن وہاں سے ہٹی تو کشور کو سیڑھیاں چڑھنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ جب سے وہ لاہور سے واپس آئی تھی، اس پر اوپر جانے پر پابندی عائد تھی۔ پابندی کی تو شاید وہ اتنی پروا نہیں کرتی لیکن درحقیقت وہ اپنے مسئلے میں اس طرح الجھ کر رہ گئی تھی کہ اسے فریدہ کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر پہنچی تو حسب معمول وہاں خاموشی کا راج تھا۔ اوپر مکین ہی کتنے تھے۔ فریدہ، بہزاد شاہ اور ان کی ایک ملازمہ... اگر بہزاد شاہ کو دورہ پڑ جاتا یا وہ کسی بچکانہ ضد پر اڑ جاتا تو اس خاموش ماحول میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ ورنہ وہاں سناٹے ہی بولتے رہتے تھے۔ اوپر پہنچ کر

کشور نے بہزاد شاہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اندر جھانکا تو وہ اسے اپنے بیڈ پر اس حال میں بیٹھا ہوا نظر آیا کہ اس کی گردن پر نیپکن لپٹا ہوا تھا اور ملازمہ اس کے سامنے بیٹھی اسے بڑے سے پیالے میں موجود کوئی دلیا نما شے کھلا رہی تھی۔ کشور خاموشی سے دبے پاؤں وہاں سے گزر گئی اور فریدہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے سیدھے اندر داخل ہونے کے بجائے باہر ہی رک کر اندر کی سن گن لی۔

"ڈاکٹر صاحبہ! تینوں رب دا واسطہ اس گل کی کسی نوں خبر نہ ہونے دینا۔" اسے اندر سے فریدہ کی منت بھری آواز سنائی دی اور ذہن میں پلتا شک اور بھی مضبوط ہو گیا۔

"لیکن کیوں؟ یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ چودھری صاحب اور حویلی کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہوگا کہ تم ماں بننے والی ہو تو سب بہت خوش ہوں گے۔ آخر تم حویلی کی بہو ہو اور حویلی والوں کی نسل بڑھ جانے کا سبب بنو گی۔" جواب میں ڈاکٹر ماریا اس سے حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔

"میں حویلی کی بہو تو ہوں لیکن ناپسندیدہ... یہ لوگ میرے بھائی سے انتقام لینے کے لیے زبردستی مجھے ویاہ کر یہاں لائے تھے اور پھر لا کر اس تنہائی میں ڈال دیا۔ اگر ان کی نظر میں میرا کوئی بہو والا مقام ہوتا تو مجھے اس طرح ایک کونے میں کیوں ڈال دیتے؟ بس تسی مہربانی کرو کسی کو اس گل کا نہ پتا لگنے دو۔ مینوں ڈر ہے کہ اگر کسی نوں خبر ہو گئی تو فیر یہ لوگ دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس بچے کی جان کے دشمن بن جائیں گے۔" فریدہ بڑی لجاجت سے ڈاکٹر ماریا سے درخواست کرتے ہوئے اسے اپنا نقطۂ نظر سمجھا رہی تھی جبکہ باہر کھڑی ہوئی کشور کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہونے لگا۔

"ٹھیک ہے، فی الحال میں خاموش رہوں گی لیکن یہ کوئی چھپنے والی تو بات نہیں۔ آخر کار دوسروں کو اس کا علم ہو ہی جائے گا۔" ڈاکٹر ماریا نے رضامندی ظاہر کرنے کے ساتھ فریدہ کو آنے والے وقت سے بھی خبردار کیا۔

"پتا لگنے میں بھی وقت لگے گا۔ ویسے بھی ادھر آتا کون ہے جو کچھ دیکھ سکے۔ مہینا بھر تو گزر گیا ہے مجھے اس حال میں۔ دو تین مہینے ہور گزر گئے تو فیر کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ابھی بھی تو کرانی نے نیچے خبر پہنچا دی تھی میری طبیعت خراب ہونے کی تو وڈی چودھرائن نے آپ کو بلوا لیا۔ آئندہ کے لیے میں نوکرانی کو سختی سے منع کر دوں گی۔ آپ بھی مجھے کوئی دوا شوا دے جانا تاکہ طبیعت خراب ہو تو میں کھا کر گزارہ کر لوں۔" فریدہ نے گویا سب کچھ سوچ رکھا تھا، سو بڑے اطمینان سے ڈاکٹر ماریا سے کہہ رہی تھی۔ کشور سے اب مزید برداشت نہ ہو سکا اور وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس کے اچانک اندر داخل ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر ماریا اور فریدہ دونوں ہی چونک گئیں لیکن پھر اسے سامنے پا کر دونوں کے چہروں پر اطمینان کے رنگ آ گئے۔ کشور اس معاملے میں ضرر رساں ثابت نہیں ہو سکتی، یہ بات دونوں ہی سمجھتی تھیں۔

"آئیں کشور صاحبہ! میں سوچ ہی رہی تھی کہ حویلی آئی ہوں تو آپ کی طبیعت بھی معلوم کرتی ہوئی چلوں گی۔ اچھا ہوا آپ خود ہی یہاں آ گئیں۔" ڈاکٹر ماریا نے ایک طرح سے اسے جتایا کہ اگر وہ اس کے اور فریدہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکی ہے تو اپنی زبان بند رکھے ورنہ خود اس کا اپنا راز بھی افشا ہو سکتا ہے۔

"میں ٹھیک ہوں اور آپ کی دی ہوئی دوائیں پابندی سے کھا رہی ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوا تو آپ سے رابطہ کر لوں گی۔" اس نے ڈاکٹر ماریا کی بات کا جواب دیا اور فریدہ کے قریب بیٹھ کر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے اس چھوٹی سی لڑکی سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی جو پہلے ہی بہت مشکل میں تھی اور اب ایک اور بوجھ اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی... لیکن اسے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فریدہ کو اپنے اوپر ڈھائے جانے والے ظلم کی نشانی اس بچے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے کہ وہ اس کی زندگی بچانے کے لیے خود کو مشکل میں ڈال رہی ہے۔

"وائے ناٹ۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہوگی۔ آپ دونوں میں سے جس کو بھی، جب بھی میری ضرورت ہو، آپ بلا تکلف مجھے کال کر سکتی ہیں۔" اس کی سوچوں سے بے خبر ڈاکٹر ماریا نے خوشگوار لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور خود اپنا میڈیکل باکس سنبھال کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تھینک یو ڈاکٹر۔" کشور نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر ماریا مسکراتی ہوئی ان دونوں سے مصافحہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد کشور فریدہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟ کیوں گناہ کی اس پوٹ کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی ہو؟"

"کیونکہ اسی میں میری بھلائی ہے۔ حقیقت جو بھی ہے لیکن کہلائے گا تو یہ بہزاد شاہ کی ہی اولاد۔ میں اس بچے کے ذریعے حویلی میں اپنے قدم مضبوط کرنا چاہتی ہوں۔ حویلی کے وارثوں میں سے ایک کی ماں بن کر میرا مقام

www.pkdigest.com

تبدیل ہو جائے گا۔" فریدہ نے اس پر اپنا نقطۂ نظر ظاہر کیا۔

"لیکن کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ بچہ بہزاد شاہ کی اولاد ہے۔" کشور نے اسے احساس دلایا۔

"اس بات کو تمہارا باپ تسلیم کروائے گا، ورنہ میں سب کے سامنے یہ راز کھول دوں گی کہ یہ بچہ بہزاد شاہ کا نہیں بلکہ چودھری افتخار عالم شاہ کی اولاد ہے۔" فریدہ کا لہجہ سخت سنگین تھا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس پر عمل بھی کر گزرے گی۔ ایک ایسا شخص جو اپنا سب کچھ گنوا چکا ہو، اسے پھر کسی بات کا ڈر نہیں رہتا۔ فریدہ سے بھی اس کا گھر، محبوب اور عزت سب کچھ چھین لیے گئے تھے چنانچہ وہ ہر خوف سے آزاد ہو گئی تھی۔ کشور نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کی۔ اس نے بے ساختہ ہی فریدہ کو گلے لگا لیا اور ہمدردی سے بولی۔

"اللہ تمہاری مشکلات دور کرے۔ میری تو دلی خواہش تھی کہ تم اس مشکل سے نکل جاؤ اور قربان کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزارو لیکن خود میں حالات کے گرداب میں اس طرح پھنسی ہوئی ہوں کہ تمہارے لیے کچھ کر نہیں پا رہی۔ ان حالات میں، میں تمہارے لیے بس یہ دعا ہی کر سکتی ہوں کہ زندگی تم پر مہربان ہو جائے اور تم میرے باپ کے ظلم سے آزاد ہو جاؤ۔"

"میں اس کے ظلم سے بچ کر نکل سکوں یا نہ نکل سکوں لیکن یہ طے ہے کہ اسے خود ایک دن اپنے ہر ظلم کا حساب دینا ہوگا۔ اس کے دامن میں اتنی بددعائیں ہیں کہ اللہ اسے معاف کر ہی نہیں سکتا۔" فریدہ نے جس نفرت سے بھرپور لہجے میں یہ بات کہی، اس نے کشور کا دل لرزا کر رکھ دیا۔ مظلوم کی آہ عرشِ الٰہی کو ہلا ڈالتی ہے۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن طاقت و دولت کے نشے میں چور اپنے بدکردار و ظالم باپ کو سمجھانے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

گل شیر کے عمران کے ہاتھوں قتل ہونے والے واقعے کو تین دن گزر گئے تھے۔ ماہ بانو نے اس واقعے کا وہاں کے ماحول پر کوئی اثر نہیں دیکھا تھا۔ اسے اس کی کوٹھری میں اسی طرح معمول کے مطابق تینوں وقت خاموشی کے ساتھ کھانا پہنچایا جاتا جس میں سے وہ خود کو سمجھا بجھا کر چند لقمے زہر مار کر لیتی کیونکہ پیٹ کی آگ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کم ہی سہی بددلی کے باوجود بہرحال وہ کچھ نہ کچھ حلق سے اتار ہی لیتی تھی کہ جب تک جسم سانسوں کی ڈور سے بندھا ہے، اس کی ضروریات بھی پوری کرنی ہی تھیں۔

اس تین دن کے عرصے میں اسے عمران کی شکل دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ وہ دوبارہ اسے دیکھنے کی خواہش مند بھی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں اپنے غلط اندازے نے خود اس کو بے حد مایوس کیا تھا۔ وہ شکل سے معصوم نظر آنے والا عمران اتنا وحشی نکلے گا، اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ عمران کے گل شیر کی کھوپڑی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر توڑ ڈالنے کا منظر اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ بے شک اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کے لیے ہی کیا تھا۔ اگر وہ صحیح وقت پر وہاں نہ پہنچتا تو گل شیر اس کی عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا۔ عمران کی مداخلت کی وجہ سے وہ ایک بار پھر کسی مرد کی ہوس ناکی کا شکار ہونے سے بچ گئی تھی لیکن اسے بچانے کے لیے عمران نے جو وحشیانہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا، وہ اس کے لیے نہایت صدمے کا باعث تھا۔ وہ اب تک اس صدمے سے پوری طرح باہر نہیں نکل سکی تھی اور چاہتی تھی کہ دوبارہ عمران سے سامنا نہ ہو لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔

تیسرا دن بھی گزر جانے کے بعد جبکہ وہ رات کے کھانے سے فارغ ہو چکی تھی اور ایک آدمی کھانے کے برتن بھی لے گیا تھا، وہ آرام کی غرض سے لیٹی تو بہت دیر یونہی گزر گئی۔ ایک محدود جگہ میں بغیر ہاتھ پیر ہلائے گزرنے والے یہ شب و روز عموماً بے خواب ہی گزرتے تھے۔ نوجوانی کی وہ البیلی نیند جو بستر پر گرتے ہی آنکھوں میں اتر آتی تھی، وہ بھی نامہربان ہو چکی تھی، اب اکثر روٹھی رہتی تھی۔ وہ ایک عرصے سے خانماں برباد تھی۔ وقت کی آندھیاں اسے ادھر سے ادھر اڑائے پھرتی تھیں۔ ان حالات میں ٹھیک سے نیند آجاتی یہ ممکن ہی کہاں تھا اور یہاں اس قید میں تو یہ مشکل اور بھی بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً گل شیر کی حرکت کے بعد تو اس بے سکونی میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ بار بار خیال آتا کہ یہاں صرف ایک گل شیر ہی تو نہیں تھا۔ یہاں تو بہت سے مرد تھے جو انسانی آبادی سے دور اس برف زار میں ایک غیر فطری زندگی گزار رہے تھے۔ گل شیر کی طرح ان میں سے کسی اور کو بھی فطرت اکسا سکتی تھی۔ ایسی صورت میں تو وہ مسلسل خطرے میں ہی تھی۔ شاید ذہن میں پلتا یہ خوف ہی تھا جو آج بھی وہ آنکھیں بند کر کے بہت دیر لیٹے رہنے کے باوجود سو نہیں سکی۔ لیٹے لیٹے یک دم اسے احساس ہوا کہ اس کے قریب ہی کوئی ہلکی سی آہٹ ابھری ہے۔ اس آہٹ کو سن کر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ یقینی طور پر وہ ایک انسانی سایہ ہی تھا جسے وہ اپنے قریب دیکھ رہی تھی۔ اس سائے کو دیکھ کر اس کے اعصاب بری طرح تن گئے اور وہ جارحانہ انداز میں اپنی جگہ

سے کھڑی ہوئی۔

"ششش... شور مت مچانا۔ میں عمران ہوں اور تم سے کچھ دیر بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے تیور دیکھ کر سائے نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی۔ ماہ بانو نے آواز دھیمی ہونے کے باوجود شناخت کر لیا کہ یہ واقعی عمران ہے۔ حیرت انگیز طور پر اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"کیا بات کرنی ہے تمہیں مجھ سے؟" وہ جو اب تک اس کا دوبارہ سامنا بھی نہ ہونے کی خواہش کر رہی تھی، اسے سامنے پا کر نرم پڑ گئی اور قدرے روٹھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" وہ تھوڑے فاصلے سے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"لیکن کیوں؟ میرا اور تمہارا تعلق ہی کیا ہے جو تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانے سے دلچسپی رکھتے ہو؟" اس نے ناراضی بھرے لہجے میں اس سے کہا۔

"تعلق تو واقعی کوئی نہیں ہے لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں تاکہ تم مجھ سے کم از کم اتنی نفرت نہ کرو جتنی کہ پچھلے واقعات کے بعد کرنے لگی ہوگی۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے اچھے جذبات دیکھے تھے۔ تمہارے انداز سے لگتا تھا کہ تم مجھے اچھا انسان سمجھتی ہو اور مجھے تمہاری یہ رائے بہت اچھی لگی تھی۔" دھیمی آواز میں نرمی سے بات کرتا ماہ بانو کو وہ وہی عمران لگ رہا تھا جیسا اس نے اسے پہلی بار دیکھنے کے بعد تصور کیا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی اس کی بات سنتی رہی۔ عمران کہہ رہا تھا۔

"میں ہمیشہ سے ایسا جنونی یا غصہ ور نہیں تھا جیسا کہ تم نے یہاں پایا ہے۔ میری شہرت تو بہت سلجھے ہوئے اور نیک نوجوان کی تھی۔ لوگ میری ماں سے کہتے کہ اللہ نے تمہیں ایک بیٹا دیا ہے، پر ہے نیک۔ امی یہ بات سنتیں تو خوشی سے مسکرا دیتیں۔ شاید انہیں لگتا ہو کہ میری صورت انہیں اپنی برسوں کی ریاضت کا صلہ مل گیا ہے۔" وہ جیسے ٹرانس کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس نیم روشن جگہ پر بھی ماہ بانو اس کی کھلی آنکھوں کو کہیں خلاؤں میں بھٹکتا ہوا محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اس سے مخاطب تھا لیکن اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ذہن میں کھل جانے والے کسی دریچے سے اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔

☆☆☆

"ہم صرف دو بہن بھائی تھے۔ میں اور مجھ سے تین سال چھوٹی بہن فرحانہ۔ میرے والد ہماری کم سنی میں ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اس وقت امی نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا اور ایک پرائیویٹ اسکول میں ملازمت کرنے کے ساتھ ساتھ گھر پر بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ ان کی اس دن رات کی محنت سے ہمارے گھر کا چولہا جلنے لگا لیکن پرائیویٹ اسکول کی نوکری میں تنخواہ بھی کم ملتی تھی اور کام کا بوجھ بھی بہت زیادہ تھا۔ ایسے میں امی کی کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ وہ بی اے پاس تو ہیں ہی، ساتھ ہی بی ایڈ بھی کر لیں تو گورنمنٹ ملازمت حاصل کر سکتی ہیں۔ امی کو اپنی سہیلی کا یہ مشورہ اچھا لگا اور انہوں نے بی ایڈ کی تیاری بھی شروع کر دی۔ ان دنوں انہیں بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان دنوں وہ کس وقت سویا کرتی تھیں۔ رات کو ہم بہن بھائی جب سونے کے لیے لیٹتے تو انہیں اپنی کتابوں کے ساتھ مصروف جاگتے ہوئے چھوڑ کر سوتے اور صبح اٹھتے تو بھی امی جاگ رہی ہوتیں۔ ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی وہ گھر کی صفائی ستھرائی سے فارغ ہونے کے علاوہ ناشتے کے ساتھ ساتھ دن بھر کا کھانا بھی تیار کر چکی ہوتیں۔ ان کے ان مصروفیت بھرے دنوں میں بھی میں نے کبھی کسی کام میں بے ترتیبی نہیں پائی۔ یہاں تک کہ وہ ہم بہن بھائی سے کبھی جھنجلا کر یا سخت لہجے میں بات بھی نہیں کرتی تھیں۔"

اپنی ماں کا تذکرہ کرتے ہوئے عمران کے لہجے میں گہری عقیدت اور مٹھاس بھری ہوئی تھی۔ ماہ بانو کو حیرت ہونے لگی کہ یہ دل میں اتنی گہری محبت رکھنے والا لڑکا آخر نفرت کی راہ پر کیسے چل پڑا؟ اس کی اس حیرت سے بے خبر وہ اپنی ہی سنانے میں مصروف تھا۔

"امی کا بی ایڈ مکمل ہوا اور انہیں اپنے کسی جاننے والے کی وساطت سے گورنمنٹ اسکول میں ملازمت ملی تو ہماری زندگی میں سکون آ گیا اور دن رات ذرا ترتیب اور آرام سے گزرنے لگے۔ میں چونکہ بڑا تھا اس لیے مجھے امی کی شبانہ روز محنت اور کوششوں کا زیادہ احساس تھا۔ اس احساس کی وجہ سے ہی میں خوب دل لگا کر پڑھتا تاکہ امی کو خوش کر سکوں۔ امی واقعی مجھ سے خوش بھی تھیں لیکن میری چھوٹی بہن فرحانہ جسے ہم پیار سے فری کہتے تھے، امی کی جدوجہد کے ان دنوں میں شاید کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں پڑنے والی اس نفسیاتی گرہ کا ہمیں کبھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ کبھی کبھی ہم اس کی زبان سے ایسے الفاظ سنتے کہ انسان کے پاس بہت ڈھیر ساری دولت ہونی چاہیے۔ ترس ترس کر اور خواہشات کو مار کر جینا بھی کوئی جینا

www.pkdigest.com

ہے... تو زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ ہمارے نزدیک تو یہ وہ باتیں تھیں جو آج کل کے کم از کم ستر اسی فیصد نوجوان کرتے ہی تھے۔ چنانچہ جب کالج میں ایڈمیشن ہونے کے بعد فرحانہ کے لائف اسٹائل میں تبدیلی آئی تو میں نے یا امی نے زیادہ غور نہیں کیا۔ میں تو یوں بھی زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا تھا، امی نے بھی اس لیے زیادہ نوٹس نہیں لیا کہ آج کل کی بچیاں پہننے اوڑھنے اور فیشن کرنے کی شوقین ہیں۔ فرحانہ کا بھی اپنی کالج فیلوز کو دیکھ کر ذرا بن ٹھن کر رہنے کو دل چاہتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

''مگر پھر بات فیشن کرنے سے کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ فرحانہ نے ہفتے میں ایک، دو دن کالج سے لیٹ گھر آنا شروع کر دیا۔ اس دیر کے لیے اس کے پاس یہ جواز تھا کہ اسے پریکٹیکل کرنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ وہ ایف ایس سی پری میڈیکل کی طالبہ تھی اس لیے اس کا یہ بہانہ بھی قبول کر لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ امی ہم دونوں بہن بھائی پر بے پناہ اعتماد کرتی تھیں۔ انہیں اپنی تربیت پر پورا بھروسا تھا۔ میری حد تک یہ بھروسا قائم بھی رہا۔ فرحانہ بھی بہرحال کردار کے اعتبار سے کوئی خراب لڑکی نہیں تھی بلکہ فطرتاً وہ بہت معصوم اور بھولی بھالی تھی جس کی وجہ سے اسے زمانے کی چالاکیوں اور چالبازیوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ اپنی اسی معصومیت اور کچھ دولت کی خواہش میں وہ ایک صنعت کار کے اوباش بیٹے کے جال میں پھنس گئی۔ اس لڑکے نے اسے نہ جانے کون کون سے سنہری خواب دکھائے کہ وہ اس کی محبت کے سحر میں گرفتار ہو گئی اور گھر والوں سے چھپ کر کالج سے باہر اس سے ملاقاتیں کرنے لگی۔ میں اور امی ان حالات سے قطعی ناواقف تھے۔ ہم پر تو اس وقت پہاڑ ٹوٹا جب ایک روز فرحانہ کالج سے شام ڈھلنے کے بعد گھر آئی۔ امی کو اس نے کالج جاتے ہوئے یہ تو بتا دیا تھا کہ آج اس کے پریکٹیکل کا دن ہے اس لیے واپسی میں دیر ہو جائے گی لیکن اتنی زیادہ دیر ہو جانے پر امی پریشان ہو گئیں اور انہوں نے فرحانہ کی دوستوں وغیرہ کو فون کر کے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ اس کی ہر دوست نے یہی جواب دیا کہ آج کوئی پریکٹیکل نہیں تھا اور فرحانہ معمول کے مطابق کالج سے روانہ ہو گئی تھی۔ یہ سن کر امی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ فرحانہ کو کہاں تلاش کریں۔ میں بھی اس روز ایک انٹر کالج ڈیبیٹ کمپیٹیشن میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ شام گئے گھر واپس پہنچا تو امی کو بے چینی سے ٹہلتا ہوا پایا۔ ان سے سبب پوچھنے پر فرحانہ کے غیاب کا علم ہوا تو میں بھی گھبرا گیا۔

''میں اور امی کوئی لائحہ عمل طے کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ فرحانہ گھر واپس آ گئی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور وہ زخمی بھی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر امی کی چیخیں نکل گئیں۔ فرحانہ نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ کالج سے واپس آتے ہوئے اسے ایک گاڑی نے ٹکر مار دی تھی جس کی وجہ سے اس کا یہ حال ہو گیا۔ گاڑی والا تو ٹکر مارنے کے بعد فرار ہو گیا لیکن ایک ہمدرد راہ گیر نے اسے اسپتال پہنچا دیا جہاں اسے کئی گھنٹوں بعد ہوش آیا اور ہوش آتے ہی وہ رکشے میں بیٹھ کر گھر آ گئی۔ اس کی سنائی یہ کہانی سن کر امی نے اس سے سوال جواب کرنے چاہے لیکن میں نے ان سے کہا کہ ابھی وہ فرحی کو آرام کرنے دیں۔ صبح جب وہ اٹھے گی تو آپ اس سے تفصیلات پوچھ لیجیے گا۔ امی نے میری بات مان لی لیکن افسوس کہ دوسری صبح فرحانہ اٹھی ہی نہیں اور ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ رات کے نہ جانے کون سے پہر اس نے اپنی دونوں کلائیوں کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ ہمیں تو صبح بس اس کی لاش ہی ملی اور ساتھ ہی ایک خط بھی جس میں اس نے مجھے اور امی کو مخاطب کر کے ہم سے معذرت طلب کی تھی۔''

بہت دیر سے مسلسل بولتا عمران داستان کے اس مرحلے پر آ کر ایک دم چپ ہو گیا۔ ماہ بانو نے محسوس کیا تھا کہ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور شاید وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں ہی خاموشی اختیار کر گیا تھا۔ رنج میں ڈوبے اس نوجوان کے لیے دل میں گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے ماہ بانو نے دھیرے سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ یہ ایک خاموش دلاسا تھا جس نے عمران کو سنبھلنے میں مدد دی اور اس نے ایک بار پھر اپنی داستان کا سلسلہ جوڑ دیا۔

''فرحانہ نے اپنے اس خط میں واضح طور پر لکھا تھا کہ وہ کس صنعت کار کے بیٹے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی اور وقتاً فوقتاً اس سے ملنے باہر جاتی رہتی تھی۔ آخری ملاقات میں وہ لڑکا اسے کلفٹن پر واقع اپنے اپارٹمنٹ لے گیا کہ چلو تمہیں وہ گھر دکھاتا ہوں جہاں تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی فرحانہ خوشی خوشی اپنا مستقبل کا گھر دیکھنے اس کے ساتھ چلی گئی لیکن وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ جال میں پھنس گئی ہے۔ اپارٹمنٹ میں اس امیر زادے کے چار دوست اور بھی تھے۔ ان سب دوستوں نے مل کر میری معصوم بہن کی آبروریزی کی۔'' یہ سب بتاتے ہوئے عمران کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔

''انہوں نے اس موقع پر اس کی تصویریں بھی کھینچ لیں اور اپنی درندگی کے نتیجے میں اس کے جسم پر لگنے والی چوٹوں پر معمولی مرہم پٹی کرنے کے بعد یہ دھمکی دے کر وہاں سے روانہ کر دیا کہ اگر تم نے کسی کو ہمارے بارے میں بتایا تو یہ تصویریں تمہارے گھر پہنچانے کے علاوہ کالج میں بھی پھیلا دی جائیں گی۔ فرحانہ ان لوگوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی تھی یا اس وقت اتنے شدید صدمے میں تھی کہ اس نے اس دھمکی کے باوجود میرے اور امی کے نام لکھے جانے والے اپنے آخری خط میں اس لڑکے کی نشان دہی کر دی۔ امی تو فرحانہ کی موت اور اس خط کی وجہ جان کر صدمے سے اس بری طرح چور ہوئیں کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ اسپتال پہنچ گئیں۔ ان کے اسپتال میں داخل ہونے کے بعد کون تھا جو مجھے روکتا یا کچھ سمجھاتا بجھاتا۔ میں نے تھانے میں اس واقعے کی رپورٹ لکھوادی اور فرحانہ کا خط تھانے دار کو دکھا کر اس سے مطالبہ کیا کہ میری بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے شخص کو گرفتار کیا جائے۔ تھانے دار بے وقوف نہیں تھا کہ میری بات پر کان دھرتا۔ اس نے لڑکے کے صنعت کار باپ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ جناب کے بیٹے کے خلاف یہ رپورٹ درج ہوئی ہے۔ اب آپ فرمائیں کہ کیا کہتے ہیں؟ صنعت کار کو کیا کہنا تھا؛ اس نے تھانے دار کو کھلا پلا دیا ... سے بگڑ کر بیٹھ گیا اور اس طرح فرحانہ کے قتل کا کیس شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ میں بے بس سا انصاف کے لیے تھانے کے چکر لگاتا اور کبھی اسپتال میں داخل امی کو دیکھنے جاتا۔

''اس روز میں امی کے پاس اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ اب وہ نہیں رہی ہیں۔ ڈاکٹرز خود حیران تھے کہ ریکور کرتے کرتے اچانک انہیں کیا ہو گیا۔ پیرا میڈیکل اسٹاف سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص امی سے ملنے آیا تھا اور ان کے لیے ایک لفافہ لایا تھا۔ امی نے اس لفافے کو کھول کر دیکھا تو اس کے بعد ان کی حالت بگڑ گئی اور پھر دوبارہ نہ سنبھل سکیں۔ میں نے امی کے سامان کی تلاشی لی تو ان کے پرس میں سے وہ لفافہ مل گیا۔ لفافے میں تصویروں کے کچھ ٹکڑے تھے جو یقیناً امی نے ہی کیے تھے۔ میں نے ان ٹکڑوں کو جوڑ کر دیکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ امی کی یہ حالت کیوں ہوئی۔ وہ فرحانہ کی وہی تصویریں تھیں جو ان اوباش لڑکوں نے اسے دھمکانے کے لیے کھینچی تھیں اور اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس دھمکی پر عمل کرنے سے باز نہیں آئے۔ مجھے امی کی موت نے بالکل پاگل کر کے رکھ دیا اور میں ہر مصلحت کو بھول کر اس امیر زادے کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ میں ارادہ کر کے نکلا تھا کہ وہ مجھے مل گیا تو میں اسے جان سے مار دوں گا لیکن اپنی اس دیوانگی میں، میں نے یہ تک سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ کسی کو قتل کرنے کے لیے کسی ہتھیار وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

''جوش و جذبات سے بھرا میں نہتا ہی اسپتال سے سیدھا اس امیر زادے کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہاں گیٹ پر گارڈز کھڑے تھے۔ مجھے اندر کون جانے دیتا؟ میرے چیخنے چلانے اور زبردستی اندر گھسنے کی کوشش کرنے پر گارڈز نے مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا اور پھر مجھے پولیس کے حوالے کر دیا گیا کہ اس شخص نے قاتلانہ حملے کی کوشش کی ہے۔ پولیس نے مجھے اور مارا اور پھر میں تین مہینے تک سلاخوں کے پیچھے قید اپنی بے بسی پر روتا رہا۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ نہ بہن رہی تھی نہ ماں۔ ماں کو تو میں... اس کے جنازے کو کندھا دے کر قبرستان تک بھی نہیں پہنچا سکا تھا۔ میرا تعلیمی سلسلہ جو کہ میرے روشن مستقبل کا راستہ تھا، وہ بھی سلاخوں کے پیچھے ہونے کے باعث منقطع ہو گیا۔ خیر، ان دنوں میں جس کیفیت سے گزر رہا تھا، اگر آزاد بھی ہوتا تو کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے شب و روز عجیب وحشت کے عالم میں گزر رہے تھے۔ کبھی میں دن بھر بھوکا رہتا تو کبھی رات رات بھر روتا رہتا۔

''میری یہ حالت دیکھ کر ایک دن ایک ساتھی قیدی میرے پاس آیا اور کچھ ایسی ہمدردی سے مجھ سے میرے حالات پوچھے کہ میں اس سے کچھ بھی نہیں چھپا سکا۔ اس شخص نے میرے حالات سنے تو مجھے سمجھایا کہ اس طرح بزدلوں کی طرح روتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ خود میں حوصلہ پیدا کرو اور اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ لو۔ وہ شخص اس دن کے بعد ہر روز مجھے اس طرح کی نصیحتیں کرتا۔ آخر کار میں اس کی باتوں سے متاثر ہونے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسی تنظیم سے وابستہ ہے جو اسی طرح کے مظالم کے خلاف جہاد کرتی ہے اور ظالموں کو ان کے صحیح انجام تک پہنچاتی ہے۔ اس شخص کی باتیں سن کر میں تنظیم کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا۔

''میرے نزدیک واقعی وہ لوگ لائق تحسین تھے جو اپنی ذات کو فراموش کر کے معاشرے کی اصلاح کے لیے بے لوث خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس بے پناہ متاثر ہونے کا ہی اثر تھا کہ جب چھ ماہ بعد مجھے اپنے کچھ دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہائی نصیب ہوئی تو میں سیدھا اس تنظیم کے افراد کے پاس پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے اپنی بہن کے قاتلوں سے انتقام لینے کے قابل

www.pkdigest.com

بتادیں گے لیکن اس کے لیے مجھے کچھ صبر سے کام لینا ہوگا اور تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ ابتدائی دو تین ماہ انہوں نے مجھے شہر میں ہی رکھ کر تربیت دی اور یہ جانچ لینے کے بعد کہ میں اپنے ارادے میں مضبوط ہوں، یہاں منتقل کر دیا۔ یہیں مجھے اطلاع دی گئی کہ تنظیم کے ساتھیوں نے میری بہن کے قاتل سے انتقام لے لیا ہے۔ اس روز تم نے جو ویڈیو دیکھی تھی، وہ اسی شخص کی تھی۔ تم چاہے اسے ظلم کہو لیکن مجھے وہ منظر دیکھ کر بڑا سکون ملا تھا۔ میری معصوم بہن کی زندگی برباد کر دینے والا اور ہمارے ہنستے بستے گھر کو ختم کر دینے والا ایسے ہی انجام کا حق دار تھا۔"

آخری جملے بولتے ہوئے عمران کے لہجے میں نفرت کا وہی زہر بھر گیا تھا جس نے اس جیسے سلجھی ہوئی طبیعت کے نوجوان کی شخصیت بدل کر رکھ دی تھی اور وہ ان لوگوں کے درمیان آپھنسا تھا جو کسی طور بھی مثبت سوچ کے حامل نظر نہیں آتے تھے۔ عمران کے ماضی کے تناظر میں ماہ بانو کو تین دن قبل پیش آنے والا واقعہ بھی سمجھ آ گیا تھا۔ گل شیر کو اس کی عزت کے درپے دیکھ کر یقیناً عمران کو یونہی لگا ہوگا کہ اس کی اپنی بہن کی عزت خطرے میں ہے۔ اپنی بہن کو تو وہ بچا نہیں سکا تھا اور اس کے قاتل کو بھی اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کر سکا تھا، چنانچہ اس نے گل شیر کو وہی امیرزادہ تصور کرتے ہوئے اپنی ساری نفرت اور غصہ اس پر نکال ڈالا۔

"مجھے تمہارے حالات جان کر دلی رنج ہوا ہے لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، وہ صحیح نہیں ہے اور نہ ہی یہ لوگ صحیح ہیں جنہوں نے تمہیں برائیوں کے خلاف جہاد کے نام پر اپنے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ یہ وحشت زدہ نیم دیوانے لوگ جن کی آنکھوں سے انسانیت کی رمق بھی مٹنے لگی ہے، مجاہد کہلانے کے حق دار ہو ہی نہیں سکتے۔ مجاہد کا تو بڑا مقام اور رتبہ ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی وحشت نہیں بلکہ نور برستا ہے۔ یہاں تمہیں کسی ایک شخص کے چہرے پر بھی ذرا سا بھی نور دکھائی دیا؟" عمران کی ساری داستان سننے کے بعد اس نے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ آخر میں اس سے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی ان لوگوں میں مجاہدین والی کوئی بھی خوبو نہیں ہے۔" خلاف توقع عمران نے اس سے اختلاف کرنے کے بجائے فوراً ہی اتفاق کر لیا تو وہ حیران رہ گئی۔

"اصل میں، میں جن حالات میں ان لوگوں سے ملا وہ ایسے تھے کہ کوئی بھی مجھے راہ سے بھٹکا سکتا تھا۔ انتقام کے جنون میں میری اچھے برے اور صحیح غلط میں فرق کرنے کی صلاحیتیں ختم ہو گئی تھیں۔ پھر ان لوگوں نے خود کو کچھ اس طرح سے میرے سامنے پیش کیا کہ میں ان کے بارے میں ٹھیک سے اندازہ ہی نہیں لگا سکا۔ تین دن پہلے تک بھی میں ان لوگوں کو بالکل صحیح سمجھتا تھا۔ میرے نزدیک یہ وہ خدائی فوجدار تھے جو معاشرے سے برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے بے لوث ہو کر جدوجہد کر رہے تھے۔ میں انہیں مظلوموں کا ہمدرد اور ظالموں کا دشمن سمجھتا تھا لیکن پھر اتفاق سے میں نے کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی اور نتیجتاً میری آنکھوں پر بندھی پٹی کھل گئی۔" عمران کے ان الفاظ نے ماہ بانو کا تجسس بھڑکا دیا۔ وہ سننے کے لیے بے چین ہو گئی کہ آخر وہ کون سے حقائق تھے جنہیں جاننے کے بعد عمران ان لوگوں سے بددل ہو گیا تھا۔

"گل شیر کی ہلاکت کے اگلے دن جب میں اپنے حواسوں میں واپس آیا اور مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھوں اپنے ہی ساتھیوں میں سے ایک کا قتل ہو گیا ہے... جس کا ہو سکتا ہے، چند لوگوں کو افسوس بھی ہو تو میں کمانڈر کا ری ایکشن جاننے کے لیے اس سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس وقت کمانڈر اور اس کے نائب کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں ان لوگوں کی زبان سے اپنا نام سن کر باہر ہی رک گیا کہ اچھا ہے بغیر سامنے جائے ہی ان کی رائے جان لوں۔ میں نے سنا، کمانڈر کا نائب اس سے کہہ رہا تھا کہ سر! عمران کا کیا کریں؟ یہ تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جذباتی نوجوان ہے۔ کل رات اس کی وجہ سے ہمارا گل شیر جیسا قیمتی آدمی ضائع ہو گیا۔ لاکھوں کی رقم خرچ کی تھی ہم نے گل شیر کی تربیت پر... اور وہ تھا بھی اپنے کام کا ماہر۔ ہمارے تربیت دیے ہوئے آدمیوں میں... خودکش جیکٹ کی تیاری میں اس جیسی مہارت کسی اور کے پاس نہیں۔ وہ دھماکا خیز مواد کے بارے میں بے حد معلومات رکھتا تھا اور اسے اس طرح کی چیزوں کو ہینڈل کرنا بھی خوب آتا تھا۔ عمران نے اسے قتل کر کے ہمارا بہت بڑا نقصان کیا ہے... جواب میں کمانڈر بولا کہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے اور مجھے خود بھی گل شیر جیسے آدمی کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس ہے لیکن ہم اس معاملے میں عمران کو کوئی تنبیہ بھی نہیں کر سکتے۔ گل شیر نے حرکت ہی ایسی کی تھی کہ اگر خود میں بھی اسے وہ حرکت کرتے ہوئے پکڑ لیتا تو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ وہ لڑکی ہمارے پاس یہاں بگ باس کی امانت ہے اور باس نے سختی سے حکم دیا تھا کہ لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے... لیکن میری تنبیہ کے باوجود گل شیر کی نیت خراب ہو گئی۔ وہ تو ایک طرح سے اچھا ہوا کہ عمران موقع پر وہاں پہنچ گیا ورنہ اگر لڑکی کو کچھ ہو جاتا تو میرے لیے بگ باس کو جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ کمانڈر کی اس بات کو سن کر نائب بولا کہ وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر لیکن عمران جیسے جونیئر بندے کے ہاتھوں گل شیر جیسے سینئر کا نقصان بھی قابل برداشت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں عمران کو کوئی سزا ضرور دینی چاہیے تاکہ وہ آئندہ سرکشی سے گریز کرے۔

"کمانڈر اپنے نائب کی یہ بات سن کر مسکرایا اور بولا کہ تم فکر نہ کرو۔ میں اس معاملے پر پہلے ہی غور و فکر کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ عمران بہت دور تک ہمارے ساتھ چلنے والا لڑکا ہی نہیں ہے۔ وہ صرف جذبات میں آ کر اس راہ پر چل پڑا ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس کی فطرت اسے اس راہ پر چلنے نہیں دے گی۔ معلوم نہیں کیسے کراچی میں موجود کیمپ کے انچارج سے اس لڑکے کو جج کرنے میں غلطی ہو گئی اور اس نے اسے یہاں تک بھجوا دیا۔ اب مجھے اس غلطی کو سدھارنا ہوگا اور اس کا ایک ہی حل ہے کہ ہم جلد از جلد عمران کو استعمال کر کے اس سے اپنی جان چھڑا لیں۔ اندر کمانڈر یہ [illegible] میں باہر کھڑا حیران تھا کہ یہ کون سے [illegible] ہیں اور [illegible] مقصد کے تحت انہوں نے یہ سارا سیٹ اپ قائم کر رکھا ہے؟ میرے ان سوالوں کا جواب کمانڈر کی آگے کی گفتگو نے دے دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ہمارے پاس وفاقی وزیر شوکت مرزا کے قتل کا ٹاسک موجود ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں اوپر سے بھی اشارہ مل چکا ہے اور یہاں ہم شوکت مرزا کے ایک مخالف کو بھی گھیر چکے ہیں کہ وہ اس کام کے لیے ہمیں معاوضہ دے دے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کام کے لیے عمران کو خودکش بمبار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ شوکت مرزا کے بارے میں، میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق دیگر برائیوں کے ساتھ ساتھ وہ کئی عورتوں کی آبرو ریزی میں بھی ملوث ہے۔ اس کے اس طرح کے چکروں کی افواہیں تو گردش کرتی رہتی ہیں مگر کبھی وہ پکڑا نہیں گیا ہے لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ ایسا آدمی کتنا ہی ہاتھ بچا کر کام کرے، کہیں نہ کہیں اس کے جرم کا ثبوت موجود ہوتا ہے... اور یہ ثبوت عموماً صحافی برادری کے کسی بندے کے پاس ہی ہوتا ہے۔ ہمارے لوگوں نے اس صحافی کو تلاش کیا جس کے پاس شوکت مرزا کے خلاف مواد موجود تھا اور وہ اس بلیک میلنگ اسٹف کے ذریعے اس سے بڑی بڑی رقوم اینٹھ رہا تھا۔ ہم نے صحافی سے وہ اسٹف حاصل کر لیا ہے۔ کب میں وہ ساری چیزیں عمران کو دکھاؤں گا اور اسے شوکت مرزا پر خودکش حملہ کرنے کے لیے اکساؤں گا۔ اس کے کل رات والے ردعمل کو دیکھتے ہوئے تم سمجھ سکتے ہو کہ وہ اس کام کے لیے فوراً راضی ہو جائے گا۔ اپنی بہن کی آبرو ریزی کے بعد وہ ہر اس طرح کے شخص کو واجب القتل سمجھتا ہے۔ اس لیے اسے شوکت مرزا پر خودکش حملہ کرنے میں کوئی تعرض نہیں ہوگا۔ اس طرح ہمارا ایک کام بھی ہو جائے گا اور ہم عمران سے نجات حاصل کرنے سے پہلے اس پر اب تک لگنے والی رقم بھی سود سمیت وصول کر لیں گے۔

"کمانڈر کے ان الفاظ نے جہاں مجھے لرزا کر رکھ دیا، وہیں اس کا نائب بے پناہ خوش ہوا اور بولا... یو آر سو جینئس سر! آپ نے مسئلے کا ایک ایسا حل ڈھونڈا ہے جسے سن کر دل خوش ہو گیا ہے۔ میں ان دونوں کی اس گفتگو کو سن کر اتنا مشتعل تھا کہ دل چاہتا تھا، ابھی اندر جاؤں اور انہیں جان سے مار ڈالوں لیکن پھر میں نے اپنے جذبات کو قابو میں کیا اور دبے پاؤں وہاں سے واپس پلٹ گیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری جذباتیت پہلے ہی مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچا چکی ہے اس لیے اب مجھے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا۔ میں نے وہ سارا دن معمول کے مطابق گزارا۔ پھر رات میں میرے پاس کمانڈر کا بلاوا آ گیا۔ میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اس منافق آدمی کی شکل بھی دیکھوں لیکن مصلحتاً برداشت سے کام لیتا ہوا اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ کمانڈر نے بڑی سنجیدگی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے بولا کہ... کل جو کچھ ہوا اس کا مجھے بہت افسوس ہے عمران۔

"میں نے کہا... بھائی صاحب! افسوس مجھے بھی ہے۔ مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا اور اس غصے کی وجہ سے گل شیر کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یقیناً آپ کو اس کی موت کا بہت افسوس ہوا ہوگا... لیکن کمانڈر کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے گل شیر کے قتل پر نہیں، اس کی حرکت پر افسوس ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہم مجاہدین کے درمیان اس جیسا شیطانی فطرت رکھنے والا آدمی بھی موجود ہے۔ تم نے اس شیطان کو قتل کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور اس وقت میں نے تمہیں تمہارے اس کارنامے پر شاباش دینے کے لیے ہی بلایا ہے۔ اگر میں نے کمانڈر کا اصل چہرہ نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کی یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوتا۔ میں نے دل ہی دل میں اس منافق پر لعنت

بھیجی اور مسلمانانِ کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے غلط نہیں سمجھا۔ کمانڈر میری طرف سے شکر گزاری کے اظہار پر خوش ہوا اور پھر اس نے تھیلے سے بلی نکالتے ہوئے وفاقی وزیر شوکت مرزا کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بڑھا چڑھا کر مجھے وزیر کی اخلاقی بے راہ روی کے بارے میں باتیں بتاتا رہا اور بولا کہ اس جیسا کرپٹ شخص اس لائق نہیں کہ اسے مزید اس دنیا میں رہنے دیا جائے۔ میں نے کمانڈر کی اس رائے سے اتفاق کیا اور ازخود اپنی خدمات پیش کر دیں کہ میں اس بدکردار آدمی کو ٹھکانے لگاؤں گا۔ کمانڈر نے میرے اس جذبے پر مجھے بہت شاباش دی اور بتایا کہ شوکت مرزا نہایت سخت سیکیورٹی میں رہتا ہے۔ اسے دور سے گولی مارنا یا کہیں ایسے ہی گھیر لینا ممکن نہیں ہے۔ اس شخص کو ختم کرنے کے لیے ہمیں خودکش حملے کی تکنیک ہی استعمال کرنی پڑے گی۔ اس کام کے لیے تمہیں یہ کرنا ہوگا کہ بارود سے بھری ہوئی گاڑی لے کر اچانک ہی شوکت مرزا کی گاڑی سے ٹکرا دو۔ گاڑی ہم تمہیں فراہم کر دیں گے اور شوکت مرزا کے شیڈول کے متعلق معلومات حاصل کر کے حملے کی جگہ اور وقت کا تعین کرنا بھی ہماری ذمے داری ہوگی۔ بس تم ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار رہو کہ تمہیں یہ کام اپنی جان کی قیمت پر کرنا ہے۔ باقی اس سلسلے میں تمہاری جو ٹریننگ وغیرہ ہونی ہوگی، اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

"میں نے کہا... بھائی صاحب! جان کی کوئی پروا نہیں۔ اگر ایک شیطان کو دنیا سے مٹانے میں میری جان چلی جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے جامِ شہادت نوش کر کے ہمیشہ کی زندگی پالی۔

"کمانڈر میرے اس جواب سے بہت خوش ہوا اور مجھے گلے لگا کر میرے جذبے کی بہت تعریف کی۔ میں اندر ہی اندر اس کی مکاری پر کڑھتا رہا لیکن زبان اور چہرے سے اظہار نہیں ہونے دیا۔ کمانڈر کی اصلیت کھلنے کے بعد میں مسلسل سوچتا رہا کہ میرا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ میں یہاں رہ کر اکیلا ان سارے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، اسی کشمکش میں مبتلا دو دن گزر گئے۔ آج شام کمانڈر نے مجھے پھر اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ کل کسی وقت مجھے یہاں سے روانہ کر دیا جائے گا۔ روانگی کے بارے میں سن کر مجھے تمہارا خیال آ گیا اور دل میں تجسس جاگا کہ تم سے معلوم تو کروں کہ آخر تم کون ہو اور کیسے ان لوگوں کے جال میں پھنس گئی ہو۔ ممکن ہے کہ میں تمہیں اس جال سے نکالنے کے لیے کچھ کر سکوں۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی اس لیے میں موقع ملتے ہی تم سے ملنے یہاں آ گیا ہوں۔ میں تمہیں ان بھیڑیوں کے درمیان تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ تمہاری صورت میں مجھے اپنی فری کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ فری کو تو میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے نہیں بچا سکا تھا لیکن تمہارے لیے جو بھی کر سکا ضرور کروں گا۔"

عمران کے لہجے میں جو سچائی اور خلوص تھا، اس نے ماہ بانو کے دل پر گہرا اثر کیا اور فرطِ جذبات سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چند ظالموں کی وجہ سے وہ اگر حالات کے گرداب میں پھنس گئی تھی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تھی کہ دستِ قدرت ہر جگہ بہانے بہانے سے اس کی مدد کے لیے کارفرما ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی اللہ نے عمران کی صورت میں اس کے لیے ایک مددگار بھیج دیا تھا۔ وہ اس مددگار کے ظہور پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے عمران کو دھیمی آواز میں مختصراً اپنے حالاتِ زندگی سناتی چلی گئی۔ اس کی زندگی کی داستان ایسی نہیں تھی جو عمران جیسے دردِ دل رکھنے والے انسان کو متاثر نہیں کرتی۔ وہ خاموشی سے مگر دلی افسوس کے ساتھ اس کی داستان سنتا چلا گیا۔

"تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔ میری کوشش ہوگی کہ کل یہاں سے روانہ ہوں تو تم ہر صورت میرے ساتھ موجود ہو۔" وہ اپنا بالکل آخری جملہ کہہ کر اٹھا جب عمران نے اس کے پاس سے رخصت ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے اور اس کے دل میں امید کی شمعیں روشن کر کے خود جس طرح تاریکی میں خاموشی سے یہاں تک آیا تھا، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

مشابرم خان ہنوز اسکردو میں ہی مقیم تھا۔ پولیس کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باعث وہ فی الحال اپنی ملازمت پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس طرف سے اسے کوئی پریشانی بھی نہیں تھی کیونکہ شہریار نے اس کی چھٹی منظور کرتے ہوئے اسے وہیں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہاں رہ کر وہ اپنی ماں کی دیکھ بھال بھی کر سکتا تھا اور اکرم خان کے قاتلوں اور ماہ بانو کے اغواکاروں کا کھوج بھی لگانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اسپتال میں داخل اس کی ماں کی حالت ہنوز پہلے جیسی تھی۔ جوان بیٹے کی موت کے غم نے اسے اتنی بری طرح متاثر کیا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر اس حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ مشابرم خان روز اسپتال جاتا اور خاموشی سے ماں کے سرہانے بیٹھا رہتا۔

اسپتال سے نکلتا تو ان لوگوں کی تلاش شروع کر دیتا جو

نیاز علی کو اپنے آلۂ کار کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ نیاز علی نے مرنے سے قبل اسے یہ تو بتا دیا تھا کہ وہ کسی شخص کے کہنے پر پہاڑوں میں کہیں خفیہ طور پر روپوش لوگوں کے لیے خوراک اور ادویات کا ذخیرہ سپلائی کرتا ہے لیکن اس نے اس آدمی کی نشان دہی نہیں کی تھی۔ وہ ایسے کسی پوائنٹ کا نام بھی نہیں بتا سکا تھا جہاں سے اس سے سپلائی لی جاتی ہو۔ اس کے مطابق مال وصول کرنے والے ہمیشہ مختلف مقام پر اس سے وصولی کرتے تھے۔ یعنی نیاز علی کو استعمال کرنے کے باوجود وہ لوگ اس پر بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایسی صورت میں مشابرم خان کے پاس یہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ اس شخص کو تلاش کرے جو یہاں اسکردو میں نیاز علی کو آگے لے جانے کے لیے سامان فراہم کرتا تھا۔ اس شخص کی تلاش کے لیے اس نے نیاز علی کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بہت زیادہ لوگوں سے تعلقات نہیں تھے اور کچھ عرصے سے تو اس نے دوستوں وغیرہ سے ملنا تقریباً ترک ہی کر دیا تھا۔ بس لے دے کر ٹورسٹ کمپنی میں اس کے ساتھ ملازمت کرنے والے چند ساتھی ہی تھے جن سے اس کا تھوڑا میل ملاپ تھا۔ مشابرم خان نے ان ملازمین اور کمپنی کے مالک پر نظر رکھنی شروع کر دی لیکن تنہا ہونے کی وجہ سے اسے اس کام میں بہت دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ بیک وقت ان تمام افراد کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ کمپنی سے وابستہ ڈرائیورز تو عموماً سفر میں ہی رہتے تھے۔ وہ ان میں سے کس کس کا پیچھا کرتا اور کس طرح؟ اس کے پاس یہاں اپنی کوئی ذاتی سواری بھی نہیں تھی۔ کرائے کی جیپ البتہ مل سکتی تھی لیکن ابھی تک اس نے اس سہولت کو حاصل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ فی الحال وہ یہیں رہ کر جائزہ لے رہا تھا کہ کوئی ایسی مشکوک جیپ نظر آ جائے جسے پہاڑوں پر جانے والی کسی ایکسپیڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو اور اس کے باوجود اس میں سامان لوڈ ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ اکثر نیاز علی کے دفتر کے آس پاس چکر اتارتا رہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ نیاز علی کی موت کے بعد اس کام کے لیے کسی اور ڈرائیور کو ہائر کیا جائے گا۔ وہ کوشش میں تھا کہ کسی طرح نیاز علی کی جگہ لینے والے ڈرائیور کا کھوج لگا لے۔ نئے ڈرائیور کا علم ہو جاتا تو پھر اس شخص تک پہنچنے کی راہ بھی نکل آتی جو یہ کام کروا رہا تھا۔ اپنی اس کھوج کے چکر میں وہ صبح ہی صبح ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے جا پہنچتا۔ عموماً جیپیں اسی وقت روانہ ہوتی تھیں اور نظر رکھنے کی صورت میں ایسی جیپ پکڑ میں آ سکتی تھی جو مشکوک ہو۔ ابھی تک اسے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی پھر بھی وہ ثابت قدمی سے اپنے معمول پر ڈٹا ہوا تھا۔

نگرانی کا کام انجام دینے کے لیے اس نے دفتر کے عین سامنے موجود ایک چھوٹے سے ہوٹل کو اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ وہ ہوٹل بھی کیا تھا، بس ایک طرح سے چائے خانہ ہی تھا جہاں چائے کے ساتھ ناشتے کے لوازمات بھی مل جاتے تھے۔ مشابرم خان ہر روز صبح وہاں پہنچ کر ناشتا کرتا۔ اس دوران اس کی نظریں ٹورسٹ کمپنی کے دفتر پر ہی لگی رہتیں۔ ابھی تک اس نے وہاں سے جتنی جیپیں روانہ ہوتی دیکھی تھیں، ان میں سے کوئی بھی مشکوک نہیں لگی تھی۔ وہ موقع پا کر جیپ کے ڈرائیور سے بات چیت بھی کر لیتا تھا۔ اس گفتگو سے اسے علم ہو جاتا کہ کون سی جیپ کہاں اور کس مقصد کے لیے روانہ ہو رہی ہے۔ اس کے سامنے اب تک کوئی ایسی جیپ روانہ نہیں ہوئی تھی جسے کسی ایکسپیڈیشن ٹیم کو واپس لانے جانا ہو۔ مسلسل ناکامی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اس کا لائحہ عمل غلط ہے۔ اسے نیاز علی کی ٹورسٹ کمپنی کے علاوہ دوسری کمپنیوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اب تک تو وہ اس شک کی بنیاد پر صرف اسی کمپنی کی جیپوں کی نگرانی کر رہا تھا کہ ہو نہ ہو، کمپنی کا مالک بھی اس کام میں شامل ہوگا۔ نیاز علی نے اگرچہ ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا تھا لیکن مشابرم خان کو شبہ تھا کہ اتنا بڑا کام مالک کی شمولیت کے بغیر کرنا صرف ڈرائیور کے بس کی بات نہیں... لیکن اب وہ خود اپنے اس نظریے کی طرف سے مشکوک ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی لائن آف ایکشن غلط ہے اور اب اسے اپنی نگرانی کا دائرہ وسیع کر کے دیگر ٹورسٹ کمپنیوں اور ان کے ڈرائیورز کو بھی چیک کرنا چاہیے۔ یہ بہت بڑا کام تھا جس کے لیے تنہا اس کی ذات ناکافی ہوتی اور اسے مقامی حکام سے مدد لینی پڑتی۔ شہریار کی وجہ سے اسے یہ مدد مل بھی جاتی لیکن اس صورت میں شاید وہ خود لاعلم رہ جاتا۔ سرکاری لوگ اسے اپنے ساتھ شامل کرنے کے بجائے جو بھی کرنا ہوتا، اپنے طور پر کرتے جبکہ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ خود یہ مہم سر کرے۔

اکرم خان کے قتل اور ماہ بانو کے اغوا نے اس معاملے کو اس کی ذاتی لڑائی بنا دیا تھا۔ نہ وہ اپنے بھائی کے قاتلوں کو معاف کر سکتا تھا، نہ ہی اپنے گھر کی عزت ماہ بانو کے اغوا کو نظرانداز کر سکتا تھا۔ اب بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس مصیبت میں مبتلا تھی اور کن حالات سے گزر رہی تھی۔ ان ساری سوچوں اور فکروں کے گرداب میں پھنسا آج پھر وہ اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھا اور ناشتے سے فارغ ہونے کے

www.pkdigest.com

بعد سنبھل جانے کے کھوف بھرا رہا تھا۔ اچانک ہی اس کی جیب میں موجود سیل فون بجنے لگا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر چیک کیا۔ یہ اس اسپتال کا نمبر تھا جہاں اس کی ماں داخل تھی۔ اسپتال کا نمبر دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ اس نے اسپتال انتظامیہ کو خود اپنا نمبر دیا تھا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں اسے کال کر لی جائے۔ وہاں سے فون آنے کا مطلب تھا کہ خیریت نہیں تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے تشویش کے عالم میں کال ریسیو کی۔

''تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہو گئی ہے، فوراً اسپتال پہنچو۔'' کسی نے بہت تیزی سے یہ پیغام دے کر فون بند کر دیا۔ مشاہد خان اپنے بدترین اندیشے کے درست ثابت ہونے پر گھبرایا ہوا پھرتی سے اٹھ کر اسپتال کے لیے روانہ ہوا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور اس کے مسلسل بے ہوشی میں ہونے کے باوجود وہ یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ ایک دن ماں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ اب جو اس کی طبیعت بگڑنے کا فون آیا تو اس کی اپنی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔ وہ حتی الامکان تیزی سے کام لے کر فوراً ہی اسپتال پہنچا لیکن جب ماں کو دیکھا تو وہ پہلے والی ہی کیفیت میں تھی۔

''مجھے یہاں سے کسی نے فون پر اطلاع دی تھی کہ میری ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ کیا سچ اس کی حالت بگڑ گئی تھی؟'' یہ گمان کرتے ہوئے کہ ممکن ہے، ماں کی حالت خراب ہوئی ہو اور ڈاکٹرز نے قابو پا لیا ہو... اس نے ڈیوٹی نرس سے پوچھا۔

''نہیں، ان کی طبیعت تو پہلے ہی جیسی ہے۔ یہاں سے تو کسی نے آپ کو فون نہیں کیا۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔'' نرس کے جواب نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ یک دم ہی اسے احساس ہوا کہ اسے نہایت خوب صورتی سے بے وقوف بنایا گیا ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی ایک ایسا بہانہ تھا جس کی مدد سے اسے اس کی جگہ سے ہٹایا جا سکتا تھا اور یقیناً اسے وہاں سے ہٹانے کے بعد مجرم اپنا کام کر گئے تھے۔ اس صورتِ حال نے جہاں اس پر یہ منکشف کیا کہ نیاز علی جس ٹورسٹ کمپنی سے وابستہ تھا، وہ اس غیر قانونی کام میں ملوث ہے وہیں یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ لوگ اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ انہیں علم تھا کہ وہ ان کی نگرانی کر رہا ہے... چنانچہ انہوں نے عین موقع پر اسے وہاں سے ہٹانے کا انتظام کر دیا۔

☆☆☆

کشور کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرف طبیعت کی خرابی نے نڈھال کر رکھا تھا تو دوسری طرف راز کھل جانے کا خوف ہر آن گھیرے رکھتا۔ فریدہ کے بارے میں ہونے والے انکشاف نے اسے اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ اس کی کوکھ میں چودھری کے گناہ کا بیج پھوٹ پڑا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسے ہر آن یوں لگتا کہ حویلی پر کوئی عذاب نازل ہونے والا ہے۔ اتنے بڑے بڑے مظالم اور گناہوں کے نتیجے میں عذاب نازل بھی ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو حیران تھی کہ اللہ نے کیوں اب تک اپنی رسی دراز کر رکھی ہے؟ شاید اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی... لیکن بہر حال وہ اس جگہ پر مزید ٹھہر کر کسی عذاب کا انتظار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے وجود میں آفتاب کی محبت کی نشانی پل رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کم از کم اتنا ضرور ہے کہ اپنی محبت کا یہ تحفہ آفتاب کو پیش کر سکے۔ یہ تحفہ اسی صورت میں آفتاب کو دیا جا سکتا تھا کہ وہ حویلی سے نکل جاتی لیکن اس کے لیے حویلی سے نکلنے کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ رانی کی حویلی میں عدم موجودگی نے اس کے ہاتھ پیر کاٹ دیے تھے۔ رانی کی واپسی کے سلسلے میں اس نے ایک دو بار وڈی چودھرائن سے بات بھی کی تھی لیکن اس کا کہنا تھا کہ رانی کا لاہور والی کوٹھی میں رکنا ضروری ہے کیونکہ وہاں تاجور اکیلی صحیح طرح سے انتظامات سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

کشور کہنا چاہتی تھی کہ رانی کو واپس بلا کر کسی اور ملازمہ کو وہاں بھیج دیا جائے لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ وڈی چودھرائن سے بحث فضول ہے۔ وہ وہی کچھ کرتی تھی جو اس کا دل چاہتا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد آخر کشور کو آفتاب سے رابطے کی ایک صورت نظر آئی۔ آفتاب اس کی بڑی بہن تاجور کے بیٹے منور کو پڑھانے کے لیے جاتا تھا۔ اس کی دونوں بڑی سوتیلی بہنیں تاجور اور صنوبر اپنے ماموں کے گھر بیاہی ہوئی تھیں۔ وہ بہنوں اور ان کے بچوں سے ملنے کے بہانے وہاں جا سکتی تھی۔ اس امید پر کہ وہاں جانے پر آفتاب سے رابطے کی کوئی صورت نکل آئے، اس نے وڈی چودھرائن سے بہنوں کے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتی رہی پھر اس کے اصرار پر اس شرط پر راضی ہو گئی کہ دو دن بعد چلیں گے۔ ان دو دنوں میں اسے حویلی میں استعمال ہونے والے اناج کے اسٹورز کی اپنی نگرانی میں صفائی کروانی تھی۔ بے شمار مستعد ملازماؤں کی موجودگی کے باوجود وڈی چودھرائن ایسے ہر کام کی خود نگرانی کرنا پسند کرتی تھی۔ اسے شک رہتا تھا کہ اگر وہ ملازماؤں کے سر پر مسلط نہیں رہی تو وہ ہڈ حرامی کریں گی یا موقع کا فائدہ اٹھا کر کچھ چرا

کر لے جائیں گی۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کے یہ دو دن گزرے اور کشور نے وڈی چودھرائن کے ساتھ اس کے میکے جانے کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اس کی اپنی ماں چودھرائن ناہید البتہ ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ اسے وڈی چودھرائن نے اپنے پیچھے حویلی کی نگرانی کا کام سونپا تھا اور خود شاید کشور کی نگرانی کے لیے اس کے ساتھ گئی تھی۔

وہ دونوں وہاں پہنچیں تو ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ تاجور اور صنوبر ماں کی آؤ بھگت کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی کریدتی رہیں کہ اس کی ذہنی حالت کو جانچ سکیں۔ پچھلے دنوں تسلسل سے یہ سننے میں آ رہا تھا کہ کشور کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے دورے پڑنے لگے ہیں۔ تاجور تو اپنے تئیں لاہور میں اس کے قیام کے عرصے میں اس کی دیوانگی کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی آئی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب کشور نکاح کے بعد پہلی بار آفتاب سے ملنے گئی تھی اور اس نے اس ملاقات کے اہتمام کے لیے پور پور خود کو سجایا تھا۔ اس وقت رانی نے مصلحتاً یہ جھوٹ بول دیا کہ بی بی کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہ دیوانگی کی حالت میں خود کو اس طرح سجانے سنوارنے بیٹھ جاتی ہیں۔ تاجور نے واپس گاؤں آ کر ماں کو ساری رپورٹ دی۔ ساتھ ہی صنوبر کو بھی سب کچھ بتایا۔ چنانچہ اب جبکہ وہ بہنوں سے ملنے ان کے گھر گئی تو دونوں بہانے بہانے سے اس کی ذہنی حالت جانچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کشور نا سمجھ نہیں تھی لیکن سب کچھ سمجھنے کے باوجود انجان بن گئی اور بہنوں کی باتیں نظر انداز کر کے ان کے بچوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے میں لگی رہی۔ سوتیلے رشتے کے باوجود اسے ان بچوں سے بہت محبت تھی اور اب تو جبکہ وہ خود ماں بننے جا رہی تھی، اسے یہ بچے اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ بچوں کے ساتھ معروف وقت کس طرح گزرا اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ البتہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس کے اعصاب تن گئے۔ اسے معلوم تھا کہ آفتاب دوپہر کے بعد ہی منور کو پڑھانے آتا ہے اور اسے اسی موقع سے کسی طرح فائدہ اٹھانا تھا۔ کھانے کے بعد کا وقت اس کے لیے بڑا کٹھن اور صبر آزما تھا۔ آخر خدا خدا کر کے یہ وقت بھی گزرا اور ایک ملازمہ نے اطلاع دی کہ منور شاہ کے ماسٹر صاحب پڑھانے کے لیے آ گئے ہیں۔ کشور اس وقت غیر محسوس طور پر منور کے ساتھ ہی مصروف تھی اور اس کے بیگ سے کتابیں، کاپیاں نکال کر بظاہر اس سے پڑھائی کے بارے میں ہی پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اس نے ماسٹر کی آمد کی اطلاع سنی تو اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ منور کی کتابیں کاپیاں سمیٹ کر بیگ میں رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے۔

''منور کو پڑھانے کے بعد مجھ سے حویلی کے باغ میں ملیں۔'' اس نے منور کی اردو کی کاپی کے اس صفحے پر جہاں آفتاب نے اسے ہوم ورک دیا تھا، یہ مختصر سا پیغام موقع ملتے ہی چپکے سے لکھ دیا تھا اور بیگ میں وہ کاپی سب سے اوپر رکھ دی تھی۔ پھر بھی اس کا دل ڈر رہا تھا کہ جانے آفتاب یہ پیغام دیکھے گا بھی یا نہیں۔ وہ کسی وجہ سے نہ دیکھ پاتا تو اس کا یہاں آنا بے کار چلا جاتا پھر دوبارہ ایسا موقع نکالنا بھی مشکل تھا۔ منور اپنی ملازمہ کے ساتھ پڑھنے کے لیے چلا گیا... وہ تب بھی بہت دیر تک تذبذب کے عالم میں بیٹھی رہی۔

''کیا گل ہے کشور! اوڈی چپ چپ سی ہے؟'' اس کی خاموشی کو دیکھ کر صنوبر نے اس سے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں آپا! بس طبیعت کچھ سست ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر سوؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' اس نے بہانہ بنایا۔ اس بہانے کی اسے ضرورت بھی تھی تاکہ کسی طرح ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو سکے۔

''تو جا، جا کر تھوڑی دیر سو لے۔'' اس کی حسبِ خواہش صنوبر نے مشورہ دیا جس پر اس نے فوراً عمل کیا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

''میں بچوں کے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی ہوں۔ وہاں آپ نے بڑی اچھی سیٹنگ کروائی ہوئی ہے۔ مجھے وہاں بڑا سکون ملتا ہے۔''

''یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اختر نے خاص طور پر شہر سے بندہ بلا کر وہ کمرا سیٹ کروایا تھا۔ تجھے وہاں چنگا لگتا ہے تو جا... وہیں جا کر سو جا۔ بچے کون سا وہاں رہتے ہیں؟ انہیں تو اماؤں کے کلیجے میں ہی گھسنے سے فرصت نہیں ملتی۔'' اس کی تعریف پر خوش ہوتے ہوئے صنوبر نے اپنے شوہر کا نام لیا اور وہ بات بتائی جو اس سے قبل بھی متعدد بار بتا چکی تھی اور ساتھ ہی فراخ دلی سے اجازت بھی دے دی۔

''ابھی بچے چھوٹے ہیں نا آپا... اس لیے انہیں آپ کے پاس رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بڑے ہوں گے تو خود اپنے کمرے کی طرف بھاگیں گے۔'' کشور نے اسے تسلی دی اور خود بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کمرے کا انتخاب اس نے خود جان بوجھ کر کیا تھا کیونکہ ایک تو واقعی یہ کسی کے زیرِ استعمال نہیں رہتا تھا، دوسرے اس کمرے میں سلائڈنگ ونڈوز لگی تھیں جن کے باہر کسی قسم کی سلاخیں یا جالیاں وغیرہ نہیں تھیں اور وہ وہاں سے اتر کر باغ میں جا سکتی تھی۔ کمرے

www.pkdigest.com

میں پہنچ کر اس نے اندر سے لاک لگا لیا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق اب آفتاب کے وہاں سے رخصت ہونے میں دس منٹ ہی رہ گئے تھے۔ وہ ذرا سی کوشش کرتا تو گیٹ کی طرف جاتے ہوئے بائیں طرف مڑ کر باغ میں جا سکتا تھا۔ کشور کو یقین تھا کہ اس کا پیغام پڑھ لینے کی صورت میں وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ ٹھیک دس منٹ بعد اس نے حسب پروگرام کمرا چھوڑ دیا اور نہایت احتیاط کے ساتھ کھڑکی پھلانگ کر باغ کی طرف بڑھ گئی۔ وہ جس حالت میں تھی اس میں اس طرح کی حرکت نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی لیکن بڑے خطرے میں پھنسنے سے پہلے اس نے یہ قدرے چھوٹا خطرہ مول لینا مناسب سمجھا تھا۔ خیر گزری کہ وہ آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئی اور باغ کے اس حصے میں پہنچ گئی جہاں امرودوں کے درخت تھے۔ دو منٹ بعد ہی اسے آہٹ سنائی دی۔ وہ آہٹ پر متوجہ ہوئی تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آنے والا آفتاب ہی تھا۔

"کہاں کھو گئی ہیں آپ؟ میں اس عرصے میں کتنا پریشان رہا ہوں آپ کو لفظوں میں بتا نہیں سکتا۔" اس کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بے تابی سے بولا تو کشور کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ یہ محبت ہی تو تھی جو اسے ہر خطرے سے بے خوف کر دیتی تھی لیکن فی الحال یہ جذباتی ہونے یا اپنی کیفیات کے اظہار کا وقت نہیں تھا۔ اسے اس مختصر سی مہلت میں آفتاب کو سارے حالات سے باخبر کرنا تھا چنانچہ خود کو مضبوط کرتے ہوئے بولی۔

"پچھلے دنوں مجھ پر کیا گزری اور میرا آپ سے رابطہ کس طرح ٹوٹا، یہ ساری تفصیلات میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال میں نے آپ کو ایک بہت ضروری بات بتانے کے لیے بلایا ہے۔"

"کیا ہوا ہے کشور! خیریت تو ہے؟" آفتاب اس کی سنجیدگی دیکھ کر پریشان ہوا۔

"پتا نہیں اسے کیا کہیں گے۔ میں جو خبر آپ کو سنانے جا رہی ہوں، عام حالات میں تو وہ کسی شادی شدہ جوڑے کے لیے بہت بڑی خوش خبری ہوتی ہے لیکن ہمارے حالات ایسے ہیں کہ ہم کھل کر اس خوشی پر خوش بھی نہیں ہو سکتے۔"

"کیسی خوش خبری؟" اس کی بات سن کر آفتاب چونکا۔

"میرے وجود میں آپ کی محبت کی نشانی سانس لینے لگی ہے آفتاب۔" کشور نے جھجکتے ہوئے اسے بتایا۔

"واقعی؟" اس نے ردعمل میں بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں، یہ سچ ہے۔ میں تصدیق کروا چکی ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب میں مزید حویلی میں نہیں رک سکتی۔ کسی پر اگر میرا یہ راز کھل گیا تو حویلی میں قیامت آ جائے گی۔" اس کی خوشی کو دیکھتے ہوئے کشور کا دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحے میں اس طرح کی گفتگو کرے لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسے ابھی یہ ساری باتیں کرنی تھیں۔ آفتاب نے اس کی بات سنی تو سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا آپ کسی بہانے کچھ دیر کے لیے حویلی سے باہر کہیں جا سکتی ہیں؟ کچھ نہیں تو درگاہ تک ہی سہی۔"

"ہاں، یہ تو ممکن ہے۔ میں جمعرات کے دن درگاہ پر حاضری کے بہانے کسی ملازمہ کے ساتھ وہاں پہنچ سکتی ہوں۔" اس کا مطلب پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی کشور نے جوش سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"بس تو پھر آپ اب آنے والی جمعرات کو عصر مغرب کے درمیان وہاں پہنچ جایئے گا۔" وہ دھیمی آواز میں اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اچانک سامنے آ جانے والی اس صورتِ حال پر اس نے گھبرانے یا سٹپٹانے کے بجائے پوری بیدار مغزی کا ثبوت دیا تھا اور بہت تیزی سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا تھا۔ کشور پوری توجہ سے اس کے منصوبے کی ساری جزئیات سن کر ذہن نشین کرنے لگی۔ اب اس منصوبے کی کامیابی پر ہی اس کی اور اس کے آنے والے بچے کی زندگی کا دارومدار تھا۔

"ٹھیک ہے نا... آپ میری ساری بات اچھی طرح سمجھ تو گئی ہیں نا؟" اسے سب کچھ سمجھانے کے بعد آفتاب نے اس سے سوال کیا جس کے جواب میں کشور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بس تو پھر اب میں چلتا ہوں۔ میرا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا اور آپ کا منظر سے غائب رہنا کوئی مشکل بھی کھڑی کر سکتا ہے۔" آفتاب نے اس سے کہا اور جاتے جاتے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اپنے ہونٹوں کے نزدیک لے گیا۔ بس یہی وقت کا وہ مختصر لمحہ تھا جو وہ دونوں اپنے اردگرد سے بے خبر ہو گئے اور انہیں اپنے اس گوشۂ تنہائی میں کسی کے آنے کی آہٹ سنائی نہیں دے سکی۔

"خبردار!" ایک نہایت رعب دار آواز قریب سے ابھری تو وہ دونوں بری طرح بدک کر مدہوشی کی کیفیت سے نکلتے ہوئے اس سمت متوجہ ہو گئے جہاں سے آواز آئی تھی۔

حادثات و سانحات کی شکار... پناہ کی تلاش میں سرگرداں ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

امراریت، رومانویت اور حسن و جمال کی داستان جس میں جرم کے کئی پہلو پوشیدہ تھے

ستمگر

سید احتشام

عورت، مصورِ کائنات کی ایک دلکش تصویر ہے..... اور کبھی کبھی یہ تصویر خود کسی تصویر ساز کی اسیر ہو جاتی ہے..... ایک پیکرِ جمال کا قصہ جو ایک مصور کی اسیر ہو چلی تھی اور اپنی زندگی میں محبت کے رنگوں کے ذریعے ایک نئی تبدیلی کی خواہاں تھی۔

نیویارک میں شام اتر آئی تھی۔ مطلع ابر آلود اور موسم بھیگا بھیگا تھا۔ یو این او میں اپنے دفتر سے نکل کر جہاں وہ امریکی سفیر کی پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتی تھی، اپنے محبوب کے ساتھ کچھ وقت گزار کر وہاں سے نکلی اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے اپارٹمنٹ کی سمت روانہ ہو گئی۔ اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا شوہر اسٹیو اسے دیکھ نہ لے۔ کہیں وہ دفتر سے لوٹ نہ آیا ہو۔ وہ کم عمر اور خوش جمال تھی، خوش اندام بھی تھی۔ اس نے اپارٹمنٹ پہنچ کر قفل کھولا اور اندر داخل ہو کر ڈریسر پر اپنا پرس اور چابیوں کا گچھا رکھا اور وسیع و عریض لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کا شوہر اسٹیو، لاؤنج کے دوسرے سرے سے مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

"تو تم آ گئیں... اور سناؤ، تمہارا دن کیسا گزرا؟" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "دنیا کو بچانے میں کوئی پیش رفت ہوئی؟" وہ ایک بوتل سے ڈرنک انڈیلنے لگا تھا۔

"میں اس پر کام کر رہی ہوں۔" ایملی نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ آج رات کے بارے میں تم اپنا ارادہ بدل چکے ہو۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"بالکل نہیں۔" اسٹیو نے جواب دیا۔ "تمہیں بتا چکا

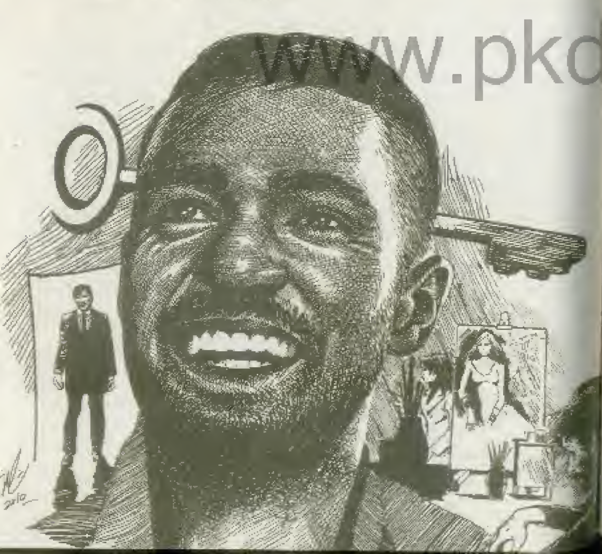

www.pkdigest.com

ہوں کہ میں وہ تقریب مس نہیں کرنا چاہتا۔"

"لندن والوں کے ساتھ تمہارے پروگرام کا کیا ہوا؟ تم تو یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ بالکل لازمی ہو۔" ایملی بولی۔

"ایسا ہی تھا۔ خوش قسمتی سے ان کا ہوائی جہاز مس ہو گیا ہے۔" اسٹیو نے جواب دیا اور دوسرے گلاس میں مشروب انڈیل کر ایملی کو پیش کیا۔ "یہ ہے، چرائے ہوئے لمحوں کے نام۔" اس نے اپنا گلاس بلند کر کے ایملی کے گلاس سے ہلکے سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز چمک عود کر آئی تھی جس میں سفاکی گھلی ہوئی تھی۔

"تم بڑے حسین لگ رہے ہو۔" ایملی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرائی۔ "میں بھی ذرا لباس تبدیل کر کے دیکھوں کہ تمہاری ٹکر کی لگتی ہوں یا نہیں۔" وہ یہ کہہ کر بیڈ روم میں غائب ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد اسٹیو، دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ ایملی رازدارانہ کسی سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اسٹیو کو دیکھ کر جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا گھر پر کوئی نہیں ہے؟" اسٹیو نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"میں سیکیورٹی کونسل کے کچھ مسودے کھلے چھوڑ آئی تھی لیکن سب جا چکے ہیں۔" ایملی نے جواب دیا اور الماری سے لباس نکالنے لگی۔

"کیا دنیا کو ہلا دینے والی چیز ہے؟" اسٹیو نے پوچھا۔

"نہیں۔" ایملی اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے ہنس پڑی۔ "لیکن اتنی اہم ضرور ہے کہ انہیں کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔"

"تم بڑی پیاری لگ رہی ہو۔" اسٹیو نے قریب آکر اس کی عریاں باہوں کو سہلاتے ہوئے، چاہت آمیز لہجے میں سرگوشی کی۔

"ہاں لیکن ہمیں ذرا جلدی کرنی ہوگی۔" وہ بولی اور لباس پہننے لگی۔

☆☆☆

ان کی چمچماتی ہوئی بیش قیمت کار ایک نہایت پُرشکوہ فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے رکی۔ دونوں اترے اور اس کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہوٹل کے وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ رنگ و نور کا طوفان تھا۔ معززین شہر ٹولیاں بنائے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ وہ دونوں، مہمانوں کے درمیان سے سب کو ہیلو ہائے کہتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

"ہاہا آخر خوب صورت لوگ آہی گئے۔" ایک جوڑے نے ان کا پُرتپاک استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"تم تو اس لباس میں غضب ڈھا رہی ہو۔" خاتون نے ایملی کے لباس پر تبصرہ کیا۔

"شکریہ!" ایملی شرما کر بولی۔

"مجھے آج رات تمہارے آنے کی توقع نہیں تھی۔" اسٹیو کے دوست نے کہا۔

"تم ایسا کیوں سمجھتے ہو؟" اسٹیو نے مسکرا کر پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ تم مسائل میں پوری طرح پھنسے ہوئے ہوگے۔" دوست نے جواب دیا۔

ایملی، مردوں کے اس گروپ سے ہٹ کر خواتین کے گروپ میں پہنچ گئی۔ "مجھے ان کا فون نمبر چاہیے۔" ایک مہمان خاتون نے اسٹیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایملی سے درخواست کی۔

"بالکل۔" ایملی نے جواب دیا۔ "اچھا، مجھے ذرا ایک کام ہے۔ میں پھر آتی ہوں۔" وہ ان خواتین کے پاس سے ہٹ کر، خواتین کے دوسرے گروپ کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کا محبوب ڈیوڈ شا ان کے درمیان گھرا ہوا تھا۔

"شاید میں نے اس مصور کا کام نہیں دیکھا ہے۔" ایک خاتون نے ڈیوڈ شا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایملی کو مخاطب کیا۔ پھر وہ ڈیوڈ سے مخاطب ہوئی۔ "میں کسی روز تمہارے اسٹوڈیو آکر دیکھوں گی۔"

"ہاں، بالکل۔" ڈیوڈ نے اپنی محبوبہ ایملی پر ایک بھرپور نگاہ ڈال کر جواب دیا۔

ایملی چپکے سے وہاں سے کھسک گئی اور ڈیوڈ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر گئی۔ وہ ہوٹل کے ایک ویران حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈیوڈ بھی چپکے سے کھسک کر اس کی طرف چل پڑا۔ ایملی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ "تمہارے شوہر نے تو کہا تھا کہ وہ نہیں آرہا۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایملی سے سرگوشی میں کہا۔ "پھر اس نے ارادہ کیسے بدل دیا؟"

خود ایملی بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے ایک دو مرتبہ پلٹ کر دیکھا پھر گویا ہوئی۔ "میں نے تمہیں کال کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بولی۔ اس کی کیفیت میں خوف اور اضطراب تھا۔ "اب ہم کیا کریں؟"

"کچھ نہیں۔ بس پُرسکون رہو۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔ "وہ یہ تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں؟"

"نہیں۔" ایملی اپنی گھبراہٹ کے باوجود ہنس پڑی۔

"تم بہت اچھی ہو۔" ڈیوڈ اس کے دہکتے رخسار پر جھک گیا۔ ایملی کے رخسار اس کی سانسوں کی حدت سے دہک اٹھے اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ محبوب کی قربت نے اسے مدہوش کر دیا تھا۔ "کل میرے ساتھ لنچ کرو گی؟" ڈیوڈ نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہاں، کل... اور اس کے بعد روزانہ...!" ایملی نے ہنس کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈیوڈ بھی ہنس پڑا۔

اچانک اسٹیو ان کے عقب میں نمودار ہوا۔ اس کی آہٹ پا کر دونوں اپنی اپنی جگہ سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ اسٹیو، ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ "میں نے تمہیں ایک سیکنڈ کے لیے تنہا چھوڑا اور تم اس نوجوان کے ساتھ جا چھپیں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

دونوں چونک کر پلٹے۔ "اسٹیو! ام... میں تمہیں ڈیوڈ شا سے ملوانا چاہتی تھی۔" ایملی خوف سے ہکلا کر بولی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"بڑی خوشی ہوئی۔" اسٹیو نے نہایت گرم جوشی سے نوجوان ڈیوڈ سے مصافحہ کیا۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" نوجوان مصور نروس نظر آرہا تھا۔

"ڈیوڈ مصور ہے۔" ایملی تھوک نگل کر بولی۔ "ہم... میں نے اس کی کچھ تصویریں شہر میں د... وہ... دیکھی ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ کک... کافی زبردست ہے۔" وہ متوحش لگ رہی تھی۔

"ہوں... زبردست ہے۔" اسٹیو کا لہجہ معنی خیز تھا۔ "تو ہماری اس چھوٹی سی دنیا میں کیسے آنا ہوا؟" اس کے ہونٹوں پر تبسم اور نیلی آنکھوں میں پتھر جیسی سختی تھی، لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ وہ براہِ راست مصور کی بھوری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"دراصل ایملی نے کچھ جوڑ توڑ کر کے مجھے مدعو کرا لیا۔" ڈیوڈ پھیکی ہنسی ہنسا۔

"مجھے بھی۔" اسٹیو نے ہنسی میں اس کا ساتھ دیا۔ ایملی بھی ہنس پڑی۔ "تم مجھے اپنے کام کے بارے میں بتاؤ گے ڈیوڈ؟" اسٹیو نے پوچھا۔

"چند چھوٹی گیلریوں میں جب جگہ ہوتی ہے تو وہ میری تصویر رکھ لیتے ہیں۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

"اور تم باقاعدہ مصوری کی تعلیم لے چکے ہو... یہ کلے آرٹس ہے؟"

"باقاعدہ ہی سمجھیں۔" ڈیوڈ بولا۔ "تقریباً گریجویشن کر چکا ہوں۔"

"زیادہ تعلیم حاصل کرنے سے روح ویسے ہی آلودہ ہو جاتی ہے۔" اسٹیو نے چوٹ کی اور اپنی نوخیز اور پُرشباب بیوی کی طرف مڑا۔ "اور یہ کافی اچھا ہے۔ کیوں؟ زبردست ہے، لاجواب ہے۔" اس نے دوسری گہری چوٹ کی۔

ایملی کے چہرے کا کنول مرجھا گیا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگی۔ اسٹیو دوبارہ ڈیوڈ سے مخاطب ہوا۔ "ڈیوڈ! میں تمہاری تصویریں دیکھنا چاہوں گا۔ چنانچہ اس کے لیے کوئی بندوبست کر لیں گے۔"

"ضرور... جب آپ کی مرضی ہو۔" ڈیوڈ اپنی اندرونی کیفیت کو مسکراہٹ میں چھپا کر بولا۔

"ایملی کے پاس تمہارا نمبر تو ہے نا؟" اسٹیو نے نہایت چالاکی سے پوچھا۔

ایملی نے اشارے سے ڈیوڈ کو منع کر دیا۔ "نہیں۔"

"کیا تمہیں بے وقوف عورتیں پسند ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"کیا تمہیں سگریٹ نوش خواتین پسند ہیں؟"

"بالکل نہیں۔"

"اور ان کے بارے میں کیا خیال ہے جو کھانا تک نہیں پکا سکتیں؟"

"یار تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟"

"تو پھر تم میری بیوی میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"

☆☆☆

لمبے سفر سے واپسی پر ایک آدمی کتا خانے سے اپنا کتا لینے کے لیے رکا۔

گھر پہنچنے پر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "میرے خیال میں جارج نے سفر کافی انجوائے کیا ہے۔ یہ راستے بھر اس طرح بھونکتا رہا جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔"

اس کی بیوی نے کہا۔ "وہ تم سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم غلط کتا گھر لے آئے ہو۔"

(ج۔ احمد۔ پشاور)

www.pkdigest.com

ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ''گیلری مجھ سے رابطہ کرسکتی ہے۔'' وہ ایملی کی طرف دیکھنے لگا۔ ''تم تو جانتی ہو نا، کون سی گیلری ہے؟''

''ہاں۔'' ایملی مری ہوئی آواز میں بولی۔

''اور اگر تم اتنے ہی اچھے ہو جتنا یہ بتا رہی ہے۔'' اسٹیو کے لہجے میں طنز تھا۔ ''تو میں اپنے باذوق دوستوں سے تمہاری سفارش بھی کرسکتا ہوں۔''

''شکریہ... آپ کی بڑی نوازش۔'' ڈیوڈ تشکر آمیز تبسم کے ساتھ بولا۔

''آؤ، اب چلیں۔'' امیر و کبیر، وجیہہ اور اسمارٹ اسٹیو نے اپنی نوخیز اور خوش جمال بیوی کی بانہہ پکڑی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

ڈیوڈ انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

''یہ عمارت اب سو سال سے زیادہ پرانی ہو چکی ہو گی۔'' ڈیوڈ لفٹ میں اسٹیو کے ساتھ اوپری منزل کی طرف جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

عمارت کی طرح لفٹ بھی قدیم طرز کی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد لفٹ رک گئی اور دونوں باہر آگئے۔ ''احتیاط سے قدم رکھنا۔'' ڈیوڈ بولا۔

دونوں ایک وسیع و عریض گودام جیسے ہال میں داخل ہوئے۔ یہ غیر قانونی رہائش تھی۔ ''تو یہ ہے تمہاری رہائش اور اسٹوڈیو۔'' اسٹیو جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ وہ رہائش گاہ کم اور کباڑ خانہ زیادہ لگ رہی تھی۔ ہر طرف تصویریں، برش اور پینٹ فرش پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ بے ترتیبی اور ابتری اس جگہ کو اور بھی ہولناک اور ناپسندیدہ بنا رہی تھی۔

''اتنا تو میں بھی دیکھ سکتا ہوں کہ ایملی نے کس بات میں کشش محسوس کی ہو گی۔'' اسٹیو جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ''ہاں، وہ کیا ہے؟ تمہارا کام... یہ ایک عام سطح کا کام ہے... لیکن جاندار ضرور ہے۔''

''عام سطح کا؟''

اسٹیو کوئی جواب دیے بغیر ایک پینٹنگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ''تمہارا غصہ بڑے قابو میں ہے۔'' اس نے تبصرہ کیا۔

''تمہارے خیال میں، میرے اندر غصہ ہے؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''تمہاری تصویروں میں غصہ ہے... غم انگیز رنگ میں... پتا نہیں یہ چیز کدھر سے آئی ہو گی۔''

''ہو سکتا ہے، میرے اندر ہی ہو۔ ہاں، اندر ہی ہو گا... بالکل۔''

''سوائے بستر کے، بیٹھنے کی اور کوئی جگہ نہیں ہے۔'' اسٹیو بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

ڈیوڈ ایک اسٹول گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''پتا ہے، میں تم پر رشک کرتا ہوں۔'' اسٹیو بولا۔

''مجھ پر رشک؟'' ڈیوڈ نے حیرت سے دہرایا۔

''میں رشک نہیں کیا کرتا۔ یہ ایک بے کار جذبہ ہے۔ یہ سرطان کی طرح چھپ کر حملہ آور ہو جاتا ہے لیکن اب میرے اندر بیدار ہو گیا ہے اور تم جانتے ہی ہو کہ کیوں؟'' اسٹیو اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''نہیں۔'' ڈیوڈ کے منہ سے نکلا۔

''یقیناً تم جانتے ہو گے۔ زندگی کا سب سے بڑا اچھا ہوا تجربہ... اور یہ بے حد مکمل بھی ہے۔''

''کیا؟''

''میری بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منانا۔'' اس نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''مسٹر اسٹیو! نہ جانے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' ڈیوڈ بھونچکا رہ گیا اور پھر اپنی خفت چھپانے کے لیے ہنس پڑا۔ ''ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، مسٹر۔ صرف اتنی سی بات ہے۔''

''کیا صرف اتنی سی بات ہے؟ تم کسی کی زندگی کی سب سے قیمتی شے چرا لو...!'' اسٹیو اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اور یہ عام سا، گھسا پٹا جملہ بول دو۔'' وہ غصے سے مٹھی بھینچتا ہوا بولا اور پھر یکبارگی چیخا۔ ''اگر یہ سچ بھی ہے، تب بھی یہ کافی نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا سچ ہے؟''

''کہ وہ تم سے محبت کرنے لگی ہے... دوست! تم کاروبار کر رہے ہو۔'' وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر دہاڑا۔

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ڈیوڈ حیرانی سے بولا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم اتفاقیہ میری بیوی سے نہیں ملے۔'' اسٹیو غصے سے اس کے سامنے ٹہلتے ہوئے چیخا۔ ''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم برکلے میں نہیں پڑھتے رہے۔ میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ تم نے ایک بیوہ سے مالی دھوکے بازی کرنے کے الزام میں سولیڈیڈ اسٹیٹ جیل میں تین سے چھ سال کی قید کاٹنے کے دوران مصوری سیکھی تھی۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو یہ تمہیں دوسری مرتبہ سزا ہوئی تھی۔ تمہارا اصلی نام ونسٹن لیگر ٹنگ ہے۔'' وہ بدستور عالم اشتعال میں اس کے سامنے ٹہلتے ہوئے چیخ رہا تھا اور ڈیوڈ کو جیسے سانپ سونگھ گیا

تھا۔ ''تم کیلی فورنیا میں، ٹریلر میں رہنے والے گھٹیا، جاہلوں کی اولاد ہو۔'' اسٹیو اس کی جانب مڑ کر چیخا۔ ''دس سال کی عمر سے تمہیں عدالت کی نگہداشت میں لے لیا گیا تھا۔ جیبیں کاٹنے اور کاریں چرانے سے لے کر تم نوسربازوں کے گرگے رہ چکے ہو... لیکن پھر تمہیں اندازہ ہوا کہ تم عورتوں کو خوب چکر دے سکتے ہو۔ ظاہر ہے، تمہیں اس ماں کی تلاش رہی ہو گی جس سے تم کبھی مل نہیں پائے۔ زندگی اب تک ہیرا پھیریوں کے سہارے گزر رہی ہے۔''

''یہ سب معلومات تم نے کہاں سے اکٹھا کی ہیں؟'' ڈیوڈ نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کی رنگت سفید ہو رہی تھی۔

''پیسا خرچ کرنے سے سب مل جاتا ہے۔'' اسٹیو نے جواب دیا۔ ''اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ تم کوئی اچھے مصور بھی نہیں ہو۔''

''یہ میری بحالی کے پروگرام کا ایک حصہ تھا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''اسے نوسربازی کہا جا سکتا ہے اور اس کا انعام میری بیوی تھی۔'' اسٹیو گہرے طنز سے بولا۔ ''لیکن اس بار تم ذرا خود تمہارے کے چکر میں ہو۔''

''وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

''وہ تمہاری دریافت ڈیوڈ شا سے محبت کرتی ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تم بنیادی طور پر ایک غلط اندازہ لگائے بیٹھے ہو۔ ذرا اس کا انجام سوچ کر دیکھو۔ محبت ہر چیز پر حاوی آجاتی ہے۔ ایملی مجھ سے طلاق لے سکتی ہے اور تم سے شادی کر سکتی ہے۔ تمہاری مرضی کے پیش نظر اس کے قانونی مشیر دولت میں تمہارا حصہ تسلیم نہیں کر سکتے۔ چنانچہ تم اس کی محبت تو جیت سکتے ہو لیکن تمہیں خزانے کی چابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کبھی بھی نہیں۔''

ڈیوڈ شا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔'' وہ ہاتھ لہرا کر بولا۔

''ایک معمولی نوسرباز کو ایسے ٹرسٹ فنڈ کی کوئی پروا نہیں جس سے تمہارا پورا آبائی گاؤں، بار، اسٹور خریدا جا سکتا ہے۔'' اسٹیو برہمی سے بولا۔ ''تمہیں بالکل اس کی پروا ہے ورنہ ہم اس وقت یہ گفتگو نہ کر رہے ہوتے۔ تم صرف گھٹیا پن اور لالچ کی وجہ سے ہی اس منصوبے کو نہیں چھوڑ رہے ہو۔''

''تو اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''تمہیں امکانات بتا سکتا ہوں۔'' اسٹیو بولا۔ ''میں ایملی کو بتا سکتا ہوں کہ تم بالکل جعلی شخص ہو۔ تم بھوکے مرنے

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس
(فون نمبر 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

www.pkdigest.com

والے مصور بن جاؤ گے اور کھیل ختم ہو جائے گا۔"
"یا؟"
"یا تم رقم لے کر الگ ہو سکتے ہو۔"
"رقم لے کر؟"
"پانچ لاکھ ڈالرز... بلا ٹیکس۔" اسٹیو ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔
ڈیوڈ اسے حیرت سے گھورتا چلا گیا۔ "صرف اسے چھوڑ جانے کے عوض؟" اس نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔
"میں نے ٹیکس فری کہا ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ کچھ کیے بغیر۔" اسٹیو کا لہجہ نرم، پُراسرار اور معنی خیز تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ابھر آنے والی مسکراہٹ کے پیچھے گویا کوئی طوفان پوشیدہ تھا۔
ڈیوڈ شا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "تو... پانچ لاکھ ڈالرز کس لیے ہوں گے؟" اس نے گردن ایک طرف ڈھلکا کر پوچھا۔
"میری بیوی کو قتل کرنے کے لیے۔" اسٹیو نے رسان سے کہا۔
ڈیوڈ اسے ایک ٹک گھورتا چلا گیا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "ایملی کو؟" اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔
"ایک لاکھ ڈالرز ابھی... اور چار لاکھ ڈالرز بعد میں... بالکل نقد!"
"تمہارا دماغ چل گیا ہے؟"
"بالکل نہیں۔"
"کیوں؟"
"میں تمہارے تجسس کو تسلیم کرتا ہوں لیکن میرے منصوبوں سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔"
"میرا خیال ہے، مجھے سیدھے ایملی کے پاس جا کر یہ سب بتا دینا چاہیے۔"
"تو پھر تم مجھ پر صرف الزام ہی لگا رہے ہو گے ڈسٹن۔"
"اور اگر میں پولیس کو اطلاع دے دوں پھر؟"
"کیا تم کبھی بوکا رٹن، فلوریڈا گئے ہو؟" اسٹیو نے اطمینان سے پوچھا۔ "وہاں ایک خاتون ہوا کرتی تھیں جس کے ایک نوجوان سے تعلقات تھے۔ وہ ٹینس کا بڑا زبردست کھلاڑی ہوا کرتا تھا۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ "بہرحال، وہ تعلقات ختم ہو گئے اور وہ نوجوان غائب ہو گیا۔ ساتھ میں وہ اس خاتون کے بونڈز بھی اڑا لے گیا۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم وہاں جا چکے ہو؟" اسٹیو اپنا اوورکوٹ پہنتے ہوئے بولا۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا۔"
"میرے ایک شناسا کے پاس اس کی ایک تصویر ہے۔" اسٹیو نے اپنے دستانے پہن کر کہا۔ "انہیں صرف اس کا نام چاہیے... تیسرے جرم کے لیے۔" اس نے اپنا دستانے والا ہاتھ بلند کیا۔ "پندرہ سال کی سزا اور پیرول کوئی نہیں۔" وہ تمسخر سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ "کیا تمہارے پاس اتنا بڑا بکس ہو گا جس میں ایک لاکھ ڈالرز سما سکیں؟ کل تم بارہ بجے ہمارے اپارٹمنٹ آ سکتے ہو، اگر پہلے سے کسی لنچ پر نہ جانا ہو تو... شاید تم جانتے ہو کہ... میں کہاں رہتا ہوں۔" وہ صدر دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔
چوبی فرش پر اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک ڈیوڈ کو اپنے سر پر ہتھوڑے برساتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دم بخود اسے جاتے ہوئے دیکھ... رہا تھا۔ اسٹیو نے نیچے آ کر سڑک عبور کی اور اپنے اوورکوٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکالا جس میں ایملی اور ڈیوڈ کی قابلِ اعتراض حالت میں کھینچی گئی چند تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے وہ تصویریں ایک لفافے میں رکھیں جس پر اس کے اپنے گھر کا پتا تحریر تھا اور لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دیا۔

☆☆☆

"[illegible] گزر گیا ہے [illegible] ایملی [illegible] مجھے ابھی [illegible] نہیں بتایا ہے۔" ایملی [illegible] ریکوئیل [illegible] میں بیٹھے تھے...... "یہ پاگل پنا ہے... میں سمجھ نہیں پائی، کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟ کیا تم اسٹیو کو چھوڑ رہی ہو؟ مجھے بتاؤ۔"
"اگر تم ایک منٹ کے لیے خاموش ہو تو تمہیں بتاؤں۔" ایملی ہنسی۔
"ٹھیک ہے۔" ریکوئیل ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی۔
"میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا تھا کیونکہ تم اسٹیو کو پسند کرتی ہو لیکن تمہیں کوئی اندازہ نہیں کہ اسٹیو کیسا ہے۔"
"میں اسٹیو کو جانتی ہوں۔"
"بالکل نہیں جانتیں۔" ایملی بولی۔ "تمہیں علم نہیں کہ ہر چیز اس کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے۔ اسے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتی ہوں۔"
"تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"
"پتا نہیں۔" ایملی نے شانے اچکائے۔ "میں کسی طریقے سے اسے بتا دینا چاہتی ہوں کہ وہ اسی کا مستحق ہے۔"
"تم کیسے سمجھتی ہو کہ وہ تمہارے اور اس کے تعلق سے

کے بارے میں نہیں جانتا ہو گا؟ کیونکہ یہ تو کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔ میرا مطلب ہے، وہ ضرور جانتا ہو گا کہ کوئی گڑبڑ ہے لیکن...؟" ریکوئیل نے کہا۔ "کیا ڈیوڈ کے نام کا کوئی آخری حصہ بھی ہے؟"
"شا... ڈیوڈ شا۔" ایملی بولی۔
"اور اسے تمہاری فیملی کے بارے میں علم ہے؟" ریکوئیل نے پوچھا۔
"ہم اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ ڈیوڈ کو میرے اور مصوری کے سوا کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس نے آج تک مجھ سے پیسے کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔"
"تو تم نے اسی لیے شادی کی انگوٹھی نہیں پہن رکھی ہے؟"
ایملی نے اپنی انگلی کی طرف دیکھا۔ "اوہ، خدایا۔" یکایک وہ گھبرا کر بولی۔ "میں اپنی انگوٹھی ڈیوڈ کے یہاں بھول آئی ہوں۔"

☆☆☆

وہ گھر پہنچی تو اسٹیو اس کے انتظار میں بیٹھا سگار کے کش لے رہا تھا۔ "آج دیر تک کام کرتی رہیں؟" اس نے اپنے پیچھے ایملی کی آہٹ پا کر گردن گھمائے بغیر پوچھا۔
"نہیں، میں ریکوئیل کے ساتھ [illegible] رہی تھی۔" ایملی نے جواب دیا۔
"ویسے، آج میری تمہارے دوست ڈیوڈ سے ملاقات ہوئی تھی۔" اسٹیو نے سگار کا ایک کش لے کر کہا اور ریوالونگ چیئر پر اس کی طرف گھوم گیا۔
"واقعی؟" ایملی کے لہجے میں حیرت تھی۔
"اس نے مجھے اپنی مستقل پناہ گاہ آنے کے اعزاز سے نوازا۔"
"تم مذاق کر رہے ہو۔" ایملی اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے بولی۔ "اور اس کی پناہ گاہ کہاں ہے؟ تم نے اس کا فون نمبر کہاں سے حاصل کیا؟"
اسٹیو نے اس پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور پھر اپنے گلاس سے مشروب کا ایک گھونٹ لیا۔ "میں نے ان چند معمولی گیلریوں کو فون کیا تھا جہاں تم اکثر جایا کرتی ہو اور تمہارا ذکر کر دیا تھا۔" اس نے ایملی پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔ "تمہارا خیال درست ہے۔ وہ واقعی بڑا ماہر ہے۔"
"کیا تم نے اس کی کوئی تصویر خریدی؟" ایملی نے مسکرا کر پوچھا۔
اسٹیو سگار کے کش لیتا ہوا بدستور ایملی کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ "میں نے اسے ایک پیش کش کی ہے۔"
وہ مسکرایا۔
"اور؟" ایملی نے پوچھا۔
اسٹیو نے اپنی ریوالونگ چیئر واپس کھڑکی کی طرف گھمائی اور سگار کا ایک گہرا کش لیا۔ "وہ ابھی اس پر غور کر رہا ہے۔"

☆☆☆

اگلی صبح ایملی بہت خوش گوار موڈ میں اپنے دفتر پہنچی اور میز پر بیٹھتے ہی ڈیوڈ کو کال کی۔ "ہیلو، میں بول رہی ہوں۔"
"ہاں، کیا حال ہے؟" دوسری طرف سے ڈیوڈ کی آواز سنائی دی۔
"میں اپنی شادی کی انگوٹھی تمہارے یہاں بھول آئی ہوں۔"
"جانتا ہوں۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں نے اسے چھپا دیا تھا۔"
"خدا کا شکر ہے۔" ایملی نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور ہنس پڑی۔ "تم لوگوں میں کیا باتیں ہوئیں؟"
"وہ یہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔" ڈیوڈ کا جواب سنائی دیا۔ "بس میری مصوری پر باتیں ہوتی رہیں۔ اسے کوئی اندازہ نہیں ہے۔"
"اس نے کہا ہے کہ تمہیں کوئی پیش کش کی ہے؟" ایملی بولی۔
"ہاں، اس نے کی ہے۔"
"کون سی تصویر؟"
"وہ تم نے نہیں دیکھی ہو گی۔"
"میرا خیال تھا کہ میں نے سب دیکھ رکھی ہیں۔"
"ہاں، تقریباً۔" ڈیوڈ کی آواز سنائی دی۔ "سنو، لگتا ہے آج میں تمہارے ساتھ لنچ نہیں کر سکوں گا۔"
"کیوں، کیا بات ہے؟"
"کچھ نہیں... کچھ بھی نہیں... کچھ لوگ یہاں میری تصویریں دیکھنا چاہتے ہیں اور کمیشن بھی اچھا ہے۔"
"تم کچھ عجیب باتیں کر رہے ہو۔"
"کیا واقعی؟" ڈیوڈ نے کہا۔ "شاید بھوک کی وجہ سے۔"
"تو پھر کل ملاقات ہو گی؟"
"ہاں۔"
"خدا حافظ۔"

☆☆☆

ڈیوڈ وقت مقررہ پر اسٹیو کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ اسٹیو اسے وسیع اور خوش نما میرس پر لے گیا۔ "پچھلے سال اس

www.pkdigest.com

بلڈنگ میں ڈاکا پڑ چکا ہے۔" اسٹیو نے کہا اور ڈیوڈ کو ٹیرس کے کنارے لے گیا۔ "ڈاکو شاید اس ڈرائیو وے گیٹ سے اندر آئے تھے۔" وہ نیچے ڈرائیو وے گیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "گرینائٹ کی دیوار کی وجہ سے یہ مقام نگرانی کے کیمروں کے سامنے نہیں آتا... اسے خوب صورتی کی بنا پر ہٹایا بھی نہیں گیا۔"

"تم یہ کیسے جانتے ہو؟" ڈیوڈ نیچے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں اس کی انتظامیہ میں ہوں۔"

وہ مڑ کر واپس چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا... ڈیوڈ اس کے ہمراہ تھا۔ "جب میں رات آٹھ بجے چلا جاؤں تو تم داخل ہو جانا۔ میں ڈرائیو وے گیٹ سے اس وقت تک نہیں نکلوں گا جب تک یہ بالکل خالی نہیں ہو جاتا۔ گیٹ کو بند ہونے میں صرف پانچ سیکنڈ لگتے ہیں۔ جب میں گزروں تو تم دیوار کے دائیں جانب چپک جانا اور پھر سروس لفٹ کے ساتھ والی سیڑھیوں میں داخل ہو جانا۔ فرنٹ ڈور کی چابی، سروس کے ایگزٹ میں بھی لگ سکتی ہے۔" اس نے کچن سے ہو کر اس کا عقبی دروازہ کھولا۔ "میں جانے سے پہلے، ایملی کے پرس میں سے چابی لے لوں گا۔" اس نے جیب سے ایک مقناطیسی ڈبیا نکال کر ڈیوڈ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اور پھر اس ڈبیا میں رکھ کر یہاں اس پائپ کے عین پیچھے چھپا دوں گا۔" اس نے چند قدم آگے بڑھ کر ڈبیا کو نکاسی کے پائپ سے چپکا دیا۔

"یوں۔" وہ بولا۔

مقناطیسی ڈبیا پائپ سے چپک گئی۔ ڈیوڈ سب کچھ ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔ "تم کہاں ہو گے؟" اس نے پوچھا۔

"میں اپنے معمول کے مطابق کلب میں تاش کھیل رہا ہوں گا۔"

"تم مجھے اپنی چابی کیوں نہیں دے دیتے؟"

"میری چابی مجھے شریک جرم بنا دے گی۔" اسٹیو نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "اس چابی سے کوئی شریک جرم ثابت نہیں ہو سکے گا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ ہو سکتا ہے، اس نے اپنی چابی کھو دی ہو یا بھول گئی ہو۔" دونوں پلٹ کر واپس کچن میں آ گئے۔ "دونوں صورتوں میں وہ بتانے کے لیے زندہ نہیں ہو گی۔" اسٹیو نے کچن کا پچھلا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"تم چابی کی نقل کیوں نہیں بنوا لیتے؟"

"اس طرح دو سراغ بنتے ہیں۔" اسٹیو بولا۔ "چابی اور نقل بنانے والا۔" اس نے دروازہ بولٹ کر دیا۔ "یہ دروازہ ہمیشہ بولٹ رہتا ہے۔ اگر اس نے دیکھ بھی لیا تو اسے پتا نہیں چل پائے گا۔" وہ پلٹ کر کچن کے دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔ ڈیوڈ اس کے پیچھے تھا۔ "تو تم ساڑھے نو بجے سیڑھیوں پر ہو گے۔ اس وقت ایملی غسل کر رہی ہو گی۔"

"کیا واقعی؟" ڈیوڈ نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"کیونکہ جب میں تاش کھیلنے جاتا ہوں تو اس کا بھی یہی معمول ہے۔"

"تو یہ کام باتھ ٹب ہی میں کیوں نہ انجام دے دوں؟"

"کیونکہ پھر یہ ایک بے رحمانہ قتل بن جائے گا ونسٹن۔" اسٹیو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یوں لگنا چاہیے کہ وہ مداخلت کار کی وجہ سے حیران رہ گئی ہو۔ سمجھ گئے؟" اس نے کچن کے دروازے کے ساتھ دیوار سے نصب ایک ٹیلی فون کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ الگ ٹیلی فون لائن ہے۔ ٹھیک دس بجے میں یہاں کال کروں گا۔" اس نے ریسیور اٹھا کر بتایا۔ "ایملی فون کا جواب دے گی۔" اس نے ریسیور واپس لٹکا دیا اور پھر ڈیوڈ سے مخاطب ہوا۔ "تم اندر داخل ہو جاؤ گے۔ اور المناک کام کا آغاز ہو جائے گا۔" اس نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ٹھونس لیے۔ "اسے لگنا چاہیے کہ احمقانہ طور پر وقتی ردعمل ہوا تھا۔ میں ہمیشہ سے سمجھتا آیا ہوں کہ وزنی چیز کا استعمال ہی وقتی ردعمل لگ سکتا ہے۔" اس نے بڑھتے ہوئے کچن کی چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ "شاید تم ان میں سے کوئی چیز استعمال کرنا چاہو۔"

وہ کچن سے باہر نکلنے لگا۔ "جیولری تمہیں بیڈ روم میں ملے گی... سروس کے داخلے کے تالے کو ناکارہ کر کے یوں بنا دینا جیسے وہ جام ہو گیا ہو۔" وہ سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "چابی دوبارہ پائپ کے پیچھے رکھ کر اسی راستے سے لوٹ جانا جس راستے سے آئے تھے۔"

"اور اگر پلان میں گڑبڑ ہو گئی تو پھر کیا ہو گا؟" ڈیوڈ پوچھ بیٹھا۔

اسٹیو چلتے چلتے رک کر اس کی طرف مڑا۔ "ایسا نہیں ہو گا۔" اس نے گہرے اعتماد سے کہا اور آگے بڑھ کر اپنا سیف کھول لیا۔ اندر گڈیاں ہی گڈیاں تھیں۔ اس نے چند گڈیاں نکالیں اور ڈیوڈ کی طرف بڑھا دیں۔

"تمہارا تاش کا کھیل کس دن ہے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"کل رات۔"

"کل؟" ڈیوڈ بوکھلا اٹھا۔ "یہ تو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔"

"تم جیسے ماضی والے شخص کے لیے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنے میں وقت نہیں لگے گا۔" اسٹیو بولا۔

"مجھ جیسے ماضی والے شخص کو تو ایک لاکھ ڈالرز لے کر فرار ہو جانا چاہیے۔" ڈیوڈ نے نوٹوں کی گڈیاں اپنے بریف کیس میں رکھ کر بند کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تجھے چار لاکھ ڈالرز لینے کے لیے تم یہ کام ضرور کرو گے۔" اسٹیو گہرے اعتماد سے بولا۔

ڈیوڈ نے بریف کیس اٹھایا اور اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔

☆☆☆

لنچ ٹائم ہوتے ہی ایملی اپنے دفتر سے نکلی۔ اسے حسب معمول ڈیوڈ کے ساتھ لنچ کرنا تھا جو اس کا منتظر تھا۔ وہ یو این او کی بلڈنگ سے نیچے آئی اور تیزی سے ڈیوڈ کی رہائش گاہ کی سمت روانہ ہو گئی۔ اچانک ایک کار تیزی سے اس کے پاس آ کر رکی، اس کا دروازہ کھلا اور اندر سے اسٹیو برآمد ہوا۔ ایملی اسے اپنے سامنے پا کر ہکا بکا رہ گئی۔ اسٹیو اس کی اس کیفیت پر مسکرا دیا۔ "مجھے دیکھ کر یہ خوشی کا اظہار تو نہیں لگتا۔" وہ گہرے طنز سے بولا۔

"حیرانی سمجھ لو۔" ایملی اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی اور پھر ہنس پڑی۔

"میرے شیڈول میں غیر متوقع طور پر فارغ وقت نکل آیا ہے۔" اسٹیو نے کہا۔ "میں نے سوچا کیوں نہ اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ لنچ کرنا اچھا رہے گا۔" اس نے ایملی کا نرم و نازک ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے پوچھ لیا۔ "لیکن لگتا ہے کہ تمہارا کوئی دوسرا پروگرام بھی ہے۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"تم بڑی جلدی میں لگ رہی ہو۔" اسٹیو بولا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"بس میں ادھر ادھر کچھ کام کرنا چاہتی تھی۔"

"مثلاً شادی کی انگوٹھی کی خریداری بھی ہو سکتی ہے۔" اسٹیو کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"ایک نگینہ ڈھیلا ہو گیا تھا چنانچہ میں اسے جیولر کو دے آئی تھی لیکن کل وہ تیار ہو جائے گی۔"

"اور اگر کل نہ ہی آیا تو؟"

"کیا مطلب؟"

"کیا تمہیں اپنے شوہر کے ساتھ آخری لنچ نہ کرنے کا افسوس نہیں ہو گا؟"

"یقیناً۔"

اسٹیو نے اس کے لیے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ ایملی ایک لمحے کے لیے سراسیمہ ہو گئی اور پھر با دل ناخواستہ کار میں جا بیٹھی۔ اسٹیو نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

رات سایہ فگن ہو چکی تھی۔ اسٹیو اپنے اپارٹمنٹ میں بے چینی سے ایملی کا انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر دروازہ کھلا اور ایملی اندر آ گئی۔ وہ اسٹیو کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی اور پھر اپنا پرس اور چابیوں کا گچھا ڈریسر پر پڑے ہوئے ایک ٹرے میں رکھ کر اسٹیو کی طرف بڑھی۔ "آج کا دن کیسا گزرا؟" اسٹیو نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ وہ خود کو اپنے موبائل میں الجھا ہوا ظاہر کر رہا تھا۔

"خاصا خراب۔"

"یہ سن کر افسوس ہوا۔"

ایملی اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ "اسٹیو! میں نہیں چاہتی کہ تم آج رات تاش کھیلنے جاؤ۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

اسٹیو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

اسٹیو کی آنکھوں میں ہیرے جیسی سختی اتر آئی تھی۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔ "میرے دوستوں کو میری جگہ لینے کے لیے کوئی دوسرا ساتھی نہیں مل سکے گا۔ اس کے علاوہ پچھلے ہفتے میں انہیں بری طرح ہرا چکا ہوں۔ اب وہ اپنی ہاری ہوئی رقم، بازی جیت کر وصول کرنے کے چکر میں ہوں گے۔"

ایملی بیڈ روم میں چلی گئی اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اسٹیو چند لمحوں تک بند دروازے کو تکتا رہا۔ پھر اس نے تیزی سے حرکت کی۔ وہ ڈریسر تک آیا۔ ایملی کے چابیوں کے گچھے سے اس کی چابی نکال کر جیب میں ڈال لی۔ پھر سامنے کی ایک دراز سے وہی مقناطیسی ڈبیا نکالی، چابی اس ڈبیا میں رکھی اور تیزی سے وسیع و عریض کچن کو عبور کر کے اس کا عقبی دروازہ کھولا اور چند قدم اٹھا کر وہ ڈبیا نکاسی کے پائپ کے نچلے حصے سے چپکا دی۔ پھر تیزی سے واپس آیا۔ ایک دراز میں سے ایملی کا موبائل اٹھا کر اوورکوٹ کی جیب میں ڈال لیا پھر اپنا موبائل بھی دراز میں سے نکال کر اسی جیب میں رکھ لیا۔

ایملی اپنا لباس تبدیل کر کے مڑی ہی تھی کہ یکبارگی بری طرح چونک گئی۔ اسٹیو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"میں صرف خدا حافظ کہنا چاہتا ہوں۔" اسٹیو نے بڑھ کر اس کا چاند سا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں تمہیں بعد میں کال کروں گا۔"

"میں ہر گر کھانے کے کڑو تک جاؤں گی۔" ایملی نے کہا۔ "اگر یہاں کوئی نہ ملے تو فلرمت کرنا۔"

"نہیں کروں گا لیکن تمہیں اس پر نظرثانی کرلینی چاہیے۔" وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولا۔

"ایسا کیوں؟"

"میں نے خاص روسٹ تیار کروایا ہے۔"

"واقعی؟" ایملی کو خوش گوار حیرت ہوئی۔ "میرا خیال تھا کہ ہم تمہارے تاش کے گیم سے پہلے کھالیں گے۔"

اسٹیو دروازے پر ٹھٹک کر مڑا۔ "میرے لیے دعا کرنا۔ گڈلک۔"

اس نے بیڈ روم سے نکل کر ڈریسر پر سے اپنی چابیوں کا گچھا اٹھایا اور نیچے اپنی کار میں آبیٹھا۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی اور ڈرائیو وے کا خودکار گیٹ آہستہ سے اوپر اٹھ گیا۔ اسٹیو کی نظر باہر موجود ایک پُراسرار سیاہ پوش پر پڑی اور اس نے کار تیزی سے باہر نکال لی۔ پُراسرار سیاہ پوش بجلی کی سی تیزی سے ڈرائیو وے میں داخل ہوا اور دیوار سے چپک گیا۔ گیٹ خود بہ خود بند ہوگیا۔ ڈرائیو وے بالکل سنسان تھا۔ پُراسرار سیاہ پوش دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ایملی نے اپنے جسم کو کپڑوں کی قید سے آزاد کیا اور باتھ ٹب کے جھاگ دار نیم گرم پانی میں سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ سیاہ پوش نے اوپر پہنچ کر پائپ سے چپکی ہوئی ڈبیا اپنے قبضے میں کی، اندر سے چابی نکالی اور کچن کے عقبی دروازے کو بہت احتیاط اور خاموشی سے کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

☆☆☆

کلب میں تاش کی میز پر بازی جمی ہوئی تھی۔ اسٹیو... بظاہر اپنے پتوں کی طرف متوجہ تھا مگر اس کی کیفیت اندرونی اضطراب کی غمازی کررہی تھی۔ اس نے چوری چوری نگاہیں گھما کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ اس نے ایک موبائل جیب سے نکال کر آن کیا اور کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف اس کے بیڈ روم میں کارڈلیس فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی لیکن کوئی ریسیور نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے موبائل آف کیا اور جیب میں رکھ کر دوسرا موبائل نکال لیا اور کچن کے فون کا نمبر ملا کر موبائل کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف کچن کے فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔

ایملی نے باتھ ٹب میں لیٹے لیٹے اپنی آنکھیں کھولیں۔ کچن کے فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ "یہ کیسا مذاق ہے۔" وہ بڑبڑائی اور باتھ ٹب سے نکل کر اپنے جسم پر ایک تولیا...... لپیٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ "ہیلو۔" اس نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں کہا۔ دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ "ہیلو... ہیلو...!"

جواب میں وہی خاموشی۔ "ہیلو... کون ہے؟"

اچانک کسی نے پیچھے سے اسے پوری قوت سے دبوچ لیا۔ ایملی کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ پُراسرار حملہ آور نے اسے اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل پر دے مارا۔ ایملی ایک لرزہ خیز چیخ کے ساتھ طویل میز پر قلابازی کھا کر اوندھے منہ پھسلتی ہوئی فرش پر جاگری۔ سیاہ پوش حملہ آور نے اسے پھر پیچھے سے دبوچ کر اٹھایا اور ایملی کی سخت مزاحمت کی پروا کیے بغیر بگڑے توازن کے ساتھ اسے کچن کی سلیب پر دے مارا۔ ایملی نے ایک کرب ناک چیخ کے ساتھ پلٹا کھایا۔ حملہ آور نے ایک بار پھر اس کی سخت کشمکش کے باوجود اسے اٹھا کر چولہے پر دے مارا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ ایملی کی بھیانک اور دل خراش چیخوں سے در و دیوار لرز رہے تھے۔ وہ سخت مزاحمت کرتی ہوئی [illegible] اپنے [illegible] ہاتھ [illegible] پاس ہی چھری رکھنے کی ٹوکری تک [illegible] ایک چھری اٹھانے کی جان توڑ کوشش کررہی تھی۔ بالآخر اس نے ایک چھری اٹھالی اور حملہ آور کے سینے پر وار کرنا چاہا لیکن حملہ آور نے اس کی کلائی جکڑ لی۔ دوسرے ہاتھ سے وہ پوری قوت سے اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کررہا تھا۔

کلب میں بیٹھا ہوا اسٹیو اپنے کان سے موبائل لگائے، بڑے سکون سے اٹھا پٹخ کی ہیبت ناک آوازیں اور ایملی کی دل خراش چیخیں سن رہا تھا۔

ایملی بہ دستور شدید مزاحمت کررہی تھی۔ حملہ آور نے اس کا گلا دبوچ رکھا تھا۔ ایملی کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے گویا ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ کسی چیز کے حصول کے لیے اپنا واحد آزاد ہاتھ بری طرح اِدھر اُدھر مار رہی تھی۔ اسی کوشش میں اس کا ہاتھ روسٹ کی ٹرے میں رکھی ہوئی ایک سلاخ پر پڑا۔ اس نے وہ سلاخ اٹھالی اور پوری قوت سے حملہ آور کی گردن میں اتار دی۔

حملہ آور کی گردن سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ سلاخ پوری کی پوری اس کی گردن میں اتر گئی تھی۔ وہ گرتے گرتے ایملی کو اپنے خون میں نہلا گیا۔ ایملی ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بھاگی۔ حملہ آور فرش پر گر کر ساکت ہو چکا تھا اور خون... بہ دستور اس کی گردن سے فوارے کے مانند ابلتا ہوا فرش پر بہہ رہا تھا۔

اسٹیو نے اپنا موبائل اطمینان سے آف کر کے جیب میں رکھ لیا اور پھر سامنے کی طرف جھک کر مسکرایا۔ "اب میں دوسری بازی بھی کھیلوں گا۔"

☆☆☆

وہ کلب سے نکل کر اپنی کار میں گھر روانہ ہوا تو...... پھوار پڑ رہی تھی۔ اس نے ایملی کا موبائل سڑک پر ایک طرف اچھال دیا اور تیزی سے فاصلہ طے کرنے لگا۔ اپنے اپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں اندر داخل ہوگیا... خاموشی... گہری خاموشی... وہ چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا، آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ گہرے سکوت میں اس کے قدموں کی آہٹ جیسے ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ وہ جچے تلے قدم اٹھاتا ہوا، ڈائننگ ٹیبل کے پاس رکا ہی تھا کہ یکبارگی اسے اندر سے گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ وہ حواس باختہ ہو کر اندر کی طرف بھاگا اور بیڈ روم کے دروازے پر ٹھٹک گیا۔ خون میں لت پت ایملی بیڈ کی دوسری طرف فرش پر بیٹھی چیخ چیخ کر روتی ہوئی [illegible] رو رہی تھی۔

"اُف... میرے خدا!" اسٹیو کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایملی کی طرف بھاگا۔ ایملی نے اسے دیکھ کر ایک بھیانک چیخ ماری۔ اسٹیو نے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"مسز ٹیلر... ہیلو مسز اسٹیو ٹیلر... ہیلو، ہیلو...!" دوسری طرف سے فون پر کسی خاتون کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "ہم نے آپ کے مقام کا تعین کرلیا ہے۔ ہیلو، ہیلو... مسز ٹیلر! آپ لائن پر رہیں۔ محترمہ... محترمہ...!"

اسٹیو حیرت پاش نظروں سے فون کو گھورنے لگا۔ "وہ کہاں ہے؟" اس نے ایک جھٹکے سے ایملی سے پوچھا۔

"کچن میں۔" تھر تھر کانپتی ہوئی ایملی نے اپنا خون سے لتھڑا ہوا ہاتھ اٹھا کر کچن کی طرف اشارہ کیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اسٹیو کے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ کچن کی طرف بھاگا۔ یہاں سے وہاں تک ایملی کے خون آلود قدموں کی چھاپ نظر آرہی تھی۔ اسٹیو نے سہمے سہمے انداز میں کچن میں قدم رکھا اور اگلے ہی لمحے اپنی جگہ شل ہوگیا۔ اس کی آنکھوں نے گویا خوف آمیز حیرت کی تصویر کھینچ لی تھی۔ فرش پر ایک طرف خون کے جوہڑ میں پراسرار قاتل کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ یہ غیر متوقع تھا۔ بازی الٹ گئی تھی۔ اسٹیو تھر تھر کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت برسنے لگی تھی۔ وہ کیبنٹ کی طرف بھاگا۔ اس نے ایک دراز میں سے ایک اسکرو ڈرائیور ڈھونڈ نکالا۔ اس کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے۔ اس نے جلدی جلدی دستانے چڑھائے، اسکرو ڈرائیور کو بیسن میں دھویا اور بھاگ کر کچن کے عقبی دروازے کے قفل کو ناکارہ کردیا۔ پھر لپک کر قاتل کی لاش پر جھک گیا اور تھرتھراتے ہاتھوں سے اس کی جیبوں میں اپنے اپارٹمنٹ کی چابی ڈھونڈنے لگا۔ ایک جیب سے ٹافیاں نکلیں۔ اس نے ٹافیاں اسی جیب میں ٹھونس کر دوسری جیب ٹٹولی۔ اس جیب میں چابی موجود تھی۔ اس نے بھاگ کر اپنے دستانے اتارتے ہوئے، وہ چابی واپس ایملی کی چابیوں کے گچھے میں پہنچادی۔

باہر سے دروازہ زور زور سے پیٹا جارہا تھا۔ پولیس پہنچ گئی تھی۔ "مسٹر اسٹیو! دروازہ کھولیں... مسٹر اسٹیو! جلدی دروازہ کھولیں...!"

اسٹیو نے دستانے جیسے تیسے اپنی جیب میں ٹھونس لیے اور بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر پولیس کا ایک مسلح دستہ موجود تھا۔ "وہ کہاں ہے؟" وہ سب دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ "آپ لوگ خیریت سے تو ہیں؟"

"وہ کچن میں ہے۔" اسٹیو نے کچن کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ مارا گیا ہے۔ میرے ساتھ تشریف لائیں۔"

وہ سب کچن کی طرف بھاگے۔ اسٹیو ان کے پیچھے تھا۔ پوری عمارت میں ہر فلور پر پولیس ہی پولیس نظر آرہی تھی۔ اسٹیو کے اپارٹمنٹ میں ہر طرف سراغ رساں حضرات ٹہل ٹہل کر جائزہ لے رہے تھے۔ ایک سراغ رساں ایملی کے سامنے آبیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں پیڈ اور قلم تھا۔ اب تک ایملی اپنی کیفیت پر قابو پاچکی تھی۔ "مسز اسٹیو! کچن میں جانے سے پہلے، کیا آپ کو کوئی غیر معمولی آواز نہیں سنائی دی تھی؟" بھاری بھرکم سراغ رساں نے پوچھا۔ "کوئی آہٹ وغیرہ؟"

"نہیں... صرف فون کال تھی۔" ایملی نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔"

پولیس کا دستہ کچن میں پڑی ہوئی لاش کا معائنہ کررہا تھا۔ ان سے کچھ ہی فاصلے پر اسٹیو کھڑا تھا۔ اچانک ایک سراغ رساں کچن میں داخل ہوا اور اسٹیو کے پاس آگیا۔

www.pkdigest.com

"سراغ رساں محمد کامران!" اس نے اسٹیو سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ "مسٹر اِملیز... میں آپ سے چند سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرنے والے کے گرد آپ ہی کے قدموں کے نشانات ہیں۔" اس نے جوتوں کے خون آلود نشانات کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، آپ سمجھ سکتے ہیں۔" اسٹیو نے جواب دیا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کیا کر رہے تھے؟" کامران نے پوچھا۔

"میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے یا نہیں۔"

"تو کیا وہ مر چکا تھا؟"

"ہاں، ایسا ہی لگ رہا تھا۔"

"اس کی نبض دیکھی تھی؟" سراغ رساں کامران نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"آپ یہ دیکھ رہے ہیں... آپ کس وجہ سے اس پر جھکے تھے؟"

"میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اس کی سانس چل رہی ہے یا نہیں۔"

"تو کیا وہ سانس لے رہا تھا؟"

"اس وقت نہیں۔"

دونوں خاموش ہو کر لاش کو بغور دیکھنے لگے۔ پراسرار حملہ آور کے چہرے پر اب بھی سیاہ نقاب تھا اور آنکھوں کی جگہ صرف دو سوراخ نظر آ رہے تھے۔ ایک اہلکار نے نقاب کو بہت احتیاط سے آہستہ آہستہ اوپر کرنا شروع کیا۔ اسٹیو دھڑکتے دل سے دیکھ رہا تھا۔ اہلکار نے نقاب اتار دیا۔

حملہ آور کوئی اجنبی تھا۔

اسٹیو کی آنکھوں میں حیرت کی بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ سراغ رساں کامران بہت غور سے اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میرے کچن میں ایک مردہ شخص کی لاش پڑی ہوئی ہے۔" اسٹیو نے جواب دیا۔ "بس یہی بات ہے۔"

"ذرا دیر کے لیے مجھے ایسا لگا کہ آپ اس شخص کو جانتے ہیں۔" کامران نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔" اسٹیو بولا۔ "اور کوئی بات؟"

"فی الحال کوئی نہیں۔ آپ کی بیوی کو باقاعدہ بیان دینے کے لیے آنا پڑے گا... جیسے ہی وہ اس کے لیے تیار ہوں... مسٹر اسٹیو! کیا آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جو آپ کی بیوی کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو؟" کامران نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کا کوئی دشمن نہیں۔" اسٹیو نے جواب دیا اور کچن سے نکل کر ایملی کے پاس آ گیا۔ ایملی اس سے لپٹ گئی اور وہ اسے دلاسا دینے لگا۔ "فکر مت کرو۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

☆☆☆

دوسرے دن پولیس ہیڈ کوارٹرز میں ایملی اور اسٹیو کو بتایا گیا کہ حملہ آور کی شناخت ہو گئی ہے۔ وہ ایک پیشہ ور مجرم تھا۔ وہ دونوں وہاں سے نکل گئے۔ اسٹیو، ایملی کو نیویارک کے مضافات میں واقع اس کے میکے چھوڑ آیا۔ ایملی کو مکمل آرام کی سخت ضرورت تھی۔ تنہائی ملتے ہی ایملی نے بیڈ پر لیٹے لیٹے ڈیوڈ کو فون کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی لیکن کوئی ریسیور اٹھا نہیں رہا تھا۔ تاہم اس کی آواز اسپیکر کے ذریعے وہاں پھیل رہی تھی۔ ڈیوڈ تھک کر بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ایملی کی آواز پڑی۔ "میں بول رہی ہوں۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں خیریت سے ہوں اور میں شہر میں نہیں ہوں...!" وہ رو رہی تھی۔

نچلی منزل پر اسٹیو اپنی ساس سے محو گفتگو تھا۔ اسی دوران اس نے دیکھا کہ ایک گوشے میں رکھے ہوئے کارڈلیس سیٹ کی لائٹ فلیش ہو گئی۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اوپری منزل پر ایملی نے ڈیوڈ سے رابطہ کر لیا تھا۔

ڈیوڈ اٹھ بیٹھا۔ اس کا ذہن نیم غنودہ تھا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ ایملی کی گلوگیر آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ "...لیکن جیسے ہی ممکن ہوا، میں تمہیں کال کروں گی۔" ایملی نے کارڈلیس آف کر دیا۔ نچلی منزل پر سیٹ کی لائٹ آف ہو گئی۔

ڈیوڈ فرش سے اٹھ کر اپنے کارڈلیس سیٹ تک پہنچا اور ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں چیخنے لگا۔ "ہیلو... ہیلو!" لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

کارڈلیس سیٹ کی لائٹ بجھتے ہی اسٹیو اوپر بھاگا۔ ایملی اپنے بیڈ پر آنکھیں بند کیے دراز تھی۔ اس کے پہلو میں ریسیور پڑا ہوا تھا۔ اسٹیو نے ریسیور خاموشی سے اٹھا لیا اور دبے پاؤں بیڈ روم سے نکل گیا۔ ایک پرسکون گوشے میں پہنچ کر اس نے ڈیوڈ سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ڈیوڈ نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ایملی!" وہ ماؤتھ پیس میں چیخا۔

"سوری ڈیوڈ... ایملی اس وقت آرام کر رہی ہے...

لیکن مجھے اور تمہیں ایک بات کر لینی چاہیے۔"

☆☆☆

نیویارک کی فلک بوس عمارتوں اور مجسمۂ آزادی کے پیش منظر میں پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے اسٹیمر کے عرشے پر تنہا کھڑا اسٹیو، مچلتی ہوئی لہروں کو تک رہا تھا۔ پیچھے سے ڈیوڈ آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ "وہ شخص کون تھا؟" اسٹیو نے پوچھا۔

"میں اس سے بروکلے میں ملا تھا۔" ڈیوڈ نے جواب دیا۔

"کیا اس کام سے تمہارا تعلق نکالا جا سکتا ہے؟"

ڈیوڈ نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ تم کسے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"تم وہ شخص ہو جس نے مجھے اپنی بیوی کے قتل پر مقرر کیا کیونکہ یہ گندہ کام تم خود نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی میں کر سکتا ہوں۔" ڈیوڈ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تو تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس شخص نے کسی اور سے بات نہیں کی ہو گی؟" اسٹیو نے پوچھا۔

"وہ ایک اچھا آدمی تھا۔"

"اتنا کافی نہیں ہے۔"

"تو پلان بی کیا ہے؟" ڈیوڈ نے زچ ہو کر پوچھا۔

"اگر اس کی جان دوبارہ لینے کی کوشش کی گئی تو اسے پتا چل جائے گا۔"

"تم ایسا سمجھتے ہو؟"

"چنانچہ ہم انتظار کریں گے۔"

"کس چیز کا؟"

"میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔"

"تو کیا اس دوران میں تمہاری بیوی کے ساتھ وقت گزار سکتا ہوں؟"

اسٹیو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند ابھر آیا تھا۔

☆☆☆

"میں گھر نہیں جاؤں گی۔" صبح ناشتے کی میز پر ایملی، اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "میں کچھ عرصے ریکونگل کے یہاں رہوں گی۔"

"ایم! آخر بات کیا ہے؟" اس کی ماں نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں اسٹیو کو چھوڑ رہی ہوں۔" وہ رونے لگی۔

ماں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ بدستور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

وہ میکے سے لوٹی تو اسٹیو اپنے دفتر میں تھا۔ ایملی نے چابیوں کا گچھا نکالا اور اپنی چابی سے دروازے کا قفل کھولنے کی کوشش کرنے لگی لیکن چابی قفل میں لگ نہیں رہی تھی۔ کافی طبع آزمائی کے باوجود ناکام ہو کر وہ نیچے استقبالیہ پر پہنچی۔ "البرٹ پلیز... کیا تم مجھے ہمارے مکان کی چابی دو گے؟" اس نے درخواست کی۔

"ہاں، بالکل مسز ٹیلر... آپ کی چابی کو کیا ہوا؟" منیجر البرٹ نے پوچھا۔

"مجھے پتا نہیں۔ یہ لگ نہیں رہی ہے۔ کیا میرے شوہر نے تالے بدل دیے تھے؟"

"مجھے اس کا علم نہیں۔" البرٹ نے جواب دیا۔

ایملی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی اپارٹمنٹ میں آ گئی۔ وسیع و عریض اور انتہائی صاف ستھرے اپارٹمنٹ میں مرگ آسا سکوت چھایا ہوا تھا۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی، ایک ایک شے کا جائزہ لیتی ہوئی کچن میں پہنچ گئی۔ ایک طرف وہی ٹوکری رکھی ہوئی تھی جس میں چھریاں تھیں۔ اس نے وہ چھری اٹھائی جس سے اس نے حملہ آور پر وار کرنا چاہا تھا۔ اچانک اسے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ پلٹی۔ اسٹیو کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ "اف خدایا!"

"ایملی! یہ میں ہوں۔" اسٹیو کی آواز خوف سے کانپنے لگی۔

"مجھے تمہارے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" ایملی ہانپتے ہوئے بولی۔ چھری ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

"کیونکہ تم سامنے کا دروازہ بالکل کھلا چھوڑ آئی تھیں۔" اسٹیو نے کہا اور اس کی کلائی تھام لی۔ "نہیں چھونا... میں تمہارا شوہر ہوں۔" اس نے چھری آہستہ سے اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دی۔

"اوہ، خدایا! میں یہاں نہیں رہ سکتی۔" ایملی کرب آمیز لہجے میں بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم آج رات یہاں سے چلے جائیں گے۔" اسٹیو نے اسے تسلی دی۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی اسٹیو... اب میں تمہارے ساتھ بالکل نہیں رہ سکتی۔ مجھے ریکونگل میرا انتظار کر رہی ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ پلٹی اور اپارٹمنٹ سے نکل گئی۔

www.pkdigest.com

اسٹیو تشویش آمیز نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

"او کے! باتھ روم میں صاف تولیے موجود ہیں۔" ریکوئیل کچن میں کام کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اور جو چاہو فریج میں سے لے سکتی ہو۔"

"میں ایک سوال پوچھوں؟" ایملی نے کہا۔ "تمہارے خیال میں اسٹیو کو اگر ڈیوڈ کے بارے میں پتا چل جائے تو وہ کیا کرے گا؟"

"کسی اور سے جنسی تعلقات کسی کو قتل کر ڈالنے کی دوسری وجہ ہو سکتی ہے۔" ریکوئیل اس کے سامنے میز پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"واقعی... اور پہلی وجہ؟"

"دولت، جانِ من... لیکن اسٹیو پہلے ہی دولت مند ہے اور تم نے اپنی دولت کے معاملے میں یقیناً قانونی پابندیاں عائد کر رکھی ہوں گی۔ بتاؤ نا، ایسا ہی ہوا ہے نا؟"

"ہاں، اس نے پیش کش کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"تو تمہارے مرنے کی صورت میں اسے کوئی سو ملین ڈالر مل جائیں گے؟"

"ہاں، تقریباً اتنے ہی۔" ایملی نے جواب دیا۔

"خوش قسمت انسان ہے وہ۔"

☆☆☆

ایملی نے یو این او میں اپنی باس امریکی سفیر کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔ ساتھ ہی اس سے درخواست کی کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کے شوہر کے مالی معاملات کے بارے میں اسے معلومات فراہم کرنے کا بندوبست کر دے۔ خاتون امریکی سفیر نے اس کی دونوں باتیں منظور کر لیں اور اسے دفتری اوقات کے بعد دفتر میں ملنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ وہ دفتر پہنچ گئی۔ خاتون باس نے خود دروازہ کھولا۔ ایملی اندر داخل ہو گئی۔

"میرے خیال میں تمہارے پاس یقیناً اس کی کوئی معقول وجہ ہو گی۔" باس نے شفقت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا اشارہ ایملی کے استعفے کی طرف تھا۔

"جی ہاں۔" ایملی منمنائی۔

"ہم تمہیں یہاں بہت مس کریں گے۔" وہ بڑے خلوص سے بولی۔ "آؤ۔" وہ اسے لے کر ایک طرف بڑھ گئی جہاں ایک کرسی پر ایک نہایت باوقار شخص متمکن تھا۔ "یہ مسٹر رابرٹ ہمکشن ہیں۔" اس نے ایملی سے اس شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یو ایس ٹریڈ کمیشن کے ڈپٹی ڈائریکٹر۔"

مسٹر رابرٹ نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ "تشریف رکھیں۔"

دونوں نے اپنی اپنی نشست سنبھال لی۔ "جتنا وقت چاہیں لے لیں۔" امریکی سفیر بولی اور ہال سے نکل کر دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا۔

"مسز اسٹیو ٹیلر!" مسٹر رابرٹ نے اسے مخاطب کیا۔ "اس قسم کی معلومات کسی کو منتقل کرنا چاہے وہ شریکِ حیات ہی کیوں نہ ہو، غیر اخلاقی بات ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" ایملی نے شائستگی سے کہا۔

"آپ کے شوہر امریکی اور غیر ملکی بونڈز مارجن پر حاصل کرتے رہے ہیں... اور ان سیکیورٹیز کو ضمانت کے طور پر استعمال کر چکے ہیں۔ یہ غیر قانونی بات ہے۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ "دراصل ان کی کمپنی کے بارے میں تقریباً ایک سال سے چھان بین ہو رہی ہے۔ چند ماہ پہلے امریکی شرح منافع ان کے خلاف جانی شروع ہو گئی۔ انہیں ضمانت کے لیے بہت بڑے مطالبات آنے شروع ہو گئے ہوں گے لیکن جن بینکوں کے ساتھ وہ کاروبار کر رہے ہیں، انہوں نے ان کے نقصانات کو چھپا رکھا تھا۔ [illegible] حالات بدتر ہو جائیں گے [illegible] ایسا نہیں ہو رہا [illegible] کے یہ مطالبات ضرور آ جائیں گے اور جب ایسا ہو گا... تو آپ کے شوہر کا صفایا ہو جائے گا۔"

ایملی کے ہوش اڑ گئے۔ وہ گہرے غور و فکر میں ڈوب گئی۔ یہ سب اسے بہت پراسرار لگ رہا تھا۔ اسٹیو نے بھی اسے اعتماد میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے ارادے کیا تھے؟ وہ اس کے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہا تھا؟ اس کے ذہن میں شکوک و شبہات سر ابھارنے لگے۔ چابی کا مسئلہ پہلے ہی اس کے ذہن میں شک کے بیج بو چکا تھا۔ وہ چابی تالے میں کیوں نہیں لگ رہی تھی؟ وہ کس کی تھی اور کہاں سے آئی تھی؟ یہ کیسا بھید تھا؟

☆☆☆

وہ وہاں سے نکلی اور سیدھی پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچ گئی۔ پولیس چیف نے اس کا استقبال کیا اور اسے ایک دروازے کے باہر چھوڑ کر لوٹ گیا جس کے شیشے پر ڈیٹیکٹیو لکھا ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ سارے سراغ رساں اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔

"محمد کامران۔" وہ بولی۔

"پلیز! تشریف رکھیں۔" چیف سراغ رساں محمد کامران نے اس سے مصافحہ کر کے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ نہایت نفیس، بردبار اور باوقار شخص تھا۔ ایملی بیٹھ گئی۔

"آپ کیسے تشریف لائیں؟" کامران نے اپنی نشست سنبھالنے کے بعد پہلا سوال کیا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ مقناطیسی آنکھوں میں ہمدردی تھی۔

"میرے پاس اپنے شوہر کے بارے میں کچھ معلومات ہیں۔" وہ بولی۔

"کس بارے میں؟" کامران اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"محمد کامران! لگتا ہے وہ بہت بڑے مالی بحران کا شکار ہے۔" ایملی ہچکچا کر بولی۔ "اور جسے وہ مجھ سے چھپا رہا ہے... اور... اور میرا خیال ہے، یہ ممکنہ وجہ ہو سکتی ہے...!"

کامران نے کسمسا کر پہلو بدلا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اس کی باتیں غور سے سننے لگا۔ ایملی اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اس کے لیے یہ ممکنہ وجہ ہو سکتی ہے کہ... کہ..."

"کہ آپ کے قتل کے لیے کسی کو مقرر کر دے۔" کامران نے اس کی بات مکمل کر دی اور پھر تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ [illegible] لگا تھا۔ "مسز اسٹیو! مجھے [illegible] اور اتنی بڑی دولت ہمیشہ [illegible] ہے۔"

"تو کیا... تمہارا مطلب ہے کہ اس پر پہلے ہی سے شک کیا جا رہا ہے؟" ایملی بے تابی سے پوچھ بیٹھی۔

"کیا جا رہا تھا۔" کامران نے لفظ "تھا" پر زور دے کر کہا۔ "لیکن پھر ہمیں آپ پر حملے والی رات اس کے موبائل فون کا پتا چل گیا۔ پھر ہمیں اس سراغ سے اس کے آفس میں خودکار سسٹم کا علم ہو گیا۔ اس کا دورانیہ دس بجنے میں پانچ منٹ سے لے کر دس بج کر نو منٹ تک تھا۔ میں اسے عدم موجودگی کا بہترین ثبوت کہہ سکتا ہوں...!"

ایملی بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کامران اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں ہزاروں مرتبہ آپ کے کیس کی چھان بین کر چکا ہوں لیکن ہر بار ایک بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکی...!"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ حملہ آور کے پاس بٹوا، نقد رقم، ڈرائیونگ لائسنس، ویڈیو اسٹور کی رکنیت کا کارڈ... سبھی کچھ موجود تھا لیکن چابی کوئی نہیں تھی... ایک بھی نہیں... اس کے اپنے اپارٹمنٹ کی بھی نہیں تھی۔" سراغ رساں کامران نے ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

ایملی حیرت سے اس کی شکل دیکھتی چلی گئی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔

☆☆☆

اسٹیو اپنے دفتر میں وسیع و عریض میز پر بیٹھا، اپنے سامنے بیٹھے ہوئے دو ماتحتوں پر بری طرح برس رہا تھا۔ اچانک انٹرکام کا بزر بول پڑا۔ "مجھے افسوس ہے سر... لیکن ایک کال کرنے والے کا کہنا ہے کہ یہ ایمرجنسی ہے۔" دوسری طرف سے اس کی سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔ "اس کا کہنا ہے کہ یہ ایملی کا معاملہ ہے۔"

"کون ہے وہ؟" اسٹیو نے چلّا کر پوچھا۔

"وہ اپنی شناخت نہیں بتا رہا۔" سیکریٹری نے جواب دیا۔

اسٹیو نے بادلِ ناخواستہ ریسیور اٹھا لیا۔ "کون بول رہا ہے؟"

"المناک کام کا آغاز ہو جائے۔" دوسری طرف سے خود اس کی ٹیپ کی ہوئی آواز اسے سمع بر گوش ہوئی۔ "اسے لگنا چاہیے کہ احمقانہ طور پر یہ وقتی ردِعمل ہوا تھا۔ میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ وزنی چیز کا استعمال ہی وقتی ردِعمل لگتا ہے۔ شاید تم ان میں سے کسی چیز کا استعمال کر سکو...!"

آواز آنی بند ہو گئی۔ اسٹیو کے چہرے کے عضلات پتھر کی طرح سخت ہو گئے اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک عود کر آئی۔ اگلے ہی لمحے اسے ڈیوڈ کی آواز سنائی دی۔ "مجھ سے میڈن اینڈ ساؤتھ کے کونے پر واقع ریسٹوران میں اسی وقت ملو۔" اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اسٹیو نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ریسیور کو کان سے الگ کیا۔ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

پولیس ہیڈ کوارٹرز میں سراغ رساں کامران نے مقتول حملہ آور کی فائل ایملی کے سامنے رکھ دی۔ "وہ رونالڈ ڈکس نامی ایک سزا یافتہ مجرم تھا۔" وہ بولا۔ "حال ہی میں وہ کیلی فورنیا کی ریاستی جیل سے رہا ہوا تھا۔"

ایملی فائل کھول کر ایک ایک کاغذ احتیاط سے پلٹتے ہوئے غور سے پڑھنے لگی۔ فائل میں حملہ آور کے بارے میں ساری تفصیل تصاویر سمیت موجود تھی۔ ایک کاغذ پر اس کے گھر کا پتا درج تھا۔ ایملی نے غور سے پڑھا۔ 2.35 ہیملٹن ہیلس، اپارٹمنٹ 209 واشنگٹن ہائٹس، نیویارک۔

☆☆☆

اسٹیو اپنے دفتر سے نکل کر سیدھے میڈن اینڈ ساؤتھ کے کونے پر واقع اس ریستوران میں پہنچ گیا۔ وہ ایک گندہ سا نیم روشن ریستوران تھا۔ اسے ڈیوڈ کو ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ایک طرف کھڑا... برگر کھا رہا تھا۔

”مسٹر اسٹیو! یہاں تک آنے میں آپ کے عمدہ جوتے خراب تو نہیں ہوئے؟“ اس نے پوچھا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ اسٹیو نے اپنی کیفیت پر قابو رکھا ہوا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں سانپ جیسی چمک تھی۔

”اپنی باقی رقم...!“

”لیکن تم نے اپنا باقی کام تو مکمل نہیں کیا۔“

”تو؟“ ڈیوڈ طنز سے ہنسا۔

”تو مجھے اس سے کیا حاصل ہوگا؟“

”تمہیں بہت ہی خاص چیز مل جائے گی۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”تم اسے کہہ سکتے ہو... کیا نام تھا اس کا... ہاں، چھپا ہوا تجربہ۔“

”یہ بڑی خاص چیز ہے کیا؟“

”یہ تمہارے سامنے ہے... اسے ’جیل سے باہر‘ کہتے ہیں میرے دوست۔ اس سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوتی۔“

”چار لاکھ ڈالرز کے بعد مجھے کتنا وقت لگے گا؟“

”جو بازار کا بھاؤ ہوگا۔“

”مجھے اس میں چند دن لگیں گے۔“ اسٹیو بولا۔

”میں تمہیں چار گھنٹے دے سکتا ہوں۔“ ڈیوڈ نے کہا۔

”ایسا ناممکن ہے اور تم یہ جانتے ہو۔“

”اب رہنے بھی دو اسٹیو... تمہارے جیسا ماضی والا شخص تو چٹکیوں میں اتنی رقم نکال سکتا ہے۔“ ڈیوڈ مسکرایا۔

اسٹیو زہرخند سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”کہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے یہاں۔“ ڈیوڈ نے جواب دیا۔ ”اگر تم رقم لے کر نہ آئے تو میں پہلی رقم پر اکتفا کر کے ٹیپ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ اسٹیو کی آنکھوں سے بلا کی عیاری جھلک رہی تھی۔

”بس یہ اچھی طرح سمجھ لو۔“ ڈیوڈ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

ایملی جس علاقے میں پہنچی، وہ خاصا گندہ تھا۔ یہ نیگرو اور ہسپانیش کی ملی جلی آبادی تھی۔ وہاں کیوبن اور پیوٹرو ریکن بھی آباد تھے۔ ایملی مطلوبہ بلڈنگ ڈھونڈتی ہوئی، ایک گندی سی گلی میں داخل ہوئی۔ ہر طرف بے ترتیبی نظر آ رہی تھی۔ عمارت بہت پرانی اور غلیظ تھی۔ ایک طرف الگنی پر کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ نیم برہنہ نیگرو بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ ایک نوجوان اسپینش دیوار پر بیٹھا ہوا تھا۔ لگتا تھا، اسے دنیا میں کوئی اور کام نہ تھا۔ ہر طرف اداسی، بے کیفی اور مفلوک الحالی چھائی ہوئی تھی۔

ایملی متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی، اس اسپینش کے قریب پہنچ گئی۔ ”اے بلونڈ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ دیوار پر بیٹھے ہوئے نوجوان اسپینش نے اسے پکار کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

”معاف کرنا۔“ ایملی اسپینش زبان میں بولی۔ ”میں اپارٹمنٹ نمبر 209 ڈھونڈ رہی ہوں۔“

نوجوان اسپینش نے اوپر ایک کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اُدھر۔“ وہ بولا۔

”شکریہ۔“ ایملی زینہ چڑھنے لگی۔

”سنہری زلفوں والی ایک قیامت اوپر جا رہی ہے۔“ اسپینش نوجوان نے پکار کر کسی سے کہا۔ ”اسے چھیڑنا مت۔“

”اسے اوپر بھیج دو۔“ کسی نے اوپر سے کہا۔

ایملی تنگ اور نیم روشن زینہ طے کرتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ ایک اپارٹمنٹ کے دروازے پر 209 کی تختی لگی ہوئی تھی اور دروازے کے آر پار پولیس کی طرف سے ان کی زرد رنگ کی مخصوص چوڑی سی پٹی چپکی ہوئی تھی جس پر جلی حروف میں ”کرائم سین... ڈونٹ انٹر“ لکھا ہوا تھا۔ ایملی نے اپنے پرس سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور وہی چابی جو اس کے اپنے اپارٹمنٹ کے قفل میں نہیں لگ رہی تھی، دروازے کے قفل میں آہستہ سے داخل کر دی۔ کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اب اس نے چابی کو آہستہ سے دائیں طرف گھمایا، کھٹ کی ہلکی سی آواز ہوئی اور قفل کھل گیا۔

ایملی کو یوں محسوس ہوا گویا اس کے دل کی دھڑکنیں تھم جائیں گی۔ اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اور آنکھوں سے دہشت برسنے لگی تھی۔ اسے اپنے گھٹنے کپکپاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی غیر ہوتی ہوئی کیفیت پر قابو پایا اور کانپتے ہاتھوں سے چابی کو الٹا گھمایا۔ قفل بند ہو گیا۔ اس نے پھر چابی کو دائیں گھمایا۔ قفل کھل گیا۔

اس نے پولیس کی مخصوص پٹی کا ٹیپ آہستہ سے اکھاڑا اور دروازے کی ناب کو دائیں طرف گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ اس نے ایک اچھی اچھی سی سانس لی اور اس کا منہ بھی مارے حیرت کے کھل گیا۔ وہ آہستہ سے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔ اپارٹمنٹ بالکل خالی تھا۔ ایملی کو اپنا ذہن سائیں سائیں کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چابی آخر اس کے چابیوں کے گچھے میں کہاں سے آ گئی تھی؟

☆☆☆

اسٹیو ایک سیاہ چرمی بیگ اٹھائے، تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بینک آف نیویارک پہنچا اور سیدھے لاکر والے سیکشن میں بڑھتا چلا گیا۔ پھر وہ رکا۔ اس نے اپنے لاکر میں سے ٹین کا ایک بڑا سا سرخ رنگ کا ڈبا نکال کر کھولا۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ اس نے اپنے سیاہ چرمی بیگ میں سے جوتوں کا ایک ڈبا نکالا، جوتے ایک طرف رکھے اور چار لاکھ ڈالرز جوتے کے اس ڈبے میں رکھ کر جوتے باقی گڈیوں کے ساتھ سرخ ڈبے میں رکھے اور جوتے کا وہ ڈبا اپنے سیاہ بیگ میں ڈال کر سیدھے گھر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

وہ جونہی اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا، اسے ایملی کا سامنا کرنا پڑا جو اس کی ریوالونگ چیئر پر دروازے کی طرف رخ کیے بیٹھی تھی۔ اسٹیو ایک لمحے کو چونکا اور پھر چند قدم آگے بڑھ کر اس نے اپنا سیاہ چرمی بیگ ایک میز کے پاس فرش پر رکھ دیا۔ ایملی کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”یہ میرے لیے کوئی خوشی تو نہیں ہے نا؟“ ایملی گہری متانت سے بولی۔

”میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔“ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

”مرنے والے حملہ آور کے اپارٹمنٹ کی چابی میری چابیوں کے گچھے میں تھی۔“ ایملی نے کہا۔ ”میرے ہاتھوں اس کی ہلاکت کے بعد کسی نے اس کی چابی میرے چابیوں کے گچھے میں لگا دی تھی اور دنیا میں صرف ایک ہی شخص ایسا کام کر سکتا تھا۔“

”میں۔“ اسٹیو اس کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔

”کیوں؟“

”تمہارے تحفظ کے لیے۔“

”کس سے؟“

”تمہارے عاشق سے۔“

ایملی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ اسٹیو کو غیر یقینی نظروں سے گھورتی چلی گئی۔

”ہاں! اگر کسی اور نے تمہاری یہ تصویریں کھینچی ہوں تو اور بات ہے۔“ اسٹیو نے ایک دراز میں سے ایک لفافہ نکالا جس پر اس کا نام اور پتا ٹائپ تھا اور لفافہ اس کے سامنے میز پر پھینک دیا۔

ایملی نے لفافہ کھولا اور ڈیوڈ کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں کھینچی گئی اس کی متعدد تصویریں میز پر بکھر گئیں۔ ایملی کی رنگت کفن کے مانند سفید پڑ گئی۔ اس کے گلابی ہونٹ سفید پڑ گئے۔ وہ میز پر سے اٹھی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

اسٹیو کہہ رہا تھا۔ ”حیران کن بات یہ ہے کہ دور سے بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں محبت کرتے ہیں۔ اس نے کوئی دو مہینے پہلے مجھے آفس میں فون کیا تھا اور بڑک ماری تھی کہ تم اسے کس قدر چاہتی ہو۔ میں اب تک اسے ایک لاکھ ڈالرز دے چکا ہوں اور وہ کہیں زیادہ مطالبہ کر رہا ہے۔“

”کس لیے؟“

”تعلقات ختم کرنے کے لیے۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ ایملی نفی میں اپنا سر ہلانے لگی۔

اسٹیو نے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ ”کیا اس نے ’جیل ٹرمز‘ کا ذکر کیا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”ہوں۔“ اسٹیو نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا اور بڑھ کر دراز میں سے ایک فائل نکال لی۔ ”وہاں اس نے دوسری عورتوں کو دھوکے دیے تھے۔ اکیلی مال دار عورتوں کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔“ اس نے فائل ایملی کی طرف بڑھا دی۔

ایملی نے فائل اس سے لے کر کھول لی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ڈیوڈ اور ایک ادھیڑ عمر... عورت کی مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔ ڈیوڈ کے ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ تھا اور دونوں ایک دوسرے سے چپکے ہوئے تھے۔ دوسری تصویر جیل کے اندر کھینچی گئی تھی جب وہ سزا کاٹ رہا تھا۔ اس کے جسم پر قیدیوں کا مخصوص لباس اور سینے پر قیدی نمبر 5659890 تحریر تھا۔ ایک اور تصویر میں وہ جیل کی کوٹھری میں بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ تصویروں کے ذیل میں اس کی پوری ہسٹری درج تھی۔

اسٹیو کہہ رہا تھا۔ ”جیسا کہ تم سمجھ سکتی ہو، اس نے وہ مصوری بر کلے میں نہیں جیل میں سیکھی تھی۔“

ایملی نے فائل پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اس کے کانوں سے اسٹیو کی آواز ٹکرا رہی تھی۔ ”پتا نہیں، اب آگے ہمارا کیا بنے گا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں

www.pkdigest.com

کہ اب "ہم" کہنا بھی مناسب ہوگا یا نہیں لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں نے تمہیں اس عادی مجرم سے بچانے کی پوری کوشش کی ہے جسے تم اپنی زندگی میں داخل کر بیٹھی ہو۔"

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"مجھے یقین تھا کہ تم اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہو۔" اسٹیو نے جواب دیا۔ "ایسا ہی ہے نا؟"

"میں یہی سمجھتی تھی۔" ایملی منہ چھپا کر رونے لگی۔ "اوہ، میرے خدا... میں تصور کرسکتی ہوں کہ میں نے تمہیں کس قدر دکھ دیے ہیں۔ کیا اس لیے تمہارا کاروبار بھی مشکلات کا شکار ہے؟"

"مشکلات؟" وہ چونک کر بولا۔

"بیک مارجن کالز...!"

"تمہیں یہ کیسے پتا چلا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" ایملی بولی۔ "لیکن یہ سچ تو ہے نا؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔" اسٹیو نے کہا۔ "لیکن میں دولت کمالوں، یہی سب سے دلچسپ بات بھی ہے۔ دنیا میں دولت بے حساب ہے لیکن تم صرف واحد ہی ہو۔"

"لیکن تم نے حملہ آور کی چابی میرے چابیوں کے گچھے میں کیوں ڈال دی تھی؟"

"ڈیوڈ نے شروع ہی میں تشدد کی دھمکی دے ڈالی تھی۔" اسٹیو نے اسے آرام سے صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "جب میں نے کچن میں لاش دیکھی تو مجھے یقین تھا کہ یہ وہی ہوسکتا ہے۔ کوئی بھی دروازہ زبردستی نہیں کھولا گیا تھا، چنانچہ میں سمجھا کہ تمہاری چابی اس کے پاس ہوگی۔"

"لیکن کب؟ اس رات کو گھر میں داخل ہونے کے لیے میں نے چابی استعمال کی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے اپنی چابی ہی استعمال کی تھی؟ کیونکہ مجھے ٹھیک یاد ہے کہ دروازے کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ میں نے تمہیں اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔"

"ہوسکتا ہے۔"

"اس صورت میں وہ کسی بھی وقت تمہاری چابی استعمال کرسکتا تھا۔ کیا ایک روز پہلے بھی تم اس سے ملی تھیں؟"

"ہاں۔" ایملی شرمندگی سے بولی۔

"چنانچہ جب میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو مجھے چابی مل گئی جسے میں اس کی سمجھا اور ردعمل کے طور پر اسکرو ڈرائیور سے دروازہ جام کردیا اور وہ چابی واپس اس کی جیب میں ڈال دی۔ پھر جسے تمہاری چابی سمجھا اسے لیا اور تمہارے چابیوں کے گچھے میں ڈال دیا۔" اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ "جانِ من! یہ سب بتا کر دکھ دینے کا مجھے بے حد افسوس ہے لیکن میں اتنا ہی کرسکتا تھا۔"

"کیا تم مجھے کبھی معاف کرسکو گے؟" ایملی گہری شرمندگی اور تاسف سے بولی۔

"ہنی! میں تمہیں پہلے ہی معاف کرچکا ہوں۔"

ایملی اس کے سینے سے لگ گئی۔ "تمہیں پولیس کو مطلع کردینا چاہیے۔"

"کیوں؟" اسٹیو چونک پڑا۔ "یہ تلخ حقیقت بتانے کا وقت نہیں ہے۔ میں قتل کے معاملے میں شہادتیں چھپا چکا ہوں۔ میں نے بلیک میلنگ کی رقم بھی ادا کردی ہے۔ اب میں بری طرح چکر میں آچکا ہوں اور تم بھی آچکی ہو۔ میرا مطلب ہے... اس پر ذرا غور کرکے دیکھ لو... ڈیوڈ جو چاہے جھوٹ بول سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ تمہیں قتل کروانے کے لیے میں نے اسے مقرر کیا تھا یا وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہمیں بلیک میل کررہا تھا، ایک رئیس شادی شدہ جوڑے کو... تو پھر لگے گا کہ ہم نے ڈیوڈ کے دھوکے میں اس بے چارے شخص کو قتل کر ڈالا ہے۔ سارا انحصار اس پر ہوگا کہ وہ کیسے اپنا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔"

"جس شخص کو میں نے قتل کیا ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ایملی پوچھ بیٹھی۔

"کیا تمہارے خیال میں اس کا ڈیوڈ سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا؟ یقیناً ہوگا۔ تمہیں اندازہ ہے کہ شہر میں روزانہ کتنی ڈکیتیاں ہوتی ہیں؟ میں ایسا نہیں سمجھتا کہ اس کا ڈیوڈ سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔"

"اب تم کیا کرو گے؟"

"تمہیں اور مجھے اس آرٹسٹ دوست سے تعلق توڑنا پڑے گا۔" اسٹیو نے جواب دیا۔ "کیا اس کے یہاں کوئی ایسی چیز ہوسکتی ہے جس کی بنا پر ڈیوڈ کا تم سے اور مجھ سے تعلق نکالا جاسکے؟"

"میری انگوٹھی۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ وہ انگوٹھی تم نے مرمت کے لیے دے رکھی ہے؟"

"وہ جھوٹ تھا۔" ایملی نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر اسٹیو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ میں بستر پر چھوڑ آئی تھی۔"

"اور کچھ؟" اسٹیو نے چاپلوسی سے پوچھا۔

"کیا یہ کافی نہیں؟"

"وہ میں لے لوں گا۔" اس نے آگے بڑھ کر اپنا سیاہ چرمی بیگ اٹھالیا پھر گردن موڑ کر پوچھا۔ "جب میں واپس آؤں گا تو کیا تم گھر پر ہوگی؟"

"ہاں۔" ایملی نے گلوگیر لہجے میں کہا اور صوفے پر بے دم سی ہوکر لیٹ گئی۔

اسٹیو اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔

☆☆☆

وہ سیدھے ڈیوڈ کی رہائش گاہ پہنچا لیکن اس کے صدر دروازے پر ایک پیغام چسپاں تھا۔ لکھا تھا۔ "اسٹیو! بہت افسوس ہے۔ پلان بدل گیا ہے۔ بیس منٹ میں واشنگٹن اسکوائر پہنچو۔ درست کرنا۔" کاغذ میں ایک انگوٹھی تھمی تھی۔ اسٹیو نے وہ انگوٹھی نکال لی۔ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسٹیو نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔

"میں مسٹر ڈیوڈ شا کے لیے کال کررہی ہوں۔"

"بول رہا ہوں۔" اسٹیو نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"ٹرومین ٹریول آج شام کی آپ کی ریزرویشن کی تصدیق کررہے ہیں۔"

"شکریہ۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور وہاں سے نکل گیا۔

☆☆☆

واشنگٹن اسکوائر میں ڈیوڈ شا اس کا انتظار کررہا تھا۔ وہ اسٹیو کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگا۔ "معاف کرنا مرا کیا آپ مجھے چار لاکھ ڈالرز دے سکتے ہیں؟"

اسٹیو مسکرایا۔ "کیوں نہیں دے سکتا۔" اس نے جواب دیا اور بیگ زمین پر رکھ دیا۔

ڈیوڈ نے وہ بیگ اٹھالیا۔ "یہ مت سمجھنا کہ موقع ملتے ہی میں اسے گنوں گا نہیں۔" وہ بولا۔

"ظاہر ہے۔" اسٹیو نے کہا۔

ڈیوڈ نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ماچس کی ڈبیا کے برابر ایک ننھا سا آڈیو کیسٹ نکالا۔ اس پر ایملی کی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر تھی۔ اس نے اس کو چوما اور اسٹیو کی طرف بڑھا دیا۔ "اسے اپنی یادگار کی کاپی سمجھ لینا۔" وہ بولا۔

اسٹیو نے وہ ننھا سا آڈیو کیسٹ لے کر دیکھا اور مسکرا دیا۔ ڈیوڈ نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھایا۔ "تم سے کاروبار کرکے خوشی ہوئی اسٹیو۔" اس نے تمسخرانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ "خدا حافظ!"

اسٹیو اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ "اپنا خیال رکھنا۔" اس نے پکار کر کہا۔

ڈیوڈ یہ سن کر مڑا اور مسکرا کر ہاتھ لہراتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسی وقت وہاں سے گزرتا ہوا ایک ٹرک ان کے درمیان حائل ہوگیا۔ ٹرک کے گزرتے ہی ڈیوڈ نے مڑ کر دیکھا اسٹیو کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ میدان صاف تھا۔ ڈیوڈ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا اور چھپتا چھپاتا ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ایک سرکلر ٹرین نیوجرسی روانہ ہورہی تھی۔ وہ اس میں سوار ہوگیا اور اس بیگ کو سینے سے چمٹائے ہوئے بھیڑ میں راستہ بناتا ہوا ایک قطار میں کھڑا ہوگیا۔ ٹرین روانہ ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ وہ اب خود کو محفوظ تصور کرنے لگا تھا۔ سیاہ چرمی بیگ میں چار لاکھ ڈالرز اور اس کے اپنے سامان میں ایک لاکھ ڈالرز، کل پانچ لاکھ ڈالرز تھے وہ پانچ لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم کا بلاشرکت غیرے مالک تھا۔ بیکس فری... قسمت نے بھی کیسی یاوری کی تھی۔ وہ ان پانچ لاکھ ڈالرز سے ایک شاہانہ زندگی کا آغاز کرسکتا تھا۔ نیا شہر نئی زندگی...! اب اس کا داغ دار ماضی اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ اسٹیو اور ایملی محض ایک بھیانک خواب بن کر رہ جاتے۔ اسے نیوجرسی کے میڈونا ریلوے اسٹیشن سے مونٹریال جانے والی ٹرین پکڑنی تھی جس کی وہ ریزرویشن کروا چکا تھا۔

☆☆☆

نیوجرسی پہنچ کر سرکلر ٹرین میڈونا ریلوے اسٹیشن پر رک گئی۔ وہ اترا اور سب وے کی طرف چل پڑا۔ وہ خاصا گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ ایک بے نام سے خوف نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا سیڑھیاں اتر کر سب وے میں پہنچ گیا۔ اسٹیو کا خوف اب تک اس کا پیچھا کررہا تھا۔ سب وے میں مونٹریال روانہ ہونے والی ٹرین کھڑی تھی۔ اس نے ایک کمپارٹمنٹ کے باہر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلیکٹر کو اپنا ٹکٹ دکھایا۔ "ادھر تشریف لائیں۔" اس نے کہا اور اسے اس کے کمپارٹمنٹ میں پہنچا دیا۔

اس نے دروازہ بند کرلیا اور آرام دہ نشست پر خود کو گرا دیا۔ اس کے منہ سے اطمینان کی ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ ائرکنڈیشنڈ اپارٹمنٹ میں سکون ہی سکون تھا۔ اس نے سیاہ بیگ سے جوتے کا ڈبا نکالا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں لاکھ لاکھ ڈالرز کی چار گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اسٹیو نے اسے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ مطمئن ہوگیا اور اس نے مسکرا کر ڈبا بند کردیا۔

اچانک باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ یکبارگی

www.pkdigest.com

اچھل پڑا اور نہایت پھرتی سے اس نے اپنا ریوالور نکال کر دروازہ نیم وا کر دیا اور اس کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر ٹکٹ کلیکٹر کھڑا تھا۔

"میں صرف یہ بتانے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ ڈائننگ کار سات بجے اپنی سروس کا آغاز کر دے گی۔" وہ شائستگی سے بولا۔ "اور ٹھیک دس بجے بند ہو جائے گی... اوکے؟"

"شکریہ۔" ڈیوڈ کی جان میں جان آئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی جیکٹ اتارنے لگا۔

جیکٹ اتار کر اس نے اسے سیٹ پر پھینک دیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ اچانک واش روم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور چھرا بدست اسٹیو نمودار ہوا۔ اگلے ہی لمحے اس نے چھرا ڈیوڈ کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

"آ... آ... آ... ہ..." ڈیوڈ کے منہ سے ایک طویل کرب ناک چیخ بلند ہوئی اور اس کے دیدے الٹ گئے۔

"یہ گندہ کام کیسا ہے؟" اسٹیو جبڑے بھینچ کر چھرے کو اس کے پیٹ میں گھماتا ہوا، کسی سانپ کے مانند پھنکارا۔ اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا۔ یہ ایک قاتل کا سفاک چہرہ تھا۔ اس کی سفاک آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ اس نے دوسرے جھٹکے سے چھرا دستے تک اس کے پیٹ میں اتار دیا اور اسے سیٹ پر دھکیل دیا۔ چھرے پر اس کی گرفت اب بھی مضبوط تھی۔ "تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔" وہ دانت پیس کر غرایا۔ "مرنے کے بعد ہی فن کاروں کی زیادہ قدر کی جاتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اس کی بیلٹ سے اس کا ریوالور اچک لیا۔

"تم ہار گئے۔" ڈیوڈ کے منہ سے کرب آمیز کراہ نکلی۔

"مجھے افسوس ہے، تمہیں ذرا اونچا بولنا پڑے گا۔ مجھے سنائی نہیں دیا۔" اس نے اس کے پیٹ میں دھنسے ہوئے چاقو پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ "تم مر رہے ہو۔" وہ دھتکارا۔

لہولہان ڈیوڈ نے سخت جاں کنی کے عالم میں اپنے پاس موجود تھیلے سے آڈیو کیسٹ کو پتلون کی جیب میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ یہ اس آڈیو کیسٹ کی ایک کاپی تھی جو اس نے اسٹیو کے حوالے کی تھی۔ اسٹیو نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی اور وہ آڈیو کیسٹ اس کی جیب سے نکال کر اپنے اوورکوٹ کی جیب میں ڈال دی۔ اچانک اس کی نظر ڈیوڈ کی پتلون میں اڑسے ہوئے ایک زرد رنگ کے کاغذ پر پڑی۔ اس نے وہ کاغذ ایک جھٹکے سے کھینچ لیا اور اسے کھول کر پڑھا۔ یہ کسی پارسل کی رسید تھی۔ اس پر ایملی کا نام اور پتا تحریر تھا۔ اسٹیو کی آنکھیں بھیانک انداز میں پھیل گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ ڈیوڈ نے ایملی کو کیا چیز پارسل کی ہوگی۔

"اسٹیو کا عظیم کارنامہ!" ڈیوڈ کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے اور بکھر گئے۔ وہ سیٹ پر سے اوندھے منہ فرش پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

اسٹیو نے اسے چھوڑ کر جوتے کا ڈبا جس میں چار لاکھ ڈالرز تھے، چرمی بیگ میں رکھا اور تیزی سے کمپارٹمنٹ سے اتر گیا۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن کے باہر پہنچ کر اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھا گھر پہنچ گیا۔ "کیا آج میرے نام کوئی پیکٹ آیا ہے؟" اس نے بلڈنگ کے منیجر البرٹ سے پوچھا۔ وہ بہت عجلت میں لگ رہا تھا... بہت حواس باختہ بھی۔

"ہاں، صرف ایک پیکٹ۔" البرٹ نے جواب دیا۔ "لیکن آپ کی مسز ڈاک کے ہمراہ وہ پیکٹ اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔"

وہ تیزی سے لفٹ کی طرف لپکا۔ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایملی پر پڑی جو ٹیرس میں اس کی جانب پشت کیے کھڑی تھی۔ سامنے ڈاک ایک میز پر پڑی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور سارے بل وغیرہ ایک طرف رکھ کر لفافے چھانٹنے لگا۔ اس میں وہ لفافہ بھی موجود تھا۔ اس نے وہ لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ننھا سا اوریجنل آڈیو کیسٹ برآمد ہوا۔ اس نے وہ آڈیو کیسٹ لفافے سمیت بیگ میں ڈال لیا اور اپنے لاکر کی طرف لپکا۔ اس نے بیگ لاکر میں رکھ کر لاکر بند کیا ہی تھا کہ آہٹ سن کر ایملی اندر آ گئی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اپنی میز پر بکھرے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرنے کی اداکاری کرنے لگا۔ پھر چونک کر ایملی کو دیکھا۔

"مجھے علم نہیں تھا کہ تم گھر پر ہو۔" وہ بولا۔

"میں ٹیرس میں تھی۔" ایملی نے جواب دیا۔

اسٹیو نے آگے بڑھ کر اسے اس کی انگوٹھی دکھائی۔ ایملی نے خوش ہو کر اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ اسٹیو نے انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی اور ایملی اس کے سینے سے لگ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"اب نئے آغاز کا وقت آ گیا ہے۔" اسٹیو اسے اپنے سینے سے لگائے ہوئے چاہت آمیز لہجے میں بولا۔ "کیا خیال ہے، آج کہیں ڈنر کرنے چلیں؟ صرف ہم دونوں... کسی خاموش سی پُرسکون جگہ... کہیں قریب ہی... ٹھیک ہے؟"

"ہاں، ٹھیک ہے۔" ایملی اس سے الگ ہو کر مسکرانے لگی۔

"میں ابھی آیا۔ ذرا نہا لوں۔" وہ بولا اور باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

ایملی کچھ دیر تک بیڈ پر خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پھر اچانک اس کی نظر کمرے کے باہر فرش پر رکھے ہوئے سیاہ چرمی بیگ پر پڑی۔ وہ آہستہ سے اٹھی، اس نے محتاط نظروں سے باتھ روم کی طرف دیکھا اور بڑھ کر اس بیگ کو کھول لیا۔ اندر صرف جوتے کا ایک خالی ڈبا رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی اور چہرے پر غور و فکر کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔

☆☆☆

اسٹیو نہا دھو کر باتھ روم سے نکلا اور ڈریسر کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے چہرے پر کریم ملنے لگا۔ "ہنی!" اسے فاصلے سے ایملی کی آواز سنائی دی۔

"ہاں۔" وہ بولا۔

"آج رات گھر ہی پر رہتے ہیں۔ میں کھانے کے لیے جا کر کچھ لے آؤں؟"

"تمہاری بڑی مہربانی۔ ہاں، مگر دیر مت کرنا۔"

"نہیں کروں گی۔"

"اوکے۔" وہ اپنے بال سنوارنے لگا۔

"اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں، میرا خیال ہے کہ ہمیں تالے بدل ڈالنے چاہئیں۔"

اسٹیو کا ہاتھ رک گیا۔ اس کے ذہن میں ایک شبہے نے سر ابھارا۔ اس نے برش رکھ دیا اور ہال میں آ گیا۔ "کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"کیونکہ ابھی تک مجھے اپنی چابی نہیں ملی ہے۔" ایملی نے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔ میں کل صبح تالے والے کو بلا لوں گا۔"

ایملی چلی گئی۔ اسٹیو نے باہر کا دروازہ بند ہونے کی ہلکی سی آواز سنی اور پھر تیزی سے ہال اور پھر کچن عبور کر کے پچھلا دروازہ کھول کر نکاسی کے پائپ کے پاس پہنچا۔ وہ مقناطیسی ڈبیا جس میں چابی تھی، اپنے مقام پر نہیں تھی بلکہ اب پائپ کے پہلو میں چپکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے چونک اٹھا۔ پھر وہ ڈبیا لے کر اندر آ گیا۔ چابی ڈبیا میں موجود تھی۔ وہ ہال سے گزر ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں سے ایملی کی آواز ٹکرائی۔ "اس نے اندر آتے ہوئے رکھ دی ہوگی۔"

وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

"تم نے ایسا منصوبہ تو نہیں بنایا تھا؟" ایملی دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔

اس نے آہستہ سے اس کی طرف گردن موڑی اور پھر خود بھی مڑ گیا۔ "نوجوان ڈیوڈ بے حد قابلِ اعتبار تھا۔" وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں چابی اب بھی موجود تھی۔

"شاید تم دونوں کو ایک ہی کوٹھری میں رہنا پڑے۔"

"کیوں؟ کیا اس کی وجہ سے؟" اس نے چابی بلند کر کے اسے دکھائی۔ "تمہاری کھوئی ہوئی چابی ذرا دیر پہلے ہی مجھے ملی ہے۔"

"یہ تم نے اسی کے لیے چھوڑی تھی۔"

"تمہارا مطلب ہے، اس شخص کے لیے جس کو تم نے مار ڈالا تھا؟" وہ بولا۔ "سوری! میں اس شخص سے کبھی نہیں ملا تھا۔"

"ڈیوڈ ملا تھا۔"

"حکام کو یہ ثابت کرنے میں سخت دشواری پیش آئے گی کہ میں ڈیوڈ کو جانتا بھی تھا۔"

"بلیک میل سے یہ ثابت ہو جاتا ہے۔"

"کیسا بلیک میل؟ صرف ایک خط اس نے لکھا تھا اور مجھے افسوس ہے کہ وہ غائب ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے ایملی کہ ہم ایک عام شادی شدہ جوڑا ہیں جو تعلقات ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تعلقات... تعلقات ٹھیک کرنے کی کوشش؟" ایملی نے نم ناک آنکھوں سے بہ یک وقت روتے اور ہنستے ہوئے کہا۔ "تو پھر یہ کیا ہے؟" اس نے ایک پاکٹ ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھ دیا اور اس کا بٹن آن کر دیا۔

ٹیپ ریکارڈر ہی سے اسٹیو کی آواز سنائی دینے لگی۔

"...کیونکہ جب میں تاش کھیلنے جاتا ہوں تو اس کا بھی یہی معمول ہے...!"

اسٹیو کا چہرہ فق ہو گیا اور آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔

"...تو یہ کام تب ہی میں کیوں نہ کر دوں؟" ڈیوڈ کی آواز ٹیپ ریکارڈر سے ابھری۔

"سیف کے قفل کی ترتیب پسند آئی؟ یہ ہماری شادی کی تاریخ ہے اسٹیو۔" ایملی اس سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔ "ٹھیک کرتے پھرو... رشتہ ٹھیک کرتے پھرو... میری طرف سے رشتہ ختم ہو چکا ہے۔" وہ یکبارگی حلق پھاڑ کر چیخی اور دروازے کی طرف بھاگی۔

اسٹیو نے لپک کر اسے دروازے پر جا لیا۔ "یہ میں

www.pkdigest.com

بتاؤں گا کہ کب ختم ہو سکتا ہے۔'' وہ غضب ناک ہو کر دھاڑا اور اس نے ایملی کو جکڑ لیا۔

ایملی نے زور سے اپنا ہاتھ فضا میں گھمایا اور اس کی انگشتری کا نکیلا کونا اسٹیو کے بائیں نتھنے کو چیر گیا۔ ایملی نے پھر دروازہ کھول کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسٹیو نے اسے دونوں شانوں سے جکڑ کر فرش پر پھینک دیا۔ ایملی پھسلتی فرش پر دور تک پھسلتی چلی گئی۔ پھر سیدھے ہوتے ہوئے ایملی نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔

''تم مرنے کے بعد ہی مجھے چھوڑ کر کہیں جا سکو گی۔'' اسٹیو جارحانہ انداز سے اس کی طرف بڑھتا ہوا کہہ رہا تھا۔

ایملی نے فائر کر دیا۔ گولی اسٹیو کے شانے میں... لگی۔ وہ ایک کرب ناک چیخ کے ساتھ چکراتا ہوا، دیوار سے جا ٹکرایا۔ ایملی کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ اٹھ کر باہر کی سمت بھاگی۔ یکایک اسٹیو نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کا پیر پکڑ کر اسے گھسیٹ لیا۔ ایملی اوندھے منہ فرش پر گری اور اس کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چکنے فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ وہ پستول کے حصول کے لیے رینگتی ہوئی آگے بڑھی اور پستول اس کے ہاتھ آگیا۔ اسی وقت اسٹیو نے پھر اسے پیچھے کی طرف گھسیٹ لیا۔ ایملی بل کھا کر پلٹی۔ اسٹیو نے اس پر چھلانگ لگائی۔ ایملی نے دوبارہ اس پر فائر کر دیا۔ اسٹیو کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اس کے جسم نے کئی جھٹکے کھائے اور پھر وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے سے ابلتا ہوا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔ ایملی حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی لاش کو گھور رہی تھی۔

☆☆☆

اس کے وسیع و عریض، بے داغ، شاہانہ طرز پر سجے سجائے اپارٹمنٹ میں سراغ رسانوں کا مجمع تھا۔ اسٹیو کی لاش اٹھائی جا چکی تھی۔ سراغ رساں حضرات ٹولیوں کی صورت میں ادھر ادھر کھڑے سرگوشیوں میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ سب کے سب اپنی جگہ حیرت زدہ تھے۔ وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے دوسرے سرے پر بچھی ہوئی میز، تیز دودھیا روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ وہاں سراغ رساں محمد کامران اور ایملی ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ چند سراغ رساں دیواروں کے ساتھ ساتھ بالکل خاموش کھڑے تھے۔ میز پر رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ آن تھا اور فضا میں اسٹیو کی آواز گونج رہی تھی...

''... میں ہمیشہ سے سمجھتا آیا ہوں کہ وزنی چیز کا استعمال ہی وقتی ردعمل لگ سکتا ہے... شاید تم ان میں سے کوئی چیز استعمال کرنا چاہو... جیولری تمہیں بیڈ روم میں ملے گی... سروس کے داخلے کے تالے کو ناکارہ کر کے یوں بتا دینا جیسے وہ جام ہو گیا ہو... چابی دوبارہ پائپ کے نیچے رکھ کر اسی راستے سے لوٹ جانا جس راستے سے آئے تھے...''

''... اور اگر پلان گڑبڑ ہو گیا تو پھر کیا ہوگا؟'' یہ ڈیوڈ کی آواز تھی جسے ایملی اچھی طرح پہچانتی تھی۔

''ایسا نہیں ہوگا۔'' اسٹیو کی آواز پھر سنائی دی۔

ایملی اور سراغ رساں کامران سمیت سب لوگ گویا سکتے کے عالم میں سن رہے تھے۔

''تمہارا... تاش کا کھیل کس دن ہے؟'' ڈیوڈ کی آواز پھر ابھری۔

''کل رات۔''

''کل؟''

''تم جیسے ماضی والے شخص کے لیے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنے میں وقت نہیں لگے گا۔''

کامران نے ایملی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کو تک رہی تھی۔ انہیں گویا اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''مجھ جیسے شخص کو تو ایک لاکھ ڈالرز لے کر فرار ہو جانا چاہیے۔'' ڈیوڈ کی آواز سمع پر گونجی۔ پھر بریف کیس کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

''لیکن بقیہ چار لاکھ ڈالرز لینے کے لیے تم یہ کام ضرور کرو گے۔'' یہ اسٹیو کی آواز تھی۔

ٹیپ ختم ہو گیا۔ سراغ رساں کامران نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کر دیا اور تشویش آمیز ہمدردانہ نظروں سے ایملی کی طرف دیکھا۔ ایملی کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ بھی کامران کو تک رہی تھی اور اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

''اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے مار ڈالے گا۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں سرگوشی کی۔ ''چنانچہ میں نے بھاگنے کی کوشش کی۔''

''اور پھر اس نے تم پر حملہ کر دیا؟'' کامران نے پوچھا۔

''ہاں۔'' ایملی کی آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

''اور تم کر بھی کیا سکتی تھیں؟'' وہ گہرے دکھ سے بولا اور پھر اس نے ایک طویل سانس لیا۔

''اللہ تم پر مہربان ہو۔'' کامران نے گہری متانت سے کہا۔

''اور تم پر بھی۔'' ایملی کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی اور وہ برستی آنکھوں سے کامران کو تکتی چلی گئی۔

آرزوئے دل کو کسوٹی کے پیمانوں میں رکھنے والے جفا گزیدہ کا تحیر انگیز ماجرا

سایہ

سیماب کمال

سرشتِ انسان میں حکم عدولی، تجسس اور خواہشات کی مثلث ہوتی ہے...... خواہشات جو ہر دل میں موجزن ہوتی ہیں اور ان خواہشات کو رکھنے والے ان کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت سرگرداں رہتے ہیں مگر جب ایک ہی خواہش دل میں گھر کر جائے تو پھر زندگی متزلزل ہو کر رہ جاتی ہے...... ایک آسودہ حال شخص کا ماجرا جس کے دل میں صرف ایک خواہش پل رہی تھی...... تکمیلِ آرزو ہی اس کی منزلِ مقصود تھی......

اندرون شہر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔

تین منزلہ عمارت کی آخری منزل میں ایک بند کمرے کے اندر ایک جوان مرد اور تین جوان عورتوں کی سربریدہ برہنہ لاشیں دریافت ہوئی تھیں۔ عورتوں کے سر بھی وہاں موجود تھے اور تینوں لاشوں میں مسالا لگا ہوا تھا۔ پولیس اور عوام کے لیے وہ لاشیں معمّا بنی ہوئی تھیں۔ حیرت کی بات تھی کہ مرد کی لاش نہ ہی سربریدہ تھی... اور نہ ہی اس میں مسالا لگا ہوا تھا... اور لاشوں کی دریافت کا سہرا بھی اسی لاش کے سر جاتا تھا... کیونکہ شہر کے اس پرانے محلے میں جہاں گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور گلیاں بے حد تنگ تھیں، لاش کے شدید تعفن کے باعث آس پاس کے لوگوں نے علاقے کے تھانے میں اطلاع کی تھی۔ چاروں قتل ایک ہی تیز دھار دار آلے سے ہوئے تھے... اور یہ ایک بڑی چھری تھی۔ یہ چھری مرد کے سینے میں پیوست تھی۔ یا تو قاتل کو چھری نکالنے کا موقع نہیں مل سکا تھا یا پھر اس چوتھے قتل کے بعد اسے اس چھری کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ یہ چاروں قتل ایک ہی شقی القلب انسان نے کسی انتقامی کارروائی کے تحت کیے ہیں۔ چھری پر کسی کی انگلیوں کے نشان نہیں تھے۔

قتل ہونے والا مرد شہر کا ایک صنعت کار تھا... اور یہ

www.pkdigest.com

تینوں برہنہ سربریدہ لاشیں اس کی بیویوں کی تھیں۔ جو پراسرار طور پر غائب ہو چکی تھیں۔ صنعت کار ایک شریف اور خاموش طبع انسان تھا اور یہ عمارت جو اندرون شہر کے اس پرانے محلے میں تھی، اسی کی ملکیت تھی... جبکہ وہ یہاں شاذونادر ہی آتا جاتا تھا۔

پولیس کی تفتیش کے بعد صرف اتنی بات واضح ہو سکی تھی کہ صنعت کار اصغر حسین ملک ایک تنہا آدمی تھا۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے جن عورتوں سے شادی کی وہ بھی لاوارث، تنہا اور خودمختار عورتیں تھیں۔ وہ عام لوگوں کی زندگی میں دخل نہیں دیتا تھا اس لیے عام لوگوں کی دخل اندازی کو پسند بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کے ماتحت خاصا بڑا عملہ تھا لیکن قریبی دوست احباب کوئی خاص نہ تھے۔ جو ایک دو تھے بھی وہ اس کی زندگی کے متعلق زیادہ نہیں جانتے تھے۔

اس پرانے محلے میں جہاں قتل ہوئے... یا لاشیں دریافت ہوئیں، وہاں کے لوگ بھی صرف اتنا ہی بتا سکے کہ ملک سرور حسین یہاں اس عمارت میں برسوں سے آباد تھا۔ اصغر کی ماں کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ سرور حسین نے دوسری شادی کر لی تھی جس سے اس کے تین بچے اور ہوئے تھے، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا... یہ بچے ابھی چھوٹے ہی تھے جبکہ اصغر حسین بچپن کی حدود پار کر کے لڑکپن کو چھو رہا تھا... کچھ عرصے بعد سرور حسین کا بھی انتقال ہو گیا۔ اصغر کی سوتیلی ماں سلیمہ بی بی کا سلوک سوتیلے بیٹے کے ساتھ کچھ اچھا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک دن وہ گھر سے فرار ہو گیا۔

سلیمہ بی بی شوہر کے انتقال کے بعد زیادہ عرصہ وہاں نہیں رہی۔ پنجاب کے کسی دوسرے شہر سے اس کے بھائی آئے اور یہ عمارت بیچ کر بہن اور اس کے بچوں کو لے کر چلے گئے۔

پندرہ سولہ برسوں کے بعد اصغر حسین ایک دن قیمتی کار میں آیا اور اپنی یہ آبائی عمارت خرید لی... لیکن وہ اس جگہ بہت کم آتا تھا۔ محلے والوں کا کہنا ہے کہ اس کے ساتھ اکثر اس کی بیوی ہوتی تھی... کون سی بیوی، اس کی وہ نشان دہی نہیں کر سکے تھے۔ شاید چھوٹے لوگوں کے نزدیک ہر فیشن ایبل عورت ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ شہر کے پوش علاقے میں اصغر حسین کی کوٹھی تھی۔ وہاں نوکروں سے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے تحت اصغر حسین نے ایک ہزار گز پر بنی ہوئی یہ کوٹھی چھ برس پہلے خریدی تھی اور خانساماں، مالی اور ان کے بیوی بچے تب ہی سے اس کے ساتھ تھے اور کوٹھی میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹرز میں رہتے تھے... ان کے بیوی بچے بھی کوٹھی میں کام کرتے تھے۔

ان کے مطابق جس وقت وہ لوگ کوٹھی میں ملازم ہوئے، صاحب اور ان کی بیگم وہاں رہتے تھے۔ بیگم صاحبہ کو صاحب جمی کہہ کے بلاتے تھے۔ بیگم صاحبہ پتلونیں پہنتی تھیں اور مردوں کی طرح بال بناتی تھیں۔ دونوں میں بظاہر کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا لیکن اچانک ہی بیگم صاحبہ گھر سے غائب ہو گئیں۔ ملازموں کو کچھ پوچھنے کی ہمت تو نہ تھی پھر بھی دبے الفاظ میں پوچھنے پر صاحب نے بتایا تھا کہ انہوں نے بیگم صاحبہ کو چھوڑ دیا ہے۔

پھر ایک روز صاحب کی دوسری بیوی گھر آ گئیں ان کا نام صبا تھا۔ وہ بہت اچھی تھیں۔ پہلی بیگم صاحبہ کی طرح ملازموں سے سخت رویہ بھی نہیں تھا... بڑی ہنس مکھ اور ملنسار تھیں۔ شلوار قمیص پہنا کرتی تھیں... مگر وہ بھی زیادہ عرصہ نہ رہیں۔ ایک روز صاحب اور بیگم صاحبہ ایک ساتھ باہر گئے... مگر اگلی صبح صاحب اکیلے واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ بیگم صاحبہ کو ان کے ماں باپ کے گھر چھوڑ آئے ہیں۔ آگے کسی ملازم کو کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی... ان کی بیویوں کے رشتے دار بھی ان سے ملنے نہیں آئے اور جب تیسری بیگم آ گئیں تو انہیں خود ہی علم ہو گیا کہ انہوں نے صبا بیگم کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ یہ تیسری بیگم جن کا نام فرخندہ تھا، بہت سنجیدہ تھیں اور زیادہ تر ساڑیاں پہنتی تھیں۔

ان کا رویہ ملازموں سے سخت تو نہ تھا مگر وہ صبا کی طرح بے تکلف بھی نہ تھیں۔ وہ بھی جاب کرتی تھیں۔

دونوں میاں بیوی صبح ساتھ ہی نکلا کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ شاید کسی کالج میں پڑھاتی تھیں اسی لیے گرمیوں میں وہ گھر میں رہتی تھیں۔ تب ہی صاحب نے سیر و تفریح کا پروگرام بنایا۔ وہ لوگ ہفتہ بھر کے لیے باہر چلے گئے... مگر ایک ہفتے بعد آئے تو صاحب اکیلے تھے۔ اس کے بعد صاحب ایک عرصے سے اکیلے ہی تھے۔ صاحب اکثر ملک سے باہر جاتے رہتے تھے۔ ابھی پچھلے دنوں بھی وہ دو ماہ کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے لیکن واپس نہیں لوٹے۔ ملازموں نے اس کے بعد ان کے قتل کی خبر ہی سنی... وہ سب بہت رنجیدہ تھے... کیونکہ صاحب بہت اچھے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔

آفس کے عملے کے بیان کے مطابق وہ ایک شریف النفس اور خاموش طبع انسان تھے۔ بہترین باس تھے۔ اپنے عملے کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھتے تھے۔ غریبوں کے خیر خواہ... عملے کے لوگوں میں مرد بھی تھے اور لڑکیاں بھی... مگر ان کی نجی اور گھریلو زندگی سے کسی کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ بظاہر جتنے وہ نرم تھے، غلطی کرنے والوں کے لیے اسی قدر سخت بھی تھے۔

اصغر حسین کے کاغذات سے علم ہوا کہ اس نے میٹرک اپنے پرانے محلے کے سیکنڈری اسکول سے، بی اے پرائیویٹ اور ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا تھا۔ اس کے پاسپورٹ سے پتا چلتا تھا کہ وہ دنیا کے چار ممالک گھوم چکا ہے بلکہ ایک عرصہ وہاں گزارا بھی ہے۔ وہ ہر ملک میں اور خصوصاً سعودی عرب میں ایک عرصہ گزارنے کے بعد وطن واپس لوٹا تھا اور کپڑے کی مل لگائی تھی۔ مل کے مزدور بھی اس سے خوش تھے اور آفس کا عملہ بھی۔ اصغر حسین کی تینوں بیویوں کے بارے میں بھی معلومات کی گئیں۔ ان کے مطابق جمانہ یزدانی پیرس کی پیدائش تھی۔ اس کی ماں فرانسیسی اور باپ پاکستانی تھا مگر اصغر حسین کے جاننے والوں سے اس کی پچھلی زندگی کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

صبا کنول اس کے آفس میں سیکریٹری تھی... اور اصغر حسین کی اس سے دوسری شادی میں شہر کے تمام معزز لوگ شامل ہوئے تھے۔ آفس کا عملہ بھی تھا۔ صبا کے والدین نہیں تھے۔ وہ ... کی فیملی کے ساتھ رہتی تھی۔ ... انہیں بھی شامل تفتیش کیا گیا۔

ان سے پتا چلا کہ وہ طلاق کے بعد ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ ہاں، طلاق نامے کی ایک کاپی اصغر حسین کی طرف سے ڈاک کے ذریعے انہیں ملی تھی۔ وہ صبا کی گمشدگی سے پریشان ہوئے مگر کچھ کر نہ پائے کیونکہ اصغر کا کہنا تھا کہ اسے صبا کا کچھ علم نہیں۔

تیسری بیوی فرخندہ علی ایک کالج میں لیکچرار تھی۔ اس کے کالج اور کولیگز سے رابطہ قائم کیا گیا۔ وہ ایک بیوہ تھی... شادی سے پہلے وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد اس نے اپنی جائے پناہ یعنی فلیٹ چھوڑ کر ملازمت پیشہ خواتین کے ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس کے شوہر سلطان علی آفندی اور فرخندہ کی عمر میں خاصا فرق تھا۔ وہ ایک ہنس مکھ آدمی تھا جبکہ فرخندہ سنجیدہ طبیعت کی مالک تھی۔ اپنی ساتھی لیکچررز سے بھی اس کی کوئی زیادہ دوستی نہ تھی۔ اس نے پہلی شادی میں بھی اپنی کولیگز اور پرنسپل کو دعوت دی تھی اور دوسری شادی میں بھی... دونوں شادیاں خاموشی سے انجام پائی تھیں۔

فرخندہ کے سابقہ مرحوم شوہر کے گھر والوں سے بھی رابطہ قائم کیا گیا مگر کوئی قابل ذکر بات معلوم نہ ہوئی۔

فرخندہ کے کالج میں بھی اصغر حسین کی طرف سے دی گئی طلاق کی کاپی پرنسپل کو پہنچ گئی تھی مگر شادی کے بعد ہونے والی موسم گرما کی چھٹیوں کے بعد وہ پھر کالج نہیں گئی۔ طلاق کے کاغذات ملنے کے باوجود پرنسپل نے دو لیکچررز کو اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اصغر حسین کے پاس بھیجا لیکن اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ فرخندہ کو طلاق دے چکا ہے اور اب اسے علم نہیں کہ وہ کہاں ہے؟

پولیس نے اس ہاسٹل میں رہنے والی خواتین سے بھی پوچھ گچھ کی جہاں شادی سے پہلے فرخندہ رہتی تھی مگر اس کے وہاں لوٹنے کی بھی اطلاع نہیں ملی۔

پولیس کا خیال تھا کہ ممکن ہے اصغر حسین کا کوئی ایسا دشمن ہو جو اس کی بیویوں کو قتل کرتا رہا ہو اور آخر کار راز کھلنے پر اصغر کو بھی قتل کر ڈالا ہو... لیکن اس گمنام قاتل کی تلاش میں پولیس ناکام رہی تھی۔

ایک عرصے تک اخباروں میں اس سانحے سے متعلق خبریں چھپتی رہیں اور لوگ مختلف قیاس آرائیاں کرتے رہے۔

''یہ ساری معلومات مجھے اخباروں سے ہی حاصل

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
انگلش لینگویج کورس | ہوم اکنامکس | بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ
الیکٹریشن | ڈرافٹس مین
اسکول ٹیچنگ میتھڈ | صحافت | فوٹو گرافی
مہر سازی | سلمنگ بیوٹی
کمپیوٹر | کوکنگ بیکنگ | لیڈیز ٹیلرنگ
میڈیکل لیب | آرٹ پینٹنگ
پولٹری ڈیری فارمنگ | فلاور میکنگ
اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237

ہوگئیں جبکہ میں اس سے بھی بہت زیادہ جانتی تھی... لیکن اس کا علم نہ ہی پولیس کو تھا اور نہ ہی عام لوگوں میں سے کسی کو... کیونکہ اس کی نجی زندگی سے قریب آج تک کوئی نہیں ہوا تھا... سوائے اس کی بیویوں کے... اور میں بھی اس کی بیوی تھی... چوتھی بیوی!"

☆☆☆

"میرا نام آسیہ فاروقی ہے۔ شادی سے پہلے میرا یہی نام تھا مگر شادی کے بعد میں آسیہ ملک ہوگئی۔

"میں آٹھ برس کی تھی جب میری ممی اور ڈیڈی میں طلاق ہوگئی۔ وہ دونوں ہی مجھے اپنے پاس رکھنے کے خواہاں تھے لیکن میں ڈیڈی سے زیادہ مانوس تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے ممی سے زیادہ ڈیڈی نے چاہا تھا... اور یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ممی نے طلاق کے بعد دوسری شادی کرلی تھی مگر ڈیڈی نے اپنی زندگی صرف میرے لیے وقف کردی تھی۔ وہ ہر جگہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ہم امریکا کے شہر بوسٹن میں رہتے تھے۔ میرے ڈیڈی ڈاکٹر سریر فاروقی بہت اچھے انسان تھے۔ وہ مجھے بے حد چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی زندگی کا محور ایک میری ہی ذات ہے...

"ڈیڈی کا کہنا تھا کہ اگر میں نہیں ہوتی تو ان کا جینا مشکل ہو جاتا۔ بیٹیاں ہمیشہ والدین کے ساتھ تو نہیں رہتیں۔ یہی سوچ ڈیڈی کو پریشان کردیا کرتی تھی۔ میں انہیں تسلی دیتی۔ ڈیڈی! اول تو میں شادی نہیں کروں گی، اگر شادی کروں گی تو ایسے آدمی سے جو مجھے آپ سے علیحدہ نہ کرے... ہم ساتھ ہی رہیں گے... لیکن دل کے مریضوں کا یہ مسیحا راستے میں ہی ٹوٹ گیا۔ دلوں کا مسیحا اپنے ہی دل کے آگے ہار گیا۔ پہلے ہی ہارٹ اٹیک نے میرے ڈیڈی... امریکا کے مانے ہوئے ہارٹ اسپیشلسٹ کی جان لے لی۔

"مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جیتے جی میری دنیا ختم ہو گئی ہو۔ ہمارے کئی پاکستانی خاندانوں سے اچھے مراسم تھے۔ انہوں نے مجھے اپنایت کا بہت احساس دیا... مگر ڈیڈی کے بغیر میرا باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں گھر میں بند ہو کر رہ گئی۔

"ڈیڈی کے انتقال کو کئی ماہ ہو چکے تھے جب ڈیڈی کے ایک کولیگ ڈاکٹر احتشام کی بیٹی لیلیٰ اپنے بھائی کی شادی کے لیے مجھے لینے آئی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی خاور، موہنی سکھی، فرحین آفاق اور زوہیب اختر بھی تھے۔ ان لوگوں سے بھی ہمارے اچھے مراسم تھے۔ اس شادی کا مجھے بہت پہلے سے علم تھا۔ مگر میرا اس شادی میں شرکت کا قطعی ارادہ نہ تھا۔

اس روز ان سب نے مل کر میرے اوپر اتنا دباؤ ڈالا کہ میں مجبور ہوگئی۔ وہ لوگ مجھے واپس رنگوں کی دنیا میں کھینچنا چاہتے تھے... لیلیٰ اپنے بھائی کی شادی کی مصروفیات چھوڑ کر میری خاطر آئی تھی۔ موہنی نے میرے وارڈ روب سے میرے کپڑے نکالے۔ لیلیٰ پریس کرنے لگی... فرحین نے پکڑ کے مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا۔

"خاور اور زوہیب باہر لان میں بڑے تحمل سے ہمارا انتظار کرتے رہے۔

"اور آخر ان سب کی محبت کے آگے میں ہار گئی۔ جس وقت سیاہ لباس پر گولڈن جیولری اور ڈارک میک اپ میں میں لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلی تو خاور اور زوہیب مجھے دیکھتے رہ گئے۔ میں جانتی تھی کہ میرا حسن، صنفِ مخالف کے لیے باعثِ کشش ہے... اکثر نوجوان ہمیشہ مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر اول تو پاپا سے میں اتنی اٹیچ تھی کہ ان سے علیحدگی کا تصور نہیں کرسکتی تھی، دوسرے زندگی کے اس پہلو پر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ سو کوئی نوجوان مجھے اپنی طرف راغب نہیں کرسکا تھا۔

"اس بڑے ہجوم میں، میں نے پہلی بار خود کو تنہا محسوس کیا۔ لوگوں کی... خاص کر نوجوانوں کی توجہ مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ مجھے ڈیڈی کی شدت سے یاد آرہی تھی۔ لڑکیاں میرے گرد جمع تھیں مگر میں ان کی بات میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ وہ سب آپس میں ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ میں افسردہ سی ہجوم کا جائزہ لے رہی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ ڈارک براؤن سوٹ میں وہ سنجیدہ سا نرم چہرے والا شخص مجھے سب سے علیحدہ محسوس ہوا۔ وہ کم عمر نوجوان نہیں تھا... چالیس سال کا مرد تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا مگر مجھے اس کی نگاہ ناگوار محسوس نہ ہوئی۔ اس کی نگاہوں میں عامیانہ پن نہیں تھا۔ جانے کیوں مجھے وہ اپنا اپنا سا لگا۔ جیسے ڈیڈی کا وجود... وہ مسکرایا تو بے اختیار میں بھی مسکرا دی۔ وہ چند لوگوں کے درمیان کھڑا تھا... لیکن شاید میری ہی طرح وہ بھی ہجوم میں اکیلا تھا... سب باتیں کررہے تھے اور وہ خاموش تھا۔ پھر اس نے لیلیٰ کے بھائی خرم جس کی شادی ہورہی تھی... اس سے یقیناً میرے متعلق پوچھا اور دونوں ہماری طرف بڑھ آئے۔

"اس نے ہمارا تعارف کروایا۔ 'یہ اصغر حسین ملک ہیں۔ میری شادی میں شرکت کے لیے پاکستان سے آئے ہیں... اکثر امریکا آتے رہتے ہیں اور اتنی دور سے خاص طور پر میری شادی میں شامل ہوکر انہوں نے اپنی محبت کا ثبوت دیا

ہے۔' خرم ان کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔

"اصغر حسین مسکرا دیا۔ کتنی نرم اور خوب صورت تھی اس کی مسکراہٹ... مجھے یوں لگا جیسے میری روح اس میں سما گئی ہو۔

"یہ میری لیلیٰ ہے۔" خرم نے اپنی بہن کا تعارف کروایا۔ "اور یہ اس کی دوست... فرحین، موہنی اور آسیہ..." میرے نام پر وہ ٹھہر گیا... اصغر حسین ہم سے رسمی سی باتیں کرتا رہا... خرم کسی اور مہمان کی طرف متوجہ ہوگیا اور فرحین، موہنی اور لیلیٰ آپس میں تو ہم دونوں ٹہلتے ہوئے لان میں آگئے۔

"آپ کچھ افسردہ سی ہیں... خوشی کی یہ محفل اور آپ کی اداسی؟" وہ مسکرایا تو میں جیسے ایک دم ہار گئی۔ اپنے اوپر چڑھایا ہوا خول توڑ بیٹھی اور اس پہلی ہی ملاقات میں، میں نے اصغر حسین کے سامنے اپنی زندگی کھول کے رکھ دی۔ اس نے جواب میں مجھے بھرپور حوصلہ دیا۔

"برات لڑکی والوں کے ہاں پہنچی پھر ولیمہ ہوا۔ ہم ساتھ ساتھ تھے۔ لوگوں کو حیرانی ہوئی کہ میں نے اپنے ہم عمر لڑکوں کو چھوڑ کے اصغر حسین کو ترجیح کیوں دی؟ لیکن آخر کار سب نے میرا ساتھ دیا اور اصغر حسین ملک سے میری شادی ہوگئی۔

"اس نے مجھے بے تحاشا پیار دیا۔ پورا امریکا ہم دونوں نے گھوما۔ اصغر نے کبھی میری کسی بات کو نہیں ٹالا۔ وہ میری چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا بھی خیال رکھتا۔ میرے منہ سے ایک بار کوئی بات نکل جائے اور اصغر اسے پورا نہ کرے، یہ ممکن ہی نہ تھا... وہ ایک دکھی شخص تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں محرومیوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ تہی داماں تھا اور میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اس کی ہر محرومی کا ازالہ کروں گی۔ اس کے تمام دکھوں کا مداوا کروں گی۔ اسے زندگی میں اتنا پیار دوں گی کہ وہ اپنا ہر دکھ، ہر محرومی بھول جائے گا... اس نے اپنی زندگی کا کوئی پہلو بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں رکھا تھا۔ شادی سے پہلے ہی اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔

"اس روز ہم دونوں نیویارک میں ایک عمارت کی بلندی سے دنیا کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرے میں گم تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کیے تھے۔ دکھ سکھ بانٹنے کا عہد کیا تھا... اور اسی روز اس نے اپنے ماضی کے تمام پردے میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیے۔"

☆☆☆

"میرے والد سرور حسین ملک اندرون شہر میں ایک کپڑے کی دکان کے مالک تھے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد وہ اور ان کے بڑے بھائی زندہ بچ کر پاکستان پہنچے تھے۔ کلیم وغیرہ کے ذریعے انہیں شہر کے ایک پرانے محلے میں تین منزلہ عمارت مل گئی تھی جسے انہوں نے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ تیسری منزل پر چار کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرا ہی بڑا تھا۔ باقی تو بس کوٹھریاں تھیں۔ نیچے کی دونوں منزلیں نسبتاً کشادہ تھیں۔ بال بچے دار لوگ کرائے پر آباد تھے۔ اسی محلے کے بازار میں تایا اور ابا نے دکان خرید لی تھی اور کپڑے کا کاروبار شروع کردیا۔ کسی نے کہہ سن کے ایک یتیم لڑکی سے ابا کی شادی کروا دی۔ تایا شادی پر رضامند ہی نہ تھے۔ وہ ابا کو بہت چاہتے تھے، سو انہوں نے پہلے ان کی خوشی چاہی۔ ابا کا خیال تھا کہ پہلے تایا کی شادی ہونی چاہیے مگر تایا کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ سوچا میری شادی کے بعد تو انہیں راضی ہونا پڑے گا۔ سو ابا نے ان کی مرضی کے مطابق شادی کرلی۔ میں پیدا ہوا تو ابا اور تایا کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے خوب دھوم دھام سے میرا عقیقہ کیا، روپیا پانی کی طرح بہایا۔ میری پرورش شہزادوں کی طرح ہونے لگی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر قسمت میں محرومی لکھی ہو تو کوئی دنیاوی شے کام نہیں آتی... سو ماں چھنی تو کوئی بھی کچھ نہ کرسکا۔ معمولی بخار بڑھ کر ماں کو موت تک لے گیا۔ غم زدہ ابا اور تایا پریشانیوں میں گھر گئے۔ تایا اپنے بارے میں تو کیا سوچتے، دوبارہ سے ابا کا گھر بسانے کی فکر نے آگھیرا کہ ننھے بچے کو ماں کا پیار اور بکھرے ہوئے ابا کو سمیٹنے کے لیے گھر والی بہت ضروری تھی۔ یوں سلیمہ بی بی سے میرے ابا کا دوسرا بیاہ ہوگیا۔ یہ عورت میری ماں سے بہت مختلف تھی۔ میری ماں نے کبھی آنکھ اٹھا کے ابا سے بات نہ کی تھی۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے لڑتی۔

"ابا میری ماں کو یاد کیا کرتے اور جب بھی سلیمہ سے انہیں دکھ ملتا، وہ اندر جا کر میری ماں کے لیے ضرور روتے۔ وہ اکثر کہا کرتے۔

"نوراں نے کبھی میرا دل نہیں دکھایا تھا... اور جی تو میں نے بھی اس کا کبھی نہیں توڑا تھا پھر مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟"

"سلیمہ بی بی قہر آلود نظر سے ابا کو دیکھ کر غراتی۔ میں نوراں نہیں ہوں جو تیری دہلیز پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئی۔ میں تو تجھے مار کے مروں گی۔"

www.pkdigest.com

"اور پھر یہی ہوا، اس نے ابا کو مار دیا۔ اس کے دیے گئے دکھوں اور اذیتوں سے ابا ایسے بیمار پڑے کہ جانبر نہ ہو سکے۔ تایا جی تو خود بے چارے دمے کے مریض تھے... مجھ بن ماں باپ کے بچے کو ایک انہی کا سہارا تھا... سلیمہ مجھ سے بہت حقارت سے پیش آتی، نوکروں کا سا سلوک کرتی۔

"ابا کی زندگی میں بھی اس کا رویّہ کوئی اچھا نہ تھا، وہ اپنے ہر حکم کی تعمیل چاہتی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد میں مشین بنا رہتا۔ اس کی کوئی بات میں ٹالوں، میری مجال نہ تھی۔ شروع شروع میں، میں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا کہ ابا اور تایا کا لاڈلا تھا مگر اس نے تو فساد مچا دیا۔ ناچار ابا نے مجھے سمجھایا کہ بیٹا، اچھے بچے بڑوں کا کہنا مانتے ہیں۔ رفتہ رفتہ میں سمجھ گیا کہ ابا کی اماں کے سامنے نہیں چلتی... میں اس کا ہر حکم مانتا... وہ اتنی فسادی تھی کہ تایا تک اس کی زبان سے ڈرتے تھے۔ میرے سوتیلے بہن بھائی ایک تنکا نہ توڑتے اور میں نوکروں کی طرح کام میں لگا رہتا۔ ابا نے ایک بات کہی تھی کہ اچھے بچے بڑوں کا کہنا مانتے ہیں۔ میں نے ان کی بات پر عمل کیا تھا اور چاہتا تھا کہ چھوٹوں سے اپنا حکم منواؤں لیکن ایسا کرتا، بھی ایک فساد کو بپا کر گیا۔ میرے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی ماں کے سر چڑھے تھے، کبھی میری کوئی بات نہ مانتے۔ اگر میں بھی بڑا بنتا تو وہ شور مچا دیتے اور اماں مجھ پر پل پڑتی۔

"ابا کے بعد تو اس کا رویّہ اور بھی برا ہو گیا۔ تایا بے بسی سے سب کچھ دیکھتے اور چپ رہتے۔ بس تنہائی میں مجھے سینے سے لگا کے تسلیاں دیا کرتے۔

"اماں ذرا ذرا سی بات پر مجھے کہتی، دفع ہو جا اور میرا جی چاہتا کہ میں چلا جاؤں اس گھر سے... مجھے اپنی سوتیلی ماں سے بھی نفرت تھی اور اس کے بچوں سے بھی مگر اس گھر سے بھاگ کر میں جاتا کہاں؟ سو جبراً یہ تمام ظلم اور کڑوے جملے سہتا رہا۔

"لیکن جیسے ہی تایا نے دنیا چھوڑی، میں نے بھی یہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں نے میٹرک کر لیا تھا اور تایا کے ساتھ دکان پر بیٹھتا تھا۔ میری عمر چودہ پندرہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ گھر میں ماں کے حکم ماننے کے میرے اندر ایک احساسِ کمتری پیدا ہو چکا تھا کہ میرے سوتیلے بہن بھائیوں پر بھی میرا حکم نہیں چل سکتا تھا۔ سوائے دے کے دکان کے ملازم ہی تھے جن پر میں حکم چلا تا تھا... مگر وہ بھی تایا کی غیر موجودگی میں کیونکہ تایا مجھے ایسا نہیں کرنے دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ملازم بھی انسان ہوتے ہیں، سو ملازم مجھ سے خوش نہیں تھے۔ تایا کے انتقال کے بعد وہ ذرا ذرا سی بات اماں تک پہنچاتے اور وہ جھگڑا بھی وہیں سے شروع ہوا تھا۔

"میں گلے میں سے پیسے لینا چاہتا تھا... جیسا کہ تایا کی زندگی میں لے لیا کرتا تھا۔ جو پیسے میں لیتا... رسول بخش جو خاصا پرانا اور اعتبار والا آدمی تھا، وہ تایا کو حساب دیتا۔ میری عادات بری نہیں تھیں۔ میں پیسے لیتا بھی تھا تو کھانے پینے کی چیزیں لینے کے لیے یا پھر مجھے لٹو گھمانے کا شوق تھا۔ شاید اس لیے کہ لٹو میری مرضی سے گھومتا تھا یعنی غیر ارادی طور پر میں کسی کو اپنی مرضی سے چلانا چاہتا تھا۔ نت نئے رنگ برنگے لٹو میرے پاس تھے۔

"بازار میں ایک دکان پر میں نے ایک بڑا رنگین لٹو دیکھا۔ میں وہ لینا چاہتا تھا کہ رسول بخش نے میرا ہاتھ روک دیا۔

"بی بی نے منع کیا ہے اصغر... آئندہ تمہیں پیسے لینے ہوں تو بی بی سے لینا۔

"مجھے بہت غصہ آیا۔ 'تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟' میں نے کہا۔ 'میں مالک ہوں اس دکان کا۔' میں نے رسول بخش کا ہاتھ جھٹک کر گلے سے پیسے نکال لیے لیکن اسی شام میں گھر پہنچا تو خوب فساد ہوا۔

"دفع ہو جا یہاں سے... [illegible] اماں کی ساری باتوں میں سے بس ایک جملہ میرے دل پر آ گیا۔ میں اسی وقت پلٹا، جا کر اپنے کچھ کپڑے، جوتے ایک بیگ میں رکھے۔ لٹوؤں کا اسٹاک اور کچھ دوسری ضروری چیزیں لیں... اور گھر سے باہر نکل گیا۔ اماں مجھ سے جھگڑ کے دوسرے کاموں میں لگ گئی تھی۔

"اس وقت میں اس حقیقت کو بھول بیٹھا تھا کہ قانونی اصولوں کے مطابق میں بھی ان چیزوں میں حصے دار تھا جن پر میری سوتیلی ماں قابض ہو گئی تھی۔

"میں گھر سے نکل کے سیدھا اپنے دوست کریم کے گھر پہنچا۔ ہم دونوں نے ساتھ ہی میٹرک کیا تھا۔ وہ گھر پر ہی مل گیا۔ مجھے بیگ اٹھائے دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔

"کیا بات ہے، کہیں سفر کا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں..." میں نے سر ہلایا۔

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔

"بس جہاں بھی قسمت لے جائے۔" میں نے کہا تو وہ الجھ گیا۔

"یار! کیا بات ہوئی... کھل کر بتا..." تب میں نے اسے سب کچھ بتا دیا... میرا غم سن کر وہ بھی میرے ساتھ اداس ہو گیا... پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

"محنت کرو گے؟"

"ضرور کروں گا۔" میں دل میں ایک مقصد لے کر گھر سے نکلا تھا... بڑا آدمی بننے کا... دنیا کو اپنے اشارے پر چلانے کا۔

"میرے بابو جی کے ایک دوست نے مغل پورہ میں ایک ورکشاپ کھولی ہے۔ وہ ذکر کر رہے تھے کہ انہیں کسی اچھے لڑکے کی ضرورت ہے۔ میں بابو جی سے کہہ کر تمہیں وہاں ملازم رکھوا دیتا ہوں۔"

"اس طرح میں عبدل شاہ کی ورکشاپ میں ملازم ہو گیا۔ رہائش کے لیے میں پریشان تھا مگر اس کا مسئلہ بھی یوں حل ہو گیا کہ نوکری دینے کے بعد شاہ صاحب نے پوچھا۔

"رہتے کہاں ہو... مرزا جی کے علاقے میں...؟"

"رہتا تو وہیں تھا... لیکن اب میں وہ جگہ چھوڑ آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"چلو، یہ بھی اچھا ہوا۔" شاہ صاحب خوش ہو گئے۔ "تم ہماری طرف ہی رہو۔ میٹرک پاس ہو، میرے بچے کو پڑھا بھی دیا کرنا۔"

"یوں اس طرح میں ان کے گھر اور دکان کا ملازم [illegible]

"شاہ صاحب نہ صرف مجھ سے ورکشاپ میں کام لیتے بلکہ وہاں کا حساب کتاب بھی میرے ذمے تھا۔ گھر میں بچوں کو پڑھانے کے علاوہ شاہ جی کے گھر اور باہر کے کام الگ تھے۔

"ان کا رویّہ میری سوتیلی ماں سے زیادہ اچھا نہ تھا۔ بچے بھی کوئی خاص عزت نہ کرتے۔ بات بے بات ماں باپ سے شکایت کر دیتے اور وہ جب دیکھو جھڑک دیتے۔

"بس فرق یہ تھا کہ مجھے اپنی محنت کا معاوضہ مل رہا تھا۔ گھر میں رہائش اور کھانا پینا ساتھ تھا۔ میری تنخواہ خاصی بچ جاتی۔ میں نے فرسٹ ایئر کی کتابیں خرید لی تھیں اور رات گئے دیر تک پڑھتا رہتا۔ اس کی مجھے ممانعت نہ تھی۔

"چار برس بعد میں نے پرائیویٹ بی اے کر لیا اور اگلے دو سال میں ایم اے... مجھے یقین تھا کہ میں ایک دن بڑا آدمی ضرور بنوں گا۔

"ورکشاپ میں ہر طرح کے لوگ آتے تھے۔ میری تعلیمی قابلیت اور شرافت کو دیکھتے ہوئے آغا دل گیر صاحب جو ایک کپڑے کی مل کے مالک تھے... مجھے ملازمت کی آفر کی۔

"اور ایک روز میں شاہ جی کی ورکشاپ چھوڑ کر آغا جی کی مل کا سپروائزر بن گیا۔ اس ملازمت کے ساتھ مل میں بنے ہوئے ایک بنگلے کی رہائش نے بڑی طمانیت بخشی۔ میرے ماتحت کام کرنے والے میری فطرت سے اچھی طرح واقف تھے۔ جو میری بات پر عمل کرتا تھا، وہ خوش رہتا اور جو میری بات سے بچنے کی کوشش کرتا، نقصان اٹھاتا۔ آغا جی میری کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے ملازموں کو رکھنے اور نکالنے کا حق مجھے دے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ہر طرح کی سہولت مہیا تھی... کار، بنگلا...

"یہ زندگی میری پچھلی زندگی سے قدرے بہتر تھی لیکن میری منزل نہ تھی... سو جیسے ہی سعودی عرب میں مجھے اچھی ملازمت کا چانس ملا... میں نے آغا جی کو بھی خدا حافظ کہہ دیا۔ شاہ صاحب کے پاس چھ سال اور آغا جی کے پاس آٹھ سال کے دوران میں نے اتنی رقم پس انداز کر لی تھی کہ کسی کمرشل ایریے میں بڑا پلاٹ خرید سکوں۔ سو یہ پلاٹ خرید کر میں نے چھوڑ دیا اور نئی ملازمت پر سعودی عرب چلا گیا۔ اگلے نو برسوں میں، میں اس قابل ہو چکا تھا کہ اپنے وطن میں اپنی خواہش کے مطابق کپڑے کی ایک مل لگا سکوں۔

"وطن واپس آنے کے بعد مل قائم کی مگر کام شروع کرنے سے پہلے میں نے ہلکے پھلکے ذہن کے ساتھ پیرس اور لندن کا چکر لگایا... جہاں مجھے وجیہہ ملی تھی۔ وہ آزاد خیال لڑکی تھی۔ دوستی میں پہل اسی نے کی تھی... جب ہماری دوستی ہو گئی تو شادی کی پیشکش بھی اسی نے کی۔ اس وقت تک میں نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ لیکن وجی جیسی خوب صورت اور پُرخلوص لڑکی کو پا کر میں نے سوچا کہ شادی کر لی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا اپنا کوئی نہیں ہے۔ جو دور کے رشتے دار ہیں، ان کا اس کی زندگی میں کوئی دخل نہیں... سو ہم دونوں نے وہیں پیرس میں شادی کی اور واپس پاکستان آ گئے۔ یہاں ہم اپنے اس بنگلے میں شفٹ ہو گئے جو میں آنے سے پہلے خرید چکا تھا۔ میں نے وجی سے بہت محبت کی۔ اس کا بہت خیال رکھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کی۔ اس کا اور میرا ساتھ تقریباً ایک برس رہا۔ وہ ابھی ماں نہیں بننا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی یہ خواہش بھی پوری کی۔ اس پورے سال میں، میں نے اس کی ہر بات مانی... اپنی کوئی بات بھی نہیں منوائی... لیکن ایک رات... میں نے بھی اس سے اپنے تمام تر رویّوں کا جواب چاہا... بات چھوٹی سی تھی... مگر اس نے میرا مان توڑ دیا... میرا دل توڑ دیا۔ وہ میری ایک ذرا سی بات نہ مان سکی... اور... اور میں نے اسے چھوڑ دیا...

www.pkdigest.com

''طویل عرصہ میں اداس اور تنہا بھٹکتا رہا۔
''اس اداسی کو میرے آفس کے عملے نے بھی محسوس کیا مگر میں نے اپنی زندگی اور کاروبار کو ہمیشہ الگ رکھا مگر صبا کنول سے میں کچھ نہ چھپا سکا۔
''وہ ڈکٹیشن لینے میرے کمرے میں آئی تھی۔ میں اس سے بے تکلف نہیں تھا مگر جس اپنائیت سے اس نے مجھ سے اداسی کا سبب پوچھا، اس نے تکلف کی تمام دیواریں گرا دیں۔ شاید اس وقت مجھے کسی اپنے کی شدید ضرورت تھی۔ سو میں نے صبا سے کہا۔
''کیا سچے جذبے دنیا میں عنقا ہیں... کیا جن کے والدین نہ ہوں، وہ دنیا میں محروم ہی رہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ انہیں کبھی نہیں نوازتا؟'' میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔
''صبا پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی اور بولی۔ ''سر! یہ حقیقت ہے کہ ماں باپ... ماں باپ ہی ہوتے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ دنیا اچھے لوگوں سے خالی ہو گئی ہے۔ اپنے والدین کی وفات کے بعد میں چچا کے پاس رہتی ہوں۔ چچا چچی اور ان کے بچوں کا رویہ ایسا ہے کہ کبھی مجھے اپنے ماں باپ کی اور بہن بھائیوں کی کمی کا احساس نہیں رہا۔ میرے چچا تو میری جاب کے بھی خلاف تھے۔ وہ کوئی بڑے آدمی نہیں، معمولی ملازمت کرتے ہیں مگر انہوں نے پھر بھی مجھے اپنے بچوں کی طرح سمجھا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو میٹرک تک پڑھایا اور شادی کر دی۔ لڑکے بھی ان کے زیادہ نہیں پڑھے اور میٹرک کرتے ہی ملازمت کرنے لگے مگر میری خواہش پر چچا نے مجھے کالج میں داخلے کی اجازت دے دی۔ وہ بات الگ ہے کہ میں تعلیم کے ساتھ ٹیوشنز بھی لیتی رہی اور اپنا بوجھ ان پر نہیں پڑنے دیا اور بی اے کرتے ہی میں نے اپنی ضد سے یہ ملازمت کی۔ ورنہ وہ چاہتے تھے کہ میری بھی شادی کر دیں۔''
''مجھ سے پہلے صبا نے اپنی زندگی میرے سامنے کھول دی تھی... مجھے وہ خود سے قریب لگی۔ سو میں نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ ''تو آپ نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا...؟''
''یہ بات نہیں ہے سر...'' اس نے نگاہ نیچے کرتے کہا۔ ''بات دراصل یہ تھی کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری شادی کا بوجھ بھی ان کمزور کاندھوں پر پڑے۔''
''یعنی آپ اپنی شادی کے اخراجات کے لیے جاب کر رہی ہیں؟'' میں نے مسکرا کے کہا۔
''یہی سمجھ لیں سر!'' اس نے بغیر کسی شرمندگی کے کہا۔
''اس روز صبا سے بات کرتے ہوئے طبیعت کافی سنبھل گئی۔ پھر بات دوسری طرف نکل آئی تھی... سو جب اس نے کہا۔
''اچھا سر، اب میں چلتی ہوں۔'' تو میں نے اسے نہیں روکا۔
''لیکن اس شام میں اپنے گھر پہنچا تو تنہائی کے عذاب نے پھر مجھ پر حملہ کیا اور ماضی رہ رہ کے مجھے ڈستا رہا۔ اپنی سوتیلی ماں کے جبر و ظلم، حکم منوانا، ملازموں اور سوتیلے چھوٹے بہن بھائیوں کا میرا حکم نہ ماننا... اس کے بعد زندگی کے نشیب و فراز... اور میری نافرمان بیوی... اور یہ دکھ میری زندگی کا سب سے بڑا دکھ تھا۔ صبا کنول مجھے اچھی فطرت کی لڑکی لگی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے شادی کروں گا۔
''رات بھر کی صورتِ حال کے باعث جو بوجھ طبیعت کے اندر تھا، وہ تمام بوجھ صبا کے سامنے اتارنے کا ارادہ کر لیا۔ صبح میں نے آفس جاتے ہی اسے طلب کر لیا۔
''صبا! آپ کو عرصہ ہو گیا ہے میرے ساتھ کام کرتے... آپ یقیناً میری طبیعت کو سمجھتی ہوں گی... پھر بھی آج میں اپنی ساری زندگی آپ کے سامنے کھول دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں گی... اور میں نے اپنی زندگی کے [illegible] ان کے سامنے الٹ دیے... اس کے بعد میں نے [illegible] اگر میں آپ کو پروپوز کروں... تو آپ کا کیا جواب ہے صبا؟''
''صبا کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
''سر! آپ چچا جان سے بات کر لیجیے۔''
''اگلی ہی شام میں صبا کے چچا سے ملا... ان کے دونوں بیٹوں سے بھی۔ وہ معمولی درمیانے طبقے کے لوگ تھے۔ میری شخصیت، میری کار اور میری باتوں سے مرعوب دکھائی دیتے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کے لیول پر جا کر بات کروں لیکن ان کے تاثر کو کم نہیں کر سکا۔ وہ جیسے میرے احسان مند تھے کہ میں نے صبا کو شادی کے لیے پسند کیا۔
''ہماری بات طے ہو گئی۔
''شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور ہماری زندگی کی خوش و خرم ابتدا ہوئی۔ صبا کے ساتھ میں نے جی سے بھی زیادہ اچھا رویہ رکھا۔ اس کی ہر خواہش پوری کرنا میرا مقصد تھا۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی، پورا خیال رکھتی کہ میری کوئی بات نہ ٹالے۔ لیکن میں نے تو کبھی اپنی کوئی بات اس سے منوائی ہی کب تھی۔ میں نے اسے ملک میں اور ملک سے باہر ہر جگہ گھمایا۔

''ہم اکثر باہر جاتے، گھومتے، کھانا کھاتے۔ میں اس کے چچا کے گھر بھی اس کو لے کر جاتا... مگر میری تمام کوشش اور اپنائیت کے باوجود وہ مجھ سے بے تکلف نہ ہو سکے۔ ہم ان کے گھر جاتے تو وہ خاطر مدارات میں کمی نہ رکھتے مگر میرے گھر آتے ہوئے جھجکتے۔
''صبا ہر طرح سے میری فرماں بردار تھی لیکن جب میں نے اس کی فرماں برداری کا امتحان لیا... تو وہ بھی سے مختلف نہ نکلی۔ شاید ساری عورتیں... دنیا کی ساری عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں... میں نے صبا کو بھی چھوڑ دیا... اور پھر کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک یہی ہستی تو اب میری زندگی میں رہ جاتی تھی جو میری زندگی بھر کی تشنہ خواہش کو پورا کر سکتی تھی... مجھے وہ محبت، وہ اعتماد دے سکتی تھی جس کے لیے میں ہمیشہ ترستا رہا۔ مگر میری تمام تر محبت... تمام تر خدمت کے بعد وہ چھوٹی سی بات پر میری نافرمانی کرتی ہو... تو پھر کیا زندگی...؟ میں زندگی کے ساتھ ایک دم سے کٹ کر رہ گیا۔
''زندگی بھی عجیب عجیب تماشے دکھاتی ہے۔ گھر میں ایک عرصہ بند رہنے کے بعد باہر نکلا تو بس آفس اور گھر تک میری زندگی محدود تھی۔
''کاروباری مصروفیات کے پیش نظر میں رات تک ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور اکثر شام کی چائے [illegible] وہیں کھاتا... اور وہیں بلیئرڈ کھیلتا رہتا۔ بچپن کا شوق اب بلیئرڈ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ باقی میں نے کبھی غلط شوق نہیں پالے، نہ ہی کبھی شراب کو ہاتھ لگایا۔
''اس رات میں نے بڑے عرصے کے بعد کھیلا تھا۔ میں دیر تک کلب میں رہا۔ رات گئے میں اپنی گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ واپس لوٹ رہا تھا کہ یکایک رات کے سناٹے میں کسی عورت کی دو تین دبی دبی چیخیں سنائی دیں۔ وہ کچھ افراد سے مزاحمت کر رہی تھی اور یقیناً یہ سب کچھ سامنے جاتی ہوئی کار میں ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً موبائل فون پر پولیس کو اطلاع دی اور ڈرائیور کو ہدایت دی کہ وہ ان کا پیچھا کرے۔ پولیس میرا نام سنتے ہی حرکت میں آ گئی۔ میں نے اے ایس آئی سے مستقل رابطہ رکھا... اور پولیس کے آتے ہی صورتِ حال پر فوراً قابو پا لیا۔ غنڈوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہلکے رنگ کی ساڑی میں وہ ایک نوجوان اور خوش شکل عورت تھی۔ میں نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھایا تاکہ اسے اس کے گھر پہنچا دوں مگر وہ بہت متوحش دکھائی دے رہی تھی۔
''میرے یہ کہنے پر کہ وہ مجھے اپنے گھر کا پتا بتائے، یکایک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی... میں نے نرمی اور اپنائیت سے کہا۔
''خاتون! پریشان مت ہوں۔ مجھے بتائیں آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ میں آپ کی مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔''
''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' وہ خاتون ہچکیوں کے درمیان بولی۔ ''میں مرنا چاہتی ہوں۔ اس بے عزتی کی زندگی سے میں موت کو گلے لگانا بہتر سمجھتی ہوں۔ خدا کے لیے میری اتنی مدد کریں کہ کہیں سے مجھے زہر لا دیں۔''
''آپ سمجھدار ہیں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''زندگی سے مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کریں۔ خودکشی حرام ہے۔ پلیز! مجھے بتائیے آپ کہاں رہتی ہیں... باقی سب کچھ میرے اوپر چھوڑ دیں۔''
''میں۔'' اس نے اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''میں ہاسٹل میں رہتی ہوں... ملازمت پیشہ خواتین کے ہاسٹل میں... اور میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔ میری ساتھی لیکچررز نے مجھے ان غنڈوں کے ہاتھوں اغوا ہوتے دیکھا ہے اور اب اتنا وقت گزر چکا ہے کہ میں واپس لوٹ کر تماشا نہیں بننا چاہتی۔ ان غنڈوں نے مجھے بے عزت کر دیا اور یہی ان کا مقصد تھا کہ میں معاشرے میں جو ایک مقام رکھتی ہوں، اس مقام سے گر جاؤں۔ منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں کسی کو۔''
''مجھے شروع سے بتائیے کہ یہ کون لوگ ہیں اور ایسا کیوں چاہا ان لوگوں نے؟'' میں نے پوچھا۔
''میں گورنمنٹ کالج میں ہسٹری پڑھاتی ہوں۔'' اس نے بتانا شروع کیا۔ ''میری ایک طالبہ کے ان غنڈوں میں سے کسی ایک سے مراسم تھے جس کا علم ہوتے ہی گھر والوں نے اس پر پابندیاں عائد کر دیں۔ گھر والے اسے کالج چھوڑ کر جاتے اور وقت پر لینے آتے۔ کالج کے قوانین بھی سخت تھے۔ کالج کے مقررہ ٹائم کے اندر کوئی طالبہ باہر نہیں جا سکتی تھی۔ یہ لڑکی اس قدر بگڑ چکی تھی کہ گھر اور کالج کے قوانین کو بھی توڑ دیتی۔ وہ کالج کی پچھلی دیوار پھلانگ کر کسی طرح سے باہر نکل جاتی... اور چھٹی سے کچھ پہلے اندر آ جاتی۔ اس کی رازدار کئی لڑکیاں تھیں۔ مختلف مضامین کی ٹیچرز نے اس کی غیر حاضری کا اتنا نوٹس نہیں لیا لیکن میں نے پوچھ گچھ کی اور لڑکیوں سے حقیقت اگلوالی۔
''پرنسپل تک بات پہنچی اور اس بات کا سختی سے نوٹس لیا گیا جس کے نتیجے میں لڑکی کو کالج سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد یہ غنڈے مجھے راستے میں تنگ کرنے لگے۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اس حد تک چلے جائیں گے لیکن آج شام جیسے ہی میں اور میری ساتھی لیکچررز کالج سے باہر نکلیں، انہوں نے

www.pkdigest.com

قائم کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ وہ تین بیویوں سے دھوکا کھا چکا تھا۔ ان تینوں نے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی اور مجھے اس کے دل سے پچھلے تمام زخم مٹانے تھے۔

"اس ساری صورتِ حال میں وہ خوشی کی خبر بھی جانے کہاں دب گئی تھی۔

"آسیہ...!" اصغر کی بھاری آواز ابھری تو میں چونک پڑی۔ "اگر تم پسند کرو، تو آج کی رات ہم اپنے اس مکان میں گزاریں... جہاں میرا بچپن اور لڑکپن بیتا۔ جہاں میری ماں اور میرے باپ کی خوشبو مجھے آج بھی محسوس ہوتی ہے۔"

"ہاں اصغر ضرور..." میں نے بے اختیار کہا۔ "کیوں نہیں، ہم ضرور اپنے دیس کی پہلی رات وہاں گزاریں گے۔"

"تو چلو۔" اصغر پلٹا اور محبت سے مجھے تھام لیا۔ "وہ ایک پرانا گھر ہے آسیہ۔" اس نے کہا۔ "مگر تمہیں وہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ کل صبح ہوتے ہی ہم اپنی کوٹھی میں چلے جائیں گے... اپنے گھر میں... جہاں ہم دونوں مل کر اپنی خوب صورت زندگی کی ابتدا کریں گے۔"

"میں جذب سے مسکرا دی۔ میرے اندر کروٹیں لیتا وہ لطیف احساس باہر آنے کو بے تاب تھا۔ اصغر جلدی جلدی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ اس نے میرا ہینڈ بیگ اٹھا کر مجھے دیا... اور کوٹ پہن کر جوتے پہننے لگا۔

"اس خبر کو دبانے کے لیے مجھے خود پر خاصا جبر کرنا پڑا اور جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

"ہوٹل سے ہم دونوں اصغر کی کار میں اندرونِ شہر کے اس پرانے محلے میں آگئے۔ گاڑی جہاں روکی... وہاں سے آگے کئی تنگ گلیوں تک پیدل جانا پڑا۔ آگے جاکر ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ رات زیادہ نہیں گزری تھی لیکن معلوم ہوتا تھا یہاں کے لوگ جلد گھروں میں بند ہوجانے کے عادی ہیں۔

"نیچے کی منزلوں میں کرائے دار ہیں۔" اصغر نے بتایا۔ "تیسری منزل میں نے اپنے لیے رکھی ہے۔ کبھی کبھی آتا ہوں... آئی ایم سوری! جذبات میں، میں تمہیں آج ہی لے آیا... گھر کی جھاڑ پونچھ بھی نہیں ہوئی۔" اصغر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں اصغر... جھاڑ پونچھ میں کرلوں گی۔ آپ تو جانتے ہیں، میں نوکروں کی عادی نہیں ہوں۔ ہاسٹل سے جب گھر آنا ہوتا تھا تو یونہی گرد آلود گھر کی صفائی خود ہی تو کرنا پڑتی تھی۔" میں نے سیڑھیوں سے نچلی منزل میں رہنے والوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ مدھم روشنی سے اندازہ ہورہا تھا کہ کوئی نہ کوئی جاگ رہا ہے۔

"تالا کھول کے ہم اندر پہنچے۔ یہ ایک کھلا برآمدہ تھا... چھت والا۔ ایک سائڈ پر یقیناً کچن تھا... اور باتھ روم... سامنے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اصغر نے سارے گھر کی بتیاں جلا دی تھیں پھر چابیاں میرے ہاتھ میں تھما دیں۔

"چلو تو پھر تم جھاڑ پونچھ کرو... میں آکر تمہاری مدد کرتا ہوں۔" اصغر نے کہا تو میں حیرانی سے بولی۔

"اس وقت آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"کچھ بھوک محسوس ہورہی ہے... دودھ لے کر آتا ہوں۔ چائے کے ساتھ کچھ کھائیں گے۔ دیکھتا ہوں بازار میں... شاید کوئی دکان کھلی ہو... ڈرو گی تو نہیں؟ ویسے آباد علاقہ ہے... نچلی منزلوں میں آس پاس لوگ موجود ہیں۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہاں دکانیں نہ کھلی ہوئیں تو گاڑی لے کر کچھ آگے نکل جاؤں گا۔"

"جائیے جناب!" میں نے مسکرا کے کہا۔ "امریکا جیسی جگہ پہ ہم اکیلے رہ سکتے ہیں تو یہاں کون سی مشکل بات ہے۔" کہتے کہتے میں نے کمرے کا تالا کھول لیا۔

"اچھا دیکھو... پورے گھر کی چابیاں اس میں ہیں، جہاں چاہو جھاڑ پونچھ کرو۔"

"اصغر نے جاتے جاتے رک کر کہا۔ میں کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بڑے سائز کا ایک بیڈ تھا۔ [illegible] جہازی سائز [illegible] وارڈ روب [illegible] صندوق رکھے تھے۔ فل کا بیڈ کمرا تھا مگر تھا وہی ہندوؤں کے زمانے کا۔ پرانے طرز کی کھڑکیاں جو برآمدے میں کھلتی تھیں... جبکہ تین طرف سے یہ کمرا بند تھا۔ کمرے کے اندر سامنے تین دروازے نظر آرہے تھے جن پر تالے لگے تھے۔

"یہ کوٹھریاں ہیں ہمارے گھر کی... دیکھ لینا اگر کوئی چیز تمہاری ضرورت کی ہو تو نکال لینا۔ ہاں، یہ دو کوٹھریاں کھول لینا۔" اس نے اشارے سے بتایا۔ "مگر وہ تیسری آخری کوٹھری مت کھولنا۔"

"کیوں؟" میں نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

"میں کہہ رہا ہوں نا۔" وہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ میں حیران رہ گئی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ وہ پلٹ کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"بات معمولی تھی مگر بہت عجیب سی تھی۔ اس نے مجھے چابیاں دے کر ایک کوٹھری کھولنے سے کیوں منع کیا؟ میں سوچتی ہوئی بیڈ روم کی جھاڑ پونچھ کرتی رہی۔ بیڈ کی چادر بدلنے کے لیے میں نے وارڈ روب کھولی۔ اوپری حصے میں

کپڑے ہینگروں میں لٹکے ہوئے تھے اور نیچے کے ریک میں دھلی ہوئی چادریں رکھی تھیں۔ میں نے ایک چادر نکالی اور تبدیل کردی۔

"سب سے نیچے ریک میں مختلف زنانہ اور مردانہ جوتے رکھے تھے۔ میں نے میلی چادر تہ کرکے جوتوں والے ریک میں رکھ دی۔ اس وقت اوپر ٹنگے ہوئے زنانہ کپڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے سوچا۔ یقیناً یہ جمی، صبا اور فرخندہ کے کپڑے ہوں گے۔ ان میں سے جینز شرٹس بھی تھیں۔ شلوار قمیص بھی اور ساڑیاں بھی... کچھ نائٹیاں بھی تھیں۔ میں نے سوچا، اپنا سوٹ کیس کھول کر نائٹی نکالنے کی مصیبت سے بہتر ہے کہ ان میں سے ایک نکال لوں۔ اکثر لیلیٰ کے گھر رہ جاتی تھی تو اس کی نائٹی بھی استعمال کرلیا کرتی تھی۔ میں وہمی قسم کی لڑکی نہیں ہوں، سو اس وقت بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ سب دھلے دھلائے کپڑے تھے۔ پلاسٹک کے موم جاموں سے ڈرائی کلین معلوم ہوتے تھے۔

"میں نے نائٹی تبدیل کی۔ چابیاں میں نے بیڈ کے نزدیک سائڈ ٹیبل پر رکھ دی تھیں۔ مجھے کوٹھریاں صاف تو نہیں کرنی تھیں، پھر بھی میرا جی چاہا کہ سب کے تالے کھول کے دیکھوں۔ اس آخری کوٹھری کا بھی... جانے اس میں کیا تھا؟ میں نے دل چاہنے کے باوجود چابیاں نہیں اٹھائیں اور وہ آخری کوٹھری تو کیا... پہلی دو بھی نہیں کھولیں۔

"میں باہر نکل کر کچن میں آگئی۔ یہاں ہر سہولت موجود تھی۔ کچن کا سارا سامان تھا، اوون تھا... ٹوسٹر، جوسر، بلینڈر یہاں تک کہ مائیکرو ویو بھی... سب پر گرد جمی تھی۔ میں نے کپڑا لے کر جھاڑ پونچھ کی مگر خاصی چیزیں دھلنے والی تھیں۔ میں نے سوچا، باقی کو کل دیکھا جائے گا۔ ہاں، چائے کے برتن ضرور دھو لوں تاکہ اصغر کے آتے ہی چائے تیار ہوجائے مگر برتن بھی پرانے گرد آلود... جن پر گرد جم کے رہ گئی تھی... دھونے کے لیے کسی لیکوئیڈ یا سوپ کی ضرورت تھی۔ میں نے کچن میں ہر جگہ تلاش کیا، ناکام رہی... سوچا شاید کوٹھریوں میں اس قسم کا سامان رکھا ہو... واپس بیڈ روم میں آئی اور چابیاں اٹھا کر پہلی کوٹھری کھولی۔ اس میں صندوق رکھے تھے... اور ایک بڑی پیٹی تھی۔ میں نے کھول کر دیکھا۔ اس میں رضائیاں رکھی تھیں... اور صندوقوں میں کپڑے اور چادریں وغیرہ... میں نے انہیں بند کیں اور باہر نکل کر پھر سے تالا لگا دیا۔ دوسری کوٹھری کھولی، اس میں ڈبے وغیرہ تھے جن میں دالیں، چاول، صابن وغیرہ تھے۔ میں نے برتن دھونے کا لیکوئیڈ اٹھایا اور باہر نکل کر دوبارہ کوٹھری کو تالا لگا دیا۔ اس وقت میرے اندر کے تجسس نے سر ابھارا کہ وہ تیسری کوٹھری بھی کھول ڈالوں... کون سا اصغر کو پتا چلے گا؟ وہ ابھی تک نہیں آیا اس کا مطلب ہے کہ قریبی بازار بند ہوچکا ہے اور وہ گاڑی لے کر کہیں آگے نکل گیا ہے۔ کوٹھری کا تالا کھولوں گی اور اندر دیکھ کر فوراً بند کردوں گی۔ بار بار یہی سوچ میرے ذہن میں سر اٹھا رہی تھی... مگر اصغر نے منع کیوں کیا ایسا کرنے سے... کیا وہ میرا امتحان لینا چاہتا ہے؟ ممکن ہے اس کوٹھری میں کچھ بھی نہ ہو اور وہ دیکھنا چاہتا ہو کہ میں اس کی بات مانتی ہوں یا نہیں...

"یہ سوچ کر میں آپ ہی آپ مسکرا دی اور کوٹھری کا تالا کھولے بغیر باہر نکل آئی۔ پھر ایک دم بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ ایسا تو نہیں کہ اپنی ہر بیوی کا امتحان اصغر نے ایسے ہی لیا ہو۔ بات چھوٹی سی ہے مگر یہی اصغر کے لیے بڑی اہم ہوسکتی ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو بے انتہا چاہا، اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی خواہش پوری کی... مگر وہ اس کی ایک ذرا سی بات نہ مان سکی... ممکن ہے وہ چھپ کر دیکھتا ہو... اور میرا یہ خیال اگلے ہی لمحے حقیقت بن کے میرے سامنے آگیا۔

"جیسے ہی میں کمرے سے باہر نکلی، اصغر جانے کہاں سے اچانک ہی میرے سامنے آگیا اور آتے ہی مجھے بازوؤں میں اٹھا لیا... وہ خوشی سے پاگل ہورہا تھا۔

"میں نے محبت پالی آسی... اعتماد پالیا... مجھے وہ سب کچھ مل گیا آسی جس کی زندگی بھر تمنا کی تھی..." وہ مجھے دیوانوں کی طرح چوم رہا تھا۔ اس کے اس والہانہ اظہار پر میری آنکھیں نم ہورہی تھیں۔

"اچھا اچھا... مجھے چھوڑیں تو... لائیں دودھ کہاں ہے؟" میں نے اس سے علیحدہ ہوکر کہا۔

"کون سا دودھ؟" وہ قہقہہ لگا کر بولے۔ "کون لایا دودھ؟ کہاں سے آیا؟" وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "وہ تو بس بہانہ تھا... میں تو یہاں ادھر چھپ کر دیوار کے سوراخ سے اندر جھانک رہا تھا... تمام وقت۔" اس نے ہنستے ہنستے اشارے سے ایک نیم اندھیرے حصے کی طرف اشارہ کیا۔

"اف آسی... تم نے مجھے کیا دے دیا ہے... سب کچھ دے دیا ہے، سب کچھ... اب مجھے کسی چیز کی تمنا نہیں رہی۔" میں مسکرا دی۔ سوچا ابھی تم ایک خبر سنو گے تب دیکھوں گی... تمہاری تمنا کیسے باہر آتی ہے... تم خوشی سے کس طرح مزید پاگل ہوتے ہو۔

"مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں ایک دوسرے

www.pkdigest.com

کے بازوؤں میں بازو ڈالے بیڈروم میں آگئے۔

”مجھے یقین نہیں تھا آسی... کہ میں اس قدر خوش نصیب ہو سکتا ہوں۔“ اصغر نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ ”کتنا پاگل تھا... میں...“ وہ ہنستا چلا گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، تب مجھے احساس ہوا کہ وہ بھی نارمل نہیں... اصغر ایک ہذیانی ہنسی ہنس رہا تھا اور پھر ہنستے ہنستے اس نے اپنے لباس میں سے... جانے کس طرف سے وہ لمبی چمک دار چھری نکال لی... ”دیکھو دیکھو، میں بھی کتنا پاگل تھا۔ میں نے یہ چھری بھی چھپا کر رکھ لی تھی... جیسے کہ آسی بھی تم ہو، صبا ہو یا فرخندہ...“ اس نے چھری میری طرف بڑھا دی... میں نے لرزتے ہاتھوں سے چھری کو تھام لیا لیکن گرد میں پڑے ہوئے اسکارف کے ساتھ... جیسے میرے ہاتھوں نے اسے چھوا تو جل جائیں گے۔ میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ جمی، صبا اور فرخندہ کی تڑپتی ہوئی لاشیں میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔

”آؤ... آؤ... میں تمہیں دکھاؤں...“ وہ آگے بڑھا اور تیسری کوٹھری کا تالا کھولنے لگا۔

”آؤ... آؤ...“ اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے تقریباً کھینچا کیونکہ میرے پاؤں، میرا وجود... من من بھر کا ہو رہا تھا۔ کوٹھری کا تالا کھل گیا... اور پھر دونوں پٹ بھی...

”بے اختیار ایک گھٹی گھٹی چیخ میرے حلق سے بلند ہوئی... اور میں سرتاپا لرزنے لگی۔

”ڈرو نہیں... آسی... ڈرو نہیں۔“ اصغر نے محبت سے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا... مگر اس کے ہر عمل میں جیسے ایسی دیوانگی اور وحشت تھی کہ مجھے لگا، اس کے وجود سے مس ہوئی تو جل جاؤں گی۔

”میں نے اس سے الگ ہونا چاہا مگر اس کی گرفت سخت ہو گئی۔ خوف سے میرے بدن کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ ”ڈرو نہیں میری جان... میری زندگی... اب یہ کوٹھری کبھی بند نہیں ہو گی۔ کبھی نہیں کھلے گی۔“ وہ وحشت سے پھٹی آواز میں چیخ رہا تھا اور پھر اس کی آواز سرگوشی بن گئی۔ ”ہم راتوں رات... ان لاشوں کو تھیلوں میں بند کر کے دریا میں بہا دیں گے۔“

”میں جو اندر کے منظر سے نگاہ چرا رہی تھی... اپنی آنکھوں کو بند نہ رکھ سکی۔ میں نے دیکھا، وہ تین جوان عورتوں کی سربریدہ برہنہ لاشیں تھیں جن کے سر بھی الگ الگ سجے ہوئے تھے۔ یقیناً لاشوں کے بدن پر یہ سفید پاؤڈر، سائنسی فارمولے کے تحت ایسا مسالا ہو گا جو نعشوں کو محفوظ رکھتا ہے۔

”میرے اندر ایک بل سا پڑا جیسے میرا سانس رک جائے گا... میرے اندر سانس لیتے وجود نے مجھے کچھ احساس دلایا... یہ... یہ میرے شوہر... میرے ہونے والے بچے کے باپ کی بربریت کا ثبوت تھا... میرے بچے کے شقی القلب باپ کا... سفاک، قاتل پاگل باپ کا!

”میں... میں... اپنے بچے پر اس کا سایہ نہیں پڑنے دوں گی۔“ خوف سے تھرتھر کانپتی آسیہ میرے اندر کہیں گم ہو گئی تھی... اور... پھر اسکارف میں چھپی وہ لمبی چھری میرے ساتھ لگے ہوئے اصغر حسین کے سینے میں اتر گئی... اس کی گھٹی گھٹی چیخ کوٹھری میں ابھری اور اسی کی دیواروں سے ٹکرا کے دم توڑ گئی۔ وہ مجھ سے الگ ہو کر فرش پر گر چکا تھا۔ میری نائٹی خون آلود ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیسے ہوا... مجھ سے کیسے سرزد ہو گیا... یہ ہمت و جرأت کہاں سے آ گئی... میں لرزتے قدموں سے آگے بڑھی اور کانپتے ہاتھوں سے اپنے اتارے ہوئے کپڑے اٹھائے اور باتھ روم میں جا کر کسی نہ کسی طرح کپڑے بدل لیے۔ خون آلود نائٹی میں نے دھو کر باہر الگنی پر ڈال دی اور گاڑی کی چابیاں اور پرس اٹھا کے باہر نکل آئی۔ تنگ گلیوں سے ہوتی ہوئی میں جلد ہی گاڑی تک پہنچ گئی... اور پھر اپنے ہوٹل...

[illegible]

اخبارات پڑھتے ہوئے میں نے بارہا سوچا کہ بھلا قاتل اصغر حسین اور آسیہ فاروقی میں کیا فرق ہوا؟ اگر وہ سزاوار تھا تو کیا آسیہ فاروقی معاف کر دیے جانے کے قابل ہے؟ پاکستانی اخبارات میں ان عجیب و غریب قتل کی خبریں اب دب چکی تھیں مگر میں اب بھی سوچتی رہتی تھی کہ کیا مجھے پاکستان جا کر خود کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے...؟ لیکن پھر میں نے وقتی طور پر اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیا... کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا بچہ جیل میں آنکھ کھولے۔

”چند ماہ بعد میں ماں بن جاؤں گی... اور اس کے بعد اخباروں کی زینت بن جاؤں گی... پھر اس عجیب و غریب قتل کی واردات کا یہ معما کھل جائے گا کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے... اپنے بچے کو لیلیٰ کی فیملی کے حوالے کر کے پاکستان چلی جاؤں اور خود کو پولیس کے سپرد کر دوں گی۔

”آخر جب اصغر حسین کا سایہ میں نے اپنے بچے پر نہیں پڑنے دیا تو اس کی قاتلہ آسیہ فاروقی کا سایہ اس پر کیسے پڑنے دوں گی؟

”یہ فیصلہ میرے لیے اطمینان کا باعث تھا۔“

پہلا رنگ

شب ظلمات

فاطمہ حسام

یقینِ کامل کی دولت دنیا کی تمام آسائشات مال و زر پر فوقیت رکھتی ہے۔ یقینِ کامل مانندِ کائنات ہے اور اس کے سامنے کائنات کی ہر دولت مانندِ ذرہ ہے۔ دولت کی چاہ رکھنے والے چند ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی کہانی جو یقین و بے یقینی کا شکار تھے... ان کی زندگی کے چند پوشیدہ حقائق گمشدہ اوراق کی صورت بکھرنے کو تھے

موت سے ہراساں... زندگی کی تلاش میں بھٹکنے والوں کی جنگ کا پُراسرار احوال

وہ قلعہ نما مکان ویرانے میں بہار کا منظر پیش کرتا تھا۔ اس کے طرزِ تعمیر اور در و دیوار سے قدامت اور کہنہ سالی جھلکتی تھی تاہم اس کے داخلی دروازے کے سامنے ایک ہرا بھرا لان بھی دکھائی دیتا تھا جو اس بات کا مظہر تھا کہ اس گھر میں کوئی رہائش پذیر بھی ہوگا۔

ہاں... اس وقت پرویز نامی ایک شخص اس گھر کے اندر موجود تھا جو چند گھنٹے پہلے عارضی طور پر وہاں رہنے آیا تھا۔ اس وقت سہ پہر کا وقت تھا۔ پرویز تمام تر انتظامات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد آج دوپہر... وہاں پہنچا تھا۔ اسے صرف ایک رات اس قلعہ نما گھر میں گزارنا تھی۔ صبح ہونے

pkdigest.com

سے پہلے وہ وہاں سے رخصت ہو جاتا... کامیاب و کامران۔

پرویز اس وقت مکان کے تہ خانے میں ایک چوبی تابوت کے ساتھ موجود تھا۔ تابوت کے اندر مارتھا نامی ایک بڑھیا کی لاش رکھی تھی۔ مارتھا کے انتقال کو دو چار روز ہی گزرے تھے۔ مارتھا نے توقع سے زیادہ عمر پائی تھی۔ ایک خطرناک سفلی عمل کے دوران میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ مارتھا ایک مانی ہوئی جادوگرنی تھی۔ وہ "ووڈو" اور دیگر سفلیات پر بڑی مضبوط دسترس رکھتی تھی۔ پرویز ایک خاص مقصد کی خاطر مارتھا کے تابوت کو قبرستان سے نکال کر اس ویرانے میں واقع قلعہ نما گھر میں لایا تھا۔ وہ مارتھا کی لاش کے ساتھ ایک مخصوص عمل کرکے اپنی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل چاہتا تھا۔

پرویز درحقیقت شیطان کا پیروکار تھا اور شیطان کی پرستش اس کی زندگی کا اولین مقصد تھا۔ اس نے اپنا دین ایمان شیطان کے پاس گروی رکھوایا ہوا تھا جس کے بدلے میں شیطان اسے چھوٹی موٹی شعبدہ بازیوں کے فارمولے عطا کرتا رہتا تھا... لیکن پرویز اپنے آقا کی ان عنایات سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ایک روز جب وہ شیطان کی پوجا میں مصروف تھا تو اس نے شکوہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"سر! ابھی تک آپ نے مجھے وہ عطا نہیں کیا جس کی تمنا میں اپنے دل میں برسوں سے پالے بیٹھا ہوں۔"

"ہم تمہارے دل اور دماغ کا حال بخوبی جانتے ہیں۔" شیطان نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے یہ بھی سن رکھا ہوگا کہ بن مانگے تو ماں بھی بچے کو دودھ نہیں پلاتی۔"

"جی سر... میں نے یہ سنا ہے۔" پرویز نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تو پھر اپنی زبان کو زحمت دو!" شیطان نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "مانگو... کیا مانگتے ہو؟"

"کوئی ایسا عمل بتائیں سر..." پرویز نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جس کی مدد سے میں خود کو "نادیدہ" بنا لوں۔"

"انویزیبل (Invisible) بننا چاہتے ہو؟" شیطان نے معنی خیز نظر سے پرویز کی جانب دیکھا۔

"جی... جی سر..." پرویز جلدی سے بولا۔

"تم ہمارے بڑے ہونہار چیلے ہو۔" شیطان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ہم تمہاری خواہش کو رد نہیں کر سکتے لیکن..."

شیطان نے ذومعنی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو پرویز تڑپ کر بولا۔ "لیکن کیا سر؟"

"لیکن یہ کہ..." شیطان نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ "کچھ پانے کے لیے کسی نہ کسی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تمہیں بھی نادیدہ بن جانے کی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے مخصوص عمل کرنا ہوگا... بولو تیار ہو؟"

"آپ حکم کریں سر۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "میں ہر عمل کے لیے تیار ہوں۔"

"چند روز پہلے ایک بہت بڑی جادوگرنی کا انتقال ہوا ہے۔" شیطان سنجیدہ انداز میں بتانے لگا۔ "اگر تم مارتھا نامی اس جادوگرنی کی لاش کو قبر سے نکال کر کسی ویران مقام پر لے جاؤ تو تمہارا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ تمہیں ہمارے بتائے ہوئے طریقے پر من و عن عمل کرنا ہوگا... بولو کرو گے؟"

"سر! میری کیا مجال جو انکار کروں۔" پرویز نے بے دام... غلام کے مانند کہا۔ "آپ جو بھی کہیں گے میں آنکھیں بند کرکے اس پر عمل کروں گا۔"

"اگر تم ہمارے بتائے ہوئے طریقے سے مارتھا کی لاش کے ساتھ عمل کرو گے تو وہ چند لمحوں کے لیے زندہ ہو جائے گی۔" شیطان نے اسے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "انہی چند لمحوں میں تم مارتھا کو ہماری قسم دے کر من کا مطالبہ کرو گے۔"

"من... سر! یہ کیا ہوتا ہے؟" پرویز پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"من... یعنی منکا!" شیطان نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "یہ سبز رنگ کا موتی کے مانند ایک منکا ہوگا۔ تم اس من کو جب بھی زبان کے نیچے رکھو گے تو [illegible] "نادیدہ" بن جاؤ گے۔"

"تھینک یو... سر..." پرویز نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا پھر پوچھا۔ "من کو زبان کے نیچے رکھنے کے بعد میں دنیا والوں کو نظر نہیں آؤں گا نا؟"

"بالکل!" شیطان نے پورے تیقن سے کہا۔ "کوئی تمہیں نہیں دیکھ سکے گا اور تم سب کو دیکھ سکو گے۔"

"سر..." فرطِ جذبات سے پرویز کی آواز کپکپا رہی تھی۔ "کتنا مزہ آئے گا نا...!"

"ہاں، مزہ تو آئے گا..." شیطان بڑے بھونڈے انداز میں ہنسا۔ "تم بڑے آرام سے کسی بھی بینک میں گھس کر جتنی چاہو رقم نکال لاؤ گے۔ جس بھی خوب صورت عورت کے بیڈروم تک پہنچنا چاہو گے، کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی اور جس..."

"سر... آپ بہت... عظیم ہیں..." پرویز، شیطان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بے صبری سے بولا۔ "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔"

"تم میرے خاص الخاص چیلے ہو... میرے اپنے ہو۔" شیطان نے مکروہ انداز میں کہا۔ "اپنوں پر احسان نہیں کیا جاتا۔ تم اگر میرے منشا کے مطابق وہ عمل کرو گے تو میں تم سے خوش ہو جاؤں گا۔"

"میں کروں گا۔" پرویز بڑے عزم سے بولا۔ "آپ جو بھی حکم دیں گے، میں اس پر ضرور عمل کروں گا..."

"تو پھر غور سے سنو۔" شیطان نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

پرویز ہمہ تن گوش ہو گیا۔

شیطان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق، شیطان کے چیلے پرویز کو مارتھا کی لاش کے ساتھ جو بھی سفلی عمل کرنا تھا، اس کی تیاری تقریباً مکمل تھی۔ اسے بس اپنے دستِ راست موسٰی کا انتظار تھا۔ موسٰی کو پرویز نے کسی اہم کام کے لیے کہیں بھیج رکھا تھا۔

موسٰی کی کامیاب واپسی کے بغیر شیطانی عمل ممکن نہیں تھا!

☆☆☆

روزینہ عرف روزی ایک معروف پرائیویٹ بینک کے ہیڈ آفس میں کام کرتی تھی۔ اس کے پاس بینکنگ لائن کا پندرہ سال کا تجربہ تھا اور وہ اپنے شعبے میں مہارت رکھتی تھی۔

اس وقت سہ پہر کے چھ بجے تھے۔ روزی آف کرکے اپنے گھر کی جانب جا رہی تھی۔ معروف سڑک پر وہ بہت توجہ سے ڈرائیونگ کر رہی تھی کہ اس کے سیل فون کی مخصوص گھنٹی نے اسے بتایا کہ کال آ رہی تھی۔ سیل فون اسٹیئرنگ کے پاس اس کے ہینڈبیگ کے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران میں عموماً فون اٹینڈ کرنے سے اجتناب ہی برتتی تھی۔ اب بھی اس نے یہی کیا لیکن دوسری اور تیسری مرتبہ بھی جب کال کی آمد کا سلسلہ برقرار رہا تو ایک سگنل پر اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھا لیا۔ سیل فون کی اسکرین پر ایک اجنبی نمبر ڈسپلے کر رہا تھا۔ سگنل چونکہ بند تھا لہٰذا اس نے کال اٹینڈ کرنے کا فوری فیصلہ کر لیا تاکہ یہ پتا چلایا جا سکے کہ اتنی بے تابی سے کون اسے فون کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"ہیلو...!" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں تو اس وقت میں روزی سے بات کر رہا ہوں؟" فون کے اسپیکر میں ایک بھاری بھرکم مردانہ آواز ابھری۔

"آپ کون...؟" روزی نے معتدل انداز میں سوال کیا۔

"میرا نام ریحان واسطی ہے۔" اس شخص نے بتایا۔

"میں کسی ریحان کو نہیں جانتی۔" روزی نے واضح الفاظ میں کہا۔ "فرمائیں، آپ نے کال کی زحمت کیوں کی؟"

"آپ بے شک مجھے نہیں جانتیں مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ روزی کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کا اصل نام روزینہ ہے۔ روزی آپ کا شارٹ نیم ہے۔ آپ بینک میں اچھے عہدے پر فائز ہیں اور اس وقت آپ بینک سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جا رہی ہیں۔ آپ کی گاڑی کا میک اور نمبر..."

"میرے بارے میں اس نوعیت کی معلومات تو بہت سے لوگوں کو حاصل ہیں واسطی صاحب!" وہ قدرے زچ ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا آپ نے یہی سب بتانے کے لیے مجھے فون کیا ہے...؟"

"نہیں۔" وہ..... قطعیت سے بولا۔ "یہ تو محض تعارف کا انداز ہے۔ میں نے تو ایک نہایت ہی اہم بات کے لیے آپ کو کال کیا ہے۔"

"تو پھر اچھا ہوگا... آپ کام ہی کی بات کریں۔"

"آپ بہت سمجھ دار ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "مجھے یقین ہے، میں آپ کو جو کچھ بھی سمجھانا چاہتا ہوں، وہ بہ آسانی آپ کی عقل میں اتر جائے گا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا مس روزی؟"

اس دوران میں سگنل گرین ہو گیا تھا۔ روزی نے گاڑی کو سڑک کے کنارے لگا دیا پھر ریحان واسطی کے استفسار کے جواب میں کہا۔

"میں نے گاڑی ایک جگہ روک دی ہے۔ اب بتائیں، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟"

"گاڑی روک کر آپ نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے کیونکہ میں آپ سے جو کچھ کہنا چاہ رہا ہوں، وہ سن کر اسٹیئرنگ پر آپ کی گرفت ڈگمگا بھی سکتی ہے۔" ریحان واسطی نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "میرا اندازہ بالکل درست ہے۔ آپ ایک سمجھ دار اور بردبار لڑکی ہیں اور مجھے امید ہے، آپ میری بات کے جواب میں بھی بڑے تحمل اور تدبر کا مظاہرہ کریں گی..."

"لیکن کچھ پتا بھی تو چلے، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" روزی بیزاری سے بولی۔ "ایسی کون سی بات ہے جسے سن کر میرے ہاتھوں میں گاڑی کا اسٹیئرنگ کپکپا اٹھے گا...؟"

"آپ کے ایک سنگین جرم کا زندہ ثبوت ہے میرے پاس۔" ریحان واسطی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ زندہ ثبوت میں آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں مس روزی!"

"جرم... میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" وہ گڑبڑا گئی۔

"چند روز پہلے آپ ایک خالی سڑک پر بڑی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے جا رہی تھیں اور آپ نے ایک بچے کو ہِٹ کر دیا تھا۔" ریحان واسطی نے ٹھہرے ہوئے

www.pkdigest.com

لہجے میں کہا۔ ”اس سنگین حادثے کے بعد آپ نے جائے وقوعہ پر ایک لمحے کے لیے بھی رکنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ آپ نے یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ اس بارہ سالہ مزدور محنت کش بچے کا کیا حشر ہوا ہوگا...“ وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”یہ تو دوسرے روز کے اخبارات سے آپ کو پتا چلا تھا کہ گزشتہ رات آپ نے جس بچے کو کچل ڈالا تھا، وہ وہیں موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا... میں غلط تو نہیں کہہ رہا...؟“

روزی کے ہاتھ میں سیل فون لرزنے لگا۔ ریحان واسطی نے ایک لفظ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ چند روز پہلے ایک رات من وعن ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ روزی کی اپنے ایک کولیگ شہزاد سے تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ وہ خاصی ٹینس تھی اور اسی ذہنی دباؤ کے زیرِ اثر وہ اندھا دھند ڈرائیونگ کرتے ہوئے اپنے گھر کی جانب جا رہی تھی کہ ایک خالی سڑک پر تولیا رومال بیچنے والا وہ محنت کش بچہ اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ بے خیالی میں سڑک پار کر رہا تھا کہ روزی کی گاڑی نے اسے روند ڈالا۔ روزی نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ بچہ اتنا اچانک گاڑی کے سامنے آیا تھا کہ روزی کی ہر کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ مذکورہ بچہ اس کی گاڑی کے ساتھ ٹکرانے کے بعد کسی فٹ بال کے مانند اچھل کر کئی گز دور جا گرا تھا۔ یہ سچ ہے کہ روزی نے جائے حادثہ پر رک کر یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس بدنصیب مزدور بچے پر کیا بیتی تھی۔ دراصل وہ بری طرح ڈر گئی تھی۔ اگلے روز اخبارات کے ذریعے ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ عرفان نامی وہ بچہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔

روزی دل اور ذہن کی بہت مضبوط تھی۔ اس نے اس اندوہناک واقعے کے بارے میں کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی بلکہ وہ تو اس حادثے کو تقریباً بھول ہی چکی تھی کہ اس کال نے اس کا سکون برباد کر دیا.....

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کے ذہن سے گزرے اور اس نے ریحان واسطی کے استفسار کے جواب میں فکرمند لہجے میں کہا۔

”آپ غلط تو نہیں کہہ رہے لیکن... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ... آپ کو اس واقعے کے بارے میں کیسے پتا چلا؟“

”مجھے صرف پتا ہی نہیں بلکہ آپ کے اس سنگین جرم کا ایک جیتا جاگتا ثبوت بھی ہے میرے پاس۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے اپنے خفیہ ذرائع کی مدد سے اس حادثے کو شوٹ کیا ہے۔ آپ کا ”کارنامہ“ ایک ڈی وی ڈی میں محفوظ ہے۔ جس میں وہ بچہ، آپ کی گاڑی نمبر پلیٹ سمیت اور آپ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اگر میں یہ ثبوت کسی پولیس آفیسر کے حوالے کر دوں تو آپ بخوبی اندازہ لگا سکتی ہیں کہ اس کے بعد آپ کا کیا بنے گا...!“

”کیا... میں پوچھ سکتی ہوں... کہ آپ نے اس اتفاقیہ حادثے کو شوٹ... کیوں کیا...؟“ روزی نے پھنسی پھنسی آواز میں سوال کیا۔

”ضرور پوچھ سکتی ہیں کیونکہ یہ آپ کا حق ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”مس روزی! لوگوں کے جرائم پر مبنی شاہکار نوعیت کے مناظر کو کیپچر کرنا میرا محبوب مشغلہ ہے اور میں نے اسی مشغلے کو اپنا کاروبار بھی بنایا ہوا ہے۔ ان ماسٹر پیس ثبوت کو متعلقہ افراد منہ مانگے داموں مجھ سے خرید لیتے ہیں۔“

”یعنی آپ ایک بلیک میلر ہو؟“ روزی نے پوچھا۔

”آپ مجھے کسی بھی نام سے پکاریں، اس سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“ وہ قدرے رکھائی سے بولا۔ ”یہ میرا بزنس ہے۔ میں محنت کی کھاتا ہوں۔ لوگوں کو قانونی پیچیدگیوں میں الجھنے اور خوار ہونے سے بچاتا ہوں۔“

”مسٹر واسطی!“ روزی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”تو آپ نے مجھے اس لیے کال کیا ہے کہ میں وہ ڈی وی ڈی حاصل کرنے کے لیے آپ کا کوئی مطالبہ پورا کر دوں؟“

”یقیناً یہی بات ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ”لیکن آپ میرے بزنس کے حوالے سے بہت نامناسب الفاظ استعمال کر رہی ہیں...!“

روزی نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے؟“

”آپ نے اپنے سنگین جرم کے لیے ”ڈی وی ڈی“ اور میری فنکارانہ محنت کے لیے ”مطالبہ“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں...“ ریحان واسطی نے شکایتی انداز میں کہا۔ ”آپ کا یہ اسٹائل مجھے اچھا نہیں لگا۔“

”اوہ... آئی ایم سوری۔“ وہ جلدی سے بولی پھر ایک امکانی صورت کے حوالے سے سوال کیا۔ ”اگر میں آپ کی محنت کا معاوضہ ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو...؟“

”آپ اس فیصلے کے لیے آزاد ہیں۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔ ”پھر میں یہ ڈی وی ڈی اس انکوائری آفیسر کو بھجوا دوں گا جو بچے کو پیش آنے والے حادثے کی تفتیش پر مامور ہے۔ اس کے بعد جو بھی نتائج برآمد ہوں، اس کی ذمے داری سراسر آپ پر عائد ہوگی۔“

روزی کو یقین تھا کہ ریحان واسطی نامی وہ بلیک میلر کچھ اسی قسم کا جواب دے گا۔ وہ مصلحت آمیز انداز میں مستفسر ہوئی۔

”مسٹر واسطی! میں وہ ڈی وی ڈی حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ بتائیں اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”بائیس مئی، بروز ہفتہ، سہ پہر ٹھیک پانچ بجے آپ کو ہوٹل بلوم اسٹار کی لابی میں پہنچنا ہوگا۔“ ریحان واسطی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہاں مشتاق نامی میرا ایک آدمی موجود ہوگا۔ وہ آپ کو اپنے ساتھ میرے پاس لے آئے گا۔ میں مذکورہ ڈی وی ڈی آپ کے حوالے کر دوں گا لیکن...“ وہ ڈرامائی انداز میں خاموش ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آپ اپنے ساتھ مبلغ دو لاکھ روپے لانا نہیں بھولیں گی۔ میں رقم وصول کرنے کے بعد ہی وہ ڈی وی ڈی آپ کو دے سکوں گا۔“

”دو لاکھ... یہ تو بہت زیادہ ہیں...“ روزی نے کہا۔

”کسی غریب مزدور کے لیے یہ یقیناً ایک بڑی رقم ہے، آپ کے لیے ہرگز نہیں۔“ وہ چبھتے ہوئے انداز میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں، آپ کی سیلری دو لاکھ سے اوپر ہے۔ کیا آپ اتنی اہم ڈی وی ڈی کو حاصل کرنے کے لیے ایک ماہ کی تنخواہ کی قربانی نہیں دے سکتیں؟“

”مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ اس ڈی وی ڈی کی کوئی کاپی اپنے پاس نہیں رکھیں گے؟“

”میں اپنا کام نہایت ایمان داری سے کرتا ہوں۔“ وہ ...... سنجیدگی سے بولا۔ ”اس سلسلے میں، میں آپ کو کوئی وارنٹی نہیں دے سکتا۔ آپ کو میری بات پر ہی بھروسا کرنا ہوگا اور اگر دل اعتبار کرنے کو تیار نہ ہو تو...؟“

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو روزی نے اضطراری لہجے میں کہا۔

”نن... نہیں... میں آؤں گی... ضرور آؤں گی۔“

”ویری گڈ...“ ریحان واسطی نے ستائشی انداز میں کہا پھر ان الفاظ پر سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔ ”بیسٹ آف لک...!“

روزی نے ایک بوجھل سانس خارج کی۔ اس کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ دو لاکھ ارینج کرنا اس کے لیے دشوار نہیں تھا اور اسے ریحان واسطی کی باتوں کا یقین تھا۔ وہ جانتی تھی کہ تمام دو نمبر کام بہت ہی دیانت داری سے کیے جاتے ہیں۔ اس نوعیت کے کاموں میں کوئی لکھت پڑھت نہیں ہوتی۔ انسان کی زبان ہی کو سب سے بڑی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔

ہفتے کا دن اس کام کے لیے ویسے بھی بہت مناسب تھا۔ اس روز وہ دوپہر دو بجے آف کر لیتی تھی مگر گھر واپسی معمول کے مطابق ہی ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والی دوستوں بینا، ثنا اور ہما کے ساتھ شاپنگ وغیرہ کے لیے نکل جایا کرتی تھی۔ کبھی ان کا بیوٹی پارلر جانے کا پروگرام بن جاتا اور کبھی وہ کسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھتیں۔ اگر وہ بلیک میلر ہفتے کے سوا کسی اور دن کا انتخاب کرتا تو اس کے لیے آفس سے نکلنا بہت مشکل ہو جاتا۔ آج کل آفس میں بڑی ہنگامی بنیادوں پر کام چل رہا تھا اور اکثر لیٹ سٹنگ بھی کرنا پڑتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ریحان واسطی نے اس کے اسکیجویل کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنا پروگرام ترتیب دیا تھا۔

اس نے سیل فون کو واپس پیسنجر سیٹ پر رکھا۔ گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور ٹریفک کے رواں دواں سیل آب میں شامل ہو گئی۔ گھر کی جانب جاتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل شہزاد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر اس روز شہزاد اس کا موڈ خراب نہ کرتا تو وہ اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے معتدل ڈرائیونگ کرتی... پھر کسی حادثے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ ان لمحات میں شہزاد کو کوسنے لگی تاہم اس خیالی چخ چخ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اسی سوچ بچار کے دوران میں ایک لمحے کے لیے روزی کے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا کہ اس بارے میں شہزاد کو آگاہ کرنا چاہیے لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ذہن جھٹک دیا۔ یہ حادثہ شہزاد کے علم میں نہیں تھا۔ اگر اب وہ بلیک میلر کے حوالے سے اسے کچھ بتاتی تو پھر ایک طولانی بحث کا دروازہ کھل جاتا۔

فی الحال وہ کوئی نیا محاذ کھولنے کے موڈ میں نہیں تھی!

☆☆☆

ماجد ایک ڈراما پروڈیوسر تھا۔ اس نے شہر کے ایک انتہائی پوش علاقے میں اپنا پروڈکشن ہاؤس بنا رکھا تھا۔ اس کے پروڈکشن ہاؤس میں تیار ہونے والے ڈرامے بڑے بولڈ تصور کیے جاتے تھے۔ وہ ہر پروجیکٹ میں نئے نئے چہروں... کو متعارف کرانے کا شوقین تھا۔ اس کی ٹیم کے آرٹسٹوں میں زیادہ تر افراد اونچی فیملیز سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قسم کے برگر فنکاروں کے بڑے فائدے تھے۔ ایک تو انہیں معاوضے کی زیادہ پروا نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی میں خوش تھے کہ اسکرین ان سے بھری رہے۔ پھر ان کے کاسٹیوم وغیرہ کا خرچہ بھی وہ خود اٹھاتے تھے اور پروڈیوسر کے ساتھ ساتھ

www.pkdigest.com

مختلف ڈائریکٹرز کو شاپنگ کرانا بھی ان کے فرائض میں شامل تھا اور بعض اوقات تو یہ صاحبِ ثروت "بگ بلڈ" پروجیکٹ کے بجٹ میں بھی حصہ ڈال دیتا تھا۔

ان کے علاوہ ماجد متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے فن کاروں کو بھی گاہے بگاہے موقع دیتا رہتا تھا۔ ان میں سے بعض تمثیلی آرٹسٹ کو "ہنی ہائنڈ دی کیمرا" ماجد کے بیڈروم میں بھی فیک دینا پڑتا تھا۔ اس غیر نصابی ان اسکیچ ٹیل شوٹنگ میں بسا اوقات اس کے قریبی دوست بھی شامل ہو جاتے تھے۔

ماجد کی یہ سرگرمیاں تو کافی عرصے سے جاری تھیں اور کبھی کوئی بدمزگی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر قسم کی سچویشن کو بڑی مہارت سے ہینڈل کر لیتا تھا... لیکن ایک سچویشن اس کے ذہن کا عذاب بن گئی تھی اور وہ سچویشن تھی... نادیہ!

نادیہ نامی ایک خوبصورت ایکسٹرا لڑکی کو پچھلے دنوں ماجد نے اپنے ایک دوست کی مدد سے کسی ویران مقام پر زیرِ زمین "چھپا" دیا تھا۔ نادیہ بے چاری ماجد اور اس کے دوست شہباز کی اجتماعی عیاشی کی تاب نہ لاتے ہوئے اس دنیا سے اس دنیا میں منتقل ہوگئی تھی۔ ماجد نے شہباز کے تعاون سے نہایت ہی مہارت کے ساتھ نادیہ کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور وہ دونوں مطمئن ہو گئے تھے کہ نادیہ کے "احوالِ واقعی" کی کسی کو کوئی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ پروڈکشن ہاؤس کا اسٹاف یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اچانک غائب ہو گئی ہے۔ کہاں...؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

پھر ایک رات ماجد کا سکون تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ اس افراتفری کا سبب ایک ٹیلی فون کال تھی۔ وہ رات کے دو بجے اپنے بیڈروم میں موجود سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کے بیوی بچے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ اس رات گھر میں اکیلا ہی تھا۔ بچوں کا رزلٹ مہینے کی آخری تاریخوں میں آنا تھا اور اس سے ایک دو روز پہلے ہی اس کی فیملی کی واپسی ہوتی۔

اس نے بیڈ سائڈ پر رکھے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا پھر ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ہیلو...!"

"ہیلو ماجد! کیسے ہو؟" ائرپیس میں ایک نامانوس آواز ابھری۔

"کون...؟" ماجد نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

دوسری جانب سے بولنے والے نے بتایا۔ "ریحان شیرازی...!"

"کون ریحان شیرازی؟"

"ریحان شیرازی، ریحان شیرازی... اور کون!"

"میں کسی ریحان شیرازی کو نہیں جانتا۔" ماجد کے لہجے میں اکتاہٹ شامل ہوگئی۔

"مگر میں تو ماجد پروڈیوسر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" ریحان شیرازی نے کہا۔ "اور اس کے ہم پیالہ، ہم نوالہ اور ہم رسالہ دوست شہباز کو بھی...!"

ماجد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ ریحان شیرازی آخر تھا کون جو اسے اور اس کے دوست شہباز کو جانتا تھا لیکن وہ خود اس ریحان شیرازی سے ناواقف تھا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"مسٹر شیرازی! کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ اتنی رات گئے فون کرنے کی زحمت کیوں کی...؟"

"تمہیں گڈ نائٹ کہنے کو جی چاہ رہا تھا۔" ریحان شیرازی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تھینک یو... میں نے آپ کا گڈ نائٹ وصول کر لیا۔" ماجد کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔ "اب آپ سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو... مجھے بڑی زور کی نیند آ رہی ہے۔"

"نہیں آئے گی۔" ریحان نے بڑے بے وثوق سے کہا۔

"کیا نہیں آئے گی... کون نہیں آئے گی...؟" ماجد نے بے ساختہ پوچھا۔

"یار! میں نیند کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیا مطلب...؟" ماجد کے لہجے میں درشتی شامل ہو گئی۔

"مطلب بہت واضح ہے۔" ریحان شیرازی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب میں نے تمہاری نیند اڑانے کے لیے فون کیا ہے تو پھر یہ کم بخت آئے گی کیسے۔"

ماجد کی جھنجلاہٹ میں تشویش بھی در آئی۔ اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو بھی کہنا چاہتے ہو، صاف صاف کہو..." ماجد نے "آپ جناب" کے لحاظ کو اٹھا کر ایک جانب رکھ دیا تھا۔

"صاف صاف سننا چاہتے ہو تو صاف صاف بتاؤ..." ریحان شیرازی نے ڈرامائی رنگ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم گھپ اندھیرے میں لائٹ کے بغیر شوٹ نہیں کر سکتے ہو؟"

"نہیں... لائٹ کے بغیر شوٹنگ کیسے ہوگی؟"

"تم اپنے پروڈکشن ہاؤس کی "ای این جی" کی بات کر رہے ہو یا دنیا کا کوئی بھی کیمرا اندھیرے میں شوٹ نہیں کر سکتا؟" ریحان شیرازی نے بڑے ماہرانہ انداز میں سوال کیا۔

"میں اپنے کیمروں کی بات کر رہا ہوں۔" ماجد نے جواباً کہا۔ "ورنہ میری معلومات کے مطابق، ایسے کیمرے بنا لیے گئے ہیں جو گہری تاریکی میں بھی بغیر لائٹ کے سونی صدکار کردگی کی بنیاد پر شوٹ کر سکتے ہیں۔"

"ویسا ہی ایک کیمرا میرے پاس ہے۔" ریحان شیرازی نے بتایا۔

"کیا اتنی رات گئے تم نے اپنا وہ کیمرا بیچنے کے لیے مجھے فون کیا ہے؟"

"کیمرا نہیں..." ریحان شیرازی نے کہا۔ "وہ میرے لیے بہت کام کی چیز ہے... بلکہ میری آمدنی کا ذریعہ ہے۔"

"پھر...؟" ماجد کے لہجے میں بے پناہ الجھن تھی۔

"میں کیمرا نہیں... اس کی پروڈکٹ تمہیں دینا چاہتا ہوں۔" ریحان شیرازی نے بتایا۔ "ایسی عظیم پروڈکٹ جس کے بارے میں سن کر تمہارے ہاتھوں کے طوطے اور آنکھوں کی نیند اڑ جائے گی۔"

"ایسی کون سی پروڈکٹ ہے بھائی...؟" ماجد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"وہ ایک "ڈی وی" ہے۔" ریحان شیرازی نے سنسناتے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "میں نے چند روز پہلے، رات کی تاریکی میں ایک مختصر سی شوٹ کی ہے جو اس ڈی وی میں محفوظ ہے۔ میں یہ ڈی وی تمہارے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن... میرا اس ڈی وی سے کیا تعلق...؟" ماجد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"بہت گہرا تعلق ہے مسٹر ماجد!" ریحان شیرازی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس رات میں نے تین کرداروں کو شوٹ کیا تھا جن میں سے ایک تم ہو۔"

"اور باقی دو...؟" ماجد نے لکنت زدہ آواز میں پوچھا۔

"ایک تمہارا سب سے چہیتا دوست ہے... شہباز۔" ریحان شیرازی نے بہ دستور سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "اور دوسرا کردار ہے ایک لاش... نادیہ نامی ایک ایکسٹرا لڑکی کی لاش..."

"اوہ...!" ماجد ایک سرسراتی ہوئی سانس لے کر رہ گیا۔

ریحان شیرازی نے کہا۔ "میرے شوٹ کا پہلا فریم کھلتا ہے۔ کیمرے کی، تاریکی میں بہ خوبی دیکھنے والی آنکھ ایک گاڑی کو نمبر پلیٹ سمیت، ایک ویران مقام پر رکتے ہوئے دکھاتی ہے۔ ایک خوب صورت اتفاق ہے کہ مذکورہ گاڑی تمہاری ملکیت ہے۔ دوسرے شاٹ میں تم اور تمہارا دوست شہباز گاڑی میں سے باہر آتے ہو اور گاڑی کی ڈکی کی جانب بڑھ جاتے ہو۔ تیسرے شاٹ میں تم ڈکی میں سے ایک بیلچہ نکالتے ہو۔ چوتھے شاٹ میں تم ویران تاریک مقام کی بھربھری زمین میں بیلچے کی مدد سے ایک گڑھا کھودتے ہو۔ پانچویں شاٹ میں تم دونوں مل کر نادیہ کی لاش کو گاڑی کی ڈکی میں سے نکالتے ہو۔ کیمرا تمہارے ساتھ پین کرتے ہوئے گڑھے تک جاتا ہے۔ پھر فل زوم ہو کر نادیہ کے چہرے کا کلوز دکھاتا ہے۔ کیمرا سولو سے ماسٹر پر آتا ہے اور تم دونوں ڈنڈا ڈولی کر کے نادیہ کی بے سر و ساماں لاش کو گڑھے میں پھینک دیتے ہو۔ اس کے بعد..."

"بس کرو..." ماجد کی برداشت جواب دے گئی۔

"وائنڈ اپ نہیں سنو گے اس سین کا...؟" ریحان شیرازی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"مجھے کچھ نہیں سننا۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔ "تم بہت خطرناک آدمی ہو۔"

"صرف دشمنوں کے لیے۔" ریحان شیرازی نے کہا۔ "دوستوں کے لیے میں بہت مفید ہوں۔ امید ہے، تم میرے دوست ثابت ہوگے... مجھے اپنا دشمن بنانے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"میں تمہارے مقصد تک پہنچ گیا ہوں مسٹر شیرازی۔" ماجد نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ "بتاؤ، وہ ڈی وی تم مجھے کتنے میں دو گے؟"

"میں تم پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ وہی مانگوں گا جو تم آسانی سے دے سکو۔" ریحان شیرازی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "صرف پانچ لاکھ روپے..."

"ٹھیک ہے۔" یہ اتنا حساس ایشو تھا کہ ماجد نے "ہاں" کہنے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کیا اور کہا۔ "لیکن مجھے ماسٹر چاہیے اور اس بات کی ضمانت بھی کہ تم اس شوٹ کی کوئی کاپی اپنے پاس نہیں رکھو گے۔"

"میں ایک کھرا اور سچا کاروباری ہوں۔" ریحان شیرازی نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "پوری دیانت داری سے دھندا کرتا ہوں۔ تمہیں میری زبان پر بھروسا کرنا ہوگا اور جہاں تک ڈی وی کا تعلق ہے تو..." وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں تمہیں ماسٹر ہی دوں گا... ایک دم "رش پرنٹس"۔ مجھے امید ہے کہ اس میں ایڈیٹنگ کی ضرورت نہیں لیکن اگر تمہیں میری ایکسپوزنگ پسند نہ آئے تو وی ٹی آر میں لگا کر اس کو ایڈیٹ کر لینا اور ریکارڈ کے طور پر اپنی ویڈیو لائبریری میں سجا لینا..."

"فضول باتیں چھوڑو۔" ماجد نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ، ہماری ملاقات کب ہو رہی ہے...؟"

"بائیس مئی، بروز ہفتہ، سہ پہر پانچ بجے، ہوٹل بلوم

www.pkdigest.com

اسٹار کی لابی میں تم میری مطلوبہ رقم کے ساتھ موجود رہو گے۔'' ریحان شیرازی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میرا معتمد خاص مشتاق وہاں سے تمہیں میرے پاس پہنچا دے گا۔''

''اوکے... ڈن...!'' ماجد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''یہ معاملہ ہم دونوں کے بیچ میں رہنا چاہیے۔'' ریحان شیرازی کے لہجے میں تنبیہ کا عنصر نمایاں تھا۔ ''ورنہ نقصان تمہارا ہی ہوگا۔ اگر تمہاری کسی حرکت سے میں بدک گیا تو یہ ڈی وی اسپیشل برانچ والوں کے حوالے کردی جائے گی اور تم تو جانتے ہی ہو...'' اس نے ڈرامائی توقف کے بعد بڑے خطرناک انداز میں کہا۔ ''اسپیشل برانچ والے کس طرح بال کی کھال اور کھال کے بال اتارتے ہیں۔''

''میں تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' ماجد نے جلدی سے کہا۔ ''حتیٰ کہ میں شہباز کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''یہ تمہاری عقل مندی ہوگی۔''

''اب یہ وقت آگیا ہے کہ عقل مندی کی سند مجھے تم سے لینا ہوگی۔'' ماجد نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''تعریف کا شکریہ۔'' ریحان شیرازی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''وقت، تاریخ اور مقام یاد رکھنا... اور... پانچ لاکھ روپے بھی!''

''اوکے...!'' ماجد نے تائیدی انداز میں کہا۔

''وِش یو سافٹ لک...!'' یہ کہتے ہوئے ریحان شیرازی نے ٹیلی فونک سلسلہ منقطع کردیا۔

اگلے ہی لمحے اس نے دوبارہ ریسیور اٹھالیا اور ایک ڈائری میں سے دیکھ کر میڈم سلمٰی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

میڈم سلمٰی ایک بوڑھے بزنس مین کی جوان بیوی تھی۔ سیٹھ عبدالکریم نے اپنی دولت کے بل بوتے پر سلمٰی سے شادی کی تھی لیکن اس شادی میں کسی دباؤ یا زور زبردستی کو دخل نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ سلمٰی ایک حسین و جمیل اور پُرکشش عورت تھی۔

اس کے سراپا کی اٹھان نے سیٹھ کریم کو چاروں خانے چت کردیا تھا۔ جب اس نے سلمٰی کو حاصل کرنے کی کوشش کی تو اسے زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس نے بڑے واضح الفاظ میں سیٹھ کریم کو بتادیا تھا۔

''اگر آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ اگر دوسرا کوئی خیال ذہن میں ہے تو میری طرف سے صاف انکار ہے۔''

''تم میرے دل و دماغ میں رچ بس گئی ہو۔ تمہارے سوا کوئی اور خیال پیدا نہیں ہوسکتا۔'' سیٹھ کریم نے فرطِ جذبات سے کہا۔ ''میں تم سے باقاعدہ شادی کروں گا۔ ہزاروں مہمانوں کی موجودگی میں شرعاً و قانوناً تمہیں اپناؤں گا۔ تم میری بیوی ہوگی۔ میرا سب کچھ تمہارا اور تمہارا سب کچھ میرا ہوگا۔ بولو منظور ہے...؟''

''ہاں... منظور ہے۔'' سلمٰی نے کہا۔

''میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی عیاشی اور ہوس کاری کے لیے چور راستے اختیار کرتے ہیں۔'' سیٹھ کریم نے صدقِ دل سے کہا۔ ''تم مجھے اچھی لگی ہو۔ میرا دل تمہارے لیے مچلا ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ تم ہر قیمت پر میرے پہلو میں ہو۔ تمہیں حاصل کرنے کا مجھے ایک ہی راستہ نظر آیا اور میں نے تمہیں پرپوز کردیا۔''

''ٹھیک ہے، آپ نے مجھے جیت لیا۔'' سلمٰی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آج کے بعد میں آپ کی ہوں۔''

آئندہ ایک ماہ کے اندر ان کی شادی ہوگئی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ سیٹھ کریم، سلمٰی کے دل و نظر میں اتر گیا ہو۔ وہ بے چارہ تو واجبی سی صورت کا مالک تھا اور عمر میں سلمٰی سے دگنا۔ ہاں البتہ سیٹھ کریم کی ذات میں سب سے بڑی کشش دولت کی فراوانی تھی۔ وہ بلاشبہ ارب پتی سیٹھ تھا۔ اس کی بیوی کی حیثیت سے سلمٰی عالی شان بنگلے کے پُرآسائش ماحول میں زندگی بسر کرسکتی تھی۔ مہنگی امپورٹڈ گاڑیوں میں سفر کرسکتی تھی۔ قیمتی ملبوسات اور کلوگرام کے حساب سے طلائی زیورات اس کے قدموں میں پڑے ہوتے۔ وہ اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی خواہش پلک جھپکتے میں پوری کرسکتی تھی۔ یہی تمام بینیفٹس دیکھتے ہوئے سلمٰی نے سیٹھ عبدالکریم کی بیوی بننے کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔

شادی کے بعد اسے حسبِ خواہش سب کچھ مل گیا تھا۔ سیٹھ کریم نے اس پر دل و جان نچھاور کرنے کے علاوہ بوریوں کے منہ بھی کھول دیے تھے۔ اس کا بینک اکاؤنٹ ہمیشہ صحت مند رہتا تھا۔ گھر کے اندر اور گھر کے باہر بھی کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ سیٹھ کریم نے گویا اسے اپنے ہاتھ کا چھالا بنالیا تھا۔

کچھ ہی عرصے کے بعد سلمٰی کو محسوس ہونے لگا کہ اس کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود بھی کچھ نہیں ہے۔ مال و دولت، ملبوسات، جیولری، لگژری گاڑی اور لگژری بنگلا اسے بے معنی لگنے لگا۔ یہ تمام تر سامانِ تعیش اس کی خارجی ضروریات کو تو پورا کرتا تھا لیکن داخلی معاملات میں اسے ایک عظیم خلا محسوس ہونے لگا۔ انسان کی روح، بدن اور دماغ کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں۔ سیٹھ کریم کی امارت اور ثروت سے سلمٰی کی ذہنی خواہشات تو من و عن پوری ہوگئی تھیں، کسی حد تک اسے روحانی تسکین بھی حاصل تھی مگر بدن اور نفسیات کے جبلی اور جسمانی تقاضے تاحال ناآسودہ تھے۔ شادی کے اوائل ہی میں یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ سیٹھ کریم کے پلے کچھ بھی نہیں۔ اگر سلمٰی کو ان تمام آسائشات سے استفادہ کرنا تھا تو جواباً جبلی اور فطری تقاضوں کو گروی رکھوانا ضروری تھا۔

اس نے بہ حالتِ مجبوری ایسا کر بھی دیا لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اس پر واضح ہوگیا کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں۔ اگر اس نے جذبات کی منہ زور اور کنارہ توڑ ندی کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی تو پانی کا سرکش ریلا اسے خس و خاشاک کے مانند بہالے جائے گا۔

انسان کو اللہ نے سب سے زیادہ برداشت والی مخلوق بنایا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انسان اپنے جبلی تقاضوں کو لگام نہ دے سکے۔ بعض لوگ تو صبر و برداشت کے ایسے ریکارڈ قائم کردیتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر فرشتے اللہ سے کہتے ہیں... پاک پروردگار! جو تو جانتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ تیرا فیصلہ درست تھا۔ انسان واقعی فرشتے سے افضل ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرشتے سے افضل انسان بننے کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت پڑتی ہے جو ہر انسان کے بس کی بات تو ہے مگر وہ اس کٹھنائی میں پڑنا نہیں چاہتا... اسی لیے انسانوں کی اکثریت ایک بے ہنگام، بے لگام ریوڑ سے زیادہ کچھ نہیں!

سلمٰی بھی اپنے جذبات کی بے قابو اور شورش زدہ ندی کی باڑ کے سامنے تنگ نہ سکی اور اس نے اپنی ناآسودگی کا علاج ڈھونڈ لیا۔ اس کے معالج کا نام تھا... مراد!

مراد نامی یہ شخص دراصل سیٹھ کریم کا منیجر تھا اور کافی دنوں سے سلمٰی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ سلمٰی نے اپنی ضرورت سے مجبور ہوکر مراد کو ویلکم کہا۔ اس طرح ان کے بیچ ایک چور رشتہ قائم ہوگیا۔ سیٹھ کریم ہر ماہ دو تین دن کے لیے کاروباری دورے پر شہر سے باہر جاتا تھا۔ اس کے غیاب میں سلمٰی اور مراد کو ''رشتے داری'' نبھانے میں خاصی آسانی میسر رہتی تھی۔

یہی سلمٰی اس وقت کسی اجنبی مرد سے ٹیلی فون پر بات کررہی تھی۔ اس کے لہجے میں الجھن اور پریشانی تھی کیونکہ فون کی مسلسل بجنے والی گھنٹی ہی نے اسے گہری نیند سے بیدار کیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے بنگلے میں اکیلی تھی اور رات کے تین بجنے والے تھے۔

''بھائی... میں آپ کو نہیں جانتی۔ ریحان شمسی کا نام میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔ آپ کون ہو... مجھے اتنی رات گئے کیوں فون کیا ہے؟''

''میرے پاس آپ کے لیے ایک تحفہ ہے۔'' ریحان شمسی نے کہا۔ ''میں وہ تحفہ آپ کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہوں...''

''یہ کیسا تحفہ ہے جسے آپ فروخت کرنا چاہتے ہیں؟'' سلمٰی نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''میرے تحفے کی یہی تو خوبی ہے کہ لوگ اسے منہ مانگے داموں خریدنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔'' ریحان شمسی نے بڑے مزے سے کہا۔ ''بس، میں ایسا ہی کاروبار کرتا ہوں...''

''کیا آپ مجھے اس تحفے کی کچھ تفصیلات بتائیں گے؟''

''کیوں نہیں... یہ تو آپ کا حق ہے۔'' وہ خالص دکان دار کے انداز میں بولا۔ ''آپ ہر طرح سے ٹھونک بجا کر اپنی تسلی کرلیں۔ میں مال آپ کی تسلی کا دوں گا اور دام اپنی مرضی کے وصول کروں گا۔''

اس کے بعد ریحان شمسی نے نہایت ہی جامع الفاظ میں اسے اس کے اور مراد کے مشترکہ کارناموں سے آگاہ کیا۔ ان کے جوائنٹ وینچر کے کئی دستاویزی ثبوت اور متعدد فوٹیج اس کے پاس محفوظ تھے۔ یہ چیزیں اگر سیٹھ کریم کے ہتھے چڑھ جاتیں تو سلمٰی کی ازدواجی اور معاشی زندگی میں ایک بھونچال آسکتا تھا۔ وہ کچھ بھی تو غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر سلمٰی نے کہا۔

''تم بہت بڑے بدمعاش ہو۔''

ریحان شمسی نے سلمٰی کے ''آپ'' سے ''تم'' پر سلپ ہونے کا ذرا برا نہیں منایا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں... میں بہت بڑا بدمعاش ہوں۔ آپ دونوں تو سیٹھ کریم کی غیر موجودگی میں جیسے شیطان کو کنکریاں مارنے کا فریضہ انجام دیتے ہونا...'' وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''دنیا کا سب سے مشکل کام اپنے گریبان میں جھانکنا ہے۔ اس سلسلے میں ہر شخص نے ہائی نیک پہنا ہوا ہے۔ دوسروں کا گریبان ہی وائیڈ نظر آتا ہے۔''

''مجھے تمہاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔'' وہ اکڑتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''صاف صاف بات کرو، تم ان ثبوتوں کے بدلے اور ہمیشہ زبان بند رکھنے کے عوض کیا لوگے؟''

www.pkdigest.com

"اگر تم دونوں کی شوٹنگ کے کچھ اور اسٹیل بھی ابھی چلتا ہیں تو معاوضہ الگ ہوگا اور اگر تم نے آج کے بعد بیک اپ کا ارادہ کرلیا ہے تو لم سم کچھ طے کر لیتے ہیں۔"

"تم دونوں صورتوں کے بارے میں بتا دو؟" سلمیٰ نے کہا۔

"سیٹھ کریم آج ہی دو دن کے لیے دوسرے شہر گیا ہے۔" ریحان کسی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پہلے دن تم دونوں احتیاط کے دامن کو تھام کر رکھتے ہو۔ کل سے تمہاری سرگرمیاں شروع ہو جائیں گی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟"

"مجھے تمہاری اس بکواس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" سلمیٰ نے چڑ کر کہا۔ "تم ہرجانے کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟"

"ہرجانہ... کیا خوب لفظ استعمال کیا ہے۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "میڈم! یہ ہرجانہ نہیں، میری محنت کا صلہ ہے۔"

"جو بھی ہے... تم اصل بات کی طرف آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بڑے رسان سے بولا۔ "اگر آج کے بعد بیک اپ کا ارادہ ہے تو یک مشت تین لاکھ روپے اور اگر... مزید کئی شفٹیں چلانے کا پروگرام ہے تو پچاس ہزار ماہانہ ٹھیک رہے گا۔"

اس موقع پر سلمیٰ نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "سمجھ لو کہ آج وائنڈ اپ ہو گیا لیکن میں سمجھتی ہوں تین لاکھ بہت زیادہ ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں تین لاکھ زیادہ نظر آرہے ہیں تو میں یہ مواد سیٹھ کریم کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں۔" ریحان کسی نے بڑی مکاری سے کہا۔ "اس بوڑھے ارب پتی سے میں اس شاہکار کے بدلے میں پانچ چھ لاکھ تو بہ آسانی نکلوا لوں گا۔"

"تم بدمعاش ہی نہیں، بہت کمینے بھی ہو۔"

"میں اپنے کلائنٹس کی باتوں کا برا نہیں مناتا۔" وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے بزنس کا پہلا اصول ہے۔"

"یہ بتاؤ، تین لاکھ کی رقم کہاں پہنچانا ہوگی؟" سلمیٰ گویا اس کے مطالبے کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے بولی۔

"بائیس مئی، بروز ہفتہ، سہ پہر پانچ بجے...!"

☆☆☆

سکندر ایک منجھا ہوا سیاست داں تھا۔ پچھلی تین پشتوں سے اس کا خاندان گردن گردن سیاست میں دھنسا ہوا تھا۔ سیاسی جگادری اسے ایک جانا مانا اور تجربہ کار کھلاڑی گردانتے تھے جبکہ عوام کی نظر میں سکندر سے زیادہ کرپٹ سیاست داں روئے زمین پر کوئی اور ہو نہیں سکتا تھا اور مزے کی بات یہی تھی کہ عوام کی ایک بھاری اکثریت نعروں کے بینر تلے اور اپنے ووٹوں کی مدد سے ہر الیکشن میں سکندر کو جتوا دیتی تھی۔ آج تک اس نے اپنا ایک وعدہ بھی پورا نہیں کیا تھا اور عوام ہر بار اس کے وعدوں پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیا کرتے تھے جس کا نتیجہ انہیں بعد میں بھگتنا پڑتا تھا...

سکندر اس وقت ایک کمرے میں بند، بہت خوش تھا۔ آج ہی اس نے اپنے علاقے کی خوش حالی کے لیے مختلف ترقیاتی کاموں کی مد میں تین کروڑ روپے کا بجٹ حاصل کیا تھا جس میں سے ظاہر ہے، اس نے پانچ، چھ فیصد سے زیادہ کام میں نہیں لگانا تھا۔ باقی کی رقم اس کی جیب میں جانے والی تھی۔ وہ اپنی جیب کی اس صحت اور تندرستی پر خوش تھا۔

کمرے میں اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ پونے تین کروڑ کی خطیر رقم کو ٹھکانے لگانے کے خیالات کے ساتھ انجوائے کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے دوسری گھنٹی سے پہلے ہی جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا جیسے وہ ریسیور نہیں کروڑوں کی مالیت کا چیک ہو۔ اگر اس نے جھپٹنے میں ذرا سی بھی کوتاہی کر دی تو کوئی دوسرا اڑا لے جائے گا۔

"ہیلو!" اس نے ریسیور کان سے لگانے کے بعد بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"آپ سکندر بات کر رہے ہیں نا؟" دوسری طرف سے بڑی شائستگی کے ساتھ پوچھا گیا۔

"ہاں ہاں، میں سکندر ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ کون؟"

"سر! میں ریحان ترمذی ہوں...!"

"کون ریحان ترمذی؟" سکندر کے لہجے میں الجھن تھی۔

"چھوڑیں سر... بس، مجھے اپنا خادم ہی سمجھیں۔" ریحان ترمذی نے کہا۔ "آپ اس وقت بہت خوش ہیں نا سر... آپ نے کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے؟"

"ہاں، ہاں... لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟" سکندر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "کیا تم کوئی نجومی وغیرہ ہو؟"

"میں نجومی نہیں سر... اندر کا آدمی ہوں۔" ریحان ترمذی نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"اندر کا آدمی...؟" سکندر کی حیرت دوچند ہو گئی۔

ریحان نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "سر! آپ نے کافور کا نام تو سنا ہوگا؟"

"ہاں، سنا ہے۔" سکندر نے الجھن زدہ انداز میں جواب دیا۔

"پھر تو آپ اس کے استعمال سے بھی واقف ہوں گے؟" ریحان ترمذی نے سوال کیا۔

"ہاں، واقف ہوں۔" سکندر نے اثبات میں جواب دیا۔ "کسی لاش کو دفن کرتے وقت کافور کا استعمال کیا جاتا ہے۔ کافور کی گولیاں بھی ملتی ہیں۔ انہیں کپڑوں کے اندر رکھا جاتا ہے تاکہ کپڑے ٹڈی وغیرہ سے محفوظ رہیں۔"

"جی سر... مقصد ایک ہی ہے۔" ریحان ترمذی کی تائیدی آواز سکندر کی سماعت تک پہنچی۔ "اس کی بو سے کیڑے مکوڑے دور بھاگتے ہیں۔ کافور کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اگر اسے کھلی فضا ملے تو یہ فوراً اڑ جاتی ہے اور... اور یہ لفظ محاورتاً بھی استعمال ہوتا ہے جیسے... اس کی خوشی "کافور" ہو گئی..."

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مسٹر ترمذی..." سکندر نے متذبذب انداز میں پوچھا۔ "اس تمام تر گفتگو کا مقصد کیا ہے؟"

"سر! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، میں اندر کا آدمی ہوں۔" ریحان ترمذی نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"ہاں... لیکن..."

"ہاں نہ، لیکن مگر کی کوئی گنجائش نہیں مسٹر سکندر۔" سکندر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ریحان ترمذی نے دبنگ لہجے میں کہا۔ "میں اگر اندر کا آدمی ہوں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے کس طرح فائلوں کی ہیرپھیر اور بعض اعلیٰ افسران کے جعلی دستخط کی مدد سے تین کروڑ کا بجٹ منظور کرایا ہے۔" لمحے بھر کا توقف کر کے ریحان ترمذی نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگی کہ ہمیشہ گھر کا بھیدی یعنی اندر کا آدمی ہی لنکا ڈھاتا ہے... یعنی بھانڈا پھوڑتا ہے۔ اگر میں نے بھی اس بجٹ کی اصلیت کا بھانڈا پھوڑ دیا تو سمجھو، تمہاری خوشی بھی کافور ہو جائے گی۔"

سکندر ایک دانا و بینا اور سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ریحان ترمذی نے اس کے حوالے سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ آج کل حکومت میں شامل چند لوگ اس کی کاٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اگر تین کروڑ کے پروجیکٹ میں کوئی رخنہ پڑ جاتا تو اسے بہت بڑا نقصان ہو سکتا تھا۔ ہاتھ میں آئی ہوئی لکشمی دیوی پھسل کر نکل جاتی۔ اس نے معاملے کی نزاکت اور سنگینی کے پیش نظر ریحان ترمذی سے کہا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" ریحان ترمذی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم کوئی گیم تو نہیں کھیل رہے؟" سکندر نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" ریحان نے پُرتوثوق انداز میں کہا۔ "یہ میرا بزنس ہے جسے میں بڑے صاف شفاف طریقے سے کرتا ہوں۔ جب ہماری ملاقات ہوگی تو میں تمہیں وہ تمام ثبوت فراہم کر دوں گا جن کے منظر عام پر آنے سے تمہارا خانہ خراب ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" سکندر جلدی سے بولا۔ "میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔"

"مجھے تمہاری طرف سے ایسی ہی دانش مندی کی توقع تھی۔" ریحان ترمذی نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "مجھے امید ہے، تم اس ایشو کو ہم دونوں کے درمیان ہی رکھو گے۔"

"فکر نہیں کرو ترمذی! میرے اندر بہت گنجائش ہے۔" سکندر نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "اب یہ بھی بتا دو... اپنا منہ بند رکھنے کا تم معاوضہ کیا لو گے؟"

"صرف دس لاکھ روپے...!" ریحان ترمذی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہوں..." سکندر نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا۔

"یہ تین کروڑ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔" ریحان ترمذی نے بڑی ہوشیاری سے کہا۔ "مسٹر سکندر! تین کروڑ کا چیک ابھی اکاؤنٹ میں جمع ہوا ہے، کلیئر نہیں ہوا... میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"ہاں، ہاں..." وہ جلدی سے بولا۔ "بتاؤ، مجھے کہاں آنا ہوگا؟"

"ہوٹل بلوم اسٹار کی لابی میں۔ بائیس مئی کی سہ پہر...!"

☆☆☆

"ہوٹل بلوم اسٹار" شہر کے ایک مصروف، پوش اور کاروباری حصے میں واقع تھا۔ اس وقت سہ پہر کے پانچ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ وہ ہفتے کا دن تھا اور تاریخ تھی بائیس مئی...!

ہوٹل کی لابی میں اس وقت لگ بھگ درجن بھر افراد

www.pkdigest.com

موجود تھے جن میں مرد و زن دونوں اصناف شامل تھیں۔ ان درجن بھر لوگوں میں چار افراد ایسے تھے جن کی نگاہیں بار بار ہوٹل کے داخلی دروازے کی جانب اٹھ جاتی تھیں جیسے انہیں کسی کی آمد کا انتظار ہو۔ وہ کبھی ہوٹل کے داخلی دروازے کو دیکھتے اور کبھی وال کلاک پر نگاہ ڈالتے۔ ان میں ایک روزینہ عرف روزی، دوسرا ماجد، تیسری میڈم سلمٰی اور چوتھا سکندر تھا۔ وہ ایک دوسرے سے قطعی ناواقف تھے اور یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ سب کسی مشتاق نامی ایک ہی شخص کا انتظار کررہے ہیں۔

دیوار گیر کلاک نے اپنے مخصوص گھنٹے کی آواز سے شام کے پانچ بجنے کا اعلان کیا۔ ان چاروں کی منتظر اور مضطرب نگاہیں یک بیک داخلی دروازے کی سمت اٹھیں۔ اگلے ہی لمحے وہاں ایک شخص نمودار ہوا۔

وہ پستہ قامت اور بھاری بھرکم شخص تھا۔ اس نے بلیو جینز کے اوپر سرخ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور سر پر فلیٹ ہیٹ کی موجودگی اسے انگلش فلموں کا جاسوس ظاہر کرتی تھی۔ اس نے پاؤں میں سفاری شوز پہن رکھے تھے۔

وہ لابی کے اندر داخل ہوا پھر وہاں موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔ ”میرا نام مشتاق ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے پاس...“

”ریحان واسطی نے بھیجا ہے۔“ روزی اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

”تم ریحان شیرازی کے آدمی ہونا؟“ ماجد نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

میڈم سلمٰی نے کہا۔ ”تم مجھے ریحان شمسی سے ملوانے لے جاؤ گے نا...؟“

”تم یقیناً ریحان ترمذی کے لیے کام کرتے ہو؟“ سکندر بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”آپ سب لوگوں کا اندازہ بالکل درست ہے۔“ مشتاق نے خالص فلمی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں ریحان صاحب ہی کا آدمی ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ واسطی ہیں، شیرازی ہیں، شمسی ہیں یا ترمذی... آپ لوگ میرے ساتھ ان کے پاس جائیں گے۔“

”وہ خود کہاں ہیں؟“ سکندر نے سوال کیا۔

”اپنے گھر میں۔“ مشتاق نے جواب دیا۔ ”آپ لوگ اپنی گاڑیوں کو ہوٹل کی پارکنگ میں چھوڑ کر میری گاڑی میں جائیں گے۔ ایک، ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں آپ سب کو واپس یہیں چھوڑ جاؤں گا۔“

ان چاروں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مشتاق کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ چاروں اپنے اپنے ایک خاص الخاص کام کی غرض سے ہوٹل بلوم اسٹار پہنچے تھے اور مقصد حاصل کیے بنا واپس نہیں جا سکتے تھے... لہٰذا وہ، چار بار کے معنی خیز نظری تبادلے کے بعد وہ مشتاق کے پیچھے چل دیے۔

☆☆☆

شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے۔

وہ چاروں ایک شان دار گاڑی میں بیٹھے کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ مشتاق نے سنبھال رکھی تھی۔ اس کے برابر میں پسنجر سیٹ پر ماجد براجمان تھا۔ سکندر، روزی اور میڈم سلمٰی عقبی نشست پر براجمان تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گاڑی شہری حدود سے باہر نکل آئی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ شہر کو پیچھے چھوڑتی چلی گئی۔

سکندر نے عقبی نشست سے سوال کیا۔ ”مشتاق! کیا تمہارا باس ریحان ترمذی شہر سے کہیں باہر رہتا ہے؟“

”ریحان واسطی تک پہنچنے کے لیے ہمیں اور کتنا سفر کرنا پڑے گا؟“ روزی نے استفسار کیا۔

شمسی کی پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ”مشتاق! ریحان شمسی نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ اس نے میرے علاوہ اور بھی کسی کو اپنے پاس بلایا ہے...؟“

”ریحان شیرازی کو کیا بھرے پرے شہر میں رہنا اچھا نہیں لگتا جو تم ہمیں اس سے ملوانے کے لیے اس ویرانے میں لے آئے ہو؟“ ماجد نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ مشتاق جس گاڑی کو ڈرائیو کررہا تھا، وہ ویران اور اجاڑ علاقے میں نکل آئی تھی۔ تاحدِ نگاہ کوئی بندہ بشر یا مکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مشتاق انہیں لامکاں کی جانب لیے جارہا تھا۔

وہ ایک شان دار لگژری گاڑی تھی جو فلی ایئر کنڈیشنڈ بھی تھی۔ وہ سب گاڑی کے ٹھنڈے ٹھار ماحول میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کے اندر بے چینی رچ بس گئی تھی۔ جب تک وہ ریحان نامی اس چہار پہلو شخص سے مل کر اپنی اپنی مطلوبہ ”چیز“ حاصل نہیں کر لیتے، انہیں اطمینان اور قرار میسر نہیں آسکتا تھا۔ ان کی ”طلب“ نے انہیں مجبور اور بے بس بنا دیا تھا ورنہ وہ مشتاق جیسے جوکر کے اشاروں پر ناچنے والے تھے نہیں...!

”تم لوگ واسطی، شیرازی، شمسی اور ترمذی کے چکر سے نکل ہی آؤ تو اچھا ہے۔“ مشتاق نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم صرف یہ یاد رکھو کہ میرے باس کا نام ریحان ہے اور تم لوگ باس سے ایک انتہائی حساس اور بے حد اہم میٹنگ کرنے جارہے ہو۔ اگر تم میں سے کوئی باس سے نہیں ملنا چاہتا تو...“ اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سنسنی خیز لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”تو مجھے بتا دے۔ میں گاڑی روک کر اسے یہیں اتار دیتا ہوں۔“

”یہ اچھی زبردستی ہے بھئی...“ میڈم سلمٰی نے بیزاری سے کہا۔ ”چاروں طرف کوئی منظر نہیں ہے۔ ہم اس اجاڑ بیابان جگہ پر اتر کر کیا کریں گے... کہاں جائیں گے؟“

”یہ زبردستی نہیں بلکہ بدمعاشی ہے۔“ ماجد نے تیکھی نظر سے اپنے دائیں پہلو میں بیٹھے ہوئے مشتاق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر مشتاق! تم ہماری بے بسی کو انجوائے کررہے ہو... ہیں ناں؟“

”بھائی! تم لوگوں کو میں زبردستی تو گاڑی سے نیچے اترنے کو نہیں کہہ رہا۔“ مشتاق نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے مختلف تبصروں کی روشنی میں، میں نے صرف ایک مشورہ دیا تھا...“

”تم اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنے کے بجائے مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہارے باس تک پہنچنے کے لیے ہمیں اور کتنا وقت صرف کرنا پڑے گا...؟“ روزی نے خفگی آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

”روزی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ سکندر نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”بتاؤ، ہمارا کتنا سفر باقی ہے؟“

اب وہ چاروں مجبور افراد ایک دوسرے کے ناموں سے اچھی طرح آگاہ ہو چکے تھے تاہم انہیں ایک دوسرے کے مسائل پر گفتگو کرنے کا ابھی موقع نہیں ملا تھا۔

مشتاق نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالنے کے بعد بتایا۔ ”زیادہ سے زیادہ دس منٹ کے بعد ہم باس کے پاس ہوں گے۔“

ان چاروں کے چہروں پر اطمینان جھلکنے لگا۔

اس اطمینان کی عمر چھینکے سے بھی کم ثابت ہوئی۔ اگلے ہی لمحے سے ان کے سامنے لاتناہی مصائب کا ایک بحرِ بے کراں ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔ ادھر مشتاق کی بات ختم ہوئی، ادھر گاڑی ایک خطرناک جھٹکا لے کر رک گئی۔

وہ چاروں پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“ مشتاق نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں کہ یہ کیوں ناراض ہوگئی؟“

بات کے اختتام پر مشتاق ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل گیا۔ وہ گھوم کر گاڑی کے سامنے والے حصے تک پہنچا پھر بونٹ اٹھا کر انجن پر جھک گیا۔ اب وہ گاڑی کے اندر بیٹھے ہوئے ان چار افراد کو نظر نہیں آرہا تھا۔ یقیناً وہ بونٹ کے پیچھے، انجن کے ساتھ مصروف تھا اور گاڑی کے یک دم رک جانے کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

”یااللہ! ہم بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گئے۔“ یہ روزی تھی۔

سلمٰی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”بیٹھے بٹھائے تو نہ کہو۔ ہم نے ضرور ایسا کچھ کیا ہے جس کی وجہ سے ہم اس ریحان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔“

سلمٰی نے ”کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے“ کی عملی تفسیر بیان کی تھی۔ ماجد نے ان کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ آواز میں کہا۔

”ہمیں کیا اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے۔“

”اپنے گریبان کے اندرونی ماحول سے کون واقف نہیں۔“ سکندر نے کسی فلسفی کے انداز میں کہا۔ ”اس وقت ضرورت ہے، دوسروں کے گریبانوں میں جھانکنے کی۔ آپ میری بات کا غلط مطلب نہ لیں... میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں ایک دوسرے کے سامنے کھل جانا چاہیے۔ ہمارے حق میں یہی بہتر ہوگا۔“

”تجویز تو اچھی ہے۔“ ماجد نے بدستور گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن کہیں آرام سے بیٹھیں تو بات بھی ہو۔ اب اس مردود کے سامنے اپنے میلے کپڑے دھونا کیا اچھا لگے گا۔“

مردود سے اس کی مراد تھی مشتاق۔ مشتاق کا ذکر ایسے ہی ثابت ہوا جیسے ماجد نے شیطان کو پکار لیا ہو۔ ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر گاڑی کا بونٹ ایک زوردار آواز کے ساتھ گرا۔

ان چاروں نے بے اختیار گاڑی کے باہر دیکھا۔ انہیں صد فیصد یقین تھا کہ مشتاق نے گاڑی کا بونٹ گرایا ہو

www.pkdigest.com

گا۔ بونٹ تو اپنی جگہ پر واپس جاچکا تھا مگر مشتاق کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

''یہ لفنٹر کہاں چلا گیا...؟'' ماجد نے خودکلامی کی۔

''ہاں واقعی...'' روزی کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''یہ اچانک کہاں غائب ہوگیا؟''

''کہیں اندر، انجن کے ساتھ ہی تو بند نہیں ہوگیا؟'' سکندر نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''ہے بھی چھوٹا سا گول مٹول سا...!''

''ہمیں اسے تلاش کرنا چاہیے۔'' میڈم سلمٰی نے تشویش بھری نظر سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ ہم اس ویرانے میں پھنس کر رہ جائیں گے۔''

''سمجھ میں نہیں آرہا، اس منحوس کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا؟'' ماجد نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ...''

بولتے بولتے جیسے ماجد کی زبان کو بریک لگ گئے تھے کیونکہ ابھی منہ میں اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ ''دھاڑ'' سے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھلا اور ایک مخصوص آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔ دروازے کی اس کھل بند سے واضح محسوس ہوتا تھا، کوئی گاڑی کے اندر آکر بیٹھا ہے لیکن ڈرائیونگ سیٹ خالی نظر آرہی تھی۔

اس تحیر آمیز صورتِ حال نے ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹکا دی۔ ان کے چہروں پر بے پناہ خوف نظر آرہا تھا۔ وہ وحشت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کچھ بولنے کی ہمت کر پاتا، گاڑی اسٹارٹ ہوکر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا لیکن ڈرائیونگ کے تمام فنکشنز بڑے مناسب طور پر جاری دکھائی دیتے تھے جس کے نتیجے میں گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے ویرانے میں رواں دواں تھی۔ یہ ایسی سچویشن تھی جو انہوں نے بارہا فلموں میں تو دیکھی ہوگی... ان کی حقیقی زندگی میں بھی ایسا کوئی واقعہ پیش آسکتا ہے، اس بارے میں انہوں نے کبھی خواب وخیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

ماجد گھر سے نکلتے وقت احتیاطاً اپنا ریوالور بھی ساتھ لے آیا تھا جو اس کے کوٹ کے نیچے محفوظ تھا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ ریوالور کی طرف رینگ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمت کرکے ڈرائیونگ سیٹ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون ہو تم...؟''

اس کے سوال کا جواب نہیں آیا۔ گاڑی بدستور کسی نامعلوم منزل کی سمت رواں دواں تھی۔ ماجد نے قدرے سختی سے استفسار کیا۔

''میں نے پوچھا ہے، تم کون ہو...؟''

اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

ماجد نے ریوالور نکال کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف تان لیا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''گاڑی روکو ورنہ... میں گولی چلا دوں گا۔''

نادیدہ ڈرائیور پر ماجد کی خطرناک دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گاڑی ہوا کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس صورتِ حال نے ماجد کو ایک سنگین فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا۔ اس نے نادیدہ ڈرائیور کا نشانہ لے کر پے در پے دو فائر کردیے۔

''ٹھائیں، ٹھائیں...'' گاڑی کی خنک فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

پچھلی سیٹ پر موجود سکندر، سلمٰی اور روزی کو جیسے موت کے خوفناک پنجوں نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں وحشت اگل رہی تھیں اور زبانوں پر گن گن کے قفل پڑ گئے تھے۔ وہ بےبسی کے فریم میں جڑی حسرت ویاس کی ایک تصویر دکھائی دیتے تھے۔

ماجد نے آخری کوشش کے طور پر پے در پے فائر کرکے اپنے ریوالور کے چیمبر خالی کر ڈالے لیکن صورتِ حال کی سنگینی میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے خالی ریوالور بھی نادیدہ ڈرائیور کی کھوپڑی پر دے مارا۔ جب اس سے بھی کچھ نہ ہوا تو وہ عقبی نشست کی جانب دیکھتے ہوئے وحشیانہ انداز میں چلّایا۔

''ہم موت کے منہ میں جارہے ہیں۔ دروازے کھول کر نیچے کود جاؤ...''

☆☆☆

ویرانے میں استادہ وہ قلعہ نما گھر ہیبت اور وحشت کی منہ بولتی تصویر تھا۔ کسی زمانے میں وہاں درجنوں افراد سکونت پذیر تھے لیکن استدادِ زمانہ نے اس کا اندر باہر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت وہاں صرف دو افراد موجود تھے۔ ایک زندہ اور دوسرا مردہ۔ مردہ ایک جادوگرنی تھی جس کی لاش کو تابوت سمیت زندہ شخص قبرستان سے کھود کر اس ویران اجاڑ گھر میں لے آیا تھا۔ پرویز نامی وہ زندہ شخص بڑی انوکھی قسم کی شکتی حاصل کرنے کے لیے مارتھا نامی جادوگرنی کی لاش کے ساتھ ایک شیطانی عمل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت تہ خانے میں رکھے مارتھا کے تابوت کے ساتھ موجود تھا۔ تابوت ایک میز

کے اوپر رکھا تھا اور شیطان کا پیروکار پرویز تابوت کے پاس کھڑا تھا۔

''بس... چند منٹ اور...'' پرویز نے تابوت پر نگاہ جما کر اضطراری انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''پھر میرا عمل شروع ہو جائے گا۔''

یوں محسوس ہوتا تھا، وہ تابوت میں ساکت وجامد پڑی مارتھا کی لاش سے مخاطب ہو۔ ''میں نے اپنے دستِ راست موسیٰ کو ایک خاص مشن پر بھیجا ہوا ہے۔ وہ پانچ چھ منٹ میں کامیاب واپس لوٹنے والا ہے۔ وہ چاروں احمق اسے مشتاق کے نام سے جانتے ہیں لیکن وہ مشتاق نہیں موسیٰ ہے۔ وہ چاروں اتنی آسانی سے یہاں تک آنے والے نہیں تھے۔ اس سلسلے میں سر (شیطان) نے میری اور موسیٰ کی بھرپور مدد کی ہے۔ ان کے خلاف سارا مواد مجھے سر نے ہی مہیا کیا ہے اور ویران علاقے میں مشتاق (موسیٰ) کو نادیدہ بنا کر سر نے گویا ان چاروں کی سٹی گم کردی ہے۔ ماجد نے ہیرو بننے کی کوشش میں اپنا ریوالور بھی خالی کر ڈالا... گدھا کہیں کا...''

وہ بڑی محبت اور لگاوٹ سے مارتھا کے تابوت پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''آج میں سر کی ہدایات پر عمل کرکے اپنا ایک دیرینہ خواب پورا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ تم...'' وہ مارتھا کی لاش سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''پھر میں تمھارے جسم میں ... زندہ ہو جاؤں گی اور سر کے حکم پر مجھے وہ منی (منکا) دوں گی جس کی مدد سے میں خود کو انوِزیبل (نادیدہ) بنانے پر قادر ہو جاؤں گا... آہاہا... چند منٹ باقی ہیں... پھر...!''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا پھر چونکنا انداز میں تہ خانے کے داخلی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کی سوچ بچار کے بعد اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

''شاید... ان چاروں کو لے کر آنے والی گاڑی یہاں پہنچ گئی ہے۔ موسیٰ کا کام ویرانے میں ختم ہوگیا تھا۔ سر نے اسے راستے ہی میں نادیدہ بنا کر فارغ کردیا تھا، اس کے بعد سر ہی نے گاڑی کو یہاں تک پہنچانا تھا اور... وہ پہنچ گئی ہے۔''

وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے تہ خانے سے باہر آنے لگا۔ اس دوران میں اس کی خودکلامی بھی جاری تھی۔

''یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔ میں ان چاروں کو ایک چھوٹا سا ٹریلر دکھا کر وحشت زدہ کردوں گا۔ خوف زدہ تو وہ پہلے ہی سے ہیں لیکن بگھار لگانا بھی ضروری ہے تاکہ لذت میں ایک خاص قسم کا سوندھا سوندھا فلیور بھی شامل ہو جائے... آہاہا... ہاہاہا...!''

☆☆☆

ماجد کی پکار سب نے سنی تھی۔ ''ہم موت کے منہ میں جارہے ہیں۔ دروازے کھول کر نیچے کود جاؤ...''

اس پکار پر لبیک کہنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ماجد سمیت سب نے اپنی اپنی جانب کا دروازہ کھول کر جمپ لگانے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی کے اندر رہ کر بھیانک موت مر جانے سے بہتر تھا کہ وہ زندگی کی جنگ لڑتے ہوئے چلتی گاڑی سے کود جاتے۔ اس ''فرار'' میں شدید نوعیت کی چوٹیں آنے کا اندیشہ تو بہرحال موجود تھا لیکن حرام موت سے یہ صورت بدرجہا قابلِ قبول تھی لیکن... کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ''مصیبت جب بھی آتی ہے، چاروں طرف سے آتی ہے اور انسان کو گھیر کر مارتی ہے۔'' اگر مصیبت کے وقت انسان کی کوئی تدبیر کارگر ہو جائے تو پھر وہ مصیبت کیا خاک ہوئی!

انہوں نے گاڑی کے دروازے کھولنے کے لیے سب سے پہلے لیورز کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی۔ دروازے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر کھڑکیوں کے شیشے گرانے کے عمل کو دہرایا گیا لیکن یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، ہر لیور اور ناب کو ایلفی ڈال کر جامد کردیا گیا ہو۔ ان کی ان تمام تر کوششوں کے دوران میں بغیر ڈرائیور کی گاڑی نامعلوم منزل کی جانب گامزن تھی۔

پے در پے ناکامیوں کے بعد ان پر جھنجلاہٹ سوار ہوگئی۔ جلد ہی یہ جھنجلاہٹ وحشت میں بدل گئی۔ بغیر ڈرائیور کے بھاگتی ہوئی گاڑی نے ویسے ہی ان کی روح فنا کر رکھی تھی۔ انہوں نے زندگی بچانے کی آخری کوشش میں گاڑی کے دروازوں پر لاتیں برسانے شروع کردیے لیکن ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ دروازے نہیں، سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ اسی بےسروسامانی اور کسمپرسی میں روزی کی آواز ابھری۔ وہ پسنجر سیٹ پر موجود ماجد سے مخاطب تھی۔

''مسٹر ماجد! آپ تھوڑی سی ہمت کرکے ڈرائیونگ سیٹ پر قبضہ کرلیں۔ گاڑی کا کنٹرول آپ کے ہاتھ میں ہوگا تو ہم خود کو بچانے کے لیے زیادہ بہتر انداز میں کوشش کرسکیں گے۔''

''ڈرائیونگ سیٹ پر قبضہ کرلوں...'' ماجد نے جواباً منہ بگاڑ کر کہا۔ ''یہ جو یہاں بیٹھا ہے، اس سے کون نمٹے گا...؟''

''ماجد صاحب! ڈرائیونگ سیٹ خالی پڑی ہے۔'' میڈم سلمٰی نے لقمہ دیا۔

''ڈرائیونگ سیٹ خالی پڑی ہے تو پھر اس گاڑی کو

ڈرائیو کون کر رہا ہے؟'' سکندر نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔
''ماجد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ شیطان مشتاق ہماری نظروں سے تو اوجھل ہے لیکن مجھے یقین ہے، گاڑی کا اسٹیئرنگ اسی کے ہاتھ میں ہے۔''
''سکندر صاحب! آپ کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ہاتھ پاؤں پر مہندی لگا کر مایوں بیٹھ جائیں۔'' روزی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور مسٹر ماجد! آپ چوڑیاں پہن کر یہ گانا گائیں... میرے ہاتھوں میں نو نو چوڑیاں ہیں... تھوڑا ٹھہرو، سجن مجبوریاں ہیں۔''
بات ختم کرتے ہی روزی نے جھجکے جھجکے پچھلی نشست سے اگلی نشست کی جانب آنے کی کوشش کی۔ میڈم سلمٰی نے اسے بہ حفاظت تھام لیا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی۔
''کیا کر رہی ہو...؟''
''ڈرائیونگ سیٹ پر جا رہی ہوں۔'' روزی بڑے عزم سے بولی۔
''یہ کیا حماقت ہے؟'' سلمٰی چلائی۔
''جس گھر کے مرد ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر پورا دن گزار دیں، اس گھر کی عورت کو زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔'' روزی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ''اس گاڑی میں موجود دونوں مردوں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ اپنی اور ان کی بقا کے لیے اب ہمیں ہی ہاتھ پاؤں مارنا ہوں گے۔''
''ٹھہرو... تم رکو... میں جاتی ہوں ڈرائیونگ سیٹ پر۔'' سلمٰی نے روزی کو اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔
''نہیں... میں جاؤں گی۔'' روزی ضدی لہجے میں بولی۔
اسی لمحے گاڑی ایک خوفناک جھٹکا لے کر رک گئی۔
گاڑی کے رکتے ہی چاروں دروازے یک بہ یک کھل گئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، کھلے ہوئے ان دروازوں سے باہر کود گئے۔
باہر آنے کے بعد انہوں نے دیکھا، گاڑی قلعہ نما ایک عمارت کے سامنے رکی تھی۔ اس ویرانے میں وہ عمارت اکیلی ہی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سلمٰی نے کہا۔
''ہمیں اس مکان کے اندر پناہ لینا چاہیے۔''
''ہرگز نہیں۔'' روزی کے لہجے میں قطعیت تھی۔
ماجد نے پوچھا۔ ''اتنی شدت سے انکار کی وجہ؟''
اس کی مخاطب یقیناً روزی ہی تھی لہٰذا روزی نے ہی اسے جواب دیا۔
''اگر کوئی شیطانی قوت اس گاڑی کو ڈرائیو کر کے یہاں تک لائی ہے تو اس کے پیچھے اس کا کوئی غلیظ مقصد بھی چھپا ہوگا۔ اس پُراسرار اور ہیبت ناک عمارت کے سامنے گاڑی رکنے کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ بدمعاش ہمیں یہیں پہنچانا چاہتا تھا۔'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔
''میں تو کسی بھی قیمت پر اس عمارت کے اندر قدم نہیں رکھوں گی۔''
''مجھے بھی یہ عمارت آسیب زدہ دکھائی دیتی ہے۔'' سکندر نے سہمی ہوئی نظر سے اس قلعہ نما مکان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''اگر اس عمارت کے اندر پناہ نہیں لینا تو پھر ہمیں فی الفور یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے۔'' سلمٰی نے تجویز پیش کی۔
''لیکن فرار کے لیے ہم اس منحوس گاڑی کا سہارا نہیں لیں گے۔'' ماجد نے دوٹوک انداز میں کہا۔
اگلے ہی لمحے وہ چاروں اس بات پر اتفاق کر چکے تھے کہ جتنی جلدی ممکن ہو، انہیں اس دہشت زدہ اجاڑ، بیابان مقام سے دور نکل جانا چاہیے۔ اسی فیصلے پر پہنچتے ہی انہوں نے ایک جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ یہ وہی سمت تھی، جدھر سے وہ آئے تھے۔ وہ چاروں ان لمحوں میں ایک ایسی جان لیوا سچوئیشن میں بندھے ہوئے تھے کہ نارمل انداز میں واکنگ کرتے ہوئے اس صورت حال سے نکلنے کی کوشش نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں تو دوڑنا تھا، بھاگنا تھا اور جلد از جلد اس مصیبت کو اپنے پیچھے چھوڑ دینا تھا۔ وہ چاروں انتہائی محفوظ سمت میں اندھا دھند بھاگنے لگے۔
ابھی انہوں نے چند گز کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ اچانک آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے گھر گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس ویرانے میں یکا یک رات اتر آئی ہو۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا تو نہیں تھا البتہ دکھائی یہی دیتا تھا کہ اب تب میں وہ گہری تاریکی کی خوراک بننے والے ہیں۔ اس اچانک نمودار ہو جانے والی افتاد نے ان کی پریشانی اور خوف میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ان کے دوڑتے ہوئے قدموں کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔
وہ موت سے نجات کے لیے زندگی کی دوڑ میں اپنا اپنا حصہ ڈال رہے تھے کہ دلوں پر ہیبت طاری کر دینے والی آواز کے ساتھ بادل گرجے... اگلے ہی لمحے آسمانی بجلی بھی چمک اٹھی۔ ان کے دل لرز اٹھے تاہم اس وقت انہیں اپنے دل و دماغ کے لرزنے یا کانپنے کی ذرا پروا نہیں تھی۔ وہ جلد از جلد کسی محفوظ مقام تک رسائی کی تگ و دو میں اندھا دھند بھاگے چلے جا رہے تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا، آج کا دن ان کی زندگی کا کٹھن ترین دن ہے۔ ان کے مصائب پہلے ہی کچھ کم نہیں تھے کہ اچانک زوردار بارش شروع ہوگئی اور بارش بھی ایسی کہ الحفیظ، الامان...!
گرجتے بادلوں، کڑکتی بجلی اور دھواں دھار بارش نے ان کی مت مار دی تھی۔ وہ خطا اوسان کے ساتھ، ہانپتے کانپتے بس بھاگے چلے جا رہے تھے۔ ایک نئی قیامت ان پر اس وقت ٹوٹی جب انہوں نے خود کو اسی پُراسرار عمارت کے سامنے پایا جس سے چھٹکارا پانے کے لیے انہوں نے مخالف سمت میں دوڑنا شروع کیا تھا۔ یہ صورت حال ان کے لیے ناقابلِ یقین ہونے کے علاوہ بے حد دہشت ناک بھی تھی۔ وہ اپنی دانست میں پچھلے دس منٹ تک اس قلعہ نما عمارت کی مخالف سمت میں سفر کرتے رہے تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ وہیں پہنچ جاتے جہاں سے انہوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا... مگر آنکھوں دیکھی حقیقت کو بھلا کیسے جھٹلایا جا سکتا تھا اور حقیقت پوری سفاکی کے ساتھ اس امر کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ چاروں قلعہ نما عمارت کے سامنے موجود ہیں۔
ماجد کی نگاہ ابھی اسی پر تھی کہ... [illegible] پہلے والی گاڑی بھی اپنی جگہ کھڑی تھی یا وہ ان کی بھاگ دوڑ کھوتے چلی گئی تھی۔
''وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا...'' سلمٰی کی ڈری سہمی آواز ابھری۔ ''مار ڈالے گا ہمیں...''
''ہم کسی شیطانی چکر میں پھنس چکے ہیں۔'' ماجد کی آواز میں بے پناہ خوف تھا۔ ''اس چکر سے نکلنا ہمارے بس کی بات نہیں۔''
''کاش! ہم نے اس منحوس ریحان ترمذی کی بات نہ مانی ہوتی۔'' سکندر نے افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔
ماجد نے تائیدی لقمہ دیا۔ ''اور اس خبیث مشتاق کے جھانسے میں نہ آئے ہوتے۔''
''اب ان گزری ہوئی باتوں کا ماتم کرنے سے کیا حاصل ہوگا؟'' روزی نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب یہ سوچو کہ اس مصیبت سے کیسے نکلیں...؟''
''یہ نیک کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔'' ماجد نے تیکھے انداز میں روزی کی جانب دیکھا۔
روزی کے ''چوڑیوں'' والے ریمارکس نے ماجد کو سلگا رکھا تھا۔ سکندر بھی ''مہندی اور مایوں'' والے ٹاکنگ کو ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اس نے ماجد کی بات میں گرہ لگانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی اور کہا۔ اس کی مخاطب یقیناً روزی تھی۔
''میں سمجھتا ہوں، ہم میں سے زیادہ بہادر اور عقل مند تم ہی ہو۔ تم جو بھی تجویز کرو گی ہم تمہارے پیچھے ہیں... تم ہماری عظیم قائد ہو۔''
''اگر میں نے کبھی چھوٹی ٹی وی پر کچھ بنانے کی ضرورت محسوس کی تو تم میری سوپ سیریل کی ہیروئن ہو گی۔'' ماجد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور اس سوپ کا ٹائٹل سانگ ہوگا...''
''ہم لوگ یہاں ویرانے میں پکنک منانے نہیں آئے۔'' سلمٰی نے ماجد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''آپس کے لایعنی اختلافات کو بھلا کر یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچو۔ ہم اس وقت مکمل طور پر شیطان کے چنگل میں ہیں۔ اس نادیدہ گرفت سے نکلنے کے سلسلے میں ہماری تمام کوششیں اس کی شیطانی قوت کے سامنے ناکام ہو چکی ہیں۔ اگر ہم نے غفلت کا مظاہرہ کیا اور آپس میں الجھتے رہے تو وہ ہمیں چن چن کر ختم کروا ڈالے گا۔''
''شیطان کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، وہ رحمان سے زیادہ بھاری نہیں ہو سکتا۔'' روزی نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''ہم اپنی غلطیوں کے سبب اگر شیطان کے ہتھے چڑھ گئے ہیں تو رحمان ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائے گا۔ یہ خبیث شیطان اگر ایک بار میرے سامنے آ جائے نا تو میں اس کی...''
روزی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی قلعہ نما عمارت کا داخلی دروازہ مخصوص چرچراہٹ کے ساتھ وا ہوا... پھر اس کھلے ہوئے دروازے کے فریم میں پرویز نمودار ہوا۔ اس نے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ سجا کر باری باری ان چاروں کے چہروں کا جائزہ لیا پھر بڑے مشفقانہ لہجے میں بولا۔
''میرے بچو! تم آ گئے... میں کافی دیر سے تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔''
یہ آواز ان چاروں کی سماعت کے لیے نامانوس نہیں تھی۔ روزی نے اضطراری انداز میں کہا۔
''ریحان واسطی...!''
''ریحان شیرازی...!'' ماجد کی سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔
''ریحان شمسی...!'' سلمٰی چونک کر بولی۔
''ریحان ترمذی...!'' سکندر کے لہجے میں حیرت تھی۔

☆☆☆

وہ چاروں بھیگے...... کپڑوں اور سکڑے ہوئے جسموں کے ساتھ ایک کمرے میں، ایک لمبے سے صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک ریوالونگ چیئر پر پرویز موجود تھا جو ان کے لیے ریحان تھا، چاہے کسی بھی ورائٹی کا ریحان کیوں نہ ہو۔ انہوں نے ریحان کی مخصوص پچ اور وکل سے اسے پہچان لیا تھا۔ اسی شخص نے مختلف اوقات میں انہیں فون کر کے ایک مخصوص رقم کے ساتھ اپنے پاس آنے کے لیے کہا تھا۔ پرویز (ریحان) نے ان کی ایسی ایسی کمزوریوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا کہ وہ اس کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ بھی اپنے وعدے کا پاس کرتا ہے یا نہیں!

کمرے کے ایک کونے میں، بڑی سی میز پر ایک... ٹی وی مونیٹر رکھا ہوا تھا۔ مونیٹر کے نزدیک ہی ڈی وی ڈی اور وی ٹی آر پلیئرز بھی موجود تھے۔ ٹی وی مونیٹر کو مخصوص کیبلز کے ذریعے ڈی وی ڈی پلیئر اور وی ٹی آر کے ساتھ منسلک کیا گیا تھا۔ کمرے میں لائٹ کا مناسب انتظام نظر آتا تھا مگر ان میں سے کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ دور دراز علاقے کے اس سنسان، بیابان مکان میں لائٹ آئی کہاں سے تھی؟ انہیں اس قلعہ نما مکان کے گردونواح میں کوئی الیکٹرک پول یا اسی نوعیت کا کوئی تار دکھائی نہیں دیا تھا۔ جنریٹر کے بارے میں بھی نہیں سوچا جاسکتا تھا۔ اگر اس انرجی اور روشنی کا سورس کوئی جنریٹر تھا تو اس کی مدھم یا تیز آواز سنائی دینا لازمی بات تھی جو کہ سرے سے نہیں تھی۔ اب آجا کر کسی انورٹر یا یو پی ایس کے بارے ہی میں سوچا جاسکتا تھا۔

پرویز نے بڑی کھوج دار نظر سے ان چاروں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''تم لوگ میری مطلوبہ چیز تو لائے ہو نا...؟''

اس کا واضح اشارہ اس رقم کی جانب تھا جو اس نے ''حصہ بہ قدر جثہ'' کے مصداق فرداً فرداً ان سے طلب کی تھی۔ انہوں نے بہ یک زبان ہو کر اثبات میں جواب دیا۔ پھر ماجد نے کہا۔

''لیکن اس گھر کے باہر ہم جس نوعیت کی صورت حال سے گزرے ہیں، اس نے جیب، بٹوا، پرس... ہر شے کو شرابور کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی تمہاری مطلوبہ رقم بھی بھیگ چکی ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' پرویز نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''یہ کرنسی نوٹ کسی حسین و جمیل محبوبہ کی طرح ہوتے ہیں... بھیگنے کے بعد کچھ زیادہ ہی پرکشش اور جاذب نظر ہو جاتے ہیں۔''

روزی اس کی عامیانہ تمثیل پر برا سا منہ بنا کر رہ گئی اور خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''لیکن جب تک تم مجھے میری چیز نہیں دو گے، میں تمہیں ہرگز دو لاکھ روپے نہیں دوں گی۔''

''تم ایک بینکر ہو نا آخر...'' پرویز نے ایک شیریں چوٹ کی۔ ''دن رات فگرز کے چکر میں الجھی رہتی ہو۔ معاملہ پچیس ہزار کا ہو یا دو لاکھ کا... لین دین کرتے وقت بڑی اسٹرکٹ ہو جاتی ہو۔ کوئی آزمانے کی خاطر ہی سہی، ذرا سی بھی اونچ نیچ کرے، تم مارنے مرنے پر تل جاتی ہو۔ کوئی تمہیں شدت سے چاہتا ہے لیکن تمہیں کوئی پروا نہیں۔ تم اس کے جذبات کو بھی کیلکولس کے ڈبلے پر چیک کرنے کی کوشش کرتی ہو۔ ایسی باؤ...'' وہ ذرا دیر کو تھما، ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں تمہاری خواہش کا احترام کروں گا۔ تم... بلکہ تم سب اپنی اپنی ''کمزوریوں'' کو حاصل کرنے کے بعد مجھے ادائیگی کرو گے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

سلمیٰ نے پوچھا۔ ''تم نے اپنے جس آدمی کو بلوم اسٹار ہوٹل ہمارے پاس بھیجا تھا، وہ کیا بلا تھا؟ جس شخص نے ہمارے ساتھ کیا بدتمیزی کی ہے...؟''

''اب جانے دو...'' وہ بڑے تحمل سے بولا۔ ''اب اس کو بھول جاؤ۔ وہ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔''

''لیکن... وہ سب... تھا کیا...؟'' سکندر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ تو... کچھ بھی... نہیں تھا...!'' پرویز نے سکندر ہی کے انداز میں جواب دیا اور دوسروں کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''اب میں آپ لوگوں کو ٹی وی مونیٹر پر وہ زریں لمحے ڈسپلے کر کے دکھاتا ہوں جن کو حاصل کرنے کے لیے تم یہاں آئے ہو تاکہ تمہیں یقین آجائے کہ میں نے تم لوگوں کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔''

''لیکن یہ انتہائی غیر اخلاقی ہوگا کہ...'' سلمیٰ کی بات ادھوری رہ گئی۔

''اس وقت تم چاروں ایک حمام میں موجود ہو۔'' پرویز، سلمیٰ کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''اور تم میں سے ہر ایک یہ بات بڑی اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک حمام میں موجود لوگوں کا کسی سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے، تم

لوگ ایک دوسرے کے کارنامے دیکھ کر انہیں فراموش کر دو گے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

ان چاروں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے قلعہ نما مکان کے باہر جس نوعیت کے تحیر آمیز اور وحشت خیز حالات سے گزرے تھے اور اس کے باوجود بھی وہ پرویز کے بلاوے پر گھر کے اندر آگئے تھے تو اس میں پرویز کی سحر انگیز آواز کا اثر تھا۔ وہ پرویز کے سامنے خود کو ایک عجیب سی بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں محسوس کرتے تھے۔ آخر کو وہ شیطان کا ہونہار چیلا تھا، کوئی مذاق نہیں تھا۔

آئندہ دس منٹ کے اندر پرویز نے ڈی وی ڈی اور وی سی ڈی میں پیچر مواد کو ٹی وی مونیٹر پر ڈسپلے کر کے انہیں دکھا دیا۔ سکندر اور سلمیٰ کے حوالے سے کچھ دستاویزی فیچر بھی تھے۔ وہ بھی اسکرین پر چلا دیے گئے۔ پرویز کی اس ''محنت'' کے نتیجے میں ان چاروں کو یقین آگیا کہ پرویز نے ان کے ساتھ کوئی غلط بیانی یا فراڈ نہیں کیا۔

اگلے مرحلے پر پرویز نے نہایت دیانت داری کے ساتھ انہیں ان کے ''اعمال نامے'' کے زندۂ جاوید ثبوت فراہم کر دیے۔ انہوں نے پرویز کی مطلوبہ بھیگی ہوئی رقم اس کے حوالے کر دی۔

پھر ماجد ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''اب ہم جا سکتے ہیں...''

''کہاں جاؤ گے عظیم پروڈیوسر صاحب؟'' پرویز نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

''اپنے گھر... اور کہاں؟'' ماجد نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''جو ہارر مووی یہاں شوٹ ہونے والی ہے اس کے ایگزیکٹو پروڈیوسر تو تم ہی ہو۔'' پرویز نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں تو سیٹ پر موجود رہنا ہوگا۔''

''ہارر مووی... یہ کیا بکواس ہے؟'' ماجد نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں... ایک دم ہارر... رگوں میں خون منجمد کر دینے والا۔'' پرویز نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''اور تم چاروں اس مووی کے کردار ہو۔ تمہارے علاوہ بھی ایک اور کردار ہے۔ میں بہت جلد تمہیں اس پانچویں کردار تک پہنچانے والا ہوں۔''

''یہ تم نے کون سی نئی کہانی شروع کر دی؟'' روزی کے استفسار میں جھنجلاہٹ بھری تھی۔

''تم لوگوں کے لیے یہ نئی کہانی ہوگی مگر میرے لیے نہیں...'' پرویز نے بڑے مکروہ انداز میں روزی کو جواب دیا۔ ''اور یہ کہانی اسی پانچویں کردار کے گرد گھومتی ہے جو اس گھر کے تہ خانے میں ایک تابوت کے اندر بند ہے۔''

''تابوت کے اندر...!'' سلمیٰ کی کپکپاتی ہوئی آواز ابھری۔ ''کیا تم کسی لاش کا ذکر کر رہے ہو...؟''

''کریکٹ...!'' پرویز نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ''تم بہت ذہین ہو میڈم سلمیٰ۔''

''تم کسی لاش کا مدعا ہمارے سر ڈالنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟'' سکندر نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''تمہاری کھوپڑی الٹا سوچتی ہے سکندر بابو۔'' پرویز نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''میں لاش کا مدعا تمہارے سر نہیں بلکہ تم چاروں کا مدعا اس لاش کے تابوت پر ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' روزی بگڑ کر بولی۔

''مطلب بہت سادہ اور آسان ہے۔'' پرویز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تم چاروں کی مدد سے اس تابوت کے ساتھ ایک دلچسپ کھیل کھیلوں گا۔ کیا تمہیں معلوم ہے، اس تابوت کے اندر کس کی لاش بند ہے؟''

''ہمیں کچھ معلوم نہیں۔'' سلمیٰ کی سہمی ہوئی آواز خارج ہوئی۔

''میں بتاتا ہوں۔'' پرویز نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''تابوت کے اندر ایک معروف جادوگرنی مارتھا کی لاش رکھی ہے جس کا انتقال چند روز پہلے ہوا تھا۔ میں ایک خاص عمل کے لیے مارتھا کے تابوت کو قبرستان سے نکال کر اس ویران سنسان مکان میں لایا ہوں۔''

''آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو...؟'' سکندر نے متوحش نظر سے پرویز کی طرف دیکھا۔

''میں مارتھا کی لاش کو چند لمحوں کے لیے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔'' پرویز نے سفاکی سے کہا۔ ''مجھے اس سے ایک ضروری کام ہے۔''

''لیکن کسی مارتھا کی لاش سے ہمارا کیا تعلق؟'' ماجد نے بے حد خوف زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''تم لوگوں کی مہربانی ہی سے میں مارتھا کی لاش کو زندہ کر پاؤں گا۔'' پرویز نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ کافی دنوں سے اس چوبی تابوت کے اندر محبوس ہے۔ وہ اس وقت ایک صحت افزا... شاور کی شدید ضرورت محسوس کر رہی ہے۔ جب تک میں اسے غسل نہیں دوں گا، وہ فریش اپ نہیں ہو گی... اور یہ غسل...'' اس نے بڑے خطرناک انداز میں توقف

www.pkdigest.com

کیا پھر سنگین لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

’’...یہ غسل میں تمہارے خون سے دوں گا۔‘‘

’’کیا بک رہے ہو؟‘‘ روزی حلق کی پوری قوت سے چلائی۔

’’اپنی زبان کو لگام دو لڑکی!‘‘ پرویز نے غصیلی نظر سے روزی کی طرف دیکھا پھر خوں خوار لہجے میں بولا۔ ’’اس بار ریلے کا اسکرپٹ سر نے لکھا ہے اور وہی اس کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔‘‘

’’سر، کون...؟‘‘ ماجد نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

’’سر، ابلیس!‘‘ وہ بڑے مکروہ انداز میں اپنی ہنسی کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

’’تو... تو... تم... شیطان کے... چیلے ہو...؟‘‘ سلمٰی کی ڈری سہمی آواز سنائی دی۔ ’’تم اپنے آقا کے حکم پر ہمارے ساتھ کوئی گھناؤنا کھیل، کھیلنا چاہتے ہو؟‘‘

’’تم اسے کوئی بھی کھیل سمجھو لیکن اس عمل کے بعد مجھے ایک عظیم شکتی حاصل ہو جائے گی۔‘‘ پرویز بڑی سنجیدگی سے انہیں بتانے لگا۔ ’’تمہیں یہاں تک لانے میں سر نے میری بہت مدد کی ہے۔ مجھے چار ایسے افراد کی ضرورت تھی جنہوں نے کوئی ایسا جرم کیا ہو جو دنیا والوں کی نظر میں نہ آسکا ہو۔ ایسی دو عورتیں اور دو مرد مجھے درکار تھے جن کی قربانی سے میں مارتھا کی لاش کو غسل دے کر اپنا مقصد حاصل کر سکوں۔ تم چاروں ایسے ہی ہو۔ بولو، ایسے ہو کہ نہیں...؟‘‘

’’تم جاؤ بھاڑ میں...‘‘ روزی نے طیش کے عالم میں کہا۔ ’’اور تمہارا وہ سر... ابلیس بھی جائے کسی دہکتے ہوئے جہنم میں... میں تمہیں اس ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔‘‘

روزی کی دیکھا دیکھی باقی تینوں نے بھی ہمت پکڑی اور اپنی اپنی حواسی سکت کے مطابق، پرویز کو چھوٹی بڑی دھمکیاں دینے لگے۔ پرویز نے ہاتھ اٹھا کر گرج دار آواز میں کہا۔

’’خاموش...!‘‘

اسی لمحے چہار سو تاریکی چھا گئی۔ ان چاروں کو جیسے کوئی زہریلا سانپ سونگھ گیا ہو۔ اچانک چھا جانے والے اندھیرے نے گویا ان کی روح قبض کر لی تھی۔ ان نازک، سنسنی خیز لمحات میں وہ خود کو مفلوج محسوس کر رہے تھے۔ ان کے چاروں جانب موت کی خاموشی کا راج تھا۔ اس سے پہلے کہ ان کے ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتے یا وہ ہاتھ پاؤں کو حرکت دینے کی پوزیشن میں آتے، کسی عورت کی دل دوز

چیخ نے اس مکان کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ بھیانک چیخ مکان کے تہ خانے کی جانب سے ابھری تھی اور اس کے ساتھ ہی مکان کے باہر بڑے خوفناک انداز میں بادلوں کے گرجنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ پھر بجلی کڑکنے اور چھاجوں مینہ برسنے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ تاریکی چھاتے ہی شیطان کے چیلے کا مکروہ چہرہ بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور اب تو اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کمرے کے اندر موجود ہی نہ ہو۔

وہ چاروں چونکہ ایک ہی صوفے پر موجود تھے لہٰذا اس ہنگامی صورت حال میں انہوں نے ٹٹول کر ایک دوسرے کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ابھی تک وہ زبان سے کچھ بولنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ دہشت در دہشت کا شکار تھے۔ ان کے دل بوجھل اور ذہن بیمار تھے۔

اگلے ہی لمحے ان کی کوشش کسی حد تک رنگ لے آئی۔ کسی حد تک ان معنوں میں کہ ماجد، سلمٰی اور روزی کا سراغ تو مل گیا تھا مگر سکندر کہیں محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ماجد نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

’’سکندر! تم کہاں ہو...؟‘‘

ماجد کی پکار کے جواب میں سکندر کی دہشت زدہ آواز ابھری۔ ’’یہ مجھے... کون کھینچ رہا ہے... کون مجھے گھسیٹ رہا ہے...؟‘‘

یہ آواز واضح طور پر کمرے کے باہر سنائی دی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ سکندر اس کمرے کے اندر موجود نہیں تھا۔ جب تک وہ کمرا روشن تھا، انہوں نے کمرے کے دروازے کو کھلا ہوا ہی پایا تھا۔ وہ یقیناً اب بھی کھلا ہی تھا لیکن ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے اندھیرے کے باعث انہیں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی یہ کوشش تو کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو پا رہی تھی تاہم سکندر کی بے بسی میں ڈوبی ہوئی فریاد ان کی سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں پوری طرح کامیاب تھی۔ وہ متوحش آواز میں چلا رہا تھا۔

’’میرے پاؤں کو چھوڑ دو... مجھے گھسیٹ کر کہاں لے جا رہے ہو... پلیز! مجھے معاف کر دو... میں پھر کبھی عوام کے حصے کی لوٹی ہوئی دولت کو اپنی ذات پر خرچ نہیں کروں گا... اے شیطان کے چیلے! تم مجھ سے دس لاکھ کیا، دس کروڑ لے لو مگر میری جان بخش دو... پلیز مجھے جانے دو... پلیز...!‘‘

الو کا پٹھا، گدھے کا بچہ... جس شیطان کے چیلے نے اس کی بھینٹ دینے کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا، وہ اسی سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ بعض لوگ ایسے عاقبت نااندیش ہوتے ہیں کہ موت کو نگاہ کے سامنے مجو رقص دیکھ کر بھی اس کی سنگینی کا ادراک نہیں کرتے۔ ان لمحات میں بھی ان کی زبان سے ڈھنگ کا کوئی کلمہ جاری نہیں ہوتا۔

سکندر کی آہ و بکا جاری تھی کہ کمرے کے دروازے کے باہر روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا پھر اس جھماکے نے ایک اسپاٹ لائٹ کی صورت اختیار کر لی۔ اس اسپاٹ لائٹ کے روشن دائرے کے اندر انہوں نے ایک وحشت ناک منظر دیکھا۔ پاؤں کے سوا سکندر کے جسم کو انہوں نے فرش پر گھسٹتے ہوئے دیکھا۔ پاؤں روشن دائرے سے باہر تھے جبھی نظر نہیں آرہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تاریکی میں چھپی کوئی طاقت سکندر کو پاؤں سے پکڑ کر کھینچے لیے جا رہی ہو۔ وہ بری طرح گردن اور دونوں ہاتھ جھٹک رہا تھا لیکن کھینچنے والا اس کی داد و فریاد پر کان دھرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے روشن دائرہ اور سکندر کا تڑپتا، پھڑکتا بدن ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کمرے کے باہر کا ماحول ایک مرتبہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔ شیطان کے چیلے پرویز نے انہیں شاید یہ ٹریلر دکھا کر اپنے آنے کی کوشش کی تھی کہ عنقریب ان کا حشر بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا ہے۔

کمرے میں خیمہ زن شب دیجور میں وہ ایک دوسرے کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور یہ ان کے حق میں بہتر ہی تھا ورنہ اس وقت ان کے چہروں پر اور آنکھوں میں جس انداز کی وحشت اور دہشت موجود تھی، وہ انہیں ڈرانے کے لیے کافی تھی۔

’’یہ شیطان کا چیلا ہمیں باری باری شکار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔‘‘ سلمٰی نے بالآخر موت کے سکوت کو توڑا۔ ’’مجھے یقین ہے، وہ سکندر کو گھسیٹ کر تہ خانے کی طرف لے گیا ہے جہاں اس حرافہ، مارتھا کا تابوت رکھا ہوا ہے۔ اف خدایا... اس خبیث کی شکل پر کیسی عیاری اور مکاری چمک رہی تھی۔ پکے ہوئے آڑو کی صورت والے کم بخت نے کتنی ہوشیاری اور چال بازی سے ہمیں اس آسیب زدہ مکان میں بند کر دیا ہے۔ کاجل بھری شیطانی آنکھوں کے ساتھ جب وہ پوری ہنسی نکال کر ہنستا تھا تو مجھے اس سے گھن آنے لگی تھی...‘‘

’’یہ اس مردود کو کوسنے کا وقت نہیں ہے۔‘‘ روزی نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ’’ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ہم اسی کمرے میں، ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے تو اگلی باری ہم تینوں میں سے کسی ایک کی ہوگی۔‘‘

’’لیکن ہم جائیں تو جائیں کہاں...؟‘‘ سلمٰی نے بے بسی سے کہا۔

’’اگر شیطان کے چیلے کے پاس گندی قوتیں ہیں تو ہمیں بھی خدا نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے۔‘‘ روزی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ’’ہمیں فوری طور پر اس کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھنا چاہیے۔‘‘

روزی کی تجویز سلمٰی اور ماجد کو پسند آئی۔ وہ تینوں ایک عزم کے ساتھ اٹھے۔ اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیے اور ایک کمپنی کی شکل میں کمرے کے دروازے کی سمت بڑھنے لگے۔

اسی لمحے مکان کے تہ خانے کی جانب سے سکندر کی، درد میں ڈوبی ہوئی ایک دہشت ناک چیخ بلند ہوئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شیطان کے پیروکار نے سکندر کو بڑی سفاکی سے ذبح کر ڈالا ہو۔

☆☆☆

وہ تینوں ہاتھ میں ہاتھ دیے، طوفانی رفتار کے ساتھ، اندازے کی انگلی تھام کر اس قلعہ نما مکان کے داخلی دروازے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے اردگرد ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ سامنے کیا ہے اور دائیں بائیں کیا۔ ان کی تیز رفتاری کسی بھی مرحلے پر خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ جہنمی بلائیں ان کے تعاقب میں تھیں اور وہ پہلی فرصت میں، اندھیرے میں چھوڑے ہوئے تیر کے مانند اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے رواں دواں تھے۔

پھر وہی ہوا جس کا خدشہ ایک ایک انچ پر موجود تھا۔ سلمٰی کو بھاگتے ہوئے کسی شے سے ٹھوکر لگی۔ یہ جھٹکا اتنا زوردار تھا کہ روزی کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ لڑھکتی ہوئی اندھیرے میں کچھ دور چلی گئی۔ اس گرنے اور لڑھکنے سے یقیناً اسے شدید نوعیت کی چوٹیں آئی تھیں جب ہی اس کے حلق سے کرب ناک چیخ بلند ہوئی تھی۔ روزی نے اندازہ لگایا کہ سلمٰی اس سے محض تین گز کے فاصلے پر موجود تھی۔

’’رک جاؤ ماجد...!‘‘ روزی نے ماجد کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ ’’ہم سلمٰی کو ساتھ لیے بغیر آگے نہیں بڑھیں گے۔‘‘

’’حماقت نہ کرو روزی۔‘‘ ماجد نے انتہائی خود غرضی سے کہا۔ ’’ہمارے پاس وقت بہت کم ہے... تم صرف اپنی فکر کرو۔‘‘

’’میں ایسا نہیں کر سکتی ماجد!‘‘ وہ اس کے ہاتھ سے اپنا

ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ''سلمٰی ہماری ساتھی ہے۔ ہم سب ایک ایسی کشتی کے مسافر ہیں جس کے پیندے میں اچانک ایک شگاف نمودار ہوگیا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد سے ایک دوسرے کو بچانا ہے۔ میں سلمٰی کو بیچ منجدھار چھوڑ کر ساحل کی جانب تیراکی نہیں کرسکتی۔''

''تم دونوں جاؤ جہنم میں۔'' ماجد نے بپھری ہوئی آواز میں کہا اور دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔

''لعنت ہے تمہاری مردانگی پر... کسی چھیل چھبیلے، رنگ رنگیلے کی اولاد!'' روزی نے حلق کے بل چیخ کر کہا۔ ''تم واقعی ان مردوں میں سے ہو جو چوڑیاں پہن کر پورا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر گزار دیتے ہیں اور ان کی گھر والیاں گھر کا چولہا روشن رکھنے کے لیے ہر ایک میلی نظر کو اپنے سراپا پر سہتی ہیں۔ ان کا پندار ہر روز زخمی ہوتا ہے لیکن وہ کرچی کرچی بدن کے ساتھ گھر کے چولہے کو بجھنے نہیں دیتیں... خدا تمہیں اور تم جیسے تمام مردوں کو غارت کرے۔''

روزی کے ان زہریلے الفاظ کا ماجد پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ اسے ان لمحوں میں سب سے زیادہ اپنی جان کی فکر تھی اور وہ جان بچانے کے لیے ہی جلد از جلد بیرونی دروازے تک پہنچنا چاہتا تھا۔

ایک تو موجودہ حالات نے روزی کو چراغ پا کر رکھا تھا، دوسرے وہ فطری طور پر بھی آتش مزاج تھی۔ آتشی برج اسد کے تحت پیدائش نے اسے اور بھی جوشیلا اور مار دھاڑ سے بھرپور شاہکار بنا دیا تھا۔ اس کی قریبی دوست بہ خوبی جانتی تھیں کہ جب وہ جلال میں ہوتی تھی تو بڑے فراٹے سے مردوں کی بولتی بھی بند کروا دیا کرتی تھی اور یہی سب اس نے ماجد کے ساتھ بھی کیا تھا۔

ماجد پر لعنت بھیجنے کے بعد وہ سلمٰی کی جانب متوجہ ہوئی لیکن اس دوران میں سلمٰی پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ تاریکی میں اس کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔

''چھوڑ دو مجھے... کون ہو تم... میری گردن کیوں دبا رہے ہو...!''

صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہی روزی نے تاریکی میں اس جانب جست بھری جدھر سلمٰی کی پھنسی پھنسی آواز سنائی دی تھی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔

روزی نے دس گز کے فاصلے پر، اپنے آگے ایک ایسی آواز سنی جیسے کوئی اناج سے بھری ہوئی بوری کو فرش پر گھسیٹ رہا ہو۔ اس نے ایک لمحے میں اندازہ لگا لیا کہ وہ سلمٰی کا خاموش بدن تھا۔ کسی نادیدہ گندی قوت نے گردن دبا کر اس کی آواز معدوم کر دی تھی۔ اس کی یادداشت میں سلمٰی کے آخری الفاظ ابھی تک تازہ تھے... چھوڑ دو مجھے... کون ہو تم... میری گردن کیوں دبا رہے ہو...!

روزی گھسٹنے کی آواز کے ساتھ ساتھ تاریکی میں آگے بڑھنے لگی۔ اس کی اولین کوشش یہی تھی کہ کسی طرح سلمٰی کے بے آواز جسم کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائے لیکن اگر وہ پانچ قدم سلمٰی کی سمت بڑھتی تھی تو گھسیٹنے والا چھ قدم اسے آگے کھینچ لیتا تھا۔ روزی نے ہمت نہ ہاری اور آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔

اس دوران میں وہ دل ہی دل میں اس پکے ہوئے آڑو کے چہرے والے ابن شیطان ریحان واسطی (پرویز) کو بھی کوستی جا رہی تھی۔ اس کے کوسنوں میں سب سے دلچسپ کوسنا یہ تھا... کم بخت نے اس بار اسپاٹ لائٹ بھی روشن نہیں کی۔ اگر روشنی کا دائرہ کہیں پڑ رہا ہوتا تو میں بہ آسانی دیکھ لیتی کہ سلمٰی ہے کس سمت...!

وہ گھپ اندھیرے کو پاٹتے ہوئے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اس کے وجود کو ایک دھکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بلندی سے پستی کی جانب لڑھک گئی ہو۔ جلد ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ زینے پر پھسل گئی ہے۔ اگلے ہی لمحے ایک قیامت خیز خیال نے اسے گرفت میں لے لیا۔ نیچے کی جانب جانے والے زینے کا ایک ہی مطلب تھا کہ... وہ مکان کے تہ خانے کی طرف جا رہی تھی جہاں کسی مارتھا نامی جادوگرنی کی لاش تابوت میں رکھی تھی اور... یہ شیطان کا فرزند ریحان واسطی ان کے خون سے مارتھا کی لاش کو غسل دے کر چند لمحوں کے لیے اسے زندہ کرنا چاہتا تھا۔

ان خطرناک خیالات کے ساتھ ہی روزی کے جی میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اسی زینے کی نگر کو تھام کر خود کو تہ خانے میں پہنچنے سے بچا لے لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ کسی قد نیچے کی نگر کو پکڑنے میں کامیاب ہوتا، اس کا سر بڑی زور سے کسی سخت شے کے ساتھ ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔

اندھیرا تو پہلے ہی اس کے تمام تر ماحول پر چھایا ہوا تھا، اس چوٹ نے تو اس کے دماغ کو تاریکی کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کی سماعت نے جو آخری آواز سنی، وہ سلمٰی کی بلبلاہٹ کی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے شیطان کی اولاد نے سلمٰی کے نرخرے پر کسی کند چھری کو آزما ڈالا ہو۔

پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

روزی کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہی تھی۔ اس کی آنکھ کسی کے گڑگڑانے کی آواز سے کھلی تھی۔ اس نے فوراً ہی آواز کو پہچان لیا۔ وہ ڈراما پروڈیوسر ماجد تھا جسے شیطان کے چیلے نے ایک کھلے ہوئے تابوت پر الٹا لٹکا رکھا تھا۔ تہ خانے کے اندر ملگجی سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ روشنی اس مشعل سے پھوٹ رہی تھی جو تابوت کے قریب ہی ایک دیوار پر آویزاں تھی۔ ماجد پوری طرح اس کے رحم و کرم پر دکھائی دیتا تھا۔ شیطان کے پیروکار کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چھری روزی کو صاف دکھائی دے رہی تھی جس کا خطرناک پھل ماجد کی گدی کے اوپر ٹکا ہوا تھا۔ ریحان واسطی (پرویز) کی پشت روزی کی جانب تھی اور وہ زینے کے تاریک حصے میں پڑی تھی۔ پرویز کی نظر اس پر نہیں پڑ سکی تھی جبکہ روزی اس کی کارروائی کو بڑی آسانی سے دیکھ رہی تھی۔ جس بڑی سی، لکڑی کی میز پر مارتھا والا تابوت رکھا نظر آ رہا تھا، اس کے اوپر تابوت کے پہلو میں دو انسانی بدن بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً سکندر اور سلمٰی کے مردہ جسم تھے جن کی وہ شیطان بھینٹ چڑھا چکا تھا اور چند لمحوں بعد ان میں ایک تیسرے مردہ بدن کا اضافہ ہونے والا تھا... ڈراما پروڈیوسر ماجد کے بدن کا۔

روزی [illegible] موت [illegible] ماجد کی منت سماجت اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''دیکھو... میں نہیں جانتا تم ریحان شیرازی ہو یا کوئی اور... بس، تم مجھے معاف کر دو... جاں بخشی کے بدلے میں تم مجھ سے جتنی بھی دولت مانگو گے، میں دینے کو تیار ہوں اور... اگر تمہیں قربانی کے لیے دوسرے انسانوں کی بھی ضرورت ہے تو میں مہیا کرنے کو تیار ہوں۔ اداکاری کے شوق میں میرے پاس لاتعداد لڑکے اور لڑکیاں آتے رہتے ہیں۔ میں ان میں سے درجن بھر تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ تم جتنا چاہو، ان کا خون بہاؤ... بس، تم مجھے یہاں سے جانے دو... تمہیں تمہارے پیر استاد ابلیس کا واسطہ... مجھے چھوڑ دو۔ تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

ماجد کی منت خوشامد کا پرویز پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے تکبیر پڑھے بغیر ماجد کو جھٹکا کر دیا۔ روزی سے یہ دل دوز منظر دیکھا نہ گیا اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے وہ اپنے خالق سے دعا کرنے لگی۔

''اے میرے پروردگار! میں نے سلمٰی کو اپنی آنکھوں کے سامنے جان دیتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن سکندر اور ماجد نے اپنی جاں بخشی کے عوض شیطان کے چیلے ہی کی خوشامد در آمد کی ہے اور اس کے سر... یعنی ابلیس کا واسطہ دے کر خود کو چھوڑ دینے کی درخواست کی ہے۔ کاش! وہ ان نازک لمحات میں ایک بار بھی اپنے خالقِ حقیقی کو پکار لیتے۔ وہ سخت بے وقوف تھے اسی لیے حرام موت مارے گئے... لیکن اے میرے معبود! میں تیرے سوا کسی کو نہیں جانتی۔ تو ہی میرا خالق ہے، تو ہی میرا مالک ہے۔ میرا ایمان ہے کہ موت اور زندگی صرف تیرے اختیار میں ہے۔ میں نہیں جانتی... تو اس گھر کے اندر مجھے موت دے گا یا زندگی۔ یہ تو صرف تو ہی جانتا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ تو مجھے جو بھی دے گا، میں اس پر صابر و شاکر ہوں۔ بس، میری تجھ سے اتنی سی درخواست ہے کہ اگر شیطان کا ایک معمولی سا چیلا مشتاق نادیدہ بن کر گاڑی کو ڈرائیو کر کے یہاں تک لا سکتا ہے تو میں کیوں نہیں... اے قادرِ مطلق، اے بحر و بر کے مالک! تو مجھے تھوڑی دیر کے لیے نادیدہ بنا دے تاکہ میں شیطان کے اس چیلے ...... کو اسی قلعے کے اندر نیست و نابود کر دوں... بے شک! جب تک تیری مدد کسی انسان کی پشت پر نہ ہو، وہ شیطان کو شکست نہیں دے سکتا...!''

ان دعائیہ کلمات کے اختتام پر روزی نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اندر توانائی کا ایک [illegible] خزانہ موجزن پایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

ریحان واسطی (پرویز) ماجد سے ''نمٹ'' چکا تھا۔ اب وہ ماجد کے بے حس و حرکت جسم کو مارتھا کے تابوت کے اوپر سے کھینچ کر نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ دو انسانوں، سکندر اور سلمٰی کو مارتھا کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ وہ اپنے شکار کو کھلے ہوئے تابوت کے اوپر، آر پار رکھ کر ذبح کر ڈالتا تھا، اس طرح مذبح کے نرخرے سے ابلنے والا خون مارتھا کی لاش کے غسل کا کام کر رہا تھا۔ تین شکاروں کی قربانی دی جا چکی تھی۔ اب چوتھے شکار یعنی روزی کی باری تھی...!

اس سے پہلے کہ شیطان کا چیلا ماجد سے ''فراغت'' حاصل کرنے کے بعد روزی کی تلاش میں روانہ ہوتا، روزی اپنی جگہ سے کھسک کر تاریکی کا سہارا لیتے ہوئے دبے پاؤں تہ خانے کی ایک دیوار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

دیوار پر ٹنگی ہوئی مشعل تہ خانے کے صرف اسی حصے کو روشن کر رہی تھی جہاں چوبی میز پر مارتھا والا تابوت رکھا ہوا تھا۔ روزی کو اس بات کا بھی کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا کہ وہ اس وقت دیدہ ہے یا نادیدہ۔ تاہم دعا کے بعد اس کے اندر اتنی ہمت اور حوصلہ آ گیا تھا کہ اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ شیطان کے اس چیلے سے ٹکرانے کے لیے پوری طرح تیار ہو

www.pkdigest.com

چکی تھی۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر وہ ہر صورت میں اپنے ٹارگٹ تک پہنچنا چاہتی تھی اور اس کا ٹارگٹ تھی، دیوار کے ساتھ ٹنگی ہوئی روشن مشعل...!

وہ لمحہ بہ لمحہ سرکتے ہوئے مشعل والی دیوار تک پہنچ گئی۔ چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا ہی دیکھا اور سنا گیا ہے۔ مشعل کے نیچے والا دیوار کا حصہ بھی تاریک تھا۔ روزی کو مذکورہ حصے تک رسائی حاصل کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اب وہ روشن مشعل سے محض اتنے فاصلے پر تھی کہ ہاتھ بڑھا کر اس مشعل کو اسٹینڈ پر سے اتار کر اپنی گرفت میں لے سکتی تھی۔

وہیں کھڑے کھڑے روزی نے شیطان کے چیلے کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہ ماجد کی لاش کو باقی دو لاشوں کے اوپر ڈھیر کر چکا تھا۔ پے در پے تین قتل کے نتیجے میں اس کے ہاتھ اور لباس بری طرح خون آلود ہو چکے تھے۔ لہو کے متعدد چھینٹے اس کے چہرے پر بھی دیکھے جا سکتے تھے جن کی وجہ سے اس کی، بپکے ہوئے آڑو والی شکل کی ہیبت ناکی اور درندگی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ کر روزی کو کراہیت کا احساس ہوا۔ اس کا جی متلانے لگا۔

اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال لیا۔ اس وقت ایک ایک سیکنڈ نہایت ہی قیمتی تھا۔ اس کی ذرا سی لغزش یا لرزش بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ وہ سانس روک کر، تاریکی میں کھڑے کھڑے اس لمحے کا انتظار کرنے لگی جب شیطان کا چیلا اس کی تلاش میں پیش قدمی کرتا۔ دعا کے مثبت اثر سے روزی کو یقین تھا کہ پرویز اس کی جانب بڑھنے کے بجائے، اس کی تلاش میں مکان کے بالائی حصے کی طرف جائے گا۔

اگلے ہی لمحے اس کا یقین رنگ لے آیا۔ قدرت نے اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ پرویز اسے نظرانداز کر کے دوسری جانب مڑا ہی تھا کہ وہ حرکت میں آ گئی۔ وہ بڑے فیصلے کن عملی لمحے تھے۔

روزی نے برق کی سی رفتار کے ساتھ مشعل کو اس کے اسٹینڈ سے جدا کیا۔ اس کی اس اچانک حرکت نے روشنی کے پھیلاؤ کو تہ خانے کی محدود فضا میں ادھر سے اُدھر نچا کر رکھ دیا۔ یہ فوری تبدیلی بھلا شیطان کے چیلے کی نگاہ سے کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔

پرویز ایک جھٹکے سے پلٹا۔ اس کی پلٹ سے پہلے ہی روزی مشعل سمیت اس پر جھپٹ پڑی۔ وہ ہوا میں جیسے پرواز کرتے ہوئے پرویز کے اوپر آ گئی تھی۔ یہ اس کی ایک اضطراری جست تھی جو ہدف پر جا بیٹھی تھی۔

پرویز اس اچانک افتاد سے گڑبڑا گیا۔ روزی کے لیے اتنی سی مہلت..... کافی تھی۔ قبل اس کے کہ پرویز سنبھل پاتا، روزی مشعل کی مدد سے اس کے لباس کو نذرِ آتش کر چکی تھی۔ جب تک وہ اس اچانک بدلتی ہوئی صورتِ حال کو سمجھ پاتا، اس کا پورا لباس بری طرح آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ آگ کا گولا بن گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیختے چلانے اور ناچنے لگا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد کے باعث ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اسی بدحواسی میں وہ تہ خانے سے باہر جانے کے بجائے چکراتے ہوئے سکندر، ماجد اور سلمٰی کی لاشوں کے اوپر جا گرا۔ نتیجے کے طور پر لاشوں کے جسموں پر موجود لباسوں نے بھی بھڑکتی ہوئی آگ کو ویلکم کہا۔

اس کے بعد روزی نے اس قلعہ نما مکان کے تہ خانے میں ایک ایسا منظر دیکھا جس نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ بات ہی ایسی تھی کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ مارتھا والے تابوت کے اندر سے دو کہنہ سال ہاتھ برآمد ہوئے اور ان ہاتھوں نے بڑی سرعت اور مہارت کے ساتھ پرویز کو تابوت کے اندر کھینچ لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ تابوت اور چوبی میز بھڑکتی ہوئی آگ کا ایندھن بن رہے تھے۔

اس دل دوز اور ہولناک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے روزی نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

روزی ہانپتے کانپتے جب اس قلعہ نما عمارت سے باہر آئی تو چہار سو گھپ تاریکی کا راج تھا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا اور گاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔ اس وقت وہاں گاڑی ہی ایک ایسی چیز تھی جو گھپ اندھیرے میں روشن نظر آ رہی تھی۔ اس کی اندرونی لائٹ آن تھی۔ ہیڈ لائٹس بھی روشن تھیں اور غرانے جیسی ایک مسلسل آواز اس بات کی دلیل تھی کہ گاڑی اسٹارٹ تھی۔

وہ لوگ اسی گاڑی میں ایک خوفناک سفر کے بعد اس مکان تک پہنچے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اس گاڑی کو چھونا بھی پسند نہ کرتی لیکن اس وقت وہ ہر ڈر خوف سے آزاد ہو چکی تھی۔ جب سے اس نے اپنے پروردگار کے حضور گڑگڑا کر دعا کی تھی... اس کے اندر جرأت اور اعتماد کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیل گیا تھا... پھر وہ شیطان کے چیلے کا حشر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ وہ نیست و نابود ہو چکا تھا۔ اس کے عبرت ناک خاتمے نے بھی روزی کو بے پناہ حوصلہ بخشا تھا۔

اپنے عقب میں ایک خوفناک دھماکے کی آواز سن کر وہ دہل گئی۔ اس نے میکانکی انداز میں پلٹ کر قلعہ نما عمارت کی

طرف دیکھا۔ یہ دھماکا یقیناً اسی عمارت کے اندر ہوا تھا۔

اس نے جو کچھ دیکھا، وہ بہت خوفناک تھا۔ آگ نے پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ نارنجی شعلے آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس تاریک ویرانے میں کسی نے جہنم دہکا دیا ہو۔

کس نے...؟ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب تھا... قدرت نے!

عمارت کے تہ خانے میں جو کچھ پیش آیا تھا، اس میں دستِ قدرت پیش پیش رہا تھا۔ جن لوگوں نے مصیبت کے وقت اپنے خالق کو فراموش کر کے طاغوتی طاقت سے رحم کی بھیک مانگی تھی، وہ عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے... حتیٰ کہ وہ طاغوتی طاقت، شیطان کا فرزندِ ارجمند بھی جہنم رسید ہو چکا تھا۔ روزی نے اپنے مالکِ حقیقی کو پکارا تھا اور اس قادرِ مطلق نے اس کی کماحقہ مدد بھی کی تھی جبھی وہ زندہ سلامت اور محفوظ تھی۔

روزی نے خوفناک شعلوں میں گھری ہوئی اس قلعہ نما عمارت پر الوداعی نگاہ ڈالی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھی۔ اگلے ہی لمحے اس کی نظر پسنجرز سیٹ پر پہنچی۔ پسنجرز سیٹ پر اس کا ہینڈ بیگ اور سیل فون موجود تھا۔ وہ تیزی سے آنکھیں پھاڑ کر ان چیزوں کو دیکھنے لگی۔ عمارت کے اندر جو الٹا [illegible] تھے۔ ان میں ہینڈ بیگ یا سیل فون کو دھیان میں رکھنا ممکن نہیں تھا۔ افراتفری کے اس دہشت ناک ماحول میں سب کو اپنی جان بچانے کی پڑی ہوئی تھی۔ شیطان کی اولاد نے انہیں سوچنے، سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع ہی کہاں دیا تھا۔

روزی آنکھوں دیکھی حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ”یہ سب یہاں کیسے پہنچ گیا...؟“

اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے ہینڈ بیگ کو اٹھا لیا پھر اسے کھول کر اضطراری انداز میں اس کے اندر رکھی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔

ہینڈ بیگ کی ہر شے جوں کی توں اپنی جگہ پر رکھی تھی۔ وہ اس حیرت سے سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ بیگ کے سامان میں ایک اضافے کو دیکھ کر چونک اٹھی۔ یہ اضافہ ایک ”ڈی وی ڈی“ کی شکل میں تھا۔ وہ مذکورہ ڈی وی ڈی کو دیکھتے ہی پہچان گئی۔ عمارت کے اندر ریحان واسطی نے یہ ڈی وی ڈی دو لاکھ روپے کے عوض اس کے حوالے کی تھی اور اس نے ڈی وی ڈی کو اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا اور اب... یہ ڈی وی ڈی اور دو لاکھ کے کرنسی نوٹ ہینڈ بیگ کے اندر موجود تھے۔

روزی نے ڈی وی ڈی کو ہینڈ بیگ سے باہر نکال لیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ یہ ڈی وی ڈی اس کے ایک مخفی جرم کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ریحان واسطی نے اسے ٹی وی مونیٹر پر پلے کر کے روزی کو دکھایا تھا۔ اس ڈی وی ڈی کا سلامت رہنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہٰذا پہلی فرصت میں اسے تلف کرنا بہت ضروری تھا۔

روزی چند قدم چل کر جلتی ہوئی قلعہ نما عمارت کے نزدیک پہنچی... پھر اپنے جسم و جان کی پوری طاقت استعمال کر کے اس نے ڈی وی ڈی کو آتش زدہ عمارت کے اندر اچھال دیا۔ شیطان کے چیلے ریحان واسطی کے اس مکروہ ”کارنامے“ کا اس آسیب زدہ عمارت کے ساتھ ہی فنا ہو جانا ضروری تھا۔

اس نیک کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دوڑتے ...... قدموں کے ساتھ گاڑی تک پہنچی پھر اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے غیر ارادی طور پر اس کی نگاہ بیک ویو مرر پر پڑی اور وہ بری طرح چونک اٹھی۔

عقبی منظر دکھانے والا آئینہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ پس منظر میں قلعہ نما عمارت آگ کی لپیٹ میں تھی اور اس جلتی ہوئی عمارت کے سامنے والے حصے میں لان کے قریب، لیمپ پوسٹ کے نیچے کوئی کھڑا تھا...!

روزی نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے پہچان لیا۔ وہ ریحان واسطی تھا... شیطان کا فرزندِ ارجمند... اور وہ شیطان زادہ روزی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

روزی نے دل ہی دل میں اس آفت زادے پر لعنت بھیجی اور گاڑی کو ٹاپ گیئر میں ڈال کر اسے طوفانی رفتار سے اڑانے لگی۔ وہ اس حوالے سے بڑی پُراعتماد تھی کہ یہ شیطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا کیونکہ ان لمحوں میں اسے تائیدِ غیبی حاصل تھی۔ اس کی توبہ کو قبول کرتے ہوئے قدرت نے اپنا نادیدہ امدادی ہاتھ اس کی جانب بڑھا رکھا تھا لہٰذا اس کے دل و دماغ میں شیطان کے ڈر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ، اس ویران سنسان ماحول میں، ہیڈ لائٹس کی اچھلتی کودتی روشنی کے تعاقب میں گاڑی کو دوڑائے چلی جا رہی تھی۔

یہ سچ ہے کہ جب تک دنیا میں ایک انسان بھی باقی ہے، شیطان کو فنا نہیں۔ وہ کسی نہ کسی روپ میں بہرحال زندہ رہے گا اور... رہتی دنیا تک انسان اور شیطان کے درمیان خیر و شر کی رسا کشی بھی جاری رہے گی۔

غلط انتخاب

کاشف زبیر

راستوں کا انتخاب کٹھن اور دشوار ہی نہیں کبھی کبھی نا ممکن حدوں تک جا پہنچتا ہے ..... نیکی اور بدی کی راہیں ہمیشہ سے جدا ہیں اور جدا رہیں گی ..... غلط راہوں کا انتخاب کرنے والوں کے راستوں میں کبھی کوئی سنگ میل یا پڑاؤ نہیں ہوتا ..... آخری پڑاؤ صرف اور صرف موت ہوتی ہے۔ جو اسے زندگی سے دور کر کے ابدی منزل سے ہمکنار کر دیتی ہے ..... منزل کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ایسے ہی مسافروں کا احوال جو سمجھ بوجھ کے باوجود غلط راستوں کا انتخاب کر بیٹھے تھے۔

مثبت اور منفی ..... بے اطمینانی و سکون پرور سوچوں کی حامل ایک سبق آموز تحریر

سعدیہ پریشان تھی، اس کا شوہر دو سال بعد جیل سے چھوٹ کر آیا تھا۔ شادی کے بعد سعدیہ نے سکھ کے دن بہت کم دیکھے تھے۔ شبیر اس کے تایا کا لڑکا تھا اور عمر میں اس سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ وہ خوب صورت بھی تھا اس لیے جب سعدیہ کو پالنے والے تایا نے اس کی شادی شبیر سے کرنے کا فیصلہ کیا تو سعدیہ نے اسے اپنی خوش نصیبی سمجھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شبیر جیسا خوب صورت مرد اس کا شریک سفر بنے گا کیونکہ وہ خود عام سی شکل کی لڑکی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ بدصورت تھی، بس اس میں دوسروں کو متوجہ کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر وہ بہت سادہ رہتی تھی۔ سادہ سے کپڑے پہنتی اور شادی سے پہلے اس نے کبھی میک اپ بھی نہیں کیا تھا۔

سعدیہ کے ماں باپ ایک حادثے میں اس وقت مر گئے تھے جب وہ چھوٹی سی تھی۔ وہ دونوں موٹر سائیکل پر دارالحکومت کے قریب ہی ایک پہاڑی تفریحی مقام سے واپس آ رہے تھے کہ سلپ ہونے سے موٹر سائیکل سمیت پہاڑ سے نیچے گر گئے اور اس حادثے میں دونوں ہی مارے گئے۔ سعدیہ کی قسمت کہ اسے بخار تھا اس لیے ماں باپ اسے تائی کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ تائی اور تایا اسے بہت پیار کرتے تھے۔ جب وہ ماں باپ سے محروم ہوئی تو وہ اس کا اور بھی زیادہ خیال رکھنے لگے۔ شبیر جوان کا اکلوتا بیٹا تھا، وہ اس کا اتنا خیال نہیں رکھتے تھے جتنا سعدیہ کا رکھتے۔ شاید اسی بنا پر شبیر، سعدیہ سے چڑنے لگا اور اسے جب موقع ملتا وہ اس سے لڑتا جھگڑتا اور اسے مارتا تھا۔ سعدیہ پانچ سال بڑی ہونے کے باوجود اس سے مار کھا لیتی تھی۔ اس نے کبھی شبیر کو جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔

پھر دونوں بچپن کی حدود سے نکل آئے اور ان میں ایک قدرتی حجاب آ گیا۔ شبیر ویسے بھی زیادہ تر گھر سے باہر رہنے لگا تھا اور جب تک اس کے باپ کو پتا چلتا، وہ بری صحبت میں بہت آگے نکل گیا تھا۔ انہوں نے پھر بھی اسے روکنے کی پوری کوشش کی۔ اسے پیار سے سمجھایا، ڈرایا دھمکایا، حتیٰ کہ مارا پیٹا بھی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بیس سال کی عمر میں وہ پہلی بار جیل گیا۔ اس پر مار پیٹ اور ایک آدمی کو چاقو سے زخمی کرنے کا الزام تھا اور اسے دو سال کی سزا ہوئی تھی..... پھر جیل میں اس کے رویے کی وجہ سے اس کی سزا میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے ایک قیدی کو مارا پیٹا اور اس کی سزا میں مزید چھ مہینے کا اضافہ ہو گیا۔ وہ ڈھائی سال بعد رہا ہوا۔

شبیر کی ماں اس کی سزا کے صدمے سے مر گئی۔ سعدیہ کے لیے یہ بہت بڑا دکھ تھا کیونکہ جب وہ تین سال کی تھی، تب سے اس کی تائی نے اسے پالا تھا۔ وہ اس سے ماں جیسی محبت کرتی تھی۔ ان دنوں سعدیہ گریجویشن کے آخری سال میں تھی۔ تائی کی بیماری میں دیکھ بھال اور پھر اس کی وفات کے دکھ کی وجہ سے وہ اتنی اچھی تیاری نہیں کر سکی اور اس کے نمبر بھی اچھے نہیں آ سکے۔ اس لیے اس نے تایا کے مشورے سے پرائمری ٹیچر کا کورس کر لیا اور ایک سال بعد اسے سرکاری اسکول میں ملازمت بھی مل گئی۔ جب شبیر جیل سے آیا تو اسے ملازمت کرتے ہوئے دوسرا سال تھا۔

سعدیہ کا خیال تھا کہ شبیر جیل سے کمزور اور برے حال میں آئے گا لیکن جب وہ آیا تو سعدیہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ لمبا چوڑا اور مزید خوب رو ہو گیا تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا اب اس میں سرخی بڑھ گئی تھی۔ اس کے بھورے بال شانوں تک آ گئے تھے۔ ان بالوں کی وجہ سے اس کی وجاہت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ سعدیہ کے تایا بیٹے سے ناراض تھے اور وہ اس سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ شبیر کو بھی باپ کی یا سعدیہ کی پروا نہیں تھی۔ وہ صرف سونے یا کھانے کے لیے گھر آتا تھا۔ سعدیہ سارا دن اسکول اور پھر گھر میں کام کرنے کے بعد رات کو دیر تک اس کا انتظار کرتی۔ جب وہ آ جاتا تو اسے کھانا دے کر سوتی۔ شبیر کو گرم روٹی کھانے کی عادت تھی۔ وہ اسے گرم روٹی بنا کر دیتی۔ کبھی کبھی تو وہ اتنی دیر سے آتا کہ سعدیہ کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگتیں مگر وہ صرف شبیر کے خیال سے نہیں سوتی تھی۔

شبیر اوباش سوچ والا نوجوان تھا۔ سعدیہ نے کئی بار اس کے کمرے میں تصویروں والے رسالے دیکھے تھے جن میں سے بعض تو انتہائی واہیات..... تھے کہ سعدیہ ایک جھلک دیکھ کر پسینے پسینے ہو جاتی۔ سعدیہ جانتی تھی کہ شبیر لڑکیوں کا شوقین ہے۔ اس کے باوجود اس نے کبھی نظر بھر کر سعدیہ کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔

تایا شبیر کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے اور رفتہ رفتہ ان کا دل جواب دینے لگا۔ ڈاکٹر نے ان کو خبردار کر دیا کہ انہوں نے اگر بائی پاس نہیں کرایا تو وہ دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے۔ مگر انہوں نے ڈاکٹر کی وارننگ سعدیہ سے چھپائی اور اس کے مستقبل کا سوچنے لگے۔ پھر انہیں شبیر کا خیال بھی تھا۔ ان دونوں مسائل کا انہیں یہی حل نظر آیا کہ وہ شبیر اور سعدیہ کی شادی کر دیں۔ سعدیہ کی طرف سے تو انہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن شبیر کو راضی کرنے میں ان کو بہت مشکل پیش آئی اور نہ جانے انہوں نے کیا کیا جتن کر کے اسے راضی

کیا۔ اتنا تو سعدیہ کو بھی اندازہ تھا کہ شبیر نے اس سے خوشی سے شادی نہیں کی۔ یہ بات اس نے شادی کی پہلی رات ہی واضح کر دی تھی۔

"یہ شادی میں نے صرف ابا کے دباؤ پر کی ہے، ورنہ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

چند مہینے بعد ہی تایا انتقال کر گئے۔ اب سعدیہ مکمل طور پر شبیر کے رحم و کرم پر تھی۔ شبیر نے باپ کی موجودگی میں بھی سعدیہ کی پروا نہیں کی تھی لیکن تایا کے ہوتے ہوئے سعدیہ کو ایک ڈھارس رہتی تھی۔ ان کے اچانک انتقال سے اسے لگا کہ وہ بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔ شبیر کی حرکتیں اسے محسوس ہونے لگیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ شبیر باہر کیا کرتا ہے اور اس کا ذریعۂ روزگار کیا ہے کیونکہ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ وہ دوپہر کو سو کر اٹھتا اور ناشتا کر کے باہر نکل جاتا۔ اس کے بعد اس کی واپسی رات گئے ہوتی اور کبھی کبھی تو وہ رات بھر گھر نہیں آتا تھا۔ اس نے سعدیہ کو کبھی خرچ کے لیے ایک روپیا نہیں دیا تھا، حالانکہ اس کا پرس نوٹوں سے بھرا رہتا۔ سعدیہ نے اکثر دیکھا تھا کہ اس کے پرس میں ہزاروں کے حساب سے رقم ہوتی۔ نہ ہی شبیر نے اسے کبھی کوئی چیز لا کر دی۔ گھر کے اور ذاتی اخراجات وہ اپنی تنخواہ سے پورے کرتی۔ ہاں، یہ تھا کہ شبیر نے کبھی اس سے رقم نہیں مانگی تھی۔ اپنے اخراجات وہ خود پورے کرتا تھا۔ دوسرے وہ اپنے کسی چکر کو گھر میں نہیں لایا تھا۔ وہ جو کرتا گھر سے باہر ہی کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ سعدیہ اس کے کسی ساتھی سے بھی واقف نہیں تھی۔

شادی کے دو سال بعد پھر شبیر کو جیل ہو گئی۔ اس بار اس پر منشیات فروشی کا الزام تھا اور اسے ایک سال کی سزا ہوئی تھی۔ بے چاری سعدیہ اس کی پیشیوں میں عدالتوں کے چکر کاٹتی رہی اور اس نے اپنا معمولی سا زیور فروخت کر کے وکیل کی فیس ادا کی۔ اس کے باوجود شبیر کو سزا ہو گئی۔ شبیر نے جیل جانے سے پہلے آخری ملاقات میں اسے منع کر دیا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے جیل نہ آئے۔

"میں رہا ہو کر خود آ جاؤں گا۔"

سعدیہ پریشان ہو گئی۔ "لیکن اتنے عرصے تک مجھے تمہارے بارے میں کیسے معلوم ہوگا؟"

"کیا ضرورت ہے معلوم کرنے کی؟" شبیر نے رکھائی سے کہا۔ "اگر زندہ رہا تو گھر ہی آؤں گا۔"

"میں جیل آؤں گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" شبیر نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس کے باوجود تم آئیں تو میں تم سے ملنے سے انکار کر دوں گا۔"

سعدیہ کو مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی۔ اس بار شبیر نے جیل میں اپنا رویہ اچھا رکھا اور اسے نو مہینے بعد ہی رہائی مل گئی۔ سعدیہ نے اچانک اور غیر متوقع طور پر اسے دیکھا تو خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اس کے برعکس شبیر کا رویہ معمول کے مطابق روکھا تھا۔ وہ بہ مشکل چند دن ٹک کر گھر میں بیٹھا اور یہ چند دن بھی اس نے آرام کرتے اور کھاتے پیتے ہوئے گزارے۔ پھر وہ پرانے معمول کے مطابق گھر سے غائب رہنے لگا۔ سعدیہ اس سے بات کرنے کو ترس گئی تھی۔

ان کی شادی کو تین سال ہونے کو آئے تھے اور وہ ابھی تک ماں نہیں بنی تھی۔ شبیر کو اولاد سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ سعدیہ نے اس سے چھپ کر اپنا معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایک دو بار اس نے دبے لفظوں میں شبیر سے اولاد کا ذکر کیا تو اس نے فوراً انکار کر دیا۔

"میں اس چکر میں نہیں پڑ سکتا، میرا جیل آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

شبیر کی آمد کے چند مہینے بعد سعدیہ نے محسوس کیا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ ایک دن اس نے اسکول سے چھٹی لے کر اپنا چیک اپ کرایا تو اس کا اندازہ درست نکلا۔ اس نے یہ بات شبیر سے چھپالی کہ کہیں وہ اسے بچہ ضائع کرنے کو نہ کہے۔ اس لیے جب تک ممکن ہوا، وہ اس بات کو چھپاتی رہی۔ جب ممکن نہیں رہا اور شبیر کو پتا چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ تلملا کر رہ گیا اور اس نے سعدیہ سے بہت جھگڑا کیا۔

ایک روز وہ سعدیہ سے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکلا اور اسی میں کسی سے تکرار ہو گئی۔ لڑائی کے دوران میں شبیر نے حریف کے سر پر چاقو مارا اور وہ زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا۔ شبیر ایک بار پھر گرفتار ہو گیا اور اس بار اسے اس کے سابقہ ریکارڈ کے پیش نظر پانچ سال کی سزا ہوئی۔ سعدیہ تڑپ کر رہ گئی۔ جس وقت اسے سب سے زیادہ شوہر کی ضرورت تھی، وہ اسے چھوڑ کر جیل جا کر بیٹھ گیا تھا۔

سعدیہ اکیلی تھی اور یہ پہلا موقع تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹے گی۔ خوش قسمتی سے اس کی ایک محلے کی خاتون شکیلہ جو اس کی تائی کی بھی اچھی دوست تھیں، اس کی مدد کو آ گئیں اور سارہ کی پیدائش تک ہر مرحلے پر انہوں نے سعدیہ کی ہر طرح مدد کی۔ سارہ اس کی ویران زندگی میں بہار کا تازہ جھونکا بن کر آئی۔ اسے پہلی بار لگا کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ جب تک سارہ چھوٹی تھی، وہ اسے ساتھ اسکول لے جاتی رہی اور جب وہ

اتنی بڑی ہو گئی کہ اسکول میں اسے کسی ایک جگہ بٹھانا ممکن نہیں رہا تو وہ اسے شکیلہ آنٹی کے پاس چھوڑ جاتی۔ اسکول سے واپسی پر وہ اسے لے لیتی۔ پھر چار سال بعد شبیر رہا ہو گیا۔ سعدیہ نے اس کی غیر موجودگی میں اپنی ایک پُرسکون زندگی بنا لی تھی لیکن شبیر کے آنے کے بعد اسے لگا کہ اس کی زندگی کا سکون زیادہ دیر قائم نہیں رہے گا۔

☆☆☆

دارالحکومت سے کوئی چالیس میل کی دوری پر اس چھوٹے سے پہاڑی قصبے کے زیادہ تر لوگ سیاحت اور زراعت سے روزگار حاصل کرتے تھے۔ ہائی وے کے ساتھ ہونے کی وجہ سے یہاں سے گزرنے والے سیاحوں کے لیے کئی ہوٹلز اور ریسٹورانٹ تھے۔ قصبے کی بیشتر آبادی ہائی وے کے ساتھ ہی اونچے نیچے مکانوں میں رہتی تھی لیکن جن کی زمینیں تھیں، انہوں نے اپنی زمینوں پر ہی مکانات بنا رکھے تھے۔ زمینوں پر پھلوں کے باغات تھے اور مجموعی طور پر یہاں کے لوگ خوشحال تھے۔ تقریباً ہر گھر پکا تھا اور یہاں بجلی کی سہولت بھی تھی۔

یوسف کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ عزیز اس کے لیے بہت بڑا باغ چھوڑ کر مرا تھا جو وادی میں نیچے سے اوپر پہاڑی تک جاتا تھا اور اس زمین کی اچھی قیمت تھی کیونکہ اس میں ایک چشمہ بھی تھا۔ جب قصبے کے دوسرے لوگ اپنی زمینوں کی سیرابی کے لیے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے تو چشمے میں پانی موجود ہوتا اور یوسف کا باغ کبھی خشک نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ علاقے کا سب سے اچھا سیب، خوبانی، آڑو، آلو بخارہ اور چیری یوسف کے باغ پیدا ہوتی تھی اور دارالحکومت کے تاجر منہ مانگے داموں اس کی فصل لے جاتے۔ یوسف نے اضافی آمدنی دوسرے لوگوں کی طرح فضولیات میں اڑانے کے بجائے اس سے مزید زمین حاصل کر کے اپنا باغ بہت بڑا کر لیا تھا۔ اب قصبے میں سب سے زیادہ زمین اس کے پاس تھی۔

یوسف کو ملازمت کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس نے بی اے کیا ہوا تھا اور قصبے کے اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی مقامی بچہ تعلیم کے بغیر نہ رہے۔ جو بہت غریب گھرانوں کے بچے تھے، ان کی کتابوں اور یونیفارم کا خرچ بھی یوسف اٹھاتا۔ فلاحی کاموں میں پیسا خرچ کرنے میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہتا اور اس وجہ سے لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔

یوسف اپنے باپ کا ایک ہی بیٹا تھا۔ جب وہ صرف

ہر شمارہ خاص شمارہ

ماہنامہ سرگزشت

جولائی 2010ء کا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

مسیح الملک

اس مسیحا کا تذکرہ جس نے ہند کی سیاست کو زیر و زبر کر دیا تھا

بابائے کیمیا

علم کیمیا کے موجد کی کتھا جس سے اہل یورپ نے علم حاصل کیا

روزِ محشر

صرف ڈیڑھ سال بعد قیامت آ جائے گی، اس خیال نے یورپینز کی نیند حرام کر دی ہے

بھارت کے جرم بھرے ماحول سے ایک قابلِ نفرت کتھا "مجھندر" - تاریخ کے اوراق سے "غائبانہ عشق" - دلچسپ سفرنامہ "منگلی سے ملاکا" - "میرا پاکستان" "کلیات" قلم نگری کی بھولی بسری باتیں "فلمی الف لیلیٰ" اور بھی بہت ساری سچ بیانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں، آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔

آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں

پندرہ برس کا تھا اور میٹرک کا امتحان دینے شہر گیا ہوا تھا، اس کا باپ ایک پراسرار حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ زمین کی گوڈی کرنے والا پنجہ نما اوزار اس کے سینے میں اترا ہوا تھا اور وہ اس سمیت اوندھے منہ پڑا تھا۔ پولیس نے تفتیش کر کے اسے حادثہ قرار دیا۔ پولیس کے مطابق عزیز کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ حادثاتی طور پر اس اوزار پر جا گرا۔ یوسف کی ماں نے اسے نہیں بتایا کہ کہیں اس کا امتحان ادھورا نہ رہ جائے اور جب وہ دو دن بعد گھر واپس آیا تو اسے پتا چلا کہ اس پر کیا سانحہ گزر گیا ہے۔ بہت دنوں تک وہ دکھ کے حصار سے باہر نہیں نکلا۔ اسے اپنے باپ سے بہت محبت تھی۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ یوسف خوب تعلیم حاصل کرے۔ یوسف ذرا سنبھلا تو اس نے فیصلہ کیا کہ باپ کی یہ خواہش ہر صورت پوری کرے گا۔

لیکن اب زمین کی دیکھ بھال اس کی ذمے داری تھی۔ زمین پر کام کرنے کی صورت میں وہ کسی کالج میں داخلہ نہیں لے سکتا تھا اس لیے اس نے پرائیویٹ پڑھنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ زمین پر بھی کام کرتا رہا۔ اس کے باپ نے اسے دس سال کی عمر سے زمین پر لگا لیا تھا۔ وہ اس سے محنت مشقت والے کام تو نہیں لیتا تھا لیکن وہ اسے باغبانی کے اسرار و رموز ضرور سکھاتا رہا۔ اسی وجہ سے پندرہ سالہ یوسف کو اتنا بڑا باغ سنبھالنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اس باغ کے ایک ایک درخت اور ایک ایک پودے سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کون سا کام کس طرح کرنا ہے۔ یوسف کے چچا اشفاق اور ان کے بیٹوں کامران اور عمران نے یوسف کو مدد کی پیش کش کی لیکن یوسف نے شکریے کے ساتھ ان کی پیش کش مسترد کر دی۔ اس نے اپنے چچا سے کہا۔

"چاچا جی! آپ فکر مت کریں، میں سب سنبھال لوں گا۔"

"پتر! تیرے باپ نے یہ باغ بڑی محنت سے بنایا ہے، کہیں تو اسے برباد نہ کر دے۔"

"اللہ نہ کرے جو میرے باپ کی محنت برباد ہو۔" یوسف نے کہا۔ "میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔"

اشفاق جیسے خدشات یوسف کی ماں اور کئی لوگوں کو بھی تھے کہ یوسف ناتجربہ کاری میں باغ برباد نہ کر دے لیکن آنے والے سال یوسف کی محنت کی وجہ سے پھلوں کی بہترین فصل ہوئی تو ان لوگوں کو بہت خوشی ہوئی اور انہیں اطمینان ہو گیا کہ یوسف باغ سنبھال سکتا ہے۔ کام کرنے کے ساتھ ساتھ یوسف پڑھتا بھی رہا... اسے کتابوں سے عشق تھا اور نصابی کتب کے ساتھ بے شمار دوسرے موضوعات پر کتابیں اس کے کمرے میں سجی ہوئی تھیں۔ اس نے بہت اچھے نمبروں سے بی اے پاس کیا اور اس کا ارادہ ایم اے کرنے کا تھا لیکن انہی دنوں مقامی پرائمری اسکول کے دو اساتذہ میں سے ایک وہاں سے چلا گیا اور اسکول چلانے میں دشواری پیش آنے لگی۔ قصبے کے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ کوئی استاد مقرر کر کے اس کی تنخواہ باہمی چندے سے دی جائے تاکہ گاؤں کے بچے کم سے کم اسکول کی ابتدائی تعلیم حاصل کر سکیں۔ ان کو دو استاد مل گئے اور یوسف نے اپنی خدمات رضاکارانہ پیش کر دیں۔ یوسف نے پڑھانا شروع کیا تو اسے اتنی دلچسپی ہو گئی کہ وہ زمین سے بچنے والا سارا وقت ہی اسکول کو دینے لگا۔

یوسف نے سوچا کہ پہلے وہ اپنے گاؤں کے اسکول میں تعلیم دے گا اور مستقبل میں بھی موقع ملا تو وہ ایم اے بھی کر لے گا۔ فی الحال اس کے پاس اسکول اور زمین پر کام کرنے کے بعد اتنا وقت نہیں بچتا تھا کہ وہ خود بھی پڑھ سکتا۔ اس نے ذاتی خرچ سے اسکول کی عمارت کی مرمت کرائی اور اس میں دو کمروں کا اضافہ کیا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی سامنے آئے۔ پھر قصبے والوں نے اپنے علاقے کے ایم پی اے سے ملاقات کی اور اس کی مدد سے اسکول کو مڈل کروا لیا۔ ایم پی اے نے وعدہ کیا کہ جب آٹھویں کلاس کا امتحان ہو گا تو وہ اسکول کو میٹرک تک کرا دے گا۔

جس سال یوسف نے ذاتی کوشش سے مڈل کے امتحان کے لیے اٹھارہ طلبہ کی تیاری کرائی، ان میں گیارہ لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں... اسی سال اس کی ماں نے اس سے شادی کے لیے کہا۔ اس نے ماں کو ٹال دیا۔

"ماں جی، میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ابھی نہیں کرے گا تو کب کرے گا؟ تیرے ساتھ کے نوجوان دو بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔"

یوسف اٹھائیس سال کا ہو رہا تھا اور ان کے علاقے میں شادی کے لیے یہ عمر بڑی سمجھی جاتی تھی۔ لڑکیوں کی شادی سولہ سال کی عمر میں اور لڑکے کی بیس بائیس سال کی عمر میں کر دی جاتی۔ اس لحاظ سے یوسف واقعی بڑی عمر کا ہو گیا تھا۔ ورنہ اس نے شہر میں دیکھا تھا کہ مرد عام طور سے تیس برس کی عمر میں شادی کرتے۔ لیکن یوسف کا مسئلہ عمر نہیں تھی۔

یوسف اپنے چچا کی بیٹی درشہوار سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ درشہوار بہت حسین تھی بلکہ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ قصبے کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔ وہ یوسف سے سات برس چھوٹی تھی اور بہت ناز نخرے والی لڑکی تھی۔ جب وہ پندرہ برس کی تھی، تبھی اس نے خاصا قد کاٹھ نکال لیا

تھا۔ یوسف تب سے اس پر فدا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے اپنی پسند سب سے چھپائی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ ابھی درشہوار کی شادی دور ہے اور اس وقت تک ممکن ہے اس کی ماں کو خیال آ جائے اور وہ اس کے لیے درشہوار کو مانگ لے۔

دو سال بعد جب درشہوار سترہ برس کی ہو گئی تو یوسف کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں چچا اس کا رشتہ نہ کر دیں۔ وہ شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھی اور اب اسے زیادہ دن گھر میں نہیں بٹھایا جا سکتا تھا۔ اس لیے یوسف نے ایک دن ہمت کر کے درشہوار سے دل کی بات کہہ دی۔ اس کا خیال تھا کہ درشہوار شرما جائے گی مگر اس کا ردعمل غیر متوقع تھا۔

"یوسف! تم نے کبھی اپنی صورت پر غور کیا ہے؟" درشہوار نے مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھا۔

یوسف ایک لمحے کو ششدر رہ گیا۔ اسے درشہوار سے اس جملے کی توقع نہیں تھی۔ "کیا... مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم ایک عام سے آدمی ہو اور میرے بارے میں پورا گاؤں کہتا ہے کہ میں اس گاؤں کی سب سے حسین لڑکی ہوں۔" درشہوار کے لہجے میں غرور آ گیا۔ "دوسرے تم مجھ سے عمر میں بھی بڑے ہو۔ تم خود سوچو، کیا تم میرے لائق ہو؟"

یوسف [illegible] گیا۔ اس نے کہا۔ "لیکن درشہوار میں تمہارے چچا کا بیٹا ہوں اور پھر میں [illegible] تمہیں خوش رکھ سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔"

"خوش؟" درشہوار تمسخرانہ انداز میں بولی۔ "میں صرف اس شخص کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں جسے میرا دل قبول کرے گا۔"

اس دوٹوک جواب کے بعد کچھ عرصے تو یوسف کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ درشہوار سے بات کر سکے۔ وہ اس کے انداز سے ڈر گیا تھا۔ ماں باپ نے چاہ میں اس کا نام یوسف ضرور رکھ دیا تھا لیکن درحقیقت وہ عام سی شکل رکھتا تھا۔ عام سے نقوش، سیاہ بال اور متوسط قامت۔ وہ نہ تو بہت لمبا تھا اور نہ چھوٹے قد کا... اس کا جسم دبلا تھا۔ اپنے عام سے نقوش کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خود پسند اور مغرور درشہوار نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ لیکن یوسف نے ہمت نہیں ہاری وہ اس کے بعد بھی درشہوار کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

اب تک وہ درشہوار کو منانے میں ناکام رہا تھا۔ جب ماں نے یوسف سے شادی کے لیے کہا تو وہ اسی وجہ سے چپ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک درشہوار نہیں مانے گی، اس کی طرف سے رشتہ جانا بے کار ہے۔ وہ چچا اشفاق کی ایک ہی بیٹی تھی اور چچی کی بہت لاڈلی تھی۔ اسی وجہ سے وہ بہت مغرور ہو گئی تھی اور اس کی مرضی کے بغیر اس کا رشتہ طے کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے اسے خود منا لے، تب ماں سے بات کرے گا۔ اس نے درشہوار کی خوشامد تک کر لی۔ اسے لالچ دیا کہ وہ اس کی ہر خواہش پوری کرے گا اور اسے کسی کام سے نہیں روکے گا۔

اس کے انکار پر ماں نے غیر متوقع انداز میں کہا۔ "یوسف! تو درشہوار سے شادی کرنا چاہتا ہے نا؟"

یوسف حیران رہ گیا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا ماں؟"

"بس مجھے معلوم ہے تیری خواہش درشہوار ہے اور وہ نہیں مان رہی لیکن میں اسے شادی پر راضی کر سکتی ہوں۔"

یوسف خوش ہو گیا۔ "سچ ماں... وہ کیسے؟"

"بس یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں آنے والے جمعے کو تیرا رشتہ لے کر جاؤں گی اور ان سے ہاں کروا کے ہی آؤں گی۔"

یوسف کو شک تھا کہ اس کی ماں کی بات مان لی جائے گی۔ ویسے بھی اس کا چچا اس کی ماں کو پسند نہیں کرتا تھا اور بھاوج دیور کی ساری عمر نہیں بنی تھی تو وہ اب کیسے اس کی بات مان جاتا؟ مگر یوسف کے لیے ایک اور حیرت منتظر تھی جب چچا کے گھر سے آ کر اس کی ماں نے مسرور لہجے میں بتایا کہ درشہوار کے لیے یوسف کا رشتہ قبول کر لیا گیا ہے۔ دو مہینے بعد یوسف کا خواب پورا ہو گیا اور درشہوار اس کی بیوی بن کر اس کی زندگی میں آ گئی۔ مگر یہاں سے اس کے لیے ایک مشکل سفر شروع ہوا۔ درشہوار نے پہلی رات ہی اسے کہہ دیا کہ یہ شادی اس کی مرضی کے بغیر ہوئی ہے اور وہ اسے اس کی مرضی کرنے سے نہیں روک سکتا۔ درشہوار نے وضاحت نہیں کی کہ اس کی مرضی کیا تھی۔

شادی کے کچھ عرصے بعد یہ ہونے لگا کہ درشہوار کئی کئی دن کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاتی۔ اس کے لیے نہ وہ یوسف یا اپنی ساس سے اجازت لیتی اور نہ انہیں بتاتی۔ وہ اپنی مرضی سے جاتی اور اپنی مرضی سے ہی واپس آتی۔ ان کے آپس کے تعلقات بھی خوش گوار نہیں تھے۔ درشہوار کھلے لفظوں میں یوسف کی صورت کا مذاق اڑاتی۔ وہ اسے پڑھا لکھا پینڈو اور تعلیم یافتہ دیہاتی کہتی جسے کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی نہیں تھا۔ درشہوار کو پینٹ سوٹ پہننے والے مرد اچھے لگتے تھے۔ اسے خوش کرنے کے لیے یوسف نے کئی اچھے سوٹ بھی لے لیے تھے لیکن وہ درشہوار کا دل نہیں جیت سکا۔ وہ اسے کہتی کہ وہ اس کے قابل نہیں اور یہ شادی یوسف کی خوش قسمتی نہیں بلکہ درشہوار کی بدقسمتی ہے۔

www.pkdigest.com

یوسف اس کی باتیں سن کر اندر سے تلملا کر رہ جاتا۔ وہ درشہوار کے سامنے کچھ کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ایک تو وہ بہت بدزبان تھی اور دوسرے اگر اسے ذرا سی بات ناگوار گزرتی تو وہ فوراً اپنی ماں کے گھر کا رخ کرتی اور جب یوسف اسے لینے جاتا تو وہ سب کے سامنے اس کی بے عزتی کرتی۔ یوسف کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اس کے ماں باپ جو اس کے چچا چچی تھے، اپنی بیٹی کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ اگر یوسف شکایت کرتا تو وہ اس کی شکایت کو نظرانداز کردیا کرتے۔ الٹا اس سے شکوہ کرتے کہ وہ ان کی نازوں... میں پلی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کررہا ہے۔

یوسف درشہوار کے ساتھ کسی قسم کا برا سلوک نہیں کرتا تھا۔ وہ گھر کا کوئی کام نہیں کرتی تھی، یوسف نے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے گھر کا کام اس کی ماں کرتی تھی۔ درشہوار کو اس کی طرف سے کھلا خرچ ملتا تھا۔ وہ جہاں چاہتی اور جتنا چاہتی خرچ کرتی۔ اس پر میکے آنے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ یوسف نے اس سے کسی اور معاملے میں زور زبردستی سے کام لیا تھا۔ حد یہ کہ اس نے درشہوار کا یہ مطالبہ بھی مان لیا کہ وہ ابھی ماں نہیں بننا چاہتی۔ یوسف کی خواہش تھی کہ وہ باپ بنے۔ اس کی ماں تو دن گن گن کر گزار رہی تھی کہ کب اسے دادی بننے کی خوش خبری ملتی ہے۔ بے چاری سکینہ بی بی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی بہو اور بھتیجی جان بوجھ کر ماں نہیں بننا چاہتی۔ وہ تو اسے حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس لے جانے کو بھی تیار تھی لیکن درشہوار نے اس سے جھوٹ بول دیا کہ اس نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا ہے اور کوئی مسئلہ نہیں ہے، صرف قدرت کی طرف سے دیر ہے۔

یوسف، درشہوار کی حرکتوں اور بے اعتنائیوں کو درگزر کرتا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی محبت بالآخر درشہوار کا دل جیت لے گی اور ان کی زندگی معمول پر آجائے گی۔ کبھی کبھی کوئی بات اس کی برداشت سے باہر ہوتی بھی تو وہ درشہوار کو کچھ کہنے کے بجائے خود کو کام میں مگن کرلیا کرتا۔

ایک بار درشہوار حسب معمول میکے گئی ہوئی تھی۔ اسے گئے ہوئے چار دن ہوگئے تو ماں نے اس سے کہا۔ "یوسف! جا کر بیوی کو لے کر آ... کیوں اسے ماں باپ کے گھر بیٹھے رہنے کی اتنی چھوٹ دی ہوئی ہے؟ اب اس کا گھر یہ ہے۔"

یوسف نے ماں کی بات خاموشی سے سن لی اور درشہوار کو لینے کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہ شام کے وقت گیا تھا۔ چچا کے گھر پہنچا تو دروازے پر عمران مل گیا۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "آج کیسے یاد آگئی ورنہ تم بس بیوی کو لینے ہی آتے ہو؟"

"اب بھی بیوی کو ہی لینے آیا ہوں۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "اس کا اور کام ہی کیا ہے ماں باپ کے گھر بیٹھے رہنے کے سوا۔"

عمران حیران ہوا۔ "پر درشہوار تو صبح چلی گئی تھی۔"

یوسف بھی ایک لمحے کو گڑبڑا گیا۔ "صبح؟" پھر اس نے جلدی سے کہا۔ "اچھا... اچھا، میں اصل میں صبح سے باہر تھا اس لیے مجھے پتا نہیں چلا۔"

"پہلے گھر میں تو دیکھ لیا کرو۔" عمران پھر بولا۔

یوسف گھر واپس آیا تو اس کے اندر خیالات امنڈ رہے تھے۔ درشہوار صبح سے اپنے گھر سے نکلی تھی تو اب تک کہاں تھی؟ لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوا تو درشہوار کو موجود پایا۔ وہ بپھرے انداز میں اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا۔ درشہوار ویسے اس سے بالکل نہیں ڈرتی تھی لیکن اس وقت اس کے تاثرات نے درشہوار کو سہما دیا۔ یوسف نے پوچھا۔

"تم صبح سے اپنے گھر سے نکلی تھیں، اب تک کہاں تھیں؟"

"میں... یہیں تھی۔" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

یوسف نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ درشہوار پر ہاتھ اٹھائے گا لیکن اس وقت اس کا ہاتھ گھوما۔ درشہوار پلنگ پر جا گری اور اس نے رونا پیٹنا شروع کردیا۔ وہ جس رونے دھونے سے یوسف بے تاب ہوجاتا تھا لیکن اس وقت اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے درشہوار کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر سوال دہرایا۔ جب اسے جواب نہیں ملا تو اس نے پھر اسے مارا۔ اس کے بعد تو وہ اسے مارتا ہی رہا۔ ممکن ہے ان کے تعلقات معمول کے مطابق ہوتے تو وہ اس حد تک نہ جاتا لیکن آج اس کی وہ ساری تلخی نکل رہی تھی جو وہ شادی کے بعد سے برداشت کرتا آرہا تھا۔ درشہوار مار کھاتی اور شور مچاتی رہی لیکن اس نے یوسف کو بتایا نہیں کہ وہ صبح سے کہاں تھی۔ یوسف کی ماں بھی آگئی۔ اس نے یوسف کو روکنے کی کوشش کی مگر اس نے درشہوار کو نہیں چھوڑا۔

"یہ... صبح سے اپنے گھر سے نکلی ہے اور ابھی آئی ہے۔" یوسف نے غصے سے ہانپتے ہوئے کہا۔ "پوچھو اس سے کہ یہ کہاں تھی؟"

"جھوٹ بولتے ہو تم ماں بیٹے۔" درشہوار نے ڈھٹائی کی انتہا کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو صبح سے گھر میں تھی، تم دونوں مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ میں اپنے ماں باپ کے گھر جا رہی ہوں۔"

"تم کہیں جا رہیں، میں تمہیں لے کر جا رہا ہوں اور آج تمہیں بتانا ہوگا کہ تم سارا دن کہاں رہیں۔" یوسف نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"یوسف! کیا سارے گاؤں کو تماشا دکھائے گا؟" ماں نے گھبرا کر کہا۔

"ماں تماشا تو بنے گا۔ آغاز اسی نے کیا ہے۔"

یوسف اسے زبردستی اس کے ماں باپ کے گھر لایا اور اس نے وہاں اس کے کرتوت بیان کیے۔ درشہوار مکر گئی کہ وہ تو صبح سے گھر میں تھی اور یہ کہ یوسف جھوٹ بول رہا ہے۔ اس پر اشفاق اور اس کے بیٹے زور زور سے بولنے لگے۔ یوسف ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ آج یہ سارا دن کہاں رہی ہے لیکن اگر میں نے کبھی اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو اسے اور جس کے ساتھ یہ پکڑی گئی، اسے بھی قتل کردوں گا... اور تم لوگ اپنی بیٹی کو اس وقت تک اپنے پاس رکھو جب تک یہ بتا نہ دے کہ یہ سارا دن کہاں رہی ہے۔"

ان لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ کہاں تو وہ اب تک اسے دباتے آئے تھے اور اپنی بیٹی کی ناجائز حمایت کرتے رہے تھے مگر اب یوسف نے پہلی بار ان کو داماد بن کر دکھایا تھا۔ انہوں نے یوسف کو رام کرنے کی کوشش کی لیکن یوسف کے رویے میں لچک نہیں آئی اور اس نے ان کی بات سننے سے بھی انکار کردیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد شبیر پہلی بار سعدیہ کو کسی جگہ کھانا کھلانے لایا تھا، یہ درمیانے درجے کا ریسٹورانٹ تھا۔ سعدیہ حیران تھی کہ یہ کایا کلپ کیسے ہوئی۔ شبیر بے شک اسے کسی جام سے ہوٹل میں ہی لے آتا، تب بھی وہ اتنا ہی حیران ہوتی۔ شبیر نے کھانا بھی بہترین منگوایا۔ سعدیہ خود کھانے کے ساتھ سارہ کو بھی کھلا رہی تھی۔ شبیر کو سارہ سے خاص انسیت نہیں تھی اور وہ بھی باپ سے کھنچی رہتی، اگر وہ اسے پیار کرنے کی کوشش بھی کرتا تو وہ اس سے دور چلی جاتی۔

شبیر کو جیل سے آئے ہوئے ایک مہینا ہونے کو آیا تھا۔ اس دوران میں اس کی سرگرمیاں پُراسرار رہی تھیں۔ وہ اکثر کئی کئی دن کے لیے گھر سے غائب ہوجاتا۔ اس دوران میں وہ کیا کرتا تھا اس نے کبھی سعدیہ کو نہیں بتایا اور نہ اس نے پوچھا۔ ان برسوں میں جب اسے تنہا رہنا پڑا اور سارہ کی پرورش اکیلے کرنا پڑی تو اس کے اندر شبیر کے حوالے سے ایک قسم کی سردمہری آگئی تھی اور اب وہ اس کے لیے پہلی جیسی جذباتی نہیں رہی تھی۔ شبیر نے یہ محسوس کرلیا تھا اور شاید اسی وجہ سے آج کل اس کے ساتھ ذرا مختلف رویہ اپنائے ہوئے تھا۔

سعدیہ نے کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "شبیر! اب یہ بتا دو کہ آج تم ہم ماں بیٹی پر اتنے مہربان کیوں ہو؟"

شبیر ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ "اصل میں... میں چاہتا ہوں کہ تم یہ معمولی ملازمت چھوڑ دو۔"

سعدیہ نے غور سے اسے دیکھا۔ "ملازمت چھوڑ دوں... اور اس کے بعد میں اور میری بچی فاقے کریں؟"

"نہیں... میں نے دولت کمانے کا ایک منصوبہ بنالیا ہے۔ اگر میں کامیاب رہا تو تمہیں اس گھٹیا ملازمت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن مجھے اس میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"کیسا منصوبہ... اور میں اس میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟"

شبیر کچھ دیر سوچتا رہا۔ "میرا ایک دوست تھا، چند مہینے ہوئے اس کا جیل میں انتقال ہوگیا۔ اس کی ایک بیوہ ہے اور اس کی ساری دولت کی وارث وہی ہے۔"

سعدیہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم اس بیوہ سے دولت حاصل کرنا چاہ رہے ہو؟"

"دولت اس کے پاس بھی نہیں ہے۔ اصل میں اسے اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس کا شوہر اس کے لیے کیا کچھ چھوڑ گیا ہے۔ اسے اس دولت کے حصول کے لیے میری مدد کی ضرورت ہوگی۔"

"تب میں کیا کرسکتی ہوں؟"

"رفعت... میرا مطلب ہے میرے دوست کی بیوہ ایک دارالامان میں ہے اور اسے وہاں سے لانا ہے۔"

سعدیہ سمجھ گئی۔ "اگر تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ ہمارے گھر رہے گی تو یہ ممکن نہیں ہے۔"

"پلیز سعدیہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ صرف چند دن کی بات ہے۔ اس کے بعد ہمارے پاس بہت ساری دولت ہوگی۔ ہم عیش و آرام کی زندگی بسر کریں گے۔"

"مجھے اور میری بچی کو ایسی زندگی نہیں چاہیے۔"

"لیکن مجھے تو چاہیے۔" شبیر کی آواز بلند ہوگئی پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے آواز دھیمی کی کیونکہ لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ "سعدیہ! معاملہ بہت بڑی رقم کا ہے۔"

"کتنی بڑی رقم کا ہے؟"

www.pkdigest.com

"شاید دو کروڑ روپے۔"

سعدیہ دنگ رہ گئی۔ "دو کروڑ روپے... تمہارے دوست کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟"

"جہاں سے بھی آئی ہو... لیکن خاص بات یہ ہے کہ وہ رقم کہیں محفوظ ہے اور اسے صرف رفعت حاصل کر سکتی ہے۔"

سعدیہ کا ذہن کسی بینک لاکر کی طرف گیا جو شبیر کے دوست کے نام تھا اور اس کے مرنے کے بعد صرف اس کی بیوہ جو اس کی وارث تھی، اسے کھول سکتی تھی۔ اسے سوچ میں دیکھ کر شبیر خوش ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنی بڑی دولت نے سعدیہ کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ "سوچو اگر اس میں سے ہمیں آدھی بھی مل جائے..."

"میں لعنت بھیجتی ہوں اس حرام کی دولت پر۔" سعدیہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میں محنت کر کے جو کماتی ہوں، میرے اور میری بچی کے لیے وہی کافی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے... تمہیں تو حلال کی روکھی سوکھی کھانے کا شوق ہے۔" شبیر کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "لیکن مجھے تو دولت کی ضرورت ہے... بہت ساری دولت کی ضرورت ہے۔"

"تو میں کیا کر سکتی ہوں؟" سعدیہ کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔" شبیر آگے جھکتے ہوئے بولا۔ "رفعت دوسرے شہر میں ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گی اور نہ میں اسے اپنے گھر میں آنے دوں گی۔" سعدیہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم گھر چل کر بات کرتے ہیں۔" شبیر نے منہ صاف کرتے ہوئے کہا اور اشارے سے ویٹر کو بل لانے کو کہا۔ سعدیہ کو اندازہ تھا کہ وہ گھر جا کر اس پر دھونس جمانے کی کوشش کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی شبیر اس پر چیخنے چلانے لگا۔ اس نے سعدیہ سے کہا۔

"تم بوڑھی چڑیل... مجھے چمٹ گئی ہو... میری زندگی برباد کر رہی ہو تم۔"

"اگر ایسا ہے تو تم مجھے چھوڑ سکتے ہو۔" سعدیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں ویسے بھی اکیلے رہنے کی عادی ہو چکی ہوں۔"

شبیر اس کی بات سن کر ذرا بوکھلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے چیخنے چلانے سے سعدیہ دباؤ میں آ جائے گی مگر سعدیہ کا ردِعمل مختلف تھا۔ اس نے پینترا بدل کر کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ دیکھو زندگی کے عیش و آرام پر میرا بھی حق ہے۔"

"میں نے کبھی تمہاری سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔" سعدیہ بولی۔ "لیکن تم مجھے اور میری بچی کو معاف رکھو۔"

شبیر اس کے انداز سے جان گیا کہ وہ اس کی بات نہیں مانے گی۔ اس وقت وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دن بعد اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ سعدیہ کا اسکول بھی بند ہو گیا تھا۔ بعض کاموں کی وجہ سے اسے چار دن مزید اسکول جانا پڑا، اس کے بعد اسے بھی چھٹی مل گئی۔ شبیر ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے سعدیہ سے کہا۔

"ہم شمالی علاقے میں چلتے ہیں۔ گرمیاں ہیں، وہاں موسم اچھا ہو گا۔"

سعدیہ کو حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے شبیر نے اسے کبھی کہیں تفریح پر لے جانے کی بات نہیں کی تھی۔ تفریح تو دور کی بات ہے، وہ اسے اپنے شہر میں کہیں لے کر نہیں گیا تھا۔ اور اب وہ اسے پہاڑوں پر تفریح کے لیے لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ سعدیہ کے ذہن میں نہیں آیا کہ شبیر کوئی چالاکی کر رہا ہے۔ جب اس نے زیادہ زور دیا اور سعدیہ سے کہا کہ سارے اخراجات بھی وہ کرے گا۔ وہ اپنی گاڑی میں جائیں گے اور مزے کریں گے، تب سعدیہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ راضی ہو گئی اور شبیر نے اگلے روز روانہ ہونے کا منصوبہ بنا لیا۔

ان دنوں میدانی علاقوں میں شدید گرمی تھی لیکن جب وہ پہاڑوں میں داخل ہوئے تو موسم بہت اچھا تھا۔ سعدیہ کا خیال تھا کہ وہ شہر کے پاس ہی کسی تفریحی مقام تک جائیں گے مگر جب چار گھنٹے ہو گئے تو سعدیہ نے لنچ کے لیے ایک ہوٹل کے باہر شبیر نے پوچھنے پر کہا۔

"ابھی ہمیں پانچ گھنٹے کا سفر اور کرنا ہے اور ہم رات تک ہی پہنچیں گے۔"

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

شبیر نے شمال میں ایک شہر کا نام لیا جو سیاحوں کے لیے بہت پُرکشش تھا لیکن وہ بہت دور تھا۔ سعدیہ نے کسی قدر بے چینی کے ساتھ کہا۔ "اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم پاس ہی کہیں جا سکتے ہیں۔"

"تفریح کے لیے وہ زیادہ اچھی جگہ ہے۔" شبیر نے کہا۔ "ویسے تم چاہو تو ہم زیادہ دن کے لیے بھی رک سکتے ہیں۔"

"ہم زیادہ دن نہیں رک سکتے۔ میں سارہ کے صرف چند جوڑے لائی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں... اگر تمہارا ارادہ بن گیا تو سارہ کے لیے وہاں سے بھی کپڑے لے سکتے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے پاس کہیں سے خاصی رقم آ گئی ہے۔

لنچ کر کے وہ دوبارہ روانہ ہوئے۔ سارہ چھوٹی تھی اور اتنے طویل سفر کی عادی نہیں تھی، وہ تھک کر سو گئی۔ سعدیہ بھی اونگھ رہی تھی۔ اسے رفعت کا خیال آیا تو اس نے شبیر سے پوچھا۔ "کیا تم رفعت سے ملے ہو؟"

شبیر ہچکچایا۔ "ہاں... ملا ہوں۔"

"دیکھنے میں وہ کیسی لگتی ہے؟"

"اچھی ہے، خوب صورت ہے، کم عمر ہے... تم آسانی سے اس کی خالہ بن سکتی ہو۔"

سعدیہ کو اس جملے سے تکلیف تو ہوئی ساتھ ہی تعجب بھی ہوا۔ "میں اس کی خالہ کیوں بننے لگی؟"

شبیر نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔ "بس ایسے ہی خیال آ گیا۔"

وہ رات کے قریب اس پہاڑی شہر تک پہنچے۔ گرمی کی وجہ سے وہاں سیزن عروج پر تھا اور انہیں بڑی مشکل سے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں سنگل روم ملا۔ شبیر نے کہا۔ "کوئی بات نہیں، میں گاڑی میں سو جاؤں گا۔ تم اور سارہ بیڈ شیئر کر سکتی ہو۔"

شبیر رات کے کھانے کے بعد غائب ہو گیا۔ سعدیہ کو اس طرح پتا چلا کہ وہ گاڑی سے سارہ کا ایک کھلونا لینے گئی تو گاڑی پارکنگ میں نہیں تھی۔ اگلی صبح ڈائننگ روم میں ناشتا کرتے ہوئے سعدیہ نے اس سے پوچھا۔

"رات تم کہاں چلے گئے تھے؟"

شبیر چونکا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس کا موڈ آف ہو گیا۔ "تم میری جاسوسی کرتی ہو؟"

سعدیہ نے آہستہ سے کہا۔ "میں رات کو سارہ کا کھلونا لینے آئی تو کار پارکنگ میں نہیں تھی۔"

"او کے... او کے۔" شبیر نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تیار رہنا، ابھی ہم نے چلنا ہے۔"

"کہاں؟"

"چلو گی تو دیکھ لینا۔" وہ چڑچڑے پن سے بولا۔

ناشتا کر کے شبیر نے سامان بھی کار میں رکھ لیا۔ سعدیہ نے پوچھا۔ "کیا ہم کسی اور ہوٹل جا رہے ہیں؟"

"نہیں، ہم ایک اور جگہ جا رہے ہیں۔" شبیر نے مبہم انداز میں کہا۔

چند منٹ بعد اس نے کار ایک عمارت کے سامنے روکی جس پر دارالامان کا بورڈ لگا تھا۔ اس عمارت پر لگا بورڈ دیکھتے ہی سعدیہ سمجھ گئی کہ شبیر اصل میں اسے کیوں لایا ہے۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تو تم اس لیے مجھے یہاں لائے ہو؟"

"ہاں۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "رفعت کو یہاں سے لے جانے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں کوئی..."

"سعدیہ! ایک منٹ۔" شبیر نے اس کی بات کاٹی۔ "کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لو، اگر تم اس وقت میرے کام نہیں آئیں تو آج سے ہمارے راستے جدا ہوں گے۔"

سعدیہ اس کی بات سن کر ساکت رہ گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شبیر اسے چھوڑ بھی سکتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے بیزار ہو گئی تھی اور شبیر بھی کئی بار اس سے الگ ہونے کا کہہ چکا تھا لیکن وہ سب جذباتی باتیں تھیں۔ آج شبیر کا لہجہ بالکل الگ تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اگر سعدیہ نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ اسے ابھی طلاق دے دے گا۔ وہ سہم گئی۔

"تم نے یہ بات کیوں کہی؟"

"تم جانتی ہو۔" اس نے ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھ لیے۔ "سعدیہ! یہ میرے لیے بہت بڑا چانس ہے۔ اگر میں کامیاب ہو گیا تو ہمیشہ کے لیے جرم کی دنیا سے نکل جاؤں گا۔"

"اگر تم کامیاب ہوئے..." سعدیہ نے کہا۔ "میں نے کسی کو جرم کی دنیا میں کامیاب ہوتے نہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا۔" شبیر نے تمسخر اڑانے کے انداز میں کہا۔ "ہمارے حکمرانوں کے بارے میں تم کیا کہتی ہو... وہ کامیاب ہیں یا ناکام؟"

"میں ان کی نہیں، عام آدمیوں کی بات کر رہی ہوں۔" سعدیہ نے کہا۔ "یہ تمہاری بھول..."

"سعدیہ! میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا، مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو۔ میں یہ چانس نہیں چھوڑ سکتا۔" شبیر نے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے اور سارہ کو چھوڑ سکتے ہو؟"

"ہاں، اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں یہ بھی کر گزروں گا۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن ہو گیا۔

سعدیہ سوچتی رہی۔ اسے لگا کہ شبیر جو کہہ رہا ہے، وہ کر گزرے گا اور سرِعام اسے تماشا بنا دے گا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔"

شبیر کھل اٹھا۔ اس نے کہا۔ "تم اپنے اس فیصلے پر پچھتاؤ گی نہیں۔ بہت جلد ہمارے پاس سب ہو گا۔"

'یا جو ہے، وہ بھی نہیں رہے گا۔' سعدیہ نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا جس پر خوش باش سیاح جوڑے جا رہے تھے۔

"آؤ اندر چلیں۔" شبیر کار سے اترتے ہوئے بولا۔

سعدیہ نے سارہ کو گود میں اٹھایا اور شبیر کے ساتھ

www.pkdigest.com

دارالامان کے اندر آ گئی۔ دفتر میں شبیر نے دارالامان کی نگران خاتون سے اپنا تعارف کرایا اور پھر بتایا کہ اس کی بیوی کی بھانجی دارالامان میں داخل ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔ نگران خاتون نے رکھائی سے کہا۔

"آپ پیچھے ہو جائیں اور اپنی مسز کو آگے بھیجیں۔"

شبیر کھسیا کر پیچھے ہو گیا اور اس نے سعدیہ کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ سعدیہ آگے آ گئی۔ نگران خاتون نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"سعدیہ شبیر۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اپنا شناختی کارڈ دکھائیں۔"

سعدیہ نے شناختی کارڈ نکال کر اسے پیش کر دیا۔ اس نے بہ غور دیکھا۔ اگلا سوال اس لڑکی یا عورت کے بارے میں تھا جو سعدیہ کی بھانجی تھی۔ "تم کسے لینے آئی ہو؟"

"اس کا نام رفعت ہے۔"

"رفعت مہناز۔" شبیر نے مداخلت کی۔

نگران خاتون نے شبیر کو گھورا۔ "آپ خاموش رہیں۔ میں آپ کی مسز سے بات کر رہی ہوں۔"

نگران خاتون نے سعدیہ سے کچھ سوالات اور کیے اور یہ جان کر اس کے رویّے میں تبدیلی آئی کہ سعدیہ اسکول ٹیچر ہے۔ اس نے رفعت کو بلایا۔ کچھ دیر بعد ایک نوجوان لڑکی دفتر میں داخل ہوئی۔ اس نے سیاہ رنگ کا سادہ سا سوٹ پہن رکھا تھا، اس کے باوجود اس کی دلکشی نمایاں تھی۔ دراز قد، شہابی، بلوری آنکھیں اور اسی رنگ کے نفاست سے کٹے بال، خوب صورت اور گداز لب... متناسب جسامت... سعدیہ نے اتنی حسین عورت پہلی بار دیکھی تھی۔ عورت... اسے صرف بیوہ ہونے کی وجہ سے کہا جا سکتا تھا ورنہ وہ کہیں سے عورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی جسامت لڑکیوں جیسی تھی اور چہرے پر معصومانہ تاثرات تھے۔ لیکن سعدیہ نے پہلی نظر میں اسے ناپسند کر دیا۔

"یہی تمہاری بھانجی ہے؟" نگران خاتون نے شاید دوسری بار پوچھا تو وہ چونک گئی۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"ہاں، یہی میری بھانجی ہے۔"

سعدیہ نے بتایا تھا کہ رفعت مہناز اس کی چچازاد بہن کی بیٹی ہے جو مر چکی ہے اور اب رفعت کا سوائے اس کے اور کوئی قریبی رشتے دار نہیں ہے اس لیے وہ اسے لینے آئی ہے۔ نگران خاتون نے رفعت سے بھی تصدیق کی اور ضروری کارروائی کے بعد اس نے رفعت کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی سعدیہ، سارہ کو لیے دفتر سے نکل آئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ شبیر خوشی سے کھلا پڑ رہا ہے اور گہری نظروں سے رفعت کو دیکھ رہا ہے۔ سعدیہ اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ آج اس کے شوہر نے جس طرح اسے استعمال کیا تھا، اسے خود سے بھی نفرت ہو رہی تھی۔ وہ ان دونوں سے پہلے کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد شبیر رفعت کو لیے باہر نکلا۔ اس نے ایک چھوٹا سا بیگ اٹھا رکھا تھا جس میں یقیناً رفعت کا سامان تھا۔ اس نے بیگ کار کی ڈگی میں رکھا اور رفعت کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ رفعت کے بیٹھنے کے بعد وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

"یہ میرے گھر نہیں جائے گی۔" سعدیہ نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ تمہارا نہیں میرا گھر ہے۔" شبیر بولا۔ "میرے باپ کا گھر ہے۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" سعدیہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ "جب تم جیل میں تھے تو تایا جان نے تمہیں عاق کر دیا تھا اور یہ گھر انہوں نے اسی وقت میرے نام کر دیا تھا۔"

شبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تبھی تم اتنا اکڑ رہی ہو؟ خیر، گھر چل کر دیکھتے ہیں کہ اس میں کون رہتا ہے۔"

شبیر نے کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ انجن گھر گھرا کر رہ گیا۔ شبیر بار بار سیلف مار رہا تھا۔ پھر وہ غصے سے چلایا۔ "[illegible]"

اسی لمحے انجن اسٹارٹ ہو گیا اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد سعدیہ نے کہا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"واپس۔"

"کیوں، تم تو مجھے اور سارہ کو گھمانے لائے تھے؟" سعدیہ نے چبھتے لہجے میں کہا۔ شبیر نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

"اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔ ویسے بھی مجھے بہت سارے اہم کام ہیں۔ فضولیات کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔"

"یوں کہو کہ تم صرف اس کام کے لیے آئے تھے۔" سعدیہ نے پچھلی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

شبیر مسکرانے لگا۔ "ٹھیک ہے، میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ میں اسی کام کے لیے آیا تھا۔"

سعدیہ نے منہ پھیر لیا۔ اس کا غصے سے برا حال تھا۔ شبیر سیٹی بجاتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ ایک چھوٹے سے قصبے سے گزر رہے تھے۔ یہاں اسے ایک کار ورکشاپ نظر آئی۔ شبیر نے فیصلہ کیا کہ پہلے کار کا معائنہ

کرائے گا، جب وہ آگے روانہ ہوں گے کیونکہ ابھی طویل سفر تھا اور ایسے میں کار کا انجن کسی ایسی جگہ مسئلہ کر گیا جہاں کوئی آبادی نہ ہوئی تو وہ مشکل میں پڑ جاتے۔ موسم بارش والا ہو رہا تھا اور جب تک وہ ورکشاپ پہنچے، بارش کا آغاز ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں دھواں دھار بارش شروع ہو گئی۔ پہاڑی علاقوں میں بارش عام طور سے ایسے ہی ہوتی ہے۔ کچھ دیر پہلے کا خوش گوار موسم اب سرد ہو گیا تھا۔ شبیر ورکشاپ کے مالک سے بات کرنے لگا۔ مسئلہ سن کر اس نے انجن دیکھا اور بولا۔

"کم سے کم دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔"

شبیر نے دل ہی دل میں حساب لگایا اور بولا۔ "ٹھیک ہے لیکن دو گھنٹے سے زیادہ نہ ہوں۔ ابھی ہمیں سات گھنٹے کا سفر اور کرنا ہے۔ میں رات سے پہلے پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔" ورکشاپ کے مالک نے کہا۔

سعدیہ نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور بولی۔ "کتنی دیر لگے گی؟"

"کم سے کم دو گھنٹے۔" شبیر نے بیزاری سے کہا۔ "اس کھٹارا کار سے یہی توقع تھی۔" اس نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔ "اپنے نصیب میں تو ہر چیز کھٹارا ہی آئی ہے۔"

سعدیہ کار سے اتر آئی۔ شیڈ کے نیچے وہ بارش سے محفوظ تھے لیکن اسے اس ماحول سے الجھن ہو رہی تھی۔ پھر سارہ بھی بے آرام ہو رہی تھی۔ اس نے شبیر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں سارہ کے ساتھ اوپر ریستوران میں جا رہی ہوں۔"

ورکشاپ سے ذرا اوپر ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ وہ جانے لگی تو رفعت بھی کار سے اتر آئی۔ "میں بھی چل رہی ہوں۔"

"میں یہاں رک کر کام کروا رہا ہوں۔" شبیر نے کہا۔ وہ رفعت کے جانے کا سن کر خوش نہیں تھا۔ سعدیہ نے سیڑھیاں تیزی سے طے کیں، اس کے باوجود وہ بھیگ گئی۔ اندر آ کر اس نے اپنے کوٹ سے پانی جھاڑا اور سارہ کو ایک خالی میز پر بٹھا دیا۔ رفعت بھی اس کے پیچھے آ گئی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ سعدیہ نے محسوس کیا کہ وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہ رہی ہے۔ سعدیہ اب تک اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ جب اس کی طرف دیکھتی تو اسے اپنے اندر آگ جلتی محسوس ہوتی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے خوش نہیں ہو۔" رفعت نے اچانک کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، ایسی عورت خوش ہو سکتی ہے جس کا شوہر ایک دوسری عورت کے چکر میں ہو؟"

رفعت کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "یہ درست ہے کہ تمہارا شوہر میرے چکر میں ہے۔"

سعدیہ نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "اور تم؟"

رفعت نے گہری سانس لی۔ "سچ کہوں تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"تمہیں اس سے دلچسپی نہیں ہے لیکن تم اس کے ساتھ چلی آئیں؟" سعدیہ کا لہجہ مزید طنزیہ ہو گیا۔

"میں مجبور تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد مجھے دارالامان بھیج دیا گیا کیونکہ میری عمر کم ہے اور مجھے کچھ لوگوں سے بھی خطرہ ہے۔ میں نے پولیس سے تحفظ کی درخواست کی تو اس نے مجھے دارالامان بھیج دیا۔"

"تمہیں کن لوگوں سے خطرہ ہے؟"

رفعت نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔ "ہیں میرے مرحوم شوہر کے کچھ جاننے والے۔"

"شبیر بھی تمہارے شوہر کا دوست ہے۔ تم نے اس پر کیسے اعتماد کر لیا؟"

"شبیر نے مجھ سے کچھ عرصے پہلے رابطہ کیا تھا اور اس نے مجھے سہارے کی پیش کش کی تھی۔"

"اس نے تمہیں شادی کی پیش کش کی تھی؟" سعدیہ چونک گئی۔

"تقریباً ایسی ہی بات ہے۔"

"کیا اس نے تمہیں بتایا نہیں کہ وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ایک بچی بھی ہے؟" سعدیہ نے پوچھا۔

"نہیں، اس نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، یہ تو مجھے ابھی پتا چلا ہے۔"

سعدیہ نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ "تم سچ کہہ رہی ہو؟"

رفعت نے سر ہلایا۔ اس دوران میں ویٹر آ گیا تھا۔ سعدیہ نے اسے چائے اور کھانے کے لیے ہلکی پھلکی...... چیزوں کا آرڈر دیا۔ وہ گھنٹے پہلے وہ ناشتا کر چکے تھے۔ ویٹر کے جانے کے بعد رفعت نے کہا۔ "یہ سچ ہے، مجھے دارالامان میں اس بات کا پتا چلا۔"

"اس کے باوجود تم یہاں چلی آئیں؟"

"میں مجبور تھی۔ اول تو مجھے وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ دوبارہ مجھے نہیں رکھتے۔ دوسرے میں اس جگہ سے نکلنا چاہتی ہوں کیونکہ میرے دشمن یہاں بھی آ چکے ہیں۔"

سعدیہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "تم ایک معمولی سی لڑکی ہو، وہ تمہارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

"میں نہیں جانتی... میں اپنے شوہر کے کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ میرے پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی وجہ سے میں نے پولیس سے مدد طلب کی تھی۔"

سعدیہ سوچنے لگی کہ کیا رفعت کو اس دولت کا علم نہیں ہے جو اس کا شوہر چھوڑ کر گیا ہے یا شبیر نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔ "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں پڑھی لکھی ہوں۔" رفعت نے کہا۔ "میں نے انٹر کیا ہوا ہے، مجھے ملازمت مل سکتی ہے۔"

سعدیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "آج کل ملازمت اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔"

"میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔" رفعت نے اصرار کیا۔ "مجھے محنت والے کام کرنے میں بھی کوئی شرم نہیں ہے۔"

سعدیہ سوچنے لگی کہ یا تو لڑکی سچ مچ معصوم ہے یا اسے بے وقوف بنا رہی ہے۔ وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین اور جوان تھی۔ اپنی باتوں اور رویے سے تعلیم یافتہ اور ذہین نظر آتی تھی۔ ایسی لڑکی کیا کسی معمولی ملازمت سے مطمئن ہو جائے گی؟ اس سوال کا جواب نفی میں تھا۔ سعدیہ نے کہا۔ "تمہاری شادی کیسے ہوئی تھی؟"

"میرے شوہر نے میرے ماں باپ کو پیسے دیے اور انہوں نے میری شادی اس سے کر دی۔ ہمارے ہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔"

"تمہارا تعلق کس گاؤں سے ہے؟"

"ہاں لاہور شہر کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے جہاں سے تم لوگ مجھے لائے ہو۔"

"تم نے اس پر احتجاج نہیں کیا؟"

رفعت تلخ انداز میں ہنسی۔ "ہمارے ہاں عورت کو احتجاج کا حق نہیں ہے۔ ہمیں اپنے باپ بھائی کا ہر فیصلہ قبول کرنا پڑتا ہے۔"

"تم تعلیم یافتہ تو ہو۔"

"میرے باپ نے مجھے صرف اس لیے تعلیم دلائی کہ اسے میری اچھی قیمت مل سکے۔"

"تمہارا شوہر کیا کرتا تھا؟"

"وہ منشیات کا بیوپاری تھا۔ تین سال تک میں اس کے ساتھ رہی اور اس نے کوئی ستم ایسا نہیں ہے جو مجھ پر نہ توڑا ہو۔ وہ اذیت پسند جنونی تھا۔ اگر میں تمہیں اپنے بدن پر اس کی بربریت کے نشان دکھا سکتی تو تمہیں پتا چل جاتا کہ میرا شوہر ایک درندہ تھا۔ پھر وہ گرفتار ہوا اور اسے جیل ہو گئی۔ جیل میں ہی اسے کینسر ہو گیا اور وہ وہیں مر گیا۔ خدا نے اس سے میری جان چھڑا دی۔"

"کیا وہ تمہارے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں گیا؟"

رفعت کراہنے کے انداز میں ہنسی۔ "وہ کروڑ پتی تھا لیکن مجھے ایک روپیا نہیں دیتا تھا۔ اس نے مجھے عملاً گھر میں قید رکھا ہوا تھا اور وہ اس خوف سے مجھے رقم یا کوئی قیمتی چیز نہیں دیتا تھا کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔ میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ اگر میرے پاس رقم ہوتی تو میں یقیناً بھاگ جاتی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے رشتے دار آ کر مکان پر قابض ہو گئے اور مجھے ایک طرف کر دیا۔ شاید انہوں نے ہی مجھے بھگانے کے لیے دشمنوں کا چکر چلایا ہو۔ بہر حال، مجھے اپنے شوہر کے مکان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ میرے لیے صرف قید خانہ تھا۔"

سعدیہ نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ "تمہارے شوہر نے اتنا کمایا... وہ کہاں گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" رفعت نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ اس قسم کی باتیں مجھ سے چھپاتا تھا۔"

ویٹر چائے اور کھانے کا سامان لے آیا تھا۔ وہ کھانے پینے لگے۔ رفعت نے پوچھا۔ "کیا تم اپنے شوہر سے خوش نہیں ہو؟"

"ایسے شوہر سے کون عورت خوش رہ سکتی ہے جو اپنا زیادہ وقت جیل میں گزارتا ہو۔"

"شبیر نے بتایا ہے کہ وہ جیل میں میرے شوہر کا دوست بن گیا تھا۔"

"ظاہر ہے، اس کے دوست بھی مجرم ہی ہوں گے۔"

"تم نے اس سے شادی کیوں کی تھی؟"

"وہ میرے تایا کا بیٹا ہے اور انہوں نے میری شادی کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ شادی کے بعد سدھر جائے گا۔ خود میرا بھی یہی خیال تھا لیکن..." سعدیہ سرد آہ بھر کر چپ ہو گئی۔

"تم مان گئی تھیں؟"

"میں نے کہا نا اس وقت میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"وہ خوب صورت بھی بہت ہے۔" رفعت نے آہستہ سے کہا۔ سعدیہ نے چونک کر اسے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ چائے پی کر سعدیہ واش روم گئی۔ اس نے سارہ کو رفعت کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ واپسی پر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سارہ رفعت سے گھل مل کر بات کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ کسی سے مشکل سے ہی بے تکلف ہوتی تھی۔ ماں کو دیکھ کر وہ اس کے پاس واپس آئی اور اس نے کہا۔

"ماما! آنٹی بہت اچھی ہیں... وہ بہت پیاری ہیں۔"

سعدیہ نے رفعت کی طرف دیکھا۔ "ہاں، آنٹی بہت پیاری ہیں۔ خوب صورت لوگ آسانی سے دوسروں کو اپنا بنا

www.pkdigest.com

لیتے ہیں لیکن خودکشی کے نہیں ہوتے۔"

کچھ دیر بعد شبیر اندر آیا اور اس نے ان سے کہا۔ "دس منٹ بعد نیچے آجانا... کار بن گئی ہے۔"

"میں واش روم سے آتی ہوں۔" رفعت اٹھتے ہوئے بولی۔ وہ چلی گئی تو شبیر نے سعدیہ سے کہا۔

"میں نیچے ہوں۔" وہ ریسٹوران سے جانے لگا لیکن سعدیہ نے دیکھا کہ شبیر باہر جانے کے بجائے اچانک ہی واش روم والے حصے کی طرف گھوم گیا تھا۔ لیڈیز اور جینٹس واش روم ساتھ ساتھ تھے۔ ایک لمحے کو سعدیہ کو خیال آیا کہ وہ بھی جا کر دیکھے لیکن پھر وہ رک گئی۔ شبیر کوئی پانچ منٹ بعد برآمد ہوا اور بہت تیزی سے باہر نکل گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سعدیہ سے یہ بات چھپانا چاہتا ہو۔ سعدیہ کے دل کے بوجھ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک منٹ بعد رفعت بھی آگئی۔ سعدیہ نے اٹھ کر سارہ کو گود میں لیا اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھا لیا۔ وہ نیچے آئیں تو شبیر کار میں بیٹھ کر اس کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی اس نے کار آگے بڑھا دی۔ بارش بدستور جاری تھی۔ سعدیہ نے فکرمندی سے باہر دیکھا۔

"اگر یہ بارش اسی طرح جاری رہی تو ہمیں بہت دیر ہو جائے گی۔"

شبیر نے جواب دیا۔ "دیر سے سہی لیکن گھر پہنچ جائیں گے۔"

سعدیہ کے خیال میں اتنا طویل سفر مسلسل ان کو تھکا دیتا اور انہیں کہیں رکنا چاہیے تھا۔ اس نے کہا۔ "سارہ بچی ہے، اتنا لمبا سفر اسے تھکا دے گا۔"

"کوئی بات نہیں، گھر پہنچ کر آرام کرے گی تو ساری تھکن اتر جائے گی۔"

لیکن بارش کی وجہ سے سڑکیں اتنی پھسلواں ہو گئی تھیں کہ وہ رینگنے کی رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ شبیر جھنجلا رہا تھا اور کبھی کبھی دبی زبان میں گالیاں دینے لگتا۔ ابھی وہ شہر سے دور تھے کہ تاریکی چھا گئی۔ بارش کے تسلسل میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ایسے میں سفر کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ سعدیہ نے کہا۔ "پلیز! کہیں رک جاؤ۔"

"نہیں، ہم کہیں نہیں رکیں گے۔" شبیر نے انکار کر دیا۔

"اچھا، بارش رکنے تک تو کہیں رک جاؤ۔" سعدیہ نے التجا کی۔ "اس موسم میں ڈرائیونگ کرنا بہت خطرناک ہے۔"

شبیر نے اس کی یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ ایک قصبے سے گزرنے لگے۔ اگر شبیر مان جاتا تو وہ یہاں رک جاتے کیونکہ یہاں کئی ہوٹل اور ریسٹوران نظر آ رہے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ بارش بہت ہلکی ہو گئی ہے اور کچھ دیر میں رک جائے گی۔ ویسے بھی شہر اب بہت دور نہیں رہا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی گھنٹے میں گھر پہنچ جاتے۔ سارہ اور رفعت دونوں پچھلی نشست پر سو گئیں۔ وہ قصبے سے نکلے تو اچانک ہی ان کو ایک جگہ بیریئر لگے نظر آئے۔ وہاں پولیس والے کھڑے تھے۔ وہاں کئی کاریں اور گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ شبیر ان کے پیچھے رکا اور کار سے اتر کر آگے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کا موڈ خراب تھا۔

"کیا ہوا؟" سعدیہ نے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے؟" وہ غرایا۔ "تمہارا رونا رنگ لایا ہے۔ آگے لینڈ سلائڈنگ ہوئی ہے اور سڑک بند ہے۔ اسے کھولنے کے لیے کام ہو رہا ہے لیکن کل صبح سے پہلے کھلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

سعدیہ پریشان ہو گئی۔ "اب کیا ہوگا؟"

شبیر سوچنے لگا۔ اس نے کہا۔ "پولیس والوں نے واپس قصبے کی طرف جانے کا مشورہ دیا ہے۔ وہاں کئی ہوٹل ہیں جہاں رات گزاری جا سکتی ہے۔"

"تب چلو... اس سے پہلے کہ وہاں جگہ نہ ملے۔" سعدیہ نے واپس جاتی گاڑیوں کو دیکھ کر کہا۔

سعدیہ کا خدشہ درست نکلا۔ جب وہ قصبے میں پہنچے تو وہاں تمام ہوٹلوں میں ہر ایک کے سامنے گاڑیوں کا ہجوم تھا۔ واپس آنے والا ہر فرد ان ہوٹلوں میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شبیر نے ایک ہوٹل کے سامنے کار روکی اور وہ اندر آئے جہاں استقبالیہ پر گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ لوگ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح انہیں ایک کمرا مل جائے۔ باہر اس سردی میں گاڑی میں رات گزارنا آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے لوگ بہر صورت کمرا چاہتے تھے۔ استقبالیہ کلرک انہیں سمجھا رہا تھا کہ سارے کمرے بک ہو چکے ہیں اور اب ان کے پاس ایک کمرا بھی خالی نہیں ہے۔

"ان کے پاس تو کوئی کمرا نہیں ہے۔" سعدیہ نے پریشان ہو کر کہا۔ رفعت اس کے پیچھے کھڑی تھی۔

"تم یہیں رکو، میں دوسرے ہوٹلوں میں دیکھ کر آتا ہوں۔" شبیر نے کہا اور چلا گیا۔ وہ دونوں ڈائننگ ہال میں آگئیں۔ کچھ دیر بعد شبیر مایوس واپس لوٹ آیا۔ کہیں ایک بھی کمرا نہیں تھا۔ اس نے جگ سے پانی نکال کر پیا۔ "لگتا ہے آج رات کار میں گزارنی پڑے گی۔"

بارش کے بعد سردی شدت کی ہو گئی تھی اور ایسی سردی میں رات کار میں گزارنا ایک مشکل کام تھا جبکہ ان کے ساتھ بچی بھی تھی۔ سعدیہ نے کہا۔ "میں منیجر سے بات کر کے آتی ہوں۔"

وہ منیجر کے پاس پہنچی تو اسے پہلے ہی لوگوں نے گھیرا ہوا تھا اور وہ اس سے کہہ رہے تھے کہ وہ ان کے لیے کوئی بندوبست کرے۔ منیجر نے انہیں تسلی دی۔ "آپ فکر مت کریں، میں کچھ انتظام کرتا ہوں لیکن یہ انتظام سب کے لیے نہیں ہو سکے گا۔"

ہوٹل کے بیرونی دروازے بند کر دیے گئے تھے کیونکہ اندر گنجائش نہیں رہی تھی۔ لوگ ہر جگہ بھرے ہوئے تھے۔ اس پر بھی مزید لوگ آ رہے تھے۔ سعدیہ واپس آئی تو شبیر نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا بھی کم پڑ گیا تھا اس لیے انہیں ان چیزوں پر گزارہ کرنا پڑا جو بچ گئی تھیں۔ ابھی وہ کھانا کھا رہے تھے کہ داخلی دروازے سے ایک پولیس پارٹی اندر آئی اور اس نے ہال میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیا۔ منیجر بھاگا ہوا آیا۔ "کیا ہوا انسپکٹر صاحب! خیریت تو ہے؟"

"یوسف عزیز نے اپنی بیوی کو ایک شخص کے ساتھ قتل کر دیا ہے اور مفرور ہے۔ ہم اس کی تلاش میں ہیں۔" دراز قد اور جوان عمر انسپکٹر نے کہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو ہوٹل کی مکمل تلاشی لینے کا حکم دیا۔

"یوسف عزیز۔" منیجر حیران رہ گیا۔ "میں اسے جانتا ہوں۔ وہ بہت اچھا نوجوان ہے، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"[illegible] سے اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس کی بیوی اور [illegible] شخص کی لاشیں [illegible] گھر سے ملی ہیں اور تب سے یوسف بھی غائب ہے۔"

"آپ کا خیال ہے کہ یوسف نے اشتعال میں ان دونوں کو قتل کر دیا ہے؟" منیجر نے پوچھا۔

سعدیہ بے ساختہ اٹھ کر پولیس انسپکٹر کی طرف بڑھی۔ شبیر نے اسے روکنا چاہا۔ "ارے! تم کہاں جا رہی ہو؟"

مگر سعدیہ اس کی بات ان سنی کر کے انسپکٹر کے پاس آئی۔ "انسپکٹر صاحب! کس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے؟"

"بی بی، ادھر ایک شخص رہتا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک دوسرے شخص کے گھر میں اس سمیت قتل کر دیا ہے اور گھر کو آگ لگا دی۔ اب وہ مفرور ہے۔ ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

"قتل کی وجہ سامنے نہیں آئی؟"

انسپکٹر جواب دیتے ہوئے ہچکچایا۔ "شاید کوئی آشنائی کا معاملہ تھا۔ یوسف نے اپنی بیوی کو اس شخص کے گھر میں پا کر اشتعال میں آ کر قتل کر دیا۔"

"اس نے کیسے قتل کیا؟"

"اس علاقے میں سب کے پاس اسلحہ ہوتا ہے۔ اس نے پستول سے فائر کر کے ان کو قتل کیا ہے۔"

"اگر وہ اب بھی مسلح ہے تو دوسروں کے لیے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

انسپکٹر نے اسے دیکھا۔ "آپ فکر مت کرو بی بی... ہم نے قصبے کی ناکا بندی کر دی ہے اور وہ یہیں کہیں چھپا ہے۔ وہ جلد پکڑا جائے گا اور پھر کسی کو اس سے خطرہ نہیں ہوگا۔"

سعدیہ واپس آئی تو شبیر خفا لگ رہا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تمہیں کیا ضرورت تھی پولیس والے سے بات کرنے کی؟"

"ہم یہاں رکے ہوئے ہیں اور ایک مسلح قاتل بھی یہاں ہے۔ ہمیں اس سے باخبر رہنا چاہیے۔" سعدیہ نے جواب دیا۔

"اس سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔" شبیر نے بے پروائی سے جواب دیا اور کھانے لگا۔ کچھ دیر بعد پولیس ہوٹل کی تلاشی لے کر واپس چلی گئی۔ جانے سے پہلے انسپکٹر نے لوگوں کو خبردار کیا کہ اکیلے اور بلا ضرورت باہر نکلنے سے گریز کریں۔ لوگ بھی قاتل کا سن کر کسی قدر سہم گئے تھے۔ قاتل آزاد تھا اور اپنی جان بچانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

کھانے کے بعد انہوں نے کافی منگوائی۔ شبیر رات یہاں رکنے پر خوش نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد شہر پہنچ جانا چاہتا تھا... بلکہ شہر نہیں، وہ جلد از جلد اس دولت تک پہنچ جانا چاہتا تھا جو رفعت کا شوہر اس کے لیے چھوڑ کر گیا تھا۔ سعدیہ کو تعجب تھا کہ کیا رفعت اتنی آسانی سے اتنی بڑی رقم یا اس کا کچھ حصہ شبیر کو دینے پر آمادہ ہو جائے گی؟ جبکہ شبیر کا اس رقم پر کوئی حق بھی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد ہوٹل کے منیجر نے اعلان کیا کہ اس نے اضافی مسافروں کے لیے ہوٹل کی بڑی راہداریوں میں سونے کا بندوبست کر دیا ہے۔ ایک گیلری خواتین اور بچوں کے لیے اور دوسری مردوں کے لیے مخصوص تھی۔ موسم کے پیش نظر ایک فرد کے لیے دو کمبل تھے۔ جو اس سہولت سے فائدہ اٹھانا چاہتا وہ ادائیگی کر کے کمبل حاصل کر سکتا تھا۔ واضح طور پر ہوٹل والے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کمانے میں لگے تھے۔ لوگوں نے جلدی جلدی کمبل اور جگہ حاصل کر لی کہ کہیں وہ اس سے بھی نہ محروم ہو جائیں۔ شبیر نے ادائیگی کر کے آٹھ کمبل حاصل کر لیے۔ سعدیہ، سارہ کو لے کر عورتوں کے لیے مخصوص راہداری میں آگئی جہاں انہیں دیوار کے ساتھ جگہ ملی۔ سعدیہ نے سارہ اور اپنے لیے فرش پر کمبل بچھایا اور سارہ کو لٹا دیا۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ اس نے ماں سے کہا۔ "ماما! میرا بھالو۔"

سارہ کو اپنا بھالو ساتھ لے کر سونے کی عادت تھی۔ اس

www.pkdigest.com

کا بھالو گاڑی میں رکھا تھا۔ پہلے سعدیہ نے سوچا کہ اسے ٹال دے۔ اتنی سردی میں باہر جانا آسان نہیں تھا اور پھر رات بھی بہت ہو گئی تھی لیکن وہ سارہ کو انکار نہیں کر سکی۔ سعدیہ نے اسے پیار کیا۔ "میں ابھی آئی، تم ڈرنا مت۔"

"میں نہیں ڈروں گی ماما۔"

سعدیہ نے آس پاس دیکھا۔ اسے رفعت نظر نہیں آئی۔ اسے خیال آیا کہ وہ شاید واش روم گئی ہے۔ اس کا کمبل سعدیہ کے ساتھ رکھا تھا۔ سعدیہ کے بیگ میں کار کی ڈپلی کیٹ چابی تھی اس لیے اسے شبیر سے چابی لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ہوٹل کے گلاس ڈور سے باہر نکلی تو اسے دائیں طرف شیڈ تلے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ ڈر کر رک گئی اور جلدی سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گئی۔ پھر اسے شبیر کی آواز آئی۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔"

"وہ تمہاری بیوی ہے۔" رفعت نے کہا۔

"وہ مجھے لگ جانے والی بیماری ہے اور میں جلد اس سے پیچھا چھڑا لوں گا۔"

"تمہاری ایک بچی بھی ہے۔" رفعت نے گویا اسے یاد دلایا۔

"مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔"

"تمہیں کسی چیز سے دلچسپی بھی ہے؟" رفعت کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"ہاں، مجھے تم سے دلچسپی ہے۔"

"کل کو یہ دلچسپی ختم بھی ہو سکتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" شبیر کا لہجہ پُرجوش ہو گیا۔ "تم میں اور سعدیہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ بغیر چاند کی تاریک رات ہے اور تم چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہو۔"

"تم شاعری بھی اچھی کر لیتے ہو۔" رفعت ہنسی۔

"اچھا سنو... ہم شہر جا کر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔"

"سعدیہ..."

"اسے خبر بھی نہیں ہوگی۔" شبیر نے اس کی بات کاٹی۔ "اس کے بعد تم میرے کہنے پر عمل کرو گی تو ہم بہت دولت مند ہو جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟"

"مجھے کچھ ایسی دولت کا علم ہے جو تمہارا شوہر چھوڑ کر گیا ہے اور تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

رفعت چونک گئی۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں، یہ سو فیصد سچ ہے لیکن وہ دولت صرف تم حاصل کر سکتی ہو کیونکہ تم اپنے شوہر کی قانونی وارث ہو۔"

رفعت نے کچھ دیر بعد کہا۔ "تو یہ بات ہے۔"

اس سے پہلے کہ شبیر کچھ کہتا، کوئی اس طرف آنے لگا۔ اس نے رفعت سے کہا۔ "باقی بات پھر کریں گے۔"

شبیر اور رفعت ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ ستون سی لگی سعدیہ کو یوں لگا جیسے اس کی دنیا ویران ہو گئی ہو۔ اس سے پہلے شبیر نے کبھی اس سے محبت نہیں جتائی تھی اور وہ جانتی تھی کہ شبیر اس سے محبت نہیں کرتا لیکن وہ اس سے اتنی نفرت کرتا ہے، یہ بات اس نے سوچی بھی نہیں تھی۔ شبیر کے الفاظ نے اس کی ایک موہوم سی آس بھی توڑ دی تھی اور وہ اندر سے لہولہان ہو گئی تھی۔ وہ پارکنگ کی طرف جانے لگی تو اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا شاید بارش سے منظر دھندلا گیا تھا۔ لیکن جب اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو اسے پتا چلا کہ یہ بارش اس کی آنکھوں سے جاری تھی۔ وہ بارش کی پروا کیے بغیر کار تک آئی اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اس نے اسٹیرنگ پر سر ٹکا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں تھمنے لگیں اور وہ پُرسکون ہونے لگی۔

اچانک کسی نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور اندر گھس آیا۔ سعدیہ نے چونک کر دیکھا اور پھر ساکت رہ گئی۔ یہ ایک طویل قامت دبلا اور ستے ہوئے چہرے والا شخص تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ لیکن سعدیہ کے ساکت رہنے کی وجہ اس کے ہاتھ میں موجود پستول تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "شور مت کرنا۔"

"تت... تم کون ہو؟"

"میں کوئی بھی ہوں۔ تم خاموش رہنا اب کار اسٹارٹ کرو اور یہاں سے چلو۔"

سعدیہ نے اپنے ابتدائی خوف پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم ڈاکو ہو؟ لیکن تم نے غلط انتخاب کیا ہے۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"میں ڈاکو نہیں ہوں۔" اس نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا جیسے اس الزام سے اسے تکلیف ہوئی ہو۔

"تب تم کون ہو؟" سعدیہ کسی اور خیال سے لرز گئی۔ وہ عورت تھی اور اکیلی تھی۔ خوب صورت نہ سہی جوان اور باعصمت تو تھی۔

آدمی ہچکچایا پھر اس نے اپنا تعارف کرایا۔ "میرا نام یوسف عزیز ہے۔"

"جس نے اپنی بیوی کو کسی شخص کے ساتھ دیکھ کر قتل کر دیا؟" سعدیہ نے بے ساختہ کہا۔

وہ چونکا۔ "تم کیسے جانتی ہو؟"

"پولیس ہوٹل میں آئی تھی۔ میں اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ یہاں رکی ہوں۔" سعدیہ نے وضاحت کی۔

"تم شادی شدہ ہو؟" یوسف نے کہا۔ "خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... یہاں سے نکلو۔"

"میں کار اسٹارٹ نہیں کر سکتی۔"

"جھوٹ مت بولو۔" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "اگر تمہارے پاس چابی نہیں ہے تو تم اندر کیسے آئیں؟"

"میرے پاس صرف دروازے کی چابی ہے۔ کار کی چابی الگ ہے اور وہ میرے شوہر کے پاس ہے۔ تمہیں یقین نہیں آ رہا تو خود دیکھ لو۔" اس نے چابیاں یوسف کی طرف بڑھا دیں لیکن اس نے چابی نہیں لی۔ شاید اسے یقین ہو گیا تھا کہ سعدیہ سچ کہہ رہی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں لیکن جب تک یہاں سے دور نہ نکل جاؤں، تم کار سے باہر مت آنا۔"

وہ کار سے اترنے لگا کہ سعدیہ کو دو پولیس والے پارکنگ میں داخل ہوتے نظر آئے۔ اس نے یوسف کو روک دیا۔ "رک جاؤ... پولیس والے ادھر آ رہے ہیں۔"

یوسف گھبرا گیا۔ "پولیس... میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا۔"

"اگر تم گرفتار نہیں ہونا چاہتے تو باہر مت جاؤ۔ کار کی پچھلی سیٹ پر چلے جاؤ۔" اس نے کہا تو یوسف تذبذب میں پڑ گیا۔ کار سے باہر جاتے ہی وہ لازمی طور پر پولیس والوں کی نظر میں آ جاتا لیکن کار میں رہتا، تب بھی پکڑا جاتا۔ سعدیہ نے زور دے کر کہا۔ "میری بات مانو، میں تمہیں بچا لوں گی۔ پچھلی نشست پر چلے جاؤ۔"

اس بار یوسف نے اس کی بات مان لی۔ وہ پھرتی سے عقبی نشست پر چلا گیا اور سعدیہ نے ایک بڑی سی چادر اس پر پھیلا دی پھر سارہ کے کھلونے اور گڑیاں اس پر یوں بکھیر دیں کہ لگنے لگا کہ چادر تلے سامان رکھا ہوا ہے۔ اتنے میں پولیس والے پاس آ گئے تھے۔ سعدیہ نے سارہ کا بھالو لیا اور نیچے اتر آئی۔ اس نے دیکھا کہ آنے والوں میں وہ انسپکٹر بھی تھا جو ہوٹل میں آیا تھا۔ اسے کار سے اترتے دیکھ کر وہ اس کے پاس آ گئے۔ انسپکٹر نے اسے پہچان لیا۔ اس نے پوچھا۔

"خاتون! آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"ہم اس ہوٹل میں رکے ہیں۔ میری بچی رات کو اس کھلونے کو لے کر سوتی ہے۔ یہ کار میں تھا، یہی لینے آئی تھی۔" سعدیہ نے وضاحت کی۔

انسپکٹر پہلی بار مسکرایا۔ "میری بھی تین سال کی بیٹی ہے اور وہ اپنی گڑیا کے بغیر نہیں سوتی۔"

سعدیہ زبردستی مسکرائی کیونکہ انسپکٹر کا ساتھی ٹارچ سے اس کی کار کا معائنہ کر رہا تھا۔ "یہ تو اچھی بات ہے۔"

"اس کے پاس بھی بہت سارے کھلونے ہیں اور جب ہم کہیں جاتے ہیں تو یہ کھلونے بھی ہمارے ساتھ ہی سفر کرتے ہیں اسی طرح۔" اس نے کار کی عقبی نشست پر بکھرے کھلونوں کی طرف اشارہ کیا۔ بارش رک گئی تھی لیکن ساتھ ہی بہت تیز ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ انسپکٹر نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ آپ اندر جائیں، یہاں سردی بہت ہو گئی ہے۔"

سعدیہ ہوٹل کی طرف آنے لگی۔ اس نے جان بوجھ کر کار کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی پیچھے سے ہنگامے کی آواز آئے گی۔ پولیس یوسف کو گرفتار کرلے گی یا اسے گولی مار دے گی لیکن جب اس نے ہوٹل کے دروازے پر پہنچ کر دیکھا تو پولیس والے اب دوسری کاروں کا معائنہ کر رہے تھے۔ اسے حیرت تھی کہ مقامی پولیس ایک قاتل کی گرفتاری کے لیے اتنی مستعدی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ عام طور سے کوئی مجرم خود پولیس کے ہاتھ آ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ اسے گرفتار کرنے کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرتی لیکن اس قصبے کی پولیس اس موسم میں بھی قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے مستعد تھی۔ سعدیہ کو حیرت تھی کہ یوسف عزیز ابھی تک کس طرح بچا ہوا تھا؟

وہ اندر آئی تو سارہ سو چکی تھی۔ اس نے بھالو اس کی بغل میں رکھا اور اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ رفعت دوسری طرف کروٹ لیے لیٹی تھی۔ نہ جانے وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ سعدیہ بھی اپنی جگہ لیٹ گئی۔ وہ سونا چاہتی تھی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کے بجائے اسے رہ رہ کر یوسف کا خیال آ رہا تھا کہ وہ ان کی کار سے نکل کر جا چکا ہے یا ابھی تک کار میں ہے۔ وہ جا کر دیکھنا چاہتی تھی لیکن اتنی رات گئے اسے باہر جاتے ہوئے عجیب سا لگ رہا تھا کہ کوئی دیکھ لے گا تو نہ جانے کیا سوچے گا۔

وہ ہچکچا رہی تھی لیکن پھر اس کا تجسس اس کے خوف پر حاوی آ گیا۔ وہ آہستہ سے اٹھی۔ بیشتر خواتین اور بچے نیند میں تھے اور جو جاگ رہے تھے، ان میں سے بھی کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ وہ سمجھے کہ سعدیہ واش روم جا رہی ہے۔ باہر اب چوکیدار بھی نہیں تھا اس لیے وہ آرام سے باہر آ گئی۔ کار کی طرف جاتے ہوئے اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

www.pkdigest.com

اس نے اندر جھانکا تو اسے چادر ویسے ہی دکھائی دی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو یوسف نے سر چادر سے باہر نکالا۔
''تم کہاں تھیں؟ میں اب جانے کا سوچ رہا تھا۔''
''میں اندر چلی گئی تھی۔ پولیس جا چکی ہے لیکن تم کہاں جاؤ گے؟ پولیس نے قصبے سے باہر جانے والے راستوں کی ناکا بندی کر دی ہے۔''
''میں پیدل جاؤں گا۔''
''تم پیدل نہیں جا سکتے... پولیس تمہیں پکڑ لے گی۔''
''میں زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔'' اس نے... پُرعزم لہجے میں کہا۔
''اس کے لیے ضروری ہے کہ تم پہلے پولیس سے بچو۔''
یوسف نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم مجھے یہاں سے نکال سکتی ہو؟''
سعدیہ پریشان ہو گئی۔ پولیس نے چاروں طرف سے ناکا بندی کی ہوئی تھی۔ وہ کس طرح پولیس کی نظر سے بچا کر اسے یہاں سے نکال سکتی تھی؟ یوسف اس کی پریشانی سمجھ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شاید تم میری مدد نہیں کر سکتیں۔''
''نہیں، اس طرح تم یقیناً پولیس کے ہاتھ لگ جاؤ گے۔'' سعدیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آ رہا تھا۔ ''ایک طریقہ ہے۔''
''وہ کیا؟''
''اگر تم کار کی ڈکی میں چھپ جاؤ تو یہاں سے نکل سکتے ہو۔'' سعدیہ نے کہا اور کار سے اتر کر ڈکی کی طرف آ گئی۔ اس پرانی کار کی ڈکی خاصی بڑی تھی اور سامان رکھنے کے بعد بھی اس میں اتنی گنجائش تھی کہ ایک آدمی آرام سے اس میں لیٹ سکتا تھا۔ یوسف ذرا طویل قامت تھا اس لیے اسے کچھ دشواری پیش آتی لیکن وہ اس میں لیٹ سکتا تھا۔ رات گہری ہونے پر ہوٹل انتظامیہ نے پارکنگ کی بیشتر روشنیاں بجھا دی تھیں اس لیے اب وہاں تقریباً تاریکی تھی۔ یوسف نے ڈکی میں لیٹ کر دیکھا مگر وہ اتنی جلدی بھی نہیں لیٹ سکتا تھا۔ ابھی صبح ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ اس نے سعدیہ سے کہا۔
''میں صبح کے قریب اس میں لیٹ جاؤں گا، تم ڈکی کھلی چھوڑ دو۔''
''تب تک تم کار میں رہو گے؟''
''ہاں۔'' یوسف نے سر ہلایا پھر ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟''
سعدیہ اس کا سوال سمجھ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیونکہ میرے خیال میں تم خود مظلوم ہو... تمہاری بیوی تم سے بے وفائی کر رہی تھی؟''
یوسف نے سر ہلایا۔ ''ہاں، یہ بات میں کچھ عرصے پہلے جان گیا تھا اور میں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ لیکن پھر وہ رو رو کر واپس آ گئی۔ میں اس کی محبت سے مجبور ہو گیا اور میں نے اسے گھر میں رکھ لیا... لیکن اس نے اس شخص سے ملنا نہیں چھوڑا۔''
''کیا اس کے گھر والے یہ بات جانتے تھے؟''
''میں نے انہیں خود بتایا تھا۔'' یوسف کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''لیکن انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔''
''تب تم نے ان دونوں کو قتل کر دیا؟''
یوسف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''میں نے... نہیں، خدا کی قسم میں نے یہ کام نہیں کیا... آج ہماری شادی کی سالگرہ تھی۔ میں خاص طور سے شہر جا کر اس کے لیے کیک اور تحفہ لے کر آیا تھا لیکن جب میں گھر آیا تو وہ گھر میں نہیں تھی۔ پھر کسی نے میرے موبائل پر فون کر کے بتایا کہ درشہوار گوہر کے گھر میں ہے۔ میں غصے میں ان کے گھر گیا لیکن میرا ان کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں تو کوئی اسلحہ بھی لے کر نہیں گیا تھا۔''
''تب تمہارے پاس یہ پستول کہاں سے آیا؟'' سعدیہ نے ... پوچھا۔
''یہ... مجھے درشہوار اور گوہر کی لاشوں کے پاس ملا تھا۔''
''وہ تمہارے وہاں جانے سے پہلے قتل کیے جا چکے تھے؟'' سعدیہ حیرت سے بولی۔ ''انسپکٹر نے بتایا ہے کہ تم نے انہیں قتل کرنے کے بعد گھر کو آگ لگا دی تھی۔''
''یہ بھی غلط ہے۔ جب میں وہاں سے نکلا تو کہیں آگ نہیں لگی تھی۔'' یوسف عزیز نے تردید کی۔
''تب تم پر کیوں الزام لگ رہا ہے؟''
''میں نہیں جانتا... پولیس کو میرے بارے میں کس نے بتایا۔ مجھے اپنے چچازاد بھائی عمران کا فون آیا تھا اور اس نے بتایا کہ پولیس مجھے درشہوار اور گوہر کے قتل کا مجرم قرار دے کر تلاش کر رہی ہے۔''
''تب سے تم پولیس سے چھپ رہے ہو... تم پولیس کو حقیقت کیوں نہیں بتا دیتے؟''
''تم ہماری پولیس کو جانتی نہیں ہو۔'' یوسف نے مایوسی سے کہا۔ ''وہ میری بات کہاں سنے گی... اور مجھے مجرم قرار دے کر جیل میں ڈال دے گی۔''
سعدیہ نے سوچا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہماری پولیس کسی معاملے میں تفتیش کی زحمت کم ہی کرتی ہے اور جو سامنے

آئے اسے ہی مجرم بنا دیتی ہے۔ پھر اسے انسپکٹر کا خیال آیا۔
''میں مقامی انسپکٹر سے ملی ہوں، وہ اچھا آدمی ہے۔''
''تم شاید انسپکٹر شہباز کی بات کر رہی ہو۔ وہ واقعی اچھا آدمی ہے لیکن اگر اس نے بھی مجھے مجرم سمجھ لیا ہے تو وہ میری بات کا یقین نہیں کرے گا اور میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔''
''تب اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ تم اس جگہ سے بلکہ اس ملک سے نکل جاؤ۔''
''فی الحال تو میں یہاں سے نکل جاؤں یہی بڑی بات ہے اور میرے پاس رقم بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں آگے میرا گزارہ کیسے ہو گا؟'' یوسف کے انداز میں مایوسی تھی۔ ''خیر چھوڑو تم اب اندر جاؤ۔ کہیں تمہارا شوہر تمہیں غائب دیکھ لے تو...''
''اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' سعدیہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''شبیر کو میری کوئی پروا نہیں ہے۔ ان دنوں وہ ایک نوجوان اور حسین بیوہ کے چکر میں ہے جس کا شوہر اس کے لیے بڑی دولت چھوڑ کر مرا ہے۔''
یوسف نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ ''تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہو؟''
''خوش؟'' سعدیہ پھٹ پڑی۔ ''میں نہیں جانتی خوشی کس چیز کا نام ہے۔''
سعدیہ نے اپنے دل کا بوجھ اس کے سامنے ہلکا کر دیا۔ اس نے ... سب بتا دیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ شاید وہ اپنے اندر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہی تھی۔ یوسف خاموشی سے سنتا رہا۔ آخر میں سعدیہ ڈیش بورڈ سے سر ٹکا کر رونے لگی۔ یوسف نے آہستہ سے کہا۔
''تمہاری اور میری کہانی ایک جیسی ہے۔''
''ہاں لیکن اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ شبیر سے میری جان چھوٹ جائے۔'' سعدیہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''تم مرد اپنی مرضی کے مختار ہوتے ہو۔ ممکن ہے کسی اور نے ان دونوں کو نہ مارا ہوتا تو تم مار دیتے۔''
''الزام تو اب بھی مجھ پر آ رہا ہے۔'' یوسف نے سرد آہ بھری۔
سعدیہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے تمہاری بیوی اور اس شخص کو کس نے مارا ہو گا؟''
''مجھے بالکل نہیں معلوم۔'' یوسف نے نفی میں سر ہلایا۔
''ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے تمہیں پھنسانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔ کسی کو تمہیں پھنسانے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟''
اس بار بھی یوسف کا جواب نفی میں تھا۔ ''میں نہیں جانتا۔''
سعدیہ جب ہوٹل سے باہر آئی تو شبیر اور رفعت کی باتیں سن کر اس کا ذہن شاک کی کیفیت میں چلا گیا اور اسی کیفیت میں اس نے دو افراد کے قتل میں ملوث ایک شخص کو پولیس سے بچایا اور اب بھی اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذہن شاک سے نکل رہا تھا اور اسے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ یوسف پولیس کو مطلوب شخص تھا اور وہ اس کی مدد کر رہی تھی۔ اگر پولیس یوسف کے ساتھ اسے پکڑ لیتی تو وہ بھی اعانت جرم میں جیل جاتی۔ اس کا سارا کیریئر تباہ ہو جاتا۔ اس نے پہلی بار خوف زدہ نظروں سے یوسف کی طرف دیکھا ورنہ اسے اتنا خوف اس وقت بھی محسوس نہیں ہوا تھا جب اس نے پہلی بار یوسف کو پستول بدست دیکھا تھا۔ اس نے کہا۔
''اب تم یہاں چھپ جاؤ اور صبح کسی وقت ڈکی میں چلے جانا۔ ہم صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ میں راستے میں کسی بہانے سے گاڑی رکواؤں گی تو تم ڈکی سے نکل جانا۔''
یوسف نے سر ہلایا اور عقبی نشست پر لیٹ کر پھر سے چادر اوڑھ لی۔ سعدیہ اندر ہوٹل میں آ گئی۔ وہ اپنی جگہ آ کر لیٹ گئی۔ رفعت بدستور دوسری طرف کروٹ لیے لیٹی تھی۔ سعدیہ کا خیال تھا کہ اسے فوراً نیند آ جائے گی لیکن وہ جاگتی رہی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے اب یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اگر یوسف ان کی گاڑی سے پکڑا گیا تو اس کا الزام ان پر بھی آئے گا۔ ممکن ہے پولیس یوسف سے تفتیش کرے اور وہ ان کے بارے میں بتا دے کہ اس نے کس طرح یوسف کی مدد کی ہے۔ ابھی تک سعدیہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ خود پولیس کو یوسف کے بارے میں بتا دے لیکن جب یہ خیال آیا تو اس نے فوری طور پر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔
نہیں، یوسف کا پولیس کے ہاتھ آنا اب اس کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے اور اس کے لیے بہتر یہی ہوتا کہ وہ یوسف کو اس جگہ سے نکال دے۔ اس کے بعد اگر یوسف پولیس کے ہاتھ آ بھی جاتا، تب بھی پولیس ان کا سراغ نہیں لگا سکتی تھی کیونکہ پولیس کے پاس نہ تو ان کے نام تھے اور نہ ہی پتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی اور اپنے گھر کی سلامتی کی دعا مانگی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے بہت دیر بعد نیند آئی اور پھر ایک دہشت ناک خواب دیکھ کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ پولیس نے کار سے یوسف کو گرفتار کر لیا ہے اور اس کے انکشاف پر اسے اور شبیر کو بھی گرفتار کیا جا رہا ہے۔ وہ جاگی تو بہت دیر تک اس کے دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آئی۔
سارہ کے پکارنے پر وہ چونکی۔ سارہ کو واش روم جانا تھا۔ سب اٹھ رہے تھے اور واش روم کے آگے ایک لمبی قطار

www.pkdigest.com

تھی۔ سعدیہ کسی نہ کسی طرح سارہ کو واش روم لے گئی اور جب وہ باہر آئی تو شبیر اور رفعت ڈائننگ روم میں بیٹھے ناشتے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ آپس میں سر جوڑے بات کر رہے تھے لیکن سعدیہ کو دیکھ کر سنبھل گئے۔

"کوئی خاص بات ہو رہی تھی؟" سعدیہ نے غیر محسوس انداز میں طنز کیا۔

"نہیں۔" شبیر سنبھل کر بولا۔ "ہم سفر کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اب تک راستہ کھل گیا ہوگا۔"

"شاید۔" سعدیہ نے کہا۔ ویٹر ناشتا لایا اور سعدیہ، سارہ کو ناشتا کرانے میں لگ گئی۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور اس کا کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے صرف چائے لی۔ رفعت اور شبیر بے فکری سے کھا رہے تھے اور انہوں نے پوچھا بھی نہیں کہ وہ کیوں نہیں کھا رہی۔ ان کے رویے کے خلاف سعدیہ کے دل میں نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ناشتے کے بعد انہوں نے روانگی کی تیاری کی۔ سامان ان کا گاڑی میں تھا۔ وہ باہر نکلے تو دوسری گاڑیاں بھی روانہ ہو رہی تھیں اور کوئی واپس نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ راستہ کھل گیا ہے۔ وہ بھی روانہ ہوئے۔ سعدیہ نے اطمینان کا سانس لیا جب شبیر نے کسی کام کے لیے ڈکی کھول کر نہیں دیکھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یوسف ڈکی میں ہے یا نہیں؟

کچھ دیر بعد وہ پولیس ناکے کے پاس تھے۔ پولیس والے جانے والی گاڑیوں کو چیک کر رہے تھے۔ انسپکٹر شہباز وہاں موجود تھا اور وہ سعدیہ کو دیکھ کر پہچان گیا۔ سعدیہ نے پوچھا۔ "کیا قاتل ابھی تک گرفتار نہیں ہوا ہے؟"

"نہیں لیکن ہم اسے پکڑ لیں گے۔" انسپکٹر شہباز نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "قانون سے بچ کر کوئی نہیں بھاگ سکتا۔"

سعدیہ ڈر رہی تھی کہ ڈکی کی بھی تلاشی لی جائے گی لیکن پولیس نے سرسری انداز میں دیکھ کر ان کو جانے کی اجازت دے دی۔ شبیر خوش تھا کیونکہ اب وہ شہر سے کچھ دور تھے۔ اس شہر سے جس کے ایک بینک کے لاکر میں دو کروڑ روپے کی خطیر رقم تھی اور اس لاکر کی چابی رفعت کی شکل میں اس کے قبضے میں تھی۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتا؟ سعدیہ اس کی خوشی دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ اسے اپنی ازدواجی زندگی کا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ شبیر کو جب دو کروڑ روپے اور رفعت جیسی حسین لڑکی مل جاتی تو وہ اس کے پاس ایک لمحہ بھی رکنا پسند نہیں کرتا۔

"کیا یہ ہمارے ساتھ جائے گی؟" سعدیہ نے اچانک پوچھا۔ شبیر نے اسے حیرت سے دیکھا جیسے یہ بات طے ہو چکی ہو۔ اس نے شانے ہلا کر کہا۔ "ظاہر ہے۔"

"لیکن یہ طے نہیں ہوا تھا؟" سعدیہ نے احتجاج کیا۔

"تو اب طے سمجھ لو۔" شبیر سرد لہجے میں بولا۔

"تم زیادتی کر رہے ہو۔" سعدیہ بولی۔ "میں اسے اپنے گھر نہیں لے جاؤں گی۔"

شبیر نے یک دم بریک لگائے۔ "میں اسے تمہارے گھر لے کر نہیں جا رہا۔ میرا اب تم سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

سعدیہ کا دل رک سا گیا۔ "کیا تم مجھ سے الگ ہو رہے ہو؟"

"ہاں، میں تم سے الگ ہو رہا ہوں۔ ابھی اسی وقت... سعدیہ! میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

"شبیر!" سعدیہ چلائی لیکن شبیر نے اس کے چلانے پر توجہ دیے بغیر دو دفعہ اور طلاق کے لفظ ادا کر دیے۔

وہ بولا۔ "اب میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم اپنے گھر میں جا کر خوش رہو۔"

سعدیہ بلند آواز سے رونے لگی۔ اس کو روتے دیکھ کر سارہ نے بھی رونا شروع کر دیا جبکہ عقبی نشست پر بیٹھی رفعت مسکرا رہی تھی۔ شبیر کار سے اترا اور اس نے سعدیہ کو بھی گھسیٹ کر اتار دیا۔ سعدیہ چلائی۔ "ہمیں یہاں کیوں اتار رہے ہو؟"

"تو کیا تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ کر آؤں؟" اس نے طنز کیا اور سارہ کو کار سے نکال کر اس کی گود میں ڈال دیا۔ "یہاں سے خود جاؤ۔"

شبیر کہتا ہوا ڈکی کی طرف آیا اور اسے کھولا لیکن ساکت رہ گیا۔ سعدیہ سمجھ گئی کہ اس نے یوسف کو دیکھ لیا ہے۔ شبیر پستول بدست یوسف کو دیکھ کر گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ یوسف ڈکی سے نکل آیا۔ اس کا جسم اتنی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں پڑے پڑے اکڑ گیا تھا لیکن اس نے جلد خود کو سنبھال لیا۔ شبیر نے کہا۔ "تم کون ہو اور میری کار کی ڈکی میں...."

"یہ یوسف عزیز ہے جس پر اپنی بیوی اور اس کے آشنا کے قتل کا الزام ہے۔" سعدیہ نے کہا۔ اس نے بھی خود کو سنبھال لیا تھا۔

شبیر نے حیرت سے سعدیہ کو دیکھا۔ "تم اسے جانتی ہو؟"

سعدیہ نے سر ہلایا۔ "ہاں، میں اسے جانتی ہوں۔"

شبیر یک دم طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "اوہ... تو یہ بات ہے۔ تم نے اسے ڈکی میں چھپایا تھا؟"

"ہاں، میں نے اسے ڈکی میں چھپایا تھا۔"

"تو یوں کہو کہ تم نے اس سے یاری..."

شبیر کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ یوسف نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا تھا اور وہ چکرا کر نیچے گر پڑا۔ عقب سے آتی ایک کار میں سوار لوگوں نے یہ منظر دیکھا لیکن وہ رفتار تیز کر کے نکل گئے۔ شاید وہ اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ شبیر بڑی مشکل سے کھڑا ہوا۔ یوسف نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ "آئندہ زبان چلاتے ہوئے محتاط رہنا، ورنہ میرا ہاتھ اسی طرح چلے گا۔ اب کار میں بیٹھو۔"

شبیر کی حالت خراب تھی، وہ ڈرائیونگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کمزور آواز میں کہا۔ "میں اس حالت میں ڈرائیونگ نہیں کر سکتا۔"

یوسف نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔ "تم ڈرائیونگ کر سکتی ہو؟"

سعدیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، کر سکتی ہوں۔"

سعدیہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئی اور شبیر سر تھام کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ یوسف سہمی ہوئی رفعت کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سارہ ان کے درمیان میں بیٹھی تھی۔ سعدیہ نے کار آگے بڑھاتے ہوئے یوسف سے کہا۔ "تم نے سن لیا ہوگا کہ اس شخص نے مجھے طلاق دے دی ہے؟"

یوسف نے سر ہلایا۔ "اور مجھے افسوس ہوا ہے۔"

"اس کے برعکس مجھے خوشی ہوئی ہے۔ روز روز کے عذاب سے میری جان چھوٹ گئی ہے۔" سعدیہ نے نفرت بھری نظروں سے شبیر کی طرف دیکھا۔ "ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا ہے۔ ایک جرائم پیشہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے۔"

"اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے؟" شبیر اس حالت میں بھی زہر اگلنے سے باز نہیں آیا۔ "یہ دو افراد کا قاتل ہے۔ پکڑا گیا تو اسے کم سے کم بھی پھانسی کی سزا ہوگی۔"

"بکو مت۔" یوسف نے غرا کر کہا۔ "میں نے ان دونوں کو قتل نہیں کیا ہے۔"

"یہ بات تم پولیس کو بتانا۔" شبیر تکلیف سے کراہتے ہوئے ہنسا۔

"لگتا ہے میں پہلا قتل تمہارا ہی کروں گا۔" یوسف نے دانت پیسے۔

"سعدیہ! مجھے اور رفعت کو یہیں اتار دو، ویسے بھی میرا اب تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"خاموش بیٹھے رہو۔" یوسف نے پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ "تم ہمارے ساتھ جا رہے ہو۔"

"نہیں، انہیں اتار دو۔" سعدیہ نے کہا۔

"اس صورت میں یہ فوراً پولیس کو اطلاع کرے گا۔" یوسف بولا۔ "نہیں، ان دونوں کو ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔ تمہارے گھر چل کر ہم ان کے بارے میں سوچیں گے۔"

سعدیہ اس کی بات سمجھ گئی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک دلدل میں پھنستی جا رہی ہے۔ اس کی آزادی اور اس کی عزت دونوں داؤ پر لگ گئے تھے۔ اس نے غیر شعوری طور پر رفتار تیز رکھی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ گھر پر تھے۔ یوسف، شبیر اور رفعت کو پستول کے زور پر ہانک کر گھر میں لے آیا اور اس نے ان دونوں کو اسٹور میں بند کر دیا۔ اس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، سوائے ایک دروازے کے۔ سعدیہ پریشان تھی۔ اس نے سارہ کو پہلے اس کے کمرے میں لٹایا اور پھر باہر آ گئی۔ یوسف فکر مندی سے لاؤنج میں ٹہل رہا تھا۔ سعدیہ نے اس سے کہا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تم خود بھی میرے گھر آ گئے اور اس شخص کو بھی لے آئے۔ اب میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔"

یوسف نے اس کی طرف دیکھا۔ "اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ ایک تو اس نے زبانی طلاق دی ہے اور یہ بعد میں مکر سکتا ہے۔ ابھی یہ تمہارے قابو میں ہے اور تم اس سے تحریری طلاق لے سکتی ہو۔ دوسرے مجھے یہاں سے نکلنے کے لیے رقم کی ضرورت ہے اور وہ رقم میں ان دونوں سے حاصل کروں گا۔"

سعدیہ چونکی۔ "تم اس رقم کی بات کر رہے ہو جو رفعت کا شوہر چھوڑ کر مرا ہے؟"

یوسف نے سر ہلایا۔ "ہاں، مجھے بڑی رقم کی ضرورت ہے۔"

"لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ ابھی تو اس رقم کو نکلوانے میں وقت لگے گا۔"

"میں جانتا ہوں، تبھی میں ان دونوں کو یہاں لایا ہوں۔ میں یہاں رہوں گا اور اس لڑکی کی مدد سے رقم حاصل کر لوں گا۔ اس کے بعد میں ان دونوں کو یہاں سے لے جاؤں گا اور تمہاری جان ہمیشہ کے لیے ان سے چھوٹ جائے گی۔"

"لیکن اگر تم اور رفعت یہاں رکو گے تو محلے والے شک کر سکتے ہیں۔"

"کیوں شک کریں گے... جب تم ان کو بتاؤ گی کہ میں شبیر کا دوست ہوں اور رفعت میری بیوی ہے۔" یوسف نے مسئلے کا سادہ سا حل پیش کر دیا۔ لیکن سعدیہ کا دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ اب کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ یوسف اس کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ سعدیہ اس کی تجویز سے متفق نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ "اگر تم میری تجویز کے حق میں نہیں ہو تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں اور آگے جو میرے مقدر میں ہوگا میں بھگت لوں گا۔"

www.pkdigest.com

سعدیہ اس کی بات سے مطمئن نہیں تھی۔ ''اگر تمہیں پولیس نے گرفتار کیا تو کیا تم میرے بارے میں بتا دو گے؟''
''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ممکن ہے پولیس مجھ پر تشدد کا حربہ آزمائے تو میں قبول کرلوں۔'' یوسف نے جواب دیا۔ نہ جانے وہ سعدیہ کو ڈرا رہا تھا یا سچ مچ اپنے خدشے کا اظہار کر رہا تھا۔
''اور تم نے کہا ہے کہ شبیر سے مجھے تحریری طلاق لینی چاہیے تاکہ وہ بعد میں مجھے تنگ نہ کرے؟''
''وہ جس قسم کا شخص ہے، بعد میں وہ تمہیں تنگ کر سکتا ہے۔'' یوسف نے سر ہلایا۔ ''اگر تم کچھ دن کی مشکل برداشت کرلو تو تمہارے ساتھ میرے مسئلے کا حل بھی نکل آئے گا۔''
''لیکن بعد میں شبیر مجھے پریشان نہیں کرے گا؟ کیونکہ اس نے تو دولت کی خاطر مجھے طلاق دی ہے۔''
''اگر اسے دولت نہیں ملے گی تو اس میں تمہارا قصور تو نہیں ہوگا۔''
''تم نہیں جانتے ہو، وہ اپنی بری قسمت کا ذمے دار بھی مجھے قرار دیتا ہے۔'' سعدیہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔
''تم فکر مت کرو، میں اس کا ایسا بندوبست کروں گا کہ وہ پھر تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔'' یوسف نے سوچتے ہوئے کہا۔
''اب تم کیا کرو گے؟''
''پہلے تم بتاؤ، تم مجھے اپنے گھر میں پناہ دینے پر آمادہ ہو؟ اور اس میں کوئی زبردستی نہیں ہے کیونکہ تم میری محسن ہو۔ اگر تم میری مدد نہ کرتیں تو پولیس مجھے گرفتار کر چکی ہوتی۔''
سعدیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرے پاس تمہاری بات ماننے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔''
''تب میرا پلان یہ ہے کہ سب سے پہلے مجھے اپنا حلیہ بدلنا ہوگا کیونکہ کل تک پولیس مجھے اشتہاری قرار دے دے گی۔ اس کے بعد میں آزادی سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔''
سعدیہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اگر تم مونچھیں صاف کر دو اور سر کے بال چھوٹے کروا لو تو تم آسانی سے نہیں پہچانے جاؤ گے۔''
یوسف نے اس کی تجویز پر عمل کیا۔ اس نے مونچھیں اور سر کے بال صاف کر دیے۔ اس طرح واقعی اس کے حلیے میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ اس کے کپڑے خراب ہو رہے تھے۔ سعدیہ نے اسے شبیر کا ایک جوڑا دیا۔ اس کا قد شبیر سے بڑا تھا اس لیے اسے لباس ذرا چھوٹا تھا۔ اس نے نہا کر یہ لباس پہن لیا۔ اس دوران میں شبیر نے شور کیا کہ انہیں باہر نکالا جائے تو یوسف نے اسے پستول دکھا کر خاموش کر دیا۔ اس نے کہا۔
''آرام سے بیٹھو۔ ابھی تم سے حساب کتاب کرنا ہے۔''
''کیسا حساب کتاب؟'' شبیر نے اسٹور سے باہر آنے کی کوشش کی لیکن یوسف نے اسے واپس دھکیل دیا۔
''اتنی جلدی کیا ہے؟ تمہیں پتا چل جائے گا۔'' یوسف نے دروازہ باہر سے بند کرتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں سعدیہ کھانا بنا رہی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ شبیر اور رفعت کے لیے بھی کھانا بنائے لیکن مجبوری تھی۔ ابھی ان دونوں کو یہیں رہنا تھا اور ظاہر ہے وہ بھوکے تو نہیں رہ سکتے تھے۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو سعدیہ کے کہنے پر یوسف نے ان دونوں کو باہر نکالا۔ وہ میز پر آئے تو شبیر کا موڈ بگڑا ہوا تھا اور رفعت خاموش تھی۔ شبیر نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔
''ٹھیک ہے پھر واپس اسٹور میں چلو۔'' یوسف نے پستول ہلا کر کہا تو مجبوراً شبیر کو میز پر بیٹھنا پڑا۔ وہ اس گرمی میں اسٹور میں بند ہو کر تنگ آگیا تھا۔ یوسف بھی بیٹھ گیا اور اس نے پستول اپنی گود میں رکھ لیا۔ شبیر نے کھاتے ہوئے پوچھا۔
''جب میں اس عورت کو طلاق دے چکا ہوں تو تم مجھے یہاں رکنے پر کیوں مجبور کر رہے ہو؟''
''اس کی کئی وجوہات ہیں۔ تم کھانا کھا لو پھر آرام سے بتاتا ہوں۔''
کھانے کے بعد وہ لاؤنج میں آگئے۔ شبیر اور رفعت ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور یوسف ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ شبیر نے بے تابی سے پوچھا۔ ''تم نے کہا تھا کہ...''
''ہاں، وہی بتا رہا ہوں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں چھوڑا تو تم پولیس کو میرے بارے میں اطلاع کر دو گے۔''
''میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں کہ میں...''
''فضول باتیں مت کرو۔ تم جیسے شخص پر اعتماد کرنے سے بہتر ہے، میں اس پستول کی دو گولیاں اور استعمال کرلوں۔''
رفعت کا چہرہ زرد ہو گیا اور شبیر نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''اور کیا وجہ ہے؟''
''دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نے اس مظلوم عورت کو صرف زبانی طلاق دی ہے اور تم بعد میں اس کے شوہر ہونے کا دعویٰ کر کے اسے تنگ کر سکتے ہو۔ تم اسے تحریری طلاق دو گے۔''
''میں دے دوں گا۔'' شبیر نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ ''مجھے ویسے بھی اس عورت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے... اور کیا وجہ ہے جو تم مجھے روک رہے ہو؟''
''تیسری وجہ وہ دولت ہے جو اس عورت کا شوہر چھوڑ کر گیا ہے۔ مجھے اس میں سے اپنا حصہ چاہیے۔''
''تمہارا حصہ کیسے؟'' شبیر نے اعتراض کیا۔

''تب تمہارا حصہ کیسے؟'' یوسف نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ تم اس لڑکی کو مجبور کر کے دولت حاصل کر رہے ہو تو میں تمہیں مجبور کر کے کیوں یہ دولت نہ حاصل کروں؟''
شبیر کے پاس اس منطق کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ وہ کوئی قانونی کام نہیں کر رہا۔ یہ جرم کی دولت ہے اور ایسی دولت اسی کے پاس ہوتی ہے جو اسے اپنے پاس رکھنے کی طاقت رکھتا ہے۔ شبیر سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ دولت ایک بینک لاکر میں ہے اور اسے صرف رفعت وارث ہونے کی حیثیت سے کھول سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے اسے پہلے خود کو وارث ثابت کرنا پڑے گا۔''
''اس کام کے لیے اسے اپنے شوہر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کرنا ہوگا اور اپنا نکاح نامہ بھی...''
''اور یہ چیزیں حاصل کرنے میں وقت لگے گا۔''
''مثلاً کتنا وقت؟''
''شاید دو تین مہینے...''
''بکواس... اگر تمہیں معلوم ہے کہ یہ چیزیں کہاں ہیں تو تم زیادہ سے زیادہ ایک دن میں حاصل کر سکتے ہو۔''
''مجھے یہی تو نہیں معلوم [illegible]''
یوسف نے غور سے شبیر کو دیکھا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ تمہیں ان چیزوں کا علم نہ ہو اور تم یہ قدم اٹھا لو۔''
''میں... میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' شبیر نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔
''تم کیا کہتی ہو؟'' یوسف نے رفعت کی طرف دیکھا۔
''مجھے... مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔ ''مجھے تو کسی دولت کا بھی علم نہیں تھا۔ مجھے یہ سب شبیر نے بتایا ہے۔''
یوسف نے اس کے چہرے پر نظریں جمائیں۔ ''اور تم اتنی بھولی ہو کہ اس کے کہنے پر یہاں تک چلی آئیں؟''
ایک طرف دیوار سے لگی سعدیہ نے نفرت سے کہا۔ ''یہ بکواس کرتی ہے۔ یہ اس شخص کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور اسے سب معلوم ہے۔''
''مجھے کچھ نہیں معلوم۔''
سعدیہ چاہتی تھی کہ یہ مصیبتیں جلد از جلد اس کے گھر سے ٹل جائیں۔ اس نے یوسف کو ایک طرف بلایا اور آہستہ سے بولی۔ ''ان لوگوں کا سامان دیکھو۔ ممکن ہے ان میں یہ چیزیں ہوں اور یہ ٹل جائیں۔''
یوسف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم بہت ذہین عورت ہو۔ میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی اور تم نے سوچ لیا۔ بالکل یہی بات ہے۔ وہ چیزیں ان کے پاس ہیں اور یہ مجھ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔''
یوسف واپس آیا اور اس نے پستول کے اشارے سے ان دونوں کو اٹھنے کو کہا۔ ''چلو اپنے ٹھکانے پر۔''
شبیر کھڑا ہو گیا اور اس نے سعدیہ کو گھورا۔ ''تم اس شخص کے ساتھ یہاں رہو گی؟''
''تمہیں اس سے کیا کہ میں کس کے ساتھ رہتی ہوں؟'' سعدیہ نے کہا۔ ''اب تمہارا اور میرا کوئی تعلق نہیں ہے جو تم مجھ سے کوئی سوال کر سکو۔''
''اسٹور میں بہت گرمی ہے۔'' رفعت نے فریاد کی۔ وہ ویسے بھی سرد علاقے کی عادی تھی اس لیے اسے یہاں کی گرمی زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ یوسف نے اس کی بات سن کر کہا۔
''یقیناً لیکن یہ اسٹور قبر سے زیادہ گرم نہیں ہوگا۔''
مجبوراً شبیر اور رفعت اسٹور روم میں بند ہو گئے۔ سعدیہ باہر موجود کار سے ان دونوں کا سامان لے آئی۔ یوسف نے پہلے رفعت کا بیگ چیک کیا۔ اس میں سے نکاح نامہ اور اس کے شوہر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ نکل آیا لیکن اس میں بینک لاکر کی چابی نہیں تھی۔ وہ شبیر کے سامان سے بھی نہیں ملی۔ سعدیہ نے کہا۔ ''ممکن ہے وہ شبیر کے کمرے میں کہیں ہو۔''
یوسف نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا تمہارا شوہر الگ کمرے میں رہتا ہے؟''
سعدیہ شرمندہ ہو گئی۔ اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، جیل سے آنے کے بعد وہ الگ کمرے میں سوتا ہے۔''
''میرا خیال ہے کہ تم اس کے مقابلے میں زیادہ تعلیم یافتہ ہو؟''
''ہاں، اس نے میٹرک کیا ہے اور میں نے بی اے کیا ہوا ہے۔''
''تم اس سے کہیں بہتر شخص کی مستحق تھیں۔'' یوسف نے کہا۔ ''لیکن آدمی اپنے مقدر سے تو نہیں لڑ سکتا۔''
''میں شبیر کا کمرا دیکھتی ہوں۔'' سعدیہ نے کہا اور اندر چلی گئی۔
یوسف نے گزشتہ شام تک سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی یوں بدل جائے گی۔ اس پر نہ صرف اپنی بیوی اور اس کے آشنا کے قتل کا الزام لگ جائے گا بلکہ وہ پولیس سے چھپنے کے لیے ایک مجرم کی رقم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

www.pkdigest.com

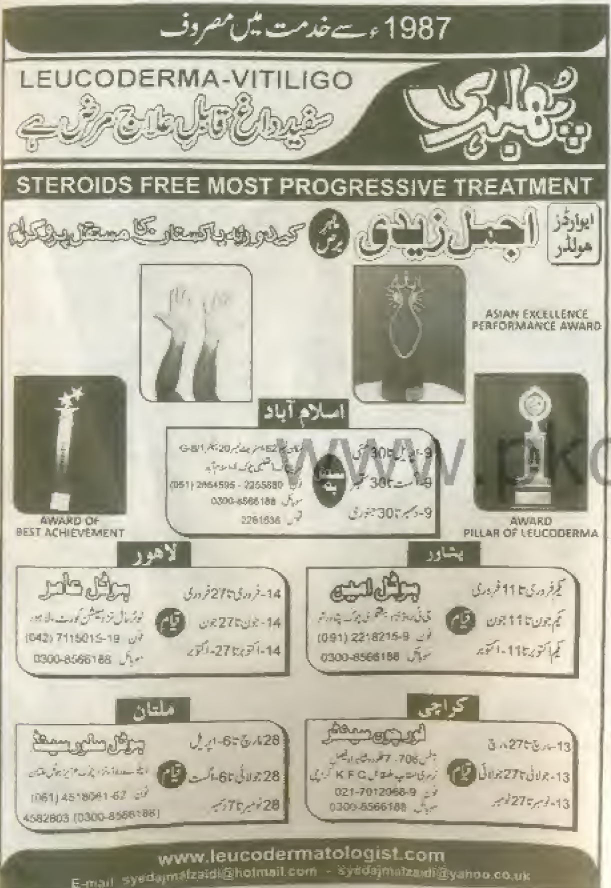

جب اس نے درشہوار کی لاش دیکھی تو اتنا غمگین ہوا تھا کہ اس نے خودکشی کا سوچا اور یہی سوچ کر اس نے وہاں پڑا پستول اٹھالیا... لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس عورت کے لیے جان دینے جارہا ہے جو کبھی اس کی تھی ہی نہیں۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ انسان اس سے محبت کرے نہ کہ اس کے لیے جان دینے کو تیار ہو جائے۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خاموشی سے وہاں سے نکل جائے گا اور آلۂ قتل کو کسی ایسی جگہ چھپادے گا جہاں سے اسے پولیس تلاش نہ کر سکے۔ کسی نے اسے گوہر کے گھر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

مگر جب وہ واپس گھر آیا تو عمران نے اسے کال کر کے بتایا کہ پولیس اسے درشہوار اور گوہر کے قتل کے الزام میں تلاش کر رہی ہے۔ وہ فوراً گھر سے نکل گیا اور اس کے بعد سے چھپتا پھر رہا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے خلاف باقاعدہ سازش ہوئی ہے۔ اسے فون کر کے گوہر کے گھر جانے پر مجبور کیا گیا اور وہاں گیا تو درشہوار اور گوہر قتل کیے جاچکے تھے اور وہ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ پولیس کو پتا بھی چل گیا۔ عمران کو کیسے پتا چلا کہ درشہوار اور گوہر قتل کیے جاچکے ہیں اور پولیس ان کے قتل کے الزام میں اسے تلاش کر رہی ہے؟ یوسف جیسے جیسے اس معاملے پر سوچ رہا تھا، اسے یقین ہوتا جارہا تھا کہ یہ سازش ہے اور اس سازش کے پیچھے یقیناً عمران تھا۔

لیکن عمران ایسا کیوں کرنے لگا؟ اس کا جواب بھی یوسف کے پاس تھا۔ یوسف کا چچا اور اس کے بیٹے شروع سے یوسف کے باپ اور یوسف سے خار کھاتے تھے کیونکہ ان کے پاس تھوڑی سی زمین تھی اور یوسف کے باپ نے اتنا بڑا باغ بنالیا تھا۔ وہ صرف جلتے ہی نہیں تھے بلکہ یوسف کا باغ بھی ہتھیانے کی فکر میں رہتے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے درشہوار کی شادی اس کی مرضی کے خلاف یوسف سے کردی اور اب عمران نے اپنی بہن کو مار کر اس کا الزام یوسف پر لگادیا تاکہ اسے پھانسی ہو جائے اور قریبی رشتے دار ہونے کے ناتے یہ باغ انہیں مل جائے۔

یوسف کو تعجب تھا کہ اتنی سادہ سی بات اب تک اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟ شاید اس وجہ سے کہ اس واقعے نے اس کے اعصاب کو متاثر کیا تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ پھر پولیس سے بچنے کی دھن میں اس نے بعد میں بھی اس بات پر توجہ نہیں دی۔ لیکن اب سکون سے بیٹھا تھا تو اسے سب سمجھ میں آگیا۔ اسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آیا کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگی اور اپنے اکلوتے بیٹے پر لگی

کے الزام کا سن کر اس کے دل پر کیا بیتے گی؟ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے درشہوار جیسی ناگن سے کیوں محبت کی جس نے اس کی پُرسکون زندگی کو ڈس لیا اور مرنے کے بعد بھی اس کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔

سعدیہ ایک گھنٹے بعد آئی اور اس نے بتایا۔ "شبیر کے سامان سے بھی ایسی کوئی چابی نہیں ملی ہے۔"

"اگر چابی نہیں ملی تو میں لاکر میں رکھی دولت حاصل نہیں کر سکوں گا۔"

سعدیہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ تم استاد بھی ہو؟"

"ہاں... تمہیں کس نے بتایا؟"

"جب ہوٹل میں تھے تو شاید اس کا منیجر بتارہا تھا۔"

"ہاں۔" یوسف نے سرد آہ بھری۔ "میں استاد ہوں... بچوں کو علم دینے والا اور اب میں قتل کا مفرور مجرم ہوں۔"

"تم جانتے ہو کہ یہ دولت حرام کی ہے اور یہ اس شخص کے کام بھی نہیں آئی جس نے اسے نہ جانے کتنی جانوں کے عوض کمایا تھا۔"

یوسف نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ تم اس دولت کا خیال دل سے نکال دو۔"

"لیکن فرار کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔"

"اگر دس ہزار روپے سے کام چل سکتا ہے تو میں تمہیں یہ رقم دینے کے لیے تیار ہوں... لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم خود کو پولیس کے حوالے کردو۔ مجھے یقین ہے کہ عدالت تمہاری بے گناہی تسلیم کرلے گی۔"

"میرے پاس اپنی بے گناہی تسلیم کرانے کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"بالکل اسی طرح پولیس کے پاس تمہیں قاتل ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت یا گواہی نہیں ہے۔"

"کیا تم ہماری پولیس کو نہیں جانتیں؟ وہ جھوٹی گواہی اور ثبوت بنالیتی ہے اور بے گناہوں کو پھانسی چڑھادیتی ہے۔" یوسف نے تلخی سے کہا۔

"انسپکٹر شہباز اچھا آدمی ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔" یوسف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے ہر صورت میں اس ملک سے فرار ہونا ہے اور اس کے لیے مجھے رقم کی ضرورت ہے۔"

سعدیہ اس کی بات سے مایوس نظر آنے لگی لیکن اس نے دوبارہ کچھ نہیں کہا۔ "ان لوگوں کو کب تک اس طرح قید رکھا

جاسکتا ہے؟"

"جب تک میں چاہوں ان کو قید رکھ سکتا ہوں۔" یوسف نے بے پروائی سے کہا۔ "کیونکہ میرے پاس ہتھیار ہے اور تمہارا شوہر... میرا مطلب ہے شبیر... اس کی زبان اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

"تم اسے نہیں جانتے، وہ بہت ضدی ہے۔ اگر اس کا دماغ گھوم گیا تو وہ پستول کی پروا بھی نہیں کرے گا۔"

"تم فکر مت کرو، میں اس سے نمٹ لوں گا۔" یوسف کا لہجہ کھردرا ہو گیا۔

"لیکن کب تک؟" سعدیہ کا لہجہ بھی تیز ہو گیا۔ "میرے گھر میں یہ ڈراما کب تک چلے گا؟ تم نے سوچا ہے میری چھوٹی سی بیٹی ہے اس پر کیا اثر ہوگا ان سب باتوں کا؟"

"تم بچی کو بہلاؤ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ دو تین دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔" یوسف نے کہا۔

اگلی صبح یوسف نے ناشتے کے بعد رفعت کو دوبارہ بند کر دیا اور صرف شبیر کو لے کر لاؤنج میں آیا۔ اس نے شبیر کو صوفے پر دھکیل دیا اور بولا۔ "مجھے بینک لاکر کی چابی چاہیے۔"

"میرے پاس ہے تو لے لو۔" شبیر نے ڈھٹائی سے کہا۔ "تم نے ہر چیز کی تلاشی تو لے لی ہوگی؟"

"مجھے رفعت کے شوہر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور اس کا نکاح نامہ مل گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بینک لاکر کی چابی بھی تم لوگوں کے پاس ہے۔" یوسف نے یقین سے کہا۔

"میں نے کہا نا... ہے تو لے لو۔"

"تم جھگڑے والی بات کر رہے ہو۔" یوسف نے ذرا جھک کر کہا۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

شبیر نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ ہم یہ رقم آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ایک کروڑ مجھے دے دو اور باقی رقم تم دونوں لے لو۔"

شبیر نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "خوب... ایک کروڑ تم لے لوگے تو باقی کیا بچا؟"

"ایک کروڑ خاصی بڑی رقم ہوتی ہے اور خاص طور سے اس صورت میں جب سب جانے کا امکان ہو تو..."

"اس رقم کے کہیں جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر تم نکاح نامہ اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہو تو شوق سے رکھو۔ ہم دوسرے بنوا لیں گے۔"

"لیکن فرض کرو، میں اس لڑکی کو ساتھ لے جاؤں تو؟" شبیر کھڑا ہو گیا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

یوسف نے اسے دھکیل کر بٹھا دیا۔ "تم مجھے نہیں روک سکتے... اب بولو کیا کہتے ہو؟"

شبیر پریشان ہو گیا۔ اس دولت کی اصل کنجی رفعت ہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ سے نکل جاتی تو اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ یوسف اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم یہ مت سمجھنا کہ میرے پاس یہاں ٹھکانے نہیں ہیں۔ میرے بہت سے جاننے والے ہیں جو مجھے پناہ دے سکتے ہیں۔ میں کسی کے پاس بھی چلا جاؤں گا۔ یہ لڑکی مجبور ہے... جو اس پر قبضہ کرلے یہ اس کے پاس رہے گی۔"

شبیر سوچ میں پڑ گیا۔ یوسف کی دھمکی میں وزن تھا۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب رقم مل جائے گی تو تم پوری رقم پر قابض نہیں ہوگے؟"

"تمہیں میری بات پر بھروسا کرنا ہوگا اور پھر مجھے تمہارا منہ بھی بند رکھنا ہے۔ اگر تمہیں تمہارا حصہ نہیں ملا تو تم پولیس کو میرے پیچھے لگا سکتے ہو۔ دوسری صورت میں تم اپنا منہ بند رکھو گے۔"

شبیر مسکرایا۔ "یہ بھی تو ممکن ہے کہ میں رقم میں اپنا حصہ حاصل کر کے بھی پولیس کو تمہارے پیچھے لگا دوں۔"

"اس صورت میں میں گرفتار ہوتے ہی سب سے پہلے پولیس کو تمہارے بارے میں بتاؤں گا۔" یوسف نے جوابی دھمکی دی۔ "ممکن ہے پولیس کو تم سے کوئی دلچسپی نہ ہو لیکن جب اسے پتا چلے گا کہ تمہارے پاس ایک کروڑ روپے ہیں تو وہ تمہیں ضرور تلاش کرے گی۔"

"اوکے! میں اپنا منہ بند رکھوں گا۔" شبیر نے جلدی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم مان گئے ہو؟"

"ہاں لیکن بینک لاکر کی چابی میرے پاس نہیں ہے۔"

"پھر کس کے پاس ہے؟"

"اس کا بھی رفعت کو ہی معلوم ہے۔"

یوسف نے رفعت کو اسٹور سے نکالا۔ "بینک لاکر کی چابی کہاں ہے؟"

"کون سے بینک لاکر کی چابی؟" اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"تم یوں شرافت سے نہیں مانو گی۔" یوسف نے غصے سے اس کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ شبیر نے کہا۔

"رفعت! کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں اس سے بات کر چکا ہوں اور اب آدھا حصہ یہ لے گا۔"

رفعت جواب تک مسکین اور ڈری ہوئی تھی، یک دم اس کی جون بدل گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ اس نے غرا کر کہا۔ "کس خوشی میں آدھی رقم... وہ سب میری ہے۔"

"بکو مت۔" یوسف نے اسے جھڑکا۔ "وہ رقم کوئی اکیلے حاصل نہیں کر سکتا۔"

"وہ میرے شوہر کی رقم ہے، اس پر میرا حق ہے۔"

"تمہارے شوہر نے کوئی حق حلال سے نہیں کمائی تھی۔" یوسف نے طنز کیا۔ "جو تم اس پر اپنا حق جتا رہی ہو۔"

"دیکھو، اگر ہم اسی طرح جھگڑتے رہے تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔" شبیر، رفعت کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس سے جھگڑ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے پہلے ہی نصف رقم مل رہی تھی اور اب نصف یوسف لے لے گا تو ان کے حصے میں کیا آئے گا؟

"نہ آئے... کسی کے ہاتھ کچھ نہ آئے لیکن میں اس میں سے کسی کو اتنی بڑی رقم نہیں دوں گی۔" رفعت نے سینہ تان کر کہا۔ "اس پر سب سے زیادہ حق میرا ہے۔"

یوسف غور سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم ایک طرح سے ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس رقم پر زیادہ حق تمہارا ہے۔ اس لیے اسے یکساں تین حصوں میں تقسیم کرلیا جائے۔"

رفعت نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "مجھے تو تم پوری رقم ہتھیانے کی فکر میں لگ رہے ہو۔"

"نہیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جتنی رقم کہوں گا، میں اتنی ہی لوں گا۔ میں ایک کروڑ کے بجائے اب اس میں سے پینسٹھ لاکھ روپے لوں گا اور باقی تم دونوں کے حصے میں آئیں گے۔ اس کا تم خود طے کر لینا کہ کس نے کتنے لینے ہیں۔" یوسف نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم پوری رقم پر قبضہ نہیں کرو گے؟"

"دیکھو، ہم میں سے کوئی پولیس تک بات لے جانا پسند نہیں کرے گا... سوائے اس کے جس کے ہاتھ کچھ نہ آئے۔"

کسی قدر بحث کے بعد رفعت اس تقسیم پر راضی ہو گئی۔ یوسف نے کہا۔ "ٹھیک ہے، اب بتاؤ کہ لاکر کی چابی کہاں ہے؟"

رفعت نے سوچا پھر گریبان میں ہاتھ ڈال کر لاکر کی چابی نکالی اور یوسف کی طرف پھینک دی۔ اس نے چابی اٹھا لی۔ "تو سب طے ہے؟"

شبیر نے کہا۔ "اب ہمیں بینک جانا ہوگا۔ ممکن ہے اس کام میں ایک دو دن لگ جائیں۔"

"اس میں کچھ عدالت کا معاملہ بھی ہوتا ہے۔" یوسف نے کہا۔

"ہاں، وہ سب کر لیں گے۔" شبیر نے جواب دیا۔

یوسف فکرمند ہو گیا کیونکہ وہ ان لوگوں کو آزادی سے نہیں چھوڑ سکتا تھا اور ہر جگہ ان کے ساتھ بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ مسئلہ کیسے حل کرے؟ سعدیہ صبح سے کہیں گئی ہوئی تھی اس نے کہا تھا کہ وہ کچھ دیر میں آجائے گی لیکن اسے آنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ وہ تھکن اور گرمی سے بے حال اندر آئی اور اس نے سارہ کو بٹھایا۔ پانی پی کر اس نے اپنے پرس سے ایک اسٹامپ پیپر نکال کر شبیر کے سامنے رکھا۔

"یہ تحریری طلاق نامہ ہے، اس پر دستخط کر دو۔"

شبیر نے بے پروائی سے چھین لیا اور طلاق نامے پر دستخط کر دیے۔ اس نے پیپر سعدیہ کی طرف بڑھا دیا جو لیتے ہی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو سب کو نظر آ گئے تھے۔ ماحول یک دم افسردہ ہو گیا حتیٰ کہ شبیر بھی چپ ہو گیا۔ یوسف نے اسے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔ "تم نے اس مظلوم عورت کے ساتھ ایک ظلم اور کر دیا۔"

"اس کے برعکس میں نے اچھا ہی کیا ہے۔" شبیر سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اصل میں مجھ سے شادی ہی اس کے ساتھ ظلم تھا۔ میں ایک لاابالی طبیعت کا آدمی ہوں اور کبھی نہیں بدل سکتا۔ میں گھر میں قید ہو کر بیٹھنے والا آدمی نہیں ہوں اس لیے سعدیہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جانا ہی بہتر ہے۔"

یوسف سوچ رہا تھا، اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں اب اس گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔"

"تو پھر کہاں جائیں گے؟" شبیر نے سوال کیا۔

"تمہارا کوئی نہ کوئی ٹھکانا تو ہوگا؟"

"ہاں ہے تو لیکن وہاں رہنا آسان کام نہیں ہے۔ ایک ہی کمرا ہے اور کوئی سہولت نہیں ہے۔"

"ہم نے گھر نہیں بسانا ہے، بس چند دن کے لیے وہاں رہنا ہے۔"

"تب ٹھیک ہے... چلو۔" شبیر تیار ہو گیا۔

یوسف نے آواز دے کر سعدیہ کو بلایا اور اس سے کہا۔

"ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"شبیر کے پاس کوئی جگہ ہے۔ میری وجہ سے تمہیں جو تکلیف ہوئی ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی۔" سعدیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

شبیر اور رفعت نے اپنا سامان لیا۔ یوسف کے پاس کچھ

www.pkdigest.com

نہیں تھا۔ جب وہ جانے لگے تو سعدیہ نے یوسف سے کہا۔ ”کیا تم اپنا ارادہ ترک نہیں کر سکتے؟“

یوسف رک گیا۔ ”نہیں، میں بہت آگے نکل گیا ہوں۔“

”فرار مسئلے کا حل نہیں ہے۔“ سعدیہ نے اصرار کیا۔

”میں جانتا ہوں لیکن میں اپنی آزادی نہیں کھونا چاہتا۔ اس کے لیے میں آخری سانس تک بھاگوں گا۔“ یوسف نے سرد آہ بھری پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ”میں پھانسی پا کر نہیں مرنا چاہتا۔“

”موت تو پھر بھی انسان کو گھیر لیتی ہے۔“ سعدیہ نے زندگی کا فلسفہ بیان کیا۔ ”آدمی جب موت سے بچ کر بھاگتا ہے تو موت کی طرف ہی بھاگتا ہے۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ یوسف نے گہری سانس لی۔ ”کاش کہ مجھے تم جیسی عورت ملی ہوتی تو شاید آج میں یوں بھاگتا نہ پھر رہا ہوتا۔“

سعدیہ کے چہرے پر سرخی آگئی۔ ”میں کوئی خوب صورت عورت نہیں ہوں۔“

”ایک خوب صورت عورت نے تو مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔“ یوسف نے کہا۔ ”اب مجھے پتا چلا کہ عورت کی اصل خوب صورتی کیا ہوتی ہے۔“

سعدیہ سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”سنو، مجھے اپنے گھر کا پتا دو۔ میں تمہاری ماں کا معلوم کروں گی۔“

یوسف خوش ہو گیا۔ ”سچ؟“ اس نے جلدی سے ایک کاغذ پر اپنے گھر کا پتا لکھ دیا۔ ”ویسے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جس ہوٹل میں رکی تھیں، اس کے پیچھے والی گلی سیدھی میرے گھر تک جاتی ہے۔ وہاں کسی سے بھی معلوم کر لو، وہ تمہیں بتا دے گا۔“

”میرے گھر کا فون نمبر یاد کر لو۔“ سعدیہ نے کہا۔ ”تم اس پر رابطہ کر کے مجھ سے بات کر سکتے ہو۔ ممکن ہے، میں ایک دو دن میں تمہارے گھر کا چکر لگاؤں۔“

”میں شکر گزار ہوں گا۔“ یوسف نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ سعدیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”تم نے بھی میرے لیے کم نہیں کیا ہے۔ اس شخص سے نجات دلا رہے ہو... ورنہ ممکن ہے کہ یہ طلاق دینے کے بعد بھی مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا۔“

”نہیں، اب یہ تمہیں کبھی تنگ نہیں کرے گا۔“ یوسف نے یقین سے کہا اور باہر نکل گیا۔ شبیر اسے اور سعدیہ کو بات کرتے دیکھ کر چڑ رہا تھا لیکن اسے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا ہر اختیار کھو دیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

سعدیہ دین سے اتری تو موسم خوشگوار تھا بلکہ تیز دھوپ کی وجہ سے ہلکی سی گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے سارہ کو گود میں اٹھانا چاہا تو اس نے کہا۔ ”ماما! میں خود چلوں گی۔“

”آپ تھک جائیں گی میری جان۔“

”جب میں تھک جاؤں تو آپ اٹھا لیجیے گا۔“ سارہ نے معصومیت سے کہا تو سعدیہ نے بے ساختہ اسے پیار کیا اور اس کی انگلی پکڑ کر سڑک عبور کر کے دوسری طرف آئی۔ ہوٹل کی تنگ گلی میں آ کر اس نے نشیب میں آبادی کا رخ کیا۔ اس نے ایک لڑکے سے یوسف عزیز کے گھر کے بارے میں پوچھا۔ لڑکا بے ساختہ بولا۔

”جس نے اپنی بیوی اور اس کے عاشق کو مار دیا تھا؟“

سعدیہ ایک لمحے کے لیے دنگ رہ گئی۔ اس لڑکے نے یوسف کے استاد ہونے کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ آج کل انسان برسوں کی عزت کیسے لمحوں میں کھو دیتا ہے۔ اس نے سنبھل کر سر ہلایا۔ ”ہاں وہی یوسف عزیز... مجھے اس کی ماں سے ملنا ہے۔“

”اس کی ماں اپنے گھر پر ہے۔ وہ دیکھیں، سرخ چھت والا گھر اسی کا ہے۔“ لڑکے نے بتایا اور آگے چل پڑا۔ کچھ دیر بعد سعدیہ نے گھر کے دروازے پر دستک دی تو ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا۔

”مجھے سکینہ بی بی سے ملنا ہے۔“ سعدیہ نے کہا۔

”آؤ، اندر آ جاؤ بی بی۔“ ملازمہ نے پوچھا نہیں کہ وہ کون ہے اور اسے اندر صحن میں لے آئی جہاں صنوبر کے گھنے درخت تلے چارپائی پر صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد یوسف کی ماں اندر سے آئی۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کی لیکن مضبوط جسامت کی عورت تھی۔ بیٹے کا دکھ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ اس نے سعدیہ سے ہاتھ ملایا اور ملازمہ سے لسی لانے کو کہا۔ سعدیہ نے اپنا تعارف کرایا۔

”مجھے سعدیہ کہتے ہیں۔ میں ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں...“

”ماشاء اللہ... یہ بچی؟“

”یہ میری بیٹی ہے... سارہ... آنٹی کو سلام کرو۔“

سارہ نے سکینہ بی بی کو سلام کیا تو انہوں نے اسے گود میں لے کر پیار کیا۔ ”ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے اور ہر بلا سے محفوظ رکھے۔ اس کا باپ کیا کرتا ہے؟“

”اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔“ سعدیہ نے مختصر جواب دیا۔

سارہ، سکینہ بی بی کی گود میں خاموشی سے دبک گئی۔ سکینہ بی بی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا کہے۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ ”مجھے آپ کے بیٹے کا سن کر افسوس ہوا ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔“ سکینہ بی بی نے یقین سے کہا۔ ”پولیس کے خوف سے نہ جانے کہاں مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسے چاہیے کہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ میرا بھانجا وکیل ہے۔ اس نے کہا ہے کہ پولیس کو کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا جس سے ثابت ہو کہ قتل یوسف نے کیے ہیں۔ اس کا پستول گھر میں ہے اور پولیس نے اس کا معائنہ کر لیا ہے۔ درشہوار اور گوہر کا قتل اس کے پستول سے نہیں ہوا ہے۔“

”آپ کے خیال میں یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟“

سکینہ بی بی کے چہرے پر نفرت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ ”یہ ان آستین کے سانپوں کا کام ہے جنہیں ہم پہچان نہیں سکے۔“

”یوسف کے چچا اور اس کے بیٹوں کا؟“ سعدیہ نے بے ساختہ کہا تو سکینہ بی بی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”مجھے یوسف نے بتایا ہے۔“ سعدیہ نے بالآخر کہہ دیا۔

”یوسف...“ سکینہ بی بی بے تابی سے بولی۔ ”تم جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے... کیسا ہے؟“

”کل تک وہ میرے گھر میں تھا اور ٹھیک تھا۔“ سعدیہ نے کہا اور پھر اس نے سکینہ بی بی کو ساری کہانی سنا دی۔ بیٹے کا سن کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”میرا بچہ بے قصور ہے۔“

”میں جانتی ہوں اور میں نے بھی اسے آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے کر دے۔ اس کیس میں جان نہیں ہے اور کوئی بھی اچھا وکیل اسے آسانی سے آزاد کرا لے گا۔“

”کاش کہ وہ مان جاتا۔“ سکینہ بی بی مایوسی سے بولی۔ ملازمہ لسی لائی تو اس دوران میں ان کی گفتگو کچھ دیر کے لیے رکی۔ پھر سکینہ بی بی نے اسے وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ ”ہمارے دشمن کھل کر سامنے آ گئے ہیں۔ یوسف کے چچا نے ہمدردی کی آڑ میں مجھ سے میری زمین کا انتظام سنبھالنے کو کہا اور جب میں نے انکار کیا تو وہ دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔ اس نے کہا ہے کہ اگر عدالت نے یوسف کو رہا کر بھی دیا، تب بھی وہ اپنی بیٹی کے قتل کا بدلہ اس سے ضرور لے گا۔“

”زمین کے لیے یہ لوگ اس حد تک چلے گئے ہیں؟“ سعدیہ نے حیرت سے کہا۔

سکینہ بی بی نے سر ہلایا۔ ”حالانکہ یہ آبائی زمین نہیں ہے بلکہ میرے شوہر نے اپنی محنت سے بنائی ہے۔ اب یہ اس پر قبضہ کرنا چاہ رہے ہیں۔ مجھے یوسف کے چاچے کی بات سن کر یقین ہونے لگا ہے کہ درشہوار اور گوہر کا قتل بھی ان لوگوں نے کرایا ہے اور اس کا الزام یوسف پر لگایا ہے تاکہ وہ راستے... سے ہٹ جائے اور یہ اس کی زمین پر قبضہ کر لیں... لیکن میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“

”آپ نے پولیس میں اس کی رپورٹ نہیں کرائی؟“

سکینہ بی بی نے سر ہلایا۔ ”میں سوچ رہی ہوں۔ درشہوار کے قتل اور یوسف کی گمشدگی کی رپورٹ اشفاق اور اس کے بیٹوں کے خلاف لکھواؤں تاکہ ان کا دماغ بھی درست ہو۔“

”بالکل... آپ ایسا ہی کریں۔ انسپکٹر شہباز اچھا آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صحیح سے تفتیش کرے تو اصل قاتل تک پہنچ سکتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ اب مجھے پتا چل گیا ہے کہ یوسف خیریت سے ہے۔ اس سے رابطہ ہو تو کہنا کہ وہ واپس آجائے۔“

”میں ایسا ہی کروں گی۔“ سعدیہ نے اسے یقین دلایا۔

سعدیہ واپس جانے کے لیے تیار تھی لیکن سکینہ بی بی نے اصرار کر کے اسے دوپہر کے کھانے پر روک لیا۔ کھانے کے بعد اس نے اپنی ملازمہ کے ہمراہ اسے اسٹاپ تک بھیجا۔ سعدیہ شام تک گھر پہنچ گئی۔ اب اسے یوسف کے فون کا انتظار تھا۔ وہ جب سے گیا تھا، اس نے ایک بار بھی اسے کال نہیں کی تھی۔

☆☆☆

یوسف جس جگہ تھا، وہاں فون کی سہولت نہیں تھی۔ شبیر کے پاس موبائل تھا لیکن وہ اس سے مانگتے ہوئے جھجک رہا تھا کہ اس کی سابقہ بیوی کو کال کرنا چاہ رہا ہے۔ ورنہ اس کھولی نما مکان میں آ کر اسے رہ رہ کر سعدیہ کا خیال آ رہا تھا۔ یوسف خوف سے باہر بھی نہیں جا رہا تھا۔ باہر کا سارا کام شبیر کر رہا تھا۔ البتہ یوسف نے اس کے ساتھ رفعت کو جانے کی اجازت نہیں دی۔ جب شبیر پہلی بار کھانے کے لیے کچھ لینے جا رہا تھا تو یوسف نے اس سے کہا۔ ”پولیس کو اطلاع کرنے کی حماقت مت کرنا، ورنہ میں تو زندہ پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا، یہ بھی میرے ساتھ جائے گی اور تم خالی ہاتھ رہ جاؤ گے۔“

www.pkdigest.com

اس دھمکی نے شبیر کو شرارت سے باز رکھا ورنہ وہ اس قسم کا شخص تھا کہ اسے کسی شرارت سے باز رکھنا مشکل کام تھا۔ رفعت بھی سہم گئی۔ ان دونوں کے سامنے یوسف نے اپنے دُہرے قاتل کا تاثر برقرار رکھا تھا اور کبھی کبھی انہیں ڈرانے کے لیے مرنے مارنے کی باتیں بھی کرتا تھا۔ یہاں آنے کے اگلے دن وہ تینوں بینک گئے جہاں رفعت نے اپنا نکاح نامہ اور شوہر کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کیا۔ بینک منیجر نے ان دونوں چیزوں کو تسلیم کرلیا لیکن اس نے کہا۔

"جب تک آپ کورٹ سے آرڈر لے کر نہیں آتیں، آپ کو لاکر کھولنے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

بینک منیجر نے اپنا اعتراض تحریری صورت میں دے دیا۔ اب انہیں کورٹ کا آرڈر حاصل کرنا تھا۔ یوسف اس مرحلے پر پریشان ہوگیا۔ وہ خود کورٹ جا نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں قدم قدم پر پولیس ہوتی اور وہ پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اگر وہ شبیر اور رفعت کو جانے کی اجازت دے دیتا اور نکاح نامہ اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی ان کے حوالے کردیتا تو وہ پھر کہاں واپس آتے۔ وہ رقم لے کر غائب ہو جاتے اور پولیس کو اس کے پیچھے لگا جاتے۔ بہت سوچنے کے بعد یوسف نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ انہیں آزادی سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ شبیر کا خیال تھا کہ شاید وہ پولیس کے خوف سے نہ جائے۔ اس لیے جب یوسف نے جانے کا فیصلہ کیا تو اسے مایوسی ہوئی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر یوسف نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں کیا تمہیں صورت سے بے وقوف نظر آتا ہوں؟"

"کورٹ میں خطرہ ہوگا۔ اگر تم پہچان لیے گئے تو تمہارے ساتھ ہم بھی لپیٹ میں آسکتے ہیں۔"

"یہ تمہاری قسمت... اگر خود کو بچانا چاہتے ہو تو مجھے بچانا بھی تمہاری ذمے داری ہے۔"

وہ اگلے روز صبح کے وقت سٹی کورٹ گئے۔ یوسف نے مختلف نظر آنے کے لیے پینٹ شرٹ پہن لی تھی اور سر پر پی کیپ لگالی۔ لیکن وہاں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ایک وکیل نے اپنی فیس لی اور ان کے لیے سارے مشکل مراحل آسان بنادیے۔ ایک گھنٹے کے اندر انہیں کورٹ آرڈر مل گیا۔ کورٹ سے باہر آکر یوسف اور اس کے ساتھ ان دونوں نے بھی سکون کا سانس لیا... کیونکہ یوسف مسلح تھا اور اگر کوئی پولیس والا اسے پہچان جاتا تو وہ گرفتاری دینے کے بجائے مقابلے پر اتر آتا اور اس مقابلے میں اس کے ساتھ وہ دونوں بھی مارے جاسکتے تھے۔ گھر پہنچ کر شبیر نے جشن منانے کے لیے ایک بوتل کھولی۔ اس نے اپنے اور رفعت کے لیے برانڈی نکالی اور یوسف کو بھی دعوت دی۔ اس نے کراہت سے کہا۔

"مہربانی کرکے اسے دور رکھو۔ اس کی بدبو سے میرا دل خراب ہو رہا ہے۔"

"مرضی تمہاری۔" شبیر نے شانے اچکائے اور رفعت کے ساتھ پینے لگ گیا۔ یوسف نفرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پینے کے بعد انہوں نے بہکنا شروع کردیا۔ اس پر یوسف کا صبر جواب دے گیا اور اس نے سختی سے انہیں ٹوکا۔ "بس... اب اپنی حد میں رہو۔"

شبیر ہنسنے لگا۔ "یہ حد کیا ہوتی ہے... ہم جیسوں کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی۔ اب تم بھی ہم میں شامل ہوگئے ہو۔"

"میں تم میں شامل نہیں ہوں۔"

"اچھا... یہ دو قتل کس نے کیے ہیں؟"

"میں نے نہیں کیے... مجھ پر غلط الزام لگایا ہے کسی نے۔"

شبیر پھر ہنسنے لگا۔ "اچھا... تم پر قتل کا غلط الزام لگا ہے؟ لیکن اگر تمہیں سزا ہوگئی تو تم مجرم کہلاؤ گے۔"

"میں مجرم نہیں ہوں۔" یوسف چیخ اٹھا۔

"اگر مجرم نہیں ہو تو اس غیر قانونی دولت کے چکر میں کیوں ہو؟" شبیر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ بھی ایک مجرم کی دولت ہے۔"

"مجھے فرار ہونے اور روپوش ہونے کے لیے دولت کی ضرورت ہے۔" یوسف کا لہجہ کمزور ہوگیا۔

شبیر نے قہقہہ مارا۔ "روپوش اور فرار ہونے کے لیے دولت کی ضرورت ہے؟ احمق... دولت صرف عیاشی کے کام آتی ہے... اس عیاشی کے۔" اس نے ہاتھ میں موجود بوتل لہرا کر کہا۔ "باقی جیل جانے سے تو آدمی کو کوئی بھی دولت نہیں بچاسکتی... اور موت کا وقت آگیا تو ساری دنیا کی دولت مل کر بھی نہیں بچاسکتی۔ تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو کہ دولت کی مدد سے فرار ہوگے۔"

یوسف نے غصے سے بے قابو ہو کر اسے گھونسا مارا تو شبیر پیچھے جا گرا اور پھر وہیں پڑا خراٹے لینے لگا۔ اسے گھونسے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ یوسف نے سر تھام لیا۔ شبیر کی باتیں رہ رہ کر اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ کیا واقعی وہ مجرم تھا اور ان کی طرح سوچنے لگا تھا؟ اسے حرام کی دولت میں اتنی کشش محسوس ہو رہی تھی؟ اس نے چلا کر زور سے کہا۔

"نہیں، یہ بکواس ہے۔"

رفعت ایک طرف پڑی تھی۔ اس نے بھی اتنی پی لی تھی کہ اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی اور اسے پتا نہیں تھا کہ وہ ننگے فرش پر پڑی ہے۔ یہ ان کی زندگی تھی... یعنی عیاشی کرو اور دنیا سے بے خبر ہو جاؤ۔ یوسف تھکے تھکے انداز میں ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آج اس کوٹھری میں اس کی آخری رات تھی۔ کل صبح ان کو بینک جانا تھا جہاں سے وہ لاکر میں رکھی رقم نکال کر اس کے حصے کرتے اور اپنی اپنی راہ لیتے۔ شبیر اور رفعت بھی یہاں نہیں آتے۔ ظاہر ہے اتنی دولت کے ساتھ ان کو اس خستہ حال کوٹھری میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ یوسف نے ان دونوں کو ہلا جلا کر دیکھا اور پھر دبے قدموں کوٹھری سے نکل گیا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ بے ہوش ہیں۔ لیکن اگر وہ ہوش میں بھی ہوتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کاغذات اس کے پاس تھے اور اس کے بغیر وہ بینک جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ باہر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ آج گرمی بہت زیادہ تھی لیکن اس کا فائدہ یہ تھا کہ سڑکیں سنسان تھیں اور تھوڑے بہت لوگ نظر آرہے تھے۔ اس نے ایک چھوٹے سے پی سی او سے سعدیہ کا نمبر ملایا۔ اسکول بند تھے اس لیے اس کا گھر پر ہونا یقینی تھا۔ اس نے دوسری بیل پر کال ریسیو کرلی۔

"میں بات کر رہا ہوں۔" یوسف نے نام لینے سے گریز کیا کیونکہ پی سی او کا مالک پاس ہی بیٹھا تھا اور وہ ساری بات سن رہا تھا۔

"یوسف۔" سعدیہ نے جلدی سے کہا۔ "[illegible] فکرمند تھی۔"

یوسف بے تاب ہوگیا۔ "اچھا... ماں جی کیسی ہیں؟"

"وہ ٹھیک ہیں اور وہ کہہ رہی ہیں کہ تم واپس آجاؤ۔ انہوں نے وکیل سے بات کرلی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ کیس میں جان نہیں ہے، وہ تمہیں عدالت سے رہا کرالے گا۔"

"سارے وکیل ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔" یوسف نے آہستہ سے کہا۔ "میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"ماں جی کا کہنا ہے کہ یہ کام تمہارے چچا اور ان کے بیٹوں کا ہے اور انہوں نے زمین کے چکر میں یہ سب کیا ہے۔"

"مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ انہوں نے ماں جی کو تو تنگ نہیں کیا؟"

"تمہارا چچا آیا تھا اور زمین سنبھالنے کی بات کی تھی۔ جب ماں جی نے انکار کیا تو دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔"

"ماں جی کو ہوشیار رہنا ہوگا۔" یوسف نے تشویش سے کہا۔

"ماں جی نے ان کے خلاف دو شہوار کے قتل اور تمہاری گمشدگی کا پرچہ کٹوانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس طرح ان پر دباؤ آئے گا اور پولیس بھی دوسرے زاویے سے تفتیش کرے گی۔" سعدیہ نے بتایا پھر التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "یوسف پلیز! واپس چلے جاؤ... خود کو پولیس کے حوالے کردو۔"

"میں پھنس جاؤں گا، میں ایسا نہیں کرسکتا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا... ہم سب ہیں نا؟"

"تم کسی طریقے سے ماں جی کو بتا دینا کہ میں ٹھیک ہوں۔" یوسف نے اس کی بات نظر انداز کرکے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، اس نے فون بند کردیا۔ ادائیگی کرکے وہ باہر آیا تو اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ سعدیہ سے بات کرکے وہ افسردہ ہوگیا تھا۔ البتہ ایک اچھی خبر تھی کہ ماں جی ٹھیک ہیں اور حوصلے سے اس صورت حال کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ اسے شرم آنے لگی۔ وہ عورت ہوکر بھی مایوس نہیں تھیں اور وہ مرد ہوکر راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتا؟ وہ پھانسی کے تختے پر نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ اسے مرنے سے خوف آتا تھا اور وہ زندہ رہنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔

وہ واپس کوٹھری میں آیا تو شبیر اور رفعت پہلے کی طرح بے سدھ پڑے تھے۔ انہیں کہیں شام کو جاکر ہوش آیا۔ وہ مزید پینا چاہتے تھے لیکن یوسف نے بوتل چھین لی۔ "تم دونوں کا دماغ درست ہے؟ اگر اسی طرح پیتے رہے تو کل ہوش ہوگا تمہیں؟"

"تم فکر مت کرو۔" شبیر نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ "کل ہم بالکل ٹھیک ہوں گے۔"

"نہیں بھی ہوں گے تو ہو جائیں گے۔" رفعت نے ہنس کر کہا۔ "دولت ایسی چیز ہے، بڑے بڑے نشے اتار دیتی ہے اور اس کا نشہ صرف موت اتار سکتی ہے۔"

یوسف دہل گیا۔ پہلے شبیر نے دولت کے ساتھ موت کا ذکر کیا تھا اور اب رفعت نے بھی وہی بات کی تھی۔ اس نے سوچا۔ 'کیا میں دولت کے پیچھے بھاگ رہا ہوں اور اس کا انجام موت ہوگا؟'

لیکن اس کے اندر سے کسی نے کہا کہ وہ دولت کے پیچھے نہیں اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہے۔ یہ اور بات تھی کہ جان بچانے کے بجائے وہ جان خطرے میں ڈال رہا تھا۔ کل وہ بینک جاتا اور کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو وہ سیدھا پولیس کے ہاتھ لگ جاتا۔ رات انہوں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ تینوں ہی جاگ رہے تھے۔ شبیر اور رفعت کی نیند تو دولت کے خیال نے اڑا رکھی تھی لیکن یوسف کسی اور وجہ سے جاگ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک کشمکش جاری تھی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ وہ سعدیہ اور ماں جی کی بات مان لے اور خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ لیکن جب جیل اور کال

www.pkdigest.com

کوٹھری کا خیال آتا تو وہ اندر سے لرز جاتا۔ وہ یہ سب نہیں بھگت سکتا تھا۔

صبح ہوئی تو انہوں نے بینک جانے کی تیاری شروع کر دی۔ شبیر کہیں نزدیک سے ناشتا لے آیا جسے سب نے بے دلی سے کھایا۔ بھوک کسی کو نہیں تھی۔ تینوں چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ مرحلہ نمٹ جائے اور وہ اپنی اپنی راہ لیں۔ یوسف نے دور دراز کے ایک شہر جانے کا سوچ لیا تھا جہاں اسے جاننے والا کوئی نہیں تھا اور جس کی وسعت میں وہ آسانی سے غائب ہو سکتا تھا۔ پھر وہاں سے کہیں باہر نکلنے کے راستے بھی تھے۔ یوسف اپنا پستول رکھنے لگا لیکن شبیر نے اسے روک دیا۔

"بینک میں یہ چیک ہو جائے گا۔"

یوسف کو یاد آیا کہ پہلے بھی وہ پستول نہیں لے کر گیا تھا کیونکہ گارڈ آلے کی مدد سے ہر آنے جانے والے کو چیک کرتے تھے۔ اس کا پستول چیک ہو جاتا تو وہ مصیبت میں پڑ جاتے۔ ایک الزام اور لگ جاتا کہ وہ بینک میں ڈکیتی کی نیت سے جا رہا تھا۔ مجبوراً اس نے پستول نہ لے جانے کا فیصلہ کیا لیکن اسے ساتھ رکھ لیا۔ "میں راستے میں کہیں اس سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑا لوں گا۔"

اب ان میں ایک طرح کا باہمی اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کسی فریق نے دوسرے کو دھوکا دینے کی کوشش کی تو سب ہی دولت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ یوسف نے راستے میں ایک جگہ بڑا سا کھلا نالا دیکھ کر کار اس کے پاس رکوائی اور اتر کر پستول اس میں پھینک دیا۔ اس میں سے پستول نکالنا تقریباً ناممکن تھا اور اگر کوئی نکال بھی لیتا تو اس کا تعلق یوسف سے ثابت کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ واپس آیا تو وہ بینک کے لیے روانہ ہو گئے۔ شبیر نے کہا۔

"تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں فی الحال کہیں روپوش ہو جاؤں گا اور پھر موقع پا کر ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔"

"یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" شبیر نے کہا۔ "دوسری صورت میں پولیس کی تلوار ہمیشہ تمہارے سر پر لٹکی رہے گی۔"

"تم دونوں کا کیا ارادہ ہے؟"

"ہم بھی اپنی اپنی راہ لیں گے۔"

یوسف نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تو کیا تم دونوں کا ساتھ رہنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

رفعت طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ "اتنی مشکل سے تو ایک شوہر سے جان چھوٹی ہے۔ اب کیا دوسرا سر پر سوار کر لوں؟"

"اور میں بھی آزاد پنچھی ہوں۔" شبیر نے ہاتھ سے پرندے کے اڑنے کا اشارہ کیا۔ "ایک برائی تھی جس سے جان چھوٹ گئی۔ اب دوبارہ اس چکر میں کون پڑتا ہے۔ ویسے بھی میں جس دنیا کا آدمی ہوں اس میں گھر داری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں تو اپنے اگلے پل کا نہیں پتا، گھر بنا کر کیا کرنا ہے؟ اپنی زندگی تو بس کھانا پینا اور عیاشی کرنا ہے۔"

یوسف نے سوچا۔ 'کیا میری آنے والی زندگی بھی ایسی ہوگی؟'

شبیر نے اس کی طرف دیکھا۔ "میں تو کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ آ جاؤ، تمہارا ہاتھ تو صاف ہو گیا ہے۔ مل کر کوئی کام کریں گے۔"

"میں جان بوجھ کر جرم نہیں کر سکتا۔"

"چھوڑو دوست... کوئی بھی پہلی بار جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ بعد میں سب کرنے لگتے ہیں۔"

"نہیں، میں یہ سب نہیں کر سکتا۔"

شبیر نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ "تو تم ابھی کیا کرنے جا رہے ہو... کیا یہ جرم نہیں ہے؟ یہ جرم سے کمائی ہوئی دولت ہے اور تم اس میں سے حصہ لینے جا رہے ہو۔"

"یہ میری مجبوری ہے۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ "مجھے فرار ہونے کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔"

"جرم مجبوری کا دوسرا نام ہے۔"

بینک آ گیا تھا۔ شبیر نے کار بینک کے دوسری طرف سڑک پر کھڑی کی۔ یہاں لائن سے کئی بینک تھے۔ ابھی وہ کار میں تھے کہ اچانک ہی ایک بینک کا دروازہ کھلا اور اس میں سے دو افراد بھاگتے ہوئے نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں بیگ اور ہتھیار تھے۔ وہ ایک گاڑی کی طرف لپک رہے تھے۔ بینک سے دو گارڈ برآمد ہوئے۔ وہ اپنی بندوقوں سے ڈاکوؤں پر فائرنگ کرنے لگے۔ ایک ڈاکو گولیاں کھا کر سڑک پر گرا اور گرنے سے اس کا بیگ کھل گیا۔ اندر موجود نوٹ سڑک پر بکھر گئے۔ ڈاکو تڑپ رہا تھا اور انہی نوٹوں پر لوٹ رہا تھا جو وہ ڈاکا مار کر لایا تھا۔ دوسرا ڈاکو کار میں گھس گیا لیکن اسے بھی وہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہوا۔ بینک کے گارڈ مسلسل فائرنگ کر رہے تھے اس ڈاکو کے سر میں لگی۔ وہ وہیں مر گیا جبکہ اس کا ساتھی ابھی تک تڑپ رہا تھا۔ اس کا خون سڑک پر پھیل رہا تھا اور نوٹوں کو بھی سرخ کر رہا تھا۔ ایک منٹ کے اندر زندگی کی امید میں دولت کے ساتھ بھاگنے والے دونوں ڈاکو موت کی نیند سو چکے تھے۔

شبیر اور رفعت نیچے جھک گئے کہ کوئی اندھی گولی آ کر انہیں نہ لگ جائے لیکن یوسف سحر زدہ سا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ایک بار شبیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "نیچے ہو جاؤ... گولی لگ جائے گی۔"

لیکن وہ توجہ دیے بغیر دیکھتا رہا۔ دونوں ڈاکو مارے جا چکے تھے۔ گارڈ ان کا معائنہ کر رہے تھے اور جلدی جلدی نوٹ سمیٹ رہے تھے۔ شبیر اور رفعت نے محسوس کیا کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے تو انہوں نے بھی سر اٹھایا اور شبیر نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ "یہاں سے نکلو... اس سے پہلے کہ پولیس آ جائے اور ہم مصیبت میں پڑ جائیں۔"

شبیر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے تیزی سے روانہ ہو گیا۔ نوٹ سمیٹنے میں مصروف گارڈز نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ شبیر نے گاڑی بہت تیز دوڑائی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد اس نے کار ایک پارک کے سامنے روک دی۔ "شکر ہے کہ پولیس نہیں آئی ورنہ پھنس جاتے... خاص طور سے تم۔" اس نے یوسف کی طرف دیکھا۔ "تم پولیس کو مطلوب ہو اور تمہاری وجہ سے ہم بھی مارے جاتے۔"

"تم فکر مت کرو، میری وجہ سے تمہیں کچھ نہیں ہوتا۔" یوسف سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اگر پولیس موقع پر آ جاتا تو میں پولیس سے کہہ دیتا کہ میں نے تمہیں یرغمال بنا رکھا ہے۔"

"پولیس میرا سابقہ ریکارڈ دیکھتی اور اس کے بعد مجھے بھی تمہارا ساتھی بنا دیتی۔" شبیر نے تلخی سے کہا۔ "ممکن ہے، مجھے بھی تمہارے ساتھ قتل میں شریک بنا دیتی۔"

"پولیس کبھی وقت پر آئی ہے؟" رفعت نے کہا۔ "اگر اس جگہ کوئی پولیس والا ہوا بھی تو اس نے فائرنگ کی آواز سن کر مخالف سمت میں دوڑ لگا دی ہوگی۔"

شبیر مایوس تھا۔ "آج تو یہ کام نہیں ہو سکتا... کچھ دیر بعد پولیس آ جائے گی اور پھر شام تک اس کا چکر چلتا رہے گا۔"

"نہیں، ہم دوپہر کے بعد جا سکتے ہیں۔" رفعت نے کہا۔ "ہم کوئی ڈاکا مارنے نہیں جا رہے جو پولیس سے ڈریں۔"

رفعت بے تاب لگ رہی تھی اور خود شبیر بھی کچھ کم بے تاب نہیں تھا۔ اس کے خوف پر لالچ غالب آتا جا رہا تھا اور کچھ دیر بعد وہ بھی رفعت کی بات سے متفق ہو گیا۔ شبیر نے یوسف کی طرف دیکھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

یوسف سوچوں میں گم تھا۔ اس نے جب سے ڈاکوؤں کو مرتے دیکھا تھا، وہ گم صم تھا۔ شبیر نے اس کا ہاتھ ہلایا تو وہ چونکا۔ "کیا ہوا؟"

شبیر نے اپنی بات دہرائی۔ "کیا خیال ہے؟"

"پتا نہیں۔" یوسف نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب... پتا نہیں؟"

"بات یہ ہے کہ مجھے اب اس رقم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

شبیر اس کی بات کا مطلب سمجھ کر کھل اٹھا۔ "سچ کہہ رہے ہو دوست؟"

"ہاں... اور میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔" یوسف نے کہا۔ "یہ دولت تم لوگوں کو مبارک ہو۔"

"شاید تم اس ڈاکو کے مرنے سے متاثر ہوئے ہو؟" شبیر نے اندازہ لگایا۔ "یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔"

"ہاں، تمہارے لیے اہم نہیں ہے کیونکہ تم دنیا میں اکیلے ہو اور مرنے والے ڈاکو بھی شاید اکیلے تھے... ورنہ اس طرح جان نہ گنواتے۔ میری ماں ہے اور میں اس طرح مر کر اسے دکھی نہیں کر سکتا۔" یوسف نے کہا اور کار سے اتر گیا۔

"ایک منٹ... کیا تمہارا ارادہ گرفتاری دینے کا ہے؟" شبیر نے جلدی سے پوچھا۔

"ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتا... لیکن ایک بات یقینی ہے، میں تم لوگوں سے پھر نہیں ملوں گا۔"

"تب خدا حافظ!" شبیر نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

سعدیہ صحن میں رکھے گملوں اور کیاری میں لگے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے چھوٹے سے گھر کو بے شمار پھولوں اور دلکش صورتوں والے پودوں سے سجا رکھا تھا۔ اچانک کال بیل بجی تو وہ گیٹ کی طرف آئی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں۔" باہر سے کسی نے آہستہ سے کہا۔

سعدیہ کا دل دھڑک اٹھا کیونکہ آواز یوسف کی تھی۔ وہ گھر میں اکیلی ہوتی تھی اس لیے دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے جھری سے جھانک کر دیکھا۔ سامنے یوسف ہی کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ سعدیہ نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا اور بے تابی سے بولی۔ "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

یوسف تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ تم سے ملنے آیا تھا۔"

سعدیہ کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اسے لاؤنج میں لائی جہاں سارہ بیٹھی ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہی تھی۔ اس نے یوسف کو سلام کیا اور ماں سے بولی۔ "ماما! اس دن ہم ان انکل کے گھر گئے تھے؟"

سعدیہ حیران ہوئی۔ "آپ کو کیسے پتا چلا؟"

www.pkdigest.com

"ان کی وہاں پر تصویر لگی تھی۔" سارہ نے بتایا اور دوبارہ کارٹون دیکھنے میں مگن ہو گئی۔

"تمہاری بیٹی بہت ذہین ہے۔" یوسف نے کہا۔

"اللہ کا شکر ہے جو اس نے مجھے سارہ دی ورنہ اس دنیا میں میرے پاس اور کیا ہے؟"

یوسف خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ "آج میں شاید آخری بار تم سے مل رہا ہوں۔"

سعدیہ اداس ہو گئی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم نے اپنی واپسی کا راستہ بند کر دیا ہے؟"

یوسف مسکرایا۔ "اس کے برعکس میں واپس آ گیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"تم نے کہا تھا کہ حرام کی دولت انسان کے کام نہیں آتی۔۔۔اور جب انسان موت سے بھاگتا ہے، تب بھی وہ موت کی طرف ہی بھاگتا ہے۔۔۔تو آج بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس کو عملی طور پر دیکھ لیا ہے۔" یوسف نے اسے بینک کے باہر ڈاکوؤں کے مارے جانے کے بارے میں بتایا۔ "جب میں نے اس ڈاکو کو اپنے ہی لہو اور نوٹوں پر لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا تو میں نے جانا کہ دولت انسان کو بچاتی نہیں بلکہ یہ اسے انجام تک لے جاتی ہے۔"

"ایسی دولت کا انجام برا ہوتا ہے۔" سعدیہ نے اس کی تائید کی۔ "اب تم کیا کرو گے؟"

"میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا اور اللہ سے بہتری کی امید رکھوں گا۔ وہ میری بے گناہی ثابت کرے گا۔"

"اس نے چاہا تو ایسا ہی ہو گا۔" سعدیہ نے کہا۔ "تم اکیلے نہیں ہو، ماں جی ہیں اور میں بھی ہوں۔"

یوسف نے اسے دیکھا۔ "تم بھی ہو میرے ساتھ؟"

"ہاں، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔"

"تب میرے لیے مشکل راہیں بھی آسان ہو جائیں گی۔" یوسف نے گہری سانس لی پھر اس نے کسی قدر ہچکچا کر کہا۔ "سعدیہ! میں تم سے وعدہ نہیں لیتا لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ عدالت مجھے بے گناہ قرار دے دے اور جب میں رہا ہو کر آؤں تو تم میری منتظر ہو؟"

سعدیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "میں بھی وعدہ نہیں کر سکتی کیونکہ میں اکیلی نہیں ہوں، میرے ساتھ ایک بچی بھی ہے۔ لیکن اگر تم رہا ہو گئے تو میں تمہیں منتظر ملوں گی۔"

"اگر ایسا ہو گیا تو میں تمہیں اور ماں جی کو لے کر شہر میں آ جاؤں گا۔ میں اس بستی میں نہیں رہ سکتا جہاں دولت کے لیے انسان اپنی اولاد کو قتل کر دے اور زمین کی خاطر خون کا دشمن بن جائے۔"

یوسف جانے کے لیے کھڑا ہو گیا تو سعدیہ کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ رونے لگی۔ یوسف نے اس کے آنسو صاف کیے۔ "تم مت رو کیونکہ تم نے تو میرا حوصلہ بڑھایا ہے اگر تم حوصلہ ہار دو گی تو میں شاید کبھی جیل سے باہر نہیں آ سکوں گا۔"

"نہیں، میں حوصلہ نہیں ہاروں گی۔" سعدیہ نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔

"میری ایک درخواست ہے کہ تم کبھی عدالت یا جیل میں مجھ سے ملنے نہیں آؤ گی۔ میری خواہش ہے کہ تم مجھے قید کی حالت میں مت دیکھو۔"

سعدیہ نے سر ہلایا۔ "میں نہیں آؤں گی لیکن ماں جی سے تو مل سکتی ہوں نا؟"

"ہاں، ماں جی سے ملنا تو لازمی ہے۔ وہ بہت اکیلی ہیں۔ تم انہیں حوصلہ دے سکتی ہو اور انہیں سنبھال بھی سکتی ہو۔"

"میں ان کا پورا خیال رکھوں گی۔" سعدیہ نے اسے یقین دلایا۔

"تب میں اطمینان سے جیل اور عدالت کا سامنا کر سکوں گا۔" یوسف نے یقین سے کہا۔ "تم اپنا اور سارہ کا بھی بہت خیال رکھنا۔ شبیر کو اس کی من پسند چیز مل گئی ہے اس لیے امکان ہے کہ وہ اب پریشان نہیں کرے گا۔ رفعت دولت سے اپنا حصہ لے کر اس سے الگ ہو جائے گی۔"

سعدیہ نے کہا۔ "مجھے ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری بلا سے وہ جہنم میں جائیں۔"

"شاید وہ اسی طرف جا رہے ہیں اور میں اس راستے سے پلٹ آیا ہوں۔"

"یوسف! مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے ساتھ انصاف ہو گا ممکن ہے، اس میں ذرا دیر لگ جائے لیکن بالآخر تم رہا ہو کر آؤ گے۔ میں اور ماں جی تمہارا انتظار کریں گے۔"

یوسف نے سر ہلایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ سعدیہ اسے جاتا دیکھ رہی تھی پھر اس نے دل میں دعا کی۔ "میرے اللہ! یہ شخص برائی کے راستے سے پلٹ آیا ہے۔ اس کی مدد فرما اور اس کی مشکلات کو آسان فرما۔"

اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر سے کسی نے آمین کہا ہو اور اس کے اندر سکون کی روشنی پھیل گئی۔ وہ اس یقین کے ساتھ دروازہ بند کر کے اندر آ گئی کہ کبھی اس دروازے پر پھر دستک ہو گی اور یوسف ایک بار پھر آئے گا۔

www.pkdigest.com